فروری 2024
www.pklibrary.com
خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماھنامہ
سسپنس ڈائجسٹ
بانی
معراج رسول

مدیرِ اعلیٰ

عذرا رسول

مدیرہ

یمنیٰ احمد

نائب مدیر

اطہر حسین

مارکیٹنگ وسرکولیشن منیجر

محمد شہزاد خان

0333-2256739

زندگی کے نشیب و فراز پر ایک صاحبِ فکر کی گہری نگاہ

سسپنس کی مجلسِ مشاورت و قارئین کی تلخ و شیریں باتیں، گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

ماضی کا آئینہ، با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

معاشرے میں ایک عزت دار اور شریف النفس انسان کی خودداری کے جرم کا تماشا

42 شہ زور

اسما قادری

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان

سحر انگیز جنگل میں شوخ و شریر چند دوستوں کی بدحواسیاں

انشائیہ

جون ایلیا

سقراط سے سرمد تک...

کون باور کرے گا کہ اس دور میں بھی علم و عقل اور فکر و نظر کی مخالفت کی جا سکتی ہے۔ فلاسفر اور مفکرین کا مذاق اڑایا جا سکتا ہے اور اس عہد میں بھی لئیموں کو حکیموں پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ ہمارا تو سب سے بڑا جرم ہی یہ قرار دیا گیا ہے کہ علم و فکر کی بات کرتے ہیں، شیخ الرئیس علی سینا، ابن ماجہ، ابن رشد اور شہاب الدین سہروردی کے نام عقیدت و احترام کے ساتھ زبان پر لاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہم شدید ترین جرائم کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ہمیں ان جرائم کی عقوبت میں وہی اذیتیں برداشت کرنا چاہئیں جو حنین ابن اسحاق، ابن رشد، گلیلیو، فردوسی، البیرونی اور ابو العتاہیہ کو برداشت کرنا پڑی تھیں۔ ہم اسی سزا کے مستوجب ہیں جو سقراط، برونو، شہاب الدین سہروردی، منصور حلاج اور سرمد کے لیے تجویز کی گئی تھی یعنی المناک مشقتیں اور دردناک موت۔ ہمارے اور ہمارے پیش رووٴں کے لیے کلیسائے جہالت کے پادریوں کے پاس شوکران اور شمشیر کے علاوہ اور ہے بھی کیا۔ شوکران اور شمشیر...... ان دو چیزوں کے ذریعے ہی ہمیشہ علم اور انسانیت کی زبان کو خاموش کیا گیا ہے۔

حیرت ہے کہ لوگ اپنے نامۂ اعمال پر شرمندہ کیوں نہیں ہوتے۔ انہیں انسانیت کا سامنا کرنے کی جرأت کس طرح ہوتی ہے۔ ان میں جہالت و وحشت پر اصرار کرنے کی جسارت کہاں سے آئی؟ کس قدر مظلوم تھے ہمارے پیشرو اور کس قدر بدنصیب ہیں ہم کہ ہمیں انسانوں کی اس دنیا میں ہمیشہ علم اور عقل کی اہمیت ثابت کرنا پڑی ہے۔ ہمیں اس دعوے پر دلیل لانا پڑتی ہے کہ آفتاب رنگ و نور کا نقیب ہوتا ہے۔ آج جبکہ ترقی یافتہ قومیں کرۂ ارض کو پوری طرح مفتوح کر کے سیاروں کی طرف بڑھ رہی ہیں، ہم اسی بحث میں مبتلا ہیں کہ علم و عقل کی واقعتاً کوئی قدر و قیمت ہے یا نہیں۔ ہمیں فکری مسائل چھیڑنے سے پہلے اب بھی یہ سوچنا پڑتا ہے کہ کہیں جبینِ جہالت پر شکن نہ پڑ جائے، کہیں مزاجِ رجعت پرستی برہم نہ ہو جائے۔ ہم پر قوم اور ملک کے ان گنت حقوق ہیں مگر ہم ان میں سے اب تک کوئی حق ادا نہیں کر سکے۔ البتہ ہم نے اپنی قوم کی ذہنی اور فکری تعمیر کے لیے کچھ نہ کچھ سوچا ہے۔ کچھ عہد کیے ہیں اور طے کیا ہے کہ اس سلسلے میں اپنا فرض ضرور ادا کریں گے لیکن رجعت پرستی اپنی قدیم دنائت اور عداوت کے ساتھ آج بھی ہمارے خلاف صف آرا ہے۔ ہم پر طرح طرح کے الزامات عائد کیے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ہم اپنے مقاصد میں خلوص رکھتے ہیں اور خلوص کے ساتھ عزم تو ہمیں ان تمام الزامات کو برداشت کرنا چاہیے۔ دانش و حکمت کو ہمیشہ تہمتوں اور ملامتوں کا نشانہ بنایا گیا ہے، صدیاں صدیوں کو، نسلیں نسلوں کو اپنا وارث بناتی چلی آئیں اور یہی ہوتا رہا۔ یہ کوئی آج کی بات نہیں اور ویسے بھی علم اس دنیا میں نو وارد ہے۔ رہی جہالت، تو اس کو بلاشبہ طوالتِ سن اور قدامتِ عہد کا قابلِ رشک امتیاز حاصل ہے۔ وہ اپنی قدیم جاگیر میں کسی دوسرے کا تصرف آسانی سے گوارا نہیں کر سکتی۔

تاریخ کا ہر متبحر طالب علم جانتا ہے کہ اگر دوسری صدی ہجری کی علمی رو کو نہ روکا جاتا تو فکر و ثقافت کی تاریخ دوسرے ہی عنوان سے لکھی جاتی اور متمدن دنیا کی دانش گاہوں میں ڈیکارٹ، لاک، لیبنز، ابن ہیثم خیام اور ان کے تلامذہ پر تقریریں کی جاتیں اور ان کی تصنیفات کے درس دیے جاتے مگر ایسا کیوں نہ ہوتا۔ مشرقی کلیسا کے رجعت پرست ایسا کیوں ہونے دیتے؟ مشرقی کلیسا کے رجعت پرست جنہوں نے علوم و افکار کی طاقتور رو کو مشرق ہی میں نہیں روکا، مغرب میں بھی اپنی تباہ کن تصنیفات کے ذریعے اس کی مزاحمت کی اور اٹلی کے عقل دشمن پادریوں کو تقویت پہنچائی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہاں ان کو اور ان کے مغربی حلیفوں کو مآل کار شکست کھانا پڑی اور یورپ کی نشاۃ ثانیہ کا پُر جلال آفتاب طلوع ہو گیا مگر ہمارے علاقوں میں یہ مقابلہ اور مقاومت ابھی جاری ہے اور جو داستان سقراط سے شروع ہو کر سرمد تک کئی خونین ابواب سے گزر چکی تھی ابھی کچھ اور فصلوں کا اضافہ چاہتی ہے مگر یہ فصلیں اب نہیں لکھی جائیں گی۔ اب ان قلموں کو شکستہ ہونا پڑے گا۔

☆☆☆

عزیزانِ من...... السلام علیکم!

فروری 2024ء کا شمارہ آپ کے ذوق اور شوق کی نذر ہے...... نئے سال کی خوشی...... دعائیں اور نیک تمنائیں ایک طرف اور نئے سال کے...... پرانے مسائل دوسری جانب جو کسی اژدھے کے مانند منہ کھولے اب تک کھڑے ہیں اور جانے کب تک کھڑے رہیں گے...... جن کا منہ بند ہونے کا امکان بھی نظر نہیں آرہا...... کیونکہ ہر جانب الیکشن کا شور اور سلیکشن کی وبا کے ساتھ ساتھ سحر انگیز نعرے اور سیاست دانوں کی وہی شعبدہ بازی...... بار بار کے جھوٹے ثابت ہونے والے وعدوں پر یقین دہانی کی پُرزور فرمائش...... اللہ رے عوام کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ کر کھیلنے والے ان شعبدہ بازوں کی ایسی سادگی کہ حیرت کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن کے مصداق سب اللہ سے یہی دعا مانگ رہے ہیں کہ اس بار حقیقی طور پر قوم کے حق میں بہتر فیصلہ ہی ہو جائے...... پانچ فروری کشمیر کے حوالے سے منایا جانے والا دن، فلسطین کی آہ و بکا اور جہاں جہاں بھی مسلمانانِ عالم پر ظلم ہو رہا ہے...... مسلم دنیا کے لیے لمحۂ فکریہ ہے...... یا اللہ اس ظلم کے بازار کو اب ختم کر دے اور عالمی منظر نامہ بدل دے...... بہت ساری دعائیں اور نیک خواہشات کے ساتھ اب ذرا خطوط کی جانب بھی ایک نگاہ ڈالتے ہیں۔

✠ عبدالجبار رومی انصاری کی دوبارہ آمد، قصور سے۔ ”سر جھکائے حسن میں افسردگی سی ہے، سج سنور کے پھر بھی آزردگی سی ہے، کوئی تو دے اسے سال نو کی مبارک، خوشی سے کھل اٹھے، کیوں بے چارگی سی ہے۔ ہاں جی سسپنس سرورق تو زبردست رہا۔ پہلی نظر میں دیکھنے پر لگا جیسے مغلیہ دور کے کسی آرٹسٹ کا شاہکار ہے۔ بالکل تیکھے تیکھے سے نین نقش والی حسینہ اچھی لگی۔ نیا سال آگیا، سبھی کو مبارک ہو اور امید کرتے ہیں اللہ پاکستان کو بھی ترقی و استحکام عطا فرمائے۔ ہاں امید ہی کرتے ہیں۔ چلیں انشائیہ کی طرف بڑھتے ہیں، انکل جون ہمارے ہر دور کے نازک موڑ سے گزرنے والے پاکستان کے حالات پر کیا فرماتے ہیں۔ جناب نشیان! سالِ نو شروع ہوا چاہتا ہے اور پاکستان میں ہے جشن کا قیام۔ ہاں جی پاکستان کے زوال کا جشن اور یہ اعزاز صرف ہمیں ہی حاصل ہے۔ کس صورت میں جون ایلیا آخر ہوا کیا ہے؟ ہاہاہا نشیان آپ بھی کتنے بھولے ہیں۔ پچھلے چھہتر سالوں میں یہاں ہر سال سیاست دانوں کی لوٹ مار کا ہی تو جشن منایا جاتا ہے۔ ہاں نشیان، بس یہ سال ہمارے لیے بہتر ہو۔ اداریہ بھی حالات کی ستم ظریفی پر شکوہ کناں تھا اور پھر سوال تو پیدا ہوتے رہیں گے جب تک کرپٹ سیاست دان اور بے لگام اشرافیہ ہم پر مسلط رہے گی۔ عام عوام اسی طرح روتے دھوتے ان کی چال بازیوں میں اگر پھر انہی کو نجات دہندہ سمجھ کر اپنے ووٹوں کے ذریعے چنتے رہیں گے اور مفاد پرست کرپٹ عناصر غلام ابن غلام بن کر اس ملک کا حشر نشر کرتے رہیں گے تو یہ تو اب عوام پر ہے۔ الیکشن آگئے اور دیکھتے ہیں اپنے لیے ایماندار قیادت منتخب کرتے ہیں یا پھر وہی دودھ کی دھلی بے ایمان قیادت اور اپنا قیمتی ووٹ اپنے ضمیر سے پوچھ کر دیں تاکہ یہ بھی ہمارے لیے دنیا و آخرت کی کامیابی بن جائے اور کسی قسم کا پچھتاوا نہ ہو...... اور آپ سب کی پُرخلوص پکار پر ہم حاضر ہیں اور سبھی کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے سسپنس کی خوبصورت محفل میں ہمیں یاد رکھا (یاد تو سب گمشدہ لوگوں کو کرتے ہیں مگر کان صرف محبت کرنے والے ہی دھرتے ہیں۔ بہت شکریہ) خاص کر جنید علی جن کے تبصرے بھرپور اور بہت خوب ہوتے ہیں۔ اس دفعہ تو آپ کی سالانہ رپورٹ پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ خطوط سے لے کر تحاریر تک بھی لکھنے والوں کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا، بہت اچھا لگا اور اب ہماری کوشش ہوگی کہ ہر ماہ اپنی حاضری کو یقینی بنائیں۔ جی سیتا شاہ، امید کرتے ہیں میری طرح دوسرے تبصرہ نگار بھی واپس آئیں۔ باقی آپ کا تبصرہ خوب رہا۔ سسپنس کے مل جانے کا احساس تو پھر کیا بات ہے جی۔ روبینہ اشعر کی مبارک باد اور امتِ مسلمہ کی خوشحالی کی دعا پر آمین کہتے ہیں اور آپ کا روایتی تبصرہ بہت اچھا رہا۔ سید محی الدین اشفاق کی ثابت قدمی لائق تحسین ہے جو مایوسی کے بجائے اپنے خوشی بھرے جذبات کا اظہار کر رہے تھے اور بھائی ہم آپ کا انتظار ختم کرتے ہوئے اپنی پرانی محفل کے ساتھ لوٹ آئے ہیں اور آپ کے خوبصورت احساس کے ساتھ اپنے احساس کو بھی شامل کیے دیتے ہیں۔ انجم فاروق ساحلی مختصر تبصرے کے ساتھ حاضر تھے، بہت اچھا لگا۔ وہ جو بے دھڑک ہر خطرے میں کود جاتا ہے اور گھوڑے کو تیز رفتاری سے دوڑا کر سرعت سے حملہ کرتا ہے اسے تیمور کہتے ہیں اور پھر امیر حسین کی موت کے بعد تیمور کو سالار لشکر چن لیا گیا جس نے اپنی فتوحات سے اپنی طاقت کا بھی لوہا منوایا۔ تیمور کی بہادری کے ساتھ کام کی جلد تکمیل بھی زبردست تھی جس نے سمرقند میں خوبصورت بازار بیس روز میں تیار کروالیا اور پھر تین ماہ کے اندر اپنے حریفوں پر بھی فوج کشی کے لیے تیار ہو گیا۔ زویا صفوان کی ”جنگجوئے صف شکن“ آنا فانا ماضی کا آئینہ زبردست رہی۔ عیوق بخاری کی ”کھڑکی“ نے تو کمال ہی کر دیا۔ کہاں تو جوزفین، لوسیا کو منہ ہی منہ میں جلی کٹی سناتی رہتی تھی اور کہاں اسے گلے سے لگا کر اسے اپنی بیکری کا کیک پیش کر رہی تھی۔ یہ سب لوسیا پیٹر کی عادت تاکا جھانکی سے ممکن ہوا۔ کھڑکی بند کروائی گئی مگر کھڑکی کا چھوٹا سوراخ سی سی ٹی وی کیمرا بن گیا اور جوزفین کا کاروباری حریف روکی بیکری کو آگ لگاتے پکڑا گیا۔ یوں لوسیا اور جوزفین کی تاکا جھانکی سے اچھی دوستی بن گئی۔ نقلی میاں بیوی بن کر ملک صفدر کے تھانے پہنچنے والے اپنا ڈرامائی دکھڑا سناتے دھر لیے گئے۔ ملک صاحب کی ذہانت سے بابا حیاتا نے ان میاں بیوی کو پہچاننے سے انکار کر دیا تو عقدہ کھلا کہ یہ تو بدنام ڈاکو کاناجما کے ہی کارندے ہیں۔ پھر ملک صاحب انہیں کیسے جانے دیتے۔ یوں ان کے ساتھ ڈاکوؤں کی پوری ٹیم کا چالان

بن گیا۔ جہاں دستور شکن پیدا ہوتے ہیں وہاں دستور نافذ کرنے والے بھی آجاتے ہیں۔ حسام بٹ کی تحریر زبردست رہی۔ پراسرار مردے نے اسمتھ کو اتنا دوڑایا کہ اگلی پچھلی ساری دوڑ کا ریکارڈ ٹوٹ گیا اور یہ بھی شکر تھا کہ پروفیسر کے گھر کا دروازہ کھلا تھا اور اسمتھ ڈر کے مارے بھاگتا گھر میں داخل ہوگیا۔ پروفیسر کو اس کی حالت پر یقین نہ آیا تو اس نے پروفیسر کو اپنی تحریر لکھ دی۔ شاہد لطیف کی ڈراؤنی تحریر بھی بہت اچھی رہی۔ ''جنگ باز'' میں راجا تیمور بچتا ہی آرہا تھا اور پھر دورانِ سفر کسی دشمن کے ہاتھوں مارا گیا جو کسی غداری ہی کا شاخسانہ لگتا ہے۔ وہیں پر تھوڑی مارا ماری سے سہراب کو لگا ملتا ہے جو اسے پچھی اور رانگا کے پیچھے لگانے کو بارڈر پر دریا کنارے لے آتا ہے، بعد ازاں کبھی پانی میں تو کبھی کشتی کے ہچکولوں میں سہراب کا خطرناک سفر طے ہوتا ہے۔ کشتی میں رامو اور راجن کی لڑائی میں دونوں مارے جاتے ہیں۔ اب اگلی قسط میں پتا چلے گا بھیڑیے کی جست کیسے راستے میں ہی رہ جاتی ہے۔ باقی جنگ باز بہت عمدہ جارہی ہے۔ اس کی ہر قسط ہی ایک سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ ''وہی راستے وہی مرحلے'' میں حسن آرا ایک مغرور لڑکی ٹھہری جس نے شاہ مراد کی خواہش کی تو اسے مل گیا مگر اس کے فلم میں کام کرنے کی خواہش شاہ مراد نے رد کردی اور پھر نرم گرم مزاج لڑکی نے چار بچے بھی پیدا کر لیے۔ شاہ مراد کا کام ٹھپ ہوا تو حسن آرا نے بچوں سمیت منہ پھیر لیا۔ صرف انیقہ باپ کی محبت میں ساتھ رہ گئی۔ دوسری طرف حسن آرا شعیب سے نکاح کے بعد شعیب کے زیر عتاب آرہی ہیں جو آگے چل کر یقیناً جو بویا وہی کاٹا کے مصداق اپنا انجام دیکھیں گی۔ ناہید سلطانہ اختر کی تحریر بے حد پسند آئی۔ تمیم داری نے دجال اکبر سے ملاقات کی جس نے پیش گوئیاں کیں کہ ابھی اس کا زمانہ نہیں آیا اور صاف بن صیاد کے دجال کے جیسا بننے کے بیان نے اسے صحابہ اکرامؓ میں متنازع کردیا مگر وہ مسلمان کی حیثیت سے الگ تھلگ رہا۔ محفل شعر وسخن سے زین الاسلام، آصف راہی، ضیا آفریدی اور انعم کمال کے شعر اچھے لگے۔''

✠ روبینہ اشعر کی دعا کراچی سے۔ سالِ نو جنوری 2024ء کا پہلا شمارہ مشرقی حسن کے خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ ملا جس میں حسینہ تیکھی نظر کیے کچھ سوچ رہی تھی۔ ٹائٹل کو سراہتے اور فہرست پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے جون ایلیا کے انشائیے ''مبارک ترین'' سے مستفید ہوئے جس میں وہ نئے سال کی مبارک باد دے رہے تھے اور ساتھ ہی انہوں نے درست فرمایا کہ ہم ابھی تک وہیں کے وہیں ہیں جہاں گزشتہ بیس اکیس سال پہلے تھے بلکہ سچ پوچھیں تو ہم اس سے بھی بہت پیچھے چلے گئے ہیں اور یہ سب ہمارے ملک کے ارباب اختیار صاحبان کی کرم فرمائی ہے۔ دعا ہے کہ نیا سال عوام کے لیے مبارک ترین ثابت ہو، آمین۔ خطوط کی محفل میں مدیرہ صاحبہ بھی نئے سال کی اچھی امیدوں کے ساتھ سالِ نو کی پہلی محفل سجائے بیٹھی تھیں۔ خطوط میں جنید علی کا سالانہ تبصرہ بہت شاندار رہا۔ نہایت عرق ریزی اور جانفشانی سے تیار کردہ خط جو اعداد وشمار کے ساتھ پورے سال کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔ خط پڑھ کر ایسا لگا جیسے پورے سال کا سسپنس ایک ساتھ پڑھ لیا ہو...... بہت عمدہ، ویل ڈن۔ ہمارا خط پسند کرنے کا شکریہ۔ دیگر حاضرین میں سیتا شاہ، سید محی الدین، انجم فاروق ساحلی کے تبصرے بھی دلچسپ رہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے نازیہ کامران کاشف کی ''شاکا'' کا آخری حصہ بھی شاندار رہا۔ شاکا کو صوفیہ مل گئی اور ساتھ ہی عفریتوں کا خاتمہ بھی ہوا۔ بورس کی ریسرچ کو اس کا پوتا رسل آگے بڑھائے گا اور پھر وہی خوفناک تاریخ دہرائی جائے گی۔ زویا صفوان کی تحریر ''جنگجوئے صف شکن'' کا دوسرا حصہ بھی زبردست رہا۔ تیمور کی فتوحات کا سلسلہ بھی دراز ہوگیا ہے۔ اس کی جنگجو فطرت نے مشکل ترین حالات میں بھی جس طرح جینے کا راستہ نکالا اور تمام مشکلات کو اپنی جان پر جھیل کر اپنی قوم کو بدگمانی اور غیر یقینی کے بھنور سے بچایا۔ عیوق بخاری کی کہانی ''کھڑکی'' نہایت دلچسپ رہی۔ لوسیا کی تاک جھانک کی عادت نے جوزفین کو اس سے متنفر کردیا تھا اور روکی جو بظاہر جوزفین کا حمایتی اور دوست تھا لیکن اس کے دل میں جوزفین کے لیے بغض بھرا ہوا تھا اور پھر لوسیا کی اسی تاک جھانک کی عادت نے روکی کا بھیانک چہرہ سب کے سامنے عیاں کردیا۔ بہت خوب۔ عائشہ نصیر کی تحریر ''تشنہ کام'' اچھی رہی۔ ملک صفدر حیات کی ''دستور شکن'' جرم کی دنیا میں خیر اور شر کے درمیان ہونے والی معرکہ آرائی کا قصہ تھی۔ داؤدا اور جھیماں فرضی میاں بیوی بن کر خطرناک ڈاکو کانا جما کو تھانے کی حوالات سے فرار کرانے آئے لیکن ملک صاحب کی بروقت کارروائی سے وہ اپنے منصوبے میں کامیاب نہ ہوسکے اور کانا جما اپنے گروہ سمیت انجام کو پہنچا۔ شاہد لطیف کی کہانی ''پُراسرار مردہ'' بھی خوب رہی۔ آصف ضیا احمد کی تحریر ''ہمراز'' زبردست رہی۔ فرزین اور اشعر نے ایک دوسرے کو قتل کردیا اور مدحت اس سارے واقعے کی چشم دید گواہ اور ان دونوں کی ہمراز تھی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی ''جنگ باز'' بھی اپنے سسپنس اور ایکشن کے ساتھ بھرپور انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔ امجد جاوید کی ''بدلہ'' بھی پسند آئی۔ ارشد نے راحیلہ کو پکڑوا کر اپنا فرض بھی پورا کیا اور ساتھ ہی پرانا بدلہ بھی لے لیا۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر ''صاف بن صیاد'' کا دوسرا اور آخری حصہ بھی خوب رہا۔ ناہید سلطانہ اختر کی ''وہی راستے وہی مرحلے'' کا پہلا حصہ اس ماہ کی سب سے زبردست تحریر رہی۔ حسن آرا نے اداکاری کے جنون میں شاہ مراد سے شادی کی اور پھر اپنی خواہش پوری نہ ہونے پر اسے وفا کی راہوں میں سسکتا چھوڑ گئی۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ محفل شعر وسخن میں اشعار اور کترنوں کا انتخاب بھی خوب رہا۔''

✠ سید محی الدین اشفاق فتح پور لیہ سے خط لکھ رہے ہیں۔ ''رسالہ بہت دیر سے ملا اور اب سخت سردی میں خط اس دعا کے ساتھ لکھ رہے ہیں کہ شائع ہوجائے۔ واہ جنید علی صاحب! کمال کردیا سسپنس کا سالانہ تبصرہ پیش کر کے۔ بڑا شاندار کام کیا ہے۔ اسے کہتے ہیں کتاب و مطالعے سے محبت اور حرف حرف پڑھ کر سمجھنا۔ ماشاء اللہ باکمال انسان ہیں آپ۔ کرسیِ صدارت پر فائز ہونے کی مبارک۔ تبصرہ ہے ہی ایسا کہ اعزاز دینے کو جی چاہے۔ پورے سال کے تمام شماروں کو ایک خط میں اس طرح پیش کیا کہ دل خوش ہوگیا۔ اتنا اچھا لکھنے پر مبارک سلامت رہیں

(آمین)۔ سیتا شاہ، روبینہ اشعر کے تبصرے بھی خوب تھے اور انجم فاروق ساحلی سے ادب سے شکوہ کہ ہاں واقعی آپ جلد بازی میں تبصرہ کرنے کے عادی ہیں۔ بھئی اپنے محبوب رسالے کے لیے اپنے خوب سارے قیمتی لفظ لکھیے نا۔ ویسے یہ مت سمجھیں کہ تبصرہ پسند نہیں آیا۔ ارے جناب! آپ کے نام کے ساتھ لکھی ہوئی عبارت جتنی بھی مقدار میں ہو، دل و جان سے پسند ہے۔ دیر سے ملنے کی وجہ سے رسالہ ابھی پورا پڑھ نہیں سکے۔ شاعری پسند ہے اس لیے پہلے اس محفل میں گئے۔ پشاور والے ضیا آفریدی کا شعر پسند آیا۔ آصفہ ضیا احمد کی ''ہمراز'' پڑھی۔ انجام میں دو افراد کا قتل ہوا لیکن افسوس کہ وہ سزا کے لائق تھے اور واقعی انہیں قدرت نے مارا۔ اچھا ہوا مدحت قاتل بننے سے بچ گئی اور بے وفا اشعر اور غدار فرزین خود ہی انجام کو پہنچ گئے۔ عیوق بخاری کی ''کھڑکی'' دلچسپ تحریر تھی۔ لوسیا کی تاک جھانک کی عادت نے جوزفین کو نقصان سے بچا لیا اور دونوں میں دوستی ہوگئی۔ لوسیا کے کھڑکی میں بیٹھنے، رونق دیکھنے اور جوزفین کے کڑھنے کے بارے میں پڑھنا کافی دلچسپ تھا، ویل ڈن۔ اسما قادری کی ''شہ زور'' اچھی تحریر ہے۔ ادارے و قارئین کے لیے دعا گو۔''

✠ سیتا شاہ، ڈیرہ غازی خان سے چلی آرہی ہیں۔ ''سردیوں کی چھٹیوں میں سسپنس کی بروقت آمد نے خوش کر دیا۔ لحاف میں بیٹھ کر کہانیاں پڑھیں اور خطوط کی محفل میں سب کے خط پڑھے۔ تبصروں میں پہلے نمبر پر شائع ہونے والا تبصرہ واقعی نمبر ون تھا۔ جنید علی نے کافی معلوماتی خط لکھا ہے۔ پورے سال تحاریر کی دہرائی کروا دی، ماشاء اللہ۔ روبینہ اشعر، سید محی الدین اشفاق اور انجم فاروق ساحلی کا مختصر تبصرہ پڑھنے کو ملا، سب پسند آئے۔ بہت اچھے ہیں وہ لوگ جو مطالعہ کرتے ہیں اور پھر پڑھے ہوئے پر تبصرہ کرنے کا وقت نکال کر بتاتے ہیں کہ وہ کتنے کتاب دوست ہیں۔ چھٹیوں میں بڑے سکون سے رسالہ پڑھا۔ ساری کہانیاں اچھی لگیں، بالخصوص امجد جاوید کی ''بدلہ''، آصفہ ضیا احمد کی ''ہمراز''، عیوق بخاری کی ''کھڑکی''، ضیا تسنیم بلگرامی کی ''صاف بن صیاد'' پڑھ کر مزہ آگیا۔ شعر بہت معیاری اور کترنیں بہت دلچسپ تھیں۔ اللہ رسالے کو مزید ترقی دے اور لکھاریوں کو لکھنے کی مزید ہمت دے تاکہ ہم اچھی تحاریر سے ہمیشہ مستفید ہوتے رہیں۔''

✠ جنید علی کی ممنونیت ملتان سے۔ ''جے ڈی پی پبلی کیشنز کا تہِ دل سے ممنون ہوں کہ سسپنس سمیت جاسوسی اور سرگزشت میں بھی سالِ نو کے شماروں میں میرے سالانہ تبصرے صفِ اول پر شائع کر کے حوصلہ افزائی کی۔ سالِ نو کا سسپنس 21 دسمبر کو مل گیا۔ اگرچہ یونیورسٹی کی غیر نصابی سرگرمیاں بھی عروج پر ہیں اور مجھے اسٹڈیز کے ساتھ ان غیر نصابی سرگرمیوں میں شریک ہونا بے حد پسند ہے کہ بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ کھیل ہو یا تقریر، تجربے سے انسان بہت کچھ سیکھتا ہے اور اپنی سابقہ غلطیوں کی نشاندہی بھی کرنی چاہیے اور تعلیم سے ہٹ کر مطالعہ، کھیل اور ایسی سرگرمیاں بہت ضروری ہیں۔ ماحول کو ہم سب انفرادی طور پر بدلیں گے تو معاشرہ بدلے گا۔ خیر، سسپنس کا سرورق سالِ نو کی مناسبت سے دلکش بیک گراؤنڈ کے ساتھ بہت ہی پسند آیا۔ جون ایلیا کچھ نئی امیدوں کے ساتھ سال کا آغاز کرتے نظر آئے۔ خطوط میں سید محی الدین اشفاق صاحب آپ اور ملک وحید صاحب کی موجودگی سے شفیق سی اپنائیت و بڑے پن کا احساس ہوتا ہے کہ ہم سے سینئر جو ٹھہرے۔ رومی صاحب پھر سے غائب ہوگئے ہیں، کیوں بھئی؟ روبینہ اشعر صاحبہ مطلب کہنے کا یہ تھا کہ تاریخی تحریروں پر کافی اچھے سے تبصرہ کرتی ہیں۔ ناہید یوسف تاخیر سے آئیں۔ انجم صاحب کی آمد اگلی بار اتنی مختصر نہ ہو۔ سیتا شاہ کو شمارہ اتنی تاخیر یعنی 2 کو ملا مگر پھر بھی پڑھ کر اچھے سے تبصرہ کیا۔ یہ ان کی سسپنس سے وابستگی ہے مگر شدید حیرانی تاخیر پر ہوئی کہ یہاں تو سسپنس کی سروس بڑی فاسٹ ہے۔ اب یہ جنوری کا شمارہ مجھے 21 دسمبر کو موصول بھی ہوگیا۔ اتنے زیادہ خطوط تاخیر سے موصول شدہ تھے۔ وجہ ڈاک کی اعلیٰ کارکردگی یا پرچہ تاخیر سے ملتا ہے یہی ہوگی ہر ایک کی وجہ، تو آپ تمام ادارے کی سہولت سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے؟ جو پیسے ہر ماہ دکاندار یا ہاکر کو دے کر اتنی تاخیر سے شمارہ لیتے ہیں تو اتنے ہی پیسے چھ ماہ یا پورے سال کے ادارے کو دے کر سالانہ خریدار بن جائیں تو آپ کو پرچہ مارکیٹ میں آنے سے بھی پہلے (ادارہ سالانہ خریداروں کو جلد روانہ کر دیتا ہے) ہر ماہ وقت پر آپ کی دہلیز، آپ کے ہوم ایڈریس پر ملے گا۔ عائشہ نصیر، عکس فاطمہ اور عیوق بخاری تینوں ہی ہر بار سنسنی خیز، معیاری، منفرد اور دلچسپ ترجمہ زاد تحریریں سسپنس و جاسوسی کے لیے لکھتی ہیں اور تینوں اب ذرا طویل تحریروں کی جانب بھی توجہ دیں۔ ''کھڑکی'' ایک دلچسپ اور ہلکی پھلکی تحریر تھی۔ مسز جوزفین جو بدگمانی کی وجہ سے بلاوجہ لوسیا پیٹر کو نحوست سمجھتے ہوئے ان سے عدم تحفظ کا شکار تھیں، آخر میں ان کی اچھائی کی معترف ہوگئیں اور دوست بن گئیں۔ ''تشنہ کام'' میں اپنی ہی منگیتر کے دشمن جو دھوکے باز تھا یعنی لیموئن نے کافی چالاکی سے اپنا مطلب پورا کرنے کے لیے ملی کو قتل کرنے کا پلان بنایا اور اپنا کارنامہ کیفیر پر ڈال دیا مگر پروفیسر چیپلین کی پیشہ ورانہ کارکردگی کام آگئی اور اصل قاتل کا پردہ فاش ہوگیا۔ مرزا امجد بیگ کی تحریر اس بار خاص پسند نہیں آئی کہ بہت عام سا پلاٹ تھا اور کچھ طوالت بھی تھی۔ شروع میں ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ داؤد اور نسیم دونوں میاں بیوی کسی سنگین سازش میں ہی ملوث ہوں گے ورنہ کسی کے پاس اتنا ٹائم نہیں ہوتا نہ شوق کہ جیل میں رات گزارے اور ڈاکو کو دیکھنے کی خواہش کرے اور وہی ہوا۔ دونوں بہروپیے اپنے ساتھی کانا جما کو بازیاب کرنے کے لیے ہی ساری کارروائی کر رہے تھے۔ شاہد لطیف کی کہانی ''پُراسرار مردہ'' ٹاپ پر تھی جو کچھ ہٹ کر تھی۔ حالات و واقعات کا تسلسل اور روانی بھی بہتر رہی جس میں ایک مُردے کی سرگرمیوں کا احوال کافی سنسنی خیز انداز میں بتایا گیا۔ ولیم نے پراسرار اور خطرناک علم سے کھیل ہی کھیل میں دوسروں کو ستانے کی ٹھانی مگر کامیاب نہ ہوسکا کہ اسمتھ نے اس کے ارادوں کو خاک میں ملا دیا۔ آخری لائن بہت ہی کارآمد رہی کہ ''جو لوگ تاریک چیزوں کے متلاشی ہوتے ہیں ان کے لیے ان کی خود ساختہ کامیابی ہی ان کی ناکامی بن جاتی ہے۔'' امجد جاوید اپنی مختصر سی تحریر میں روپ اور جگہ بدل کر مکر و فریب کا جال بچھا کر اپنا مطلب پورا کر کے

موت کے گھاٹ اتار دینے والی چالاک حسینہ کا احوال سنا رہے تھے جس کا دوست ہی اس کی بازیابی کی وجہ بنا اور راحیلہ خود بھی اپنے دوست کے جال میں آکر پھنس گئی اور پکڑی گئی۔ آصفہ ضیا کی کہانی معاشرے کی تلخ مگر حقیقت سے قریب تحریر تھی۔ اشعر اور فرزین نے مدحت کو دھوکا دیا اور غداری کی اور مدحت نے ان کو مارنا چاہا جو اس کا غلط فیصلہ تھا مگر اختتام میں بچ گئی۔ ہاں، اشعر اور فرزین کا موقع پر ہی مر جانا کچھ حیرت زدہ تھا کہ دونوں نے جنونی انداز میں خود کو مار دیا۔ سیر بنا راض کافی ٹائم سے غیر حاضر ہیں، ساتھ اعتزاز سلیم وصلی بھی اور دونوں جلد ہی اپنی نئی تحریروں کے ساتھ انٹری دیں۔ آخری صفحات پر کافی ٹائم بعد ناہید سلطانہ کے قلم سے کہانی پڑھی۔ عاقبت نا اندیش حسن آرا نے محض اپنی انا اور بے جا خواہشات کی خاطر اپنے خاوند سے طلاق لی جس کی وجہ سے بچوں پر بھی اثر پڑا مگر شعیب کے ساتھ بھی اس کی زیادہ نہیں بنے گی۔ والدین کے معاملات میں اولاد اور ان کی زندگی پر کتنا اثر پڑتا ہے کاش یہ والدین سوچ لیں تو کیا ہی اچھا ہو۔ دوسری قسط میں دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ ''شاکا'' کا زبردست اختتام ہوا اور سائینٹیفک فکشن پر مبنی مصنفہ نے یہ ناول ہر ماہ عرق ریزی سے لکھا جو ہمیں بہت پسند آیا۔ مصنفہ کو سسپنس ڈائجسٹ میں پہلی بار اتنے زبردست ناول کے اختتام پر مبارک باد۔ اب جلد ہی ان سے اگلی کوئی طویل قسط وار تحریر بھی سسپنس کے لیے لکھوائیں۔ اسما قادری صاحبہ کا ''شہ زور'' بھی اپنی منازل ہر ماہ دلچسپی کے ساتھ طے کر رہا ہے۔ ناول میں کچھ معاملات زیر بحث آئے ہیں، کچھ مزید کرداروں کے ساتھ جو امید ہے دلچسپی برقرار رکھیں گے، وہیں معاذ بھی کچھ ریلیکس موڈ میں ہوا ہے۔ اچھا ہے مگر وہیں نجل کی حالت کافی خراب ہے جو کاش آگے جا کر صحیح ہو جائے۔ ''جنگ باز'' میں ہر ماہ ہی ہمارے جنگ باز سہراب صاحب کی مشکلات میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور ہر بار نئے سے نئے دشمن نکلتے جا رہے ہیں جو اس کے مسائل میں اضافہ کر رہے ہیں، وہیں فوزیہ ابھی تک بازیاب نہیں ہوئی۔ سہراب کے ساتھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اولین صفحات پر زویا صفوان کے تاریخی ناول کی دوسری قسط بھی شاندار تھی۔ تیمور نے اپنی ذہانت، قابلیت، بہادری اور جوش و ولولے کی وجہ سے پوری زندگی کامیابیاں سمیٹیں اور دین اسلام کے لیے کافی خدمات سرانجام دیں اور ایک مثال کی حیثیت تاریخ میں رکھتا ہے۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ چلیں اب اگلے ماہ ملتے ہیں تب تک آپ سسپنس سے لطف اندوز ہوں۔''

✠ ملک وحید، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ ''نئے سال کا نیا شمارہ جلد ہی مل گیا۔ خوبصورت ٹائٹل اور فہرست کو دیکھ کر جون ایلیا کے پُرمغز انشائیہ سے مستفید ہوئے۔ خطوط کی محفل خوب سجی رہی اور ہمارا نام ان قارئین میں نظر آیا جن کے خطوط لیٹ موصول ہونے کی بنا پر شائع نہ ہو سکے حالانکہ ہم نے بروقت اپنا تبصرہ ارسال کر دیا تھا۔ جنید علی کا پورے سال کے شماروں پر شاندار تبصرہ پسند آیا۔ سیتا شاہ، سید محی الدین، انجم فاروق ساحلی اور روبینہ اشعر کے تبصرے بھی اچھے رہے۔ کہانیوں میں نازیہ کامران کاشف کی ''شاکا'' کا آخری حصہ شاندار رہا۔ زویا صفوان کی ''جنگجوئے صف شکن'' کا دوسرا حصہ بھی پسند آیا۔ عیوق بخاری کی تحریر ''کھڑکی'' اچھی لگی۔ عائشہ نصیر کی تحریر ''تشنہ کام'' بھی پسند آئی۔ ملک صفدر حیات کی ''دستور شکن'' ہمیشہ کی طرح خوب رہی۔ شاہد لطیف کی کہانی ''پُراسرار مردہ'' اچھی لگی۔ آصفہ ضیا احمد کی تحریر ''ہمراز'' پسند آئی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی ''جنگ باز'' نئے واقعات اور سسپنس کے ساتھ بھرپور انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔ امجد جاوید کی ''بدلہ'' کچھ خاص نہیں لگی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی ''صاف بن صیاد'' کا دوسرا اور آخری حصہ بھی خوب رہا۔ ناہید سلطانہ اختر کی ''وہی راستے وہی منزلیں'' کا پہلا حصہ پڑھا جو زبردست تھا۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ محفل شعر و سخن اور کترنوں کا انتخاب بھی خوب رہا۔ مجموعی طور پر شمارہ اچھا رہا۔''

✠ انجم فاروق ساحلی کا تبصرہ لاہور سے۔ ''جنوری کا سسپنس خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ منظرِ عام پر آیا۔ خطوط جامع تھے۔ جنید علی، سیتا شاہ، روبینہ اشعر، سید محی الدین اشفاق بھی احباب نے شہر بے وفا کو پسند کیا اور سابقہ خط کو سراہا۔ میں ان کا مشکور ہوں۔ ریاض بٹ اور رمضان پاشا غیر حاضر تھے۔ محفل شعر و سخن میں جگنو چمک رہے تھے۔ صاف بن صیاد کا دوسرا حصہ خوب ہے۔ تشنہ کام، کھڑکی سے بہتر تھی۔ سسپنس سے بھرپور پراسرار مردہ، دستور شکن دونوں خوب ہیں۔ شاکا، جنگ باز اور شہ زور اپنے اپنے انداز میں ٹھیک ہیں۔ ہمراز، بدلہ، وہی راستے وہی مرحلے ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔ شہر بے وفا کو پسند کیا گیا ہے۔ اب دوسری کہانیوں کی طرف توجہ دی جائے۔ دوسرا رخ کے مکالمے اچھے ہیں۔ انسان کے جسم میں سب سے اہم چیز دماغ یا ذہن کہہ لیں۔ اس دماغ کی سب سے بڑی خوبی سوچ و فکر ہے۔ جو قوم تسخیر کائنات کرے گی، فطرت اپنے چھپے ہوئے خزانے اس کے حوالے کر دے گی۔ اس میں مسلم یا غیر مسلم و کافر کا کوئی فرق یا امتیاز نہیں۔ قرآن کریم میں سات سو چھپن (756) جگہ مناظر قدرت و قوانین فطرت پر غور کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ علامہ ابن رشد، فارابی، بوعلی سینا اور فخر الدین رازی نے بھی ہمیں اسی طرف متوجہ کیا لیکن ہم نے توجہ نہ کی۔ نتیجہ یہ کہ دوسری قومیں برق و بار پر سوار ہو کر ترقی کی منازل طے کر رہی ہیں اور ہم صرف ماضی کی عظمت و رفعت میں الجھے ہوئے ہیں اور دوسری قوموں کے دستِ نگر ہیں۔ اٹھیے، اپنے ماحول کو سمجھنے اور بہتر بنانے کے لیے ایک قوم اور مشن کے تحت نیشنل ازم (قوم پرستی) کو اہمیت دے کر سائنسی شعور اپنائیے (آپ نے وقت کی قلت کا بتایا اور طبیعت کی ناسازی کا...... ہمیں احساس ہے جناب...... ٹھیک ہے جیسے آپ کو سہولت ہو آپ محفل میں شرکت کر سکتے ہیں)۔''

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے

صابر فیاض، حیدر آباد۔ سلطان احمد، بھکر (لیہ)۔ غلام رسول، پھالیہ۔ اعجاز احمد، لاہور۔ ریاض الدین، میرپور خاص۔

تیسرا اور آخری حصہ

جنگجوئے صف شکن

زویا صفوان

یوں تو یہ کائنات اللہ کی مخلوق سے بھری ہوئی ہے۔ جانے کتنے نام والے بے نام ہوئے مگر تاریخ کے صفحات نے کچھ لوگوں کو اپنے دامن میں کچھ اس طرح جگہ دی ہے جو ہمیشہ آنے والے لوگوں کو یاد رہیں گے... انہی میں چنگیز خان کے خاندان کو بھی دنیا کبھی نہیں بھول سکتی لیکن اس خاندان میں جو باہر سے شامل ہوا، اس کے کارناموں نے بھی اس خاندان کو چونکا دیا۔ اس کی جنگجو فطرت نے مشکل ترین حالات میں بھی جس طرح جینے کا رستہ نکالا اور تمام مشکلات کو اپنی جان پر جھیل کر اپنی قوم کو بدگمانی اور غیر یقینی کے بھنور سے بچایا... اس صلاحیت نے اسے تاریخ میں ہمیشہ کے لیے ایک بلند مقام عطا کر دیا۔

ماضی کا آئینہ۔ با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

جنگجوئے صف شکن ایک کٹھن اور پُرپیچ مہم پر روانہ ہو چکا تھا۔ ایسی مہم جس کی تکمیل کے متعلق اس کے پیشروؤں کے خواب بھی ادھورے ہی رہے تھے۔

اس جنگ میں تیمور کو بہت عجیب وغریب حالات درپیش تھے۔ اسے اپنے دشمن تک رسائی کے لیے مغربی سمت ایک ہزار میل کی مسافت طے کرنا تھی۔ اس مسافت کا اختتام ان بادشاہوں کی سرحدوں پر ہوتا جو اس کے خلاف دل وجان سے متحد ہو چکے تھے۔ یہ سرحدیں نیم دائرے کی شکل میں کوہستان قلقاز سے بغداد تک وسیع تھیں۔ ان کا جغرافیہ ایک ایسی لچک دار کمان کی طرح تھا جو پوری کھنچ جانے کے بعد محرابی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ تاتاری فوج کی خراسان کی شاہراہ پر پیش قدمی تیر کے پردار سرے سے نوک پیکان اور کمان کے وسطی حصے کی طرف بڑھنے کے مترادف تھی۔

اس متوقع مہم میں فی الوقت واحد خوش آئند بات صرف یہ دکھائی دے رہی تھی کہ اس کے دشمن مختلف گروہوں میں منقسم تھے۔ ان کے سردار بھی الگ الگ تھے جبکہ تیمور کی فوج آزمودہ کار اور فردِ واحد کی کمان میں تھی۔ اس واحد سہولت سے قطع نظر تیمور کے سامنے مشکلات وکٹھنائیوں کا ایک پہاڑ بھی ایستادہ تھا۔ اسے مغربی ایشیا کے دریاؤں، پہاڑی سلسلوں، دلدلوں اور صحراؤں کی مسافت درپیش تھی۔

تیمور کے پیش قدمی کے لیے موجود راستے بھی چنیدہ ہی تھے۔ انہیں راستے بھی کیا کہیے یہ قافلوں کی آمدورفت کے لیے ایسی شاہراہیں تھیں جن میں سے کسی ایک پر روانہ ہو جانے کے بعد راستہ بدلنے کے لیے دوسری پر منتقلی ناممکن تھی۔ اس کے علاوہ ان شاہراہوں پر مستحکم قلعے اور شہر بھی تھے جن میں سے ہر ایک کے دفاع کے لیے محافظ فوج بھی موجود رہتی تھی۔

ان عوامل سے قطع نظر تیمور کے لیے موسمی تبدیلیوں اور گھوڑوں کی چراگاہوں کی ضروریات کا خیال رکھنا بھی ایک اہم مسئلہ تھا۔ اسے بہر صورت یہ اندازہ درکار تھا کہ مختلف علاقوں میں فصلوں کی کاشت کیسی ہوگی۔ وہ انہی فصلوں سے اپنی فوج کے لیے خوراک اور جانوروں کے لیے گھاس فراہم کرنا چاہتا تھا۔ موسم کی صورتِ حال سے آگاہی بھی ضروری تھی کیونکہ بعض علاقوں سے جاڑوں میں اور بعض سے گرما میں سفر ناممکن تھا۔

تیمور کے خلاف برسرِ پیکار اتحادی ممالک نیم دائرے کے ساتھ ساتھ بارہ مختلف افواج کے ساتھ اس سے صف آرائی کے لیے تیار کھڑے تھے۔ اولاً جنگجو گرجستانی قبائل اپنے کوہستان قلقاز کے مستحکم قلعے سے نکل آئے تھے۔ اس کے بعد فرات کے منبع پر ترکوں کی ایک فوج راستہ روکے کھڑی تھی۔ قرا یوسف بھی ترکمانوں کے غول ساتھ لیے اپنی عادت کے مطابق لوٹ مار کے مواقع کی تلاش میں تھا۔

شام میں ایک طاقتور مصری فوج ملک کی حفاظت کے لیے موجود تھی۔ جنوبی سمت میں بغداد تھا۔ تیمور کو اس بات کا خدشہ بھی لاحق تھا کہ بغداد کی جانب پیش قدمی سے ترک شمال سے عقبی حملہ کر سکتے تھے۔ اگر وہ ایشیائے کوچک میں ترکوں کے علاقے میں گھستا تو مصری فوج عقب سے دھاوا بول سکتی تھی۔

اس صورتِ حال میں تیمور یورپ میں ترکوں کے قلعوں پر حملہ آور ہو سکتا تھا نہ ہی مصر میں مملوکوں کے دارالخلافہ کو نشانہ بنا سکتا تھا۔ وہ ان میں سے کسی بھی فریق کو جنگ میں پہل پر بھی مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے برعکس ترک اور مصری حسبِ منشا ایشیا میں داخل ہو سکتے تھے۔

مہم کی روانگی کے بعد تیمور کے لیے سب سے بڑی مشکل پانی کی فراہمی تھی۔ یہ مشکل اس لیے بھی نہایت صبر آزما محسوس ہو رہی تھی کہ قبل ازیں تیموری فوج کے ہمراہ محض اونٹ ہوتے تھے لیکن اب ہاتھی بھی اس کے ہمراہی تھے۔ اس کے علاوہ فوج کا بیشتر حصہ گھڑسواروں پر مشتمل تھا۔ تیمور کی حکمتِ عملی مہم کے آغاز سے ہی بالکل منظم تھی۔ وہ کوچ کے دوران میں بلاناغہ جغرافیہ دانوں اور تاجروں سے معلومات حاصل کرتا رہتا۔

فوج کے آگے رواں اس کے ہراول پیش قدمی میں دشمن کے مقامات، حرکات اور پانی کے متعلق اطلاعات فراہم کیا کرتے۔ ان ہراول اہلکاروں کے علاوہ جاسوس بھی مختلف سرحدیں پار کیے آگے اپنی پیش قدمی جاری رکھتے تھے۔ اس سفر میں سرائے خانم کے علاوہ دو بیگمات اور کئی ایک پوتے بھی اس کے ہمراہ تھے۔

کچھ ہی روز گزرے تھے کہ تیمور نے خط کتابت کا آغاز کر دیا اور سب سے پہلے روسی سطح مرتفع کے حاکم "ایدکو" کے لیے ایک نامہ ارسال کیا۔ ایدکو نے تیمور کے دباؤ میں آئے بغیر دوٹوک انداز میں جواب دیا۔

"امیر تیمور! تم نے جس دوستی کا ذکر کیا ہے، وہ میرے نزدیک خام خیالی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ایسی باتوں پر یقین تو وہ شخص کرے جو تم سے واقف نہ ہو۔ میں نے

تمہارے دربار میں دس سال بسر کیے ہیں۔ تمہیں اور تمہاری چالاکیوں کو خوب اچھی طرح جانتا ہوں اور اب تم بھی جان لو کہ ہمارے دوست بن کر رہنے کی ایک ہی صورت ہے کہ ہمہ وقت تلوار اپنے ہاتھ میں رکھیں۔"

ایدکو کے اس جواب نے تیمور کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ وہ سطح مرتفع کے ان تاتاریوں کے خلاف کوئی سخت قدم اٹھانا تو چاہتا تھا لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ سطح مرتفع کے یہ تاتاری تیمور سے الجھے بغیر غیر جانبدار ہی رہے۔

ایدکو کے بعد تیمور نے اگلا خط قدرے نرم لہجہ اختیار کرتے ہوئے "بایزید یلدرم" کو روانہ کیا۔

"مجھے بایزید یلدرم کی فراست اور مصلحت اندیشی سے یہی توقع ہے کہ وہ قرا یوسف اور سلطان احمد کی کوئی مدد نہیں کرے گا۔ گو یہ دونوں افراد اس وقت ترکوں کی حفاظت میں ہیں اور بایزید سے باقاعدہ معاہدہ بھی کر چکے ہیں لیکن مجھے بایزید سے بالکل کوئی پرخاش نہیں ہے۔ میں ترکوں کی جنگی طاقت کا بھرپور احترام کرتا ہوں۔"

تیمور کے اس مصالحانہ انداز نے بایزید کو یہ باور کروایا کہ وہ ترکوں کے یورپ میں رہنے کی صورت میں ایشیا میں ان سے جنگ کا خواہاں نہیں ہے۔ اس نے نہایت کروفر سے غیر شائستہ انداز اختیار کرتے ہوئے جواب دیا۔

"اے خونی سگ تیمور! اپنی ناپاک سماعت سے یہ گوش گزار لے کہ ترک اپنے دوستوں کو پناہ دینے سے کبھی انکار نہیں کرتے۔ ترکوں کی خصلت میں دشمنوں سے لڑائی کا گریز شامل نہیں۔ ہمارا خمیر دروغ گوئی سے نہیں گندھا۔"

تیمور اس جواب پر سخت چیں بہ جبیں ہوا۔ اس نے بھی سخت اور دوٹوک موقف اختیار کرتے ہوئے لکھا۔

"میں تمہارے خمیر اور خصلت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ تم جس ترک نسل پر اتراتے ہوئے طنزیہ دشنام طرازی پر اتر آئے ہو، اس کی حقیقت بھی میری زبان سے سن لو۔ تمہارا پس منظر عثمانی ترک خانہ بدوش ترکمانوں کی نسل سے ہے۔ اب میری صلاح مانو تو مقابلے پر آنے سے پہلے خوب اچھی طرح غور و فکر کر لو۔ میرے پاس ہاتھیوں کی فوج ہے جو انسانوں کو کچل ڈالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں لیکن نہیں..... تم بھلا غور و فکر کیوں کرو گے؟ تم تو نسلاً عثمانی ترک خانہ بدوش ترکمان ہو اور اس نسل کی خصلت یہ ہوتی ہے کہ یہ کبھی غور و فکر کی صلاحیت کا مظاہرہ نہیں کرتے۔

"اے ترکمان! اس حقیقت کو بھی جان لو کہ میرے مشورے پر عمل نہ کیا تو سخت پچھتاؤ گے۔ سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا اور وہی کرنا جس میں فائدہ نظر آئے ورنہ قبر میں تا قیامت پچھتاوے اور خلش کی آگ میں جلتے رہو گے۔"

بایزید اس جواب پر سرتاپا سلگ کر رہ گیا۔ اس نے جواب در جواب میں اپنی فتوحات کی طویل داستان بیان کرتے ہوئے جتایا کہ وہ کافروں کے گڑھ یورپ میں فتوحات کے جھنڈے گاڑ چکا ہے۔

"خونی سگ تیمور! میرے آبا و اجداد نے دین کی حفاظت کے لیے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے ہیں۔ ہم جدی پشتی طور پر اسلام کے محافظ ہیں۔ تم سے جنگ کا ارادہ تو مدتوں سے باندھ رکھا ہے۔ اللہ کے فضل سے اب اس ارادے پر عمل کا وقت آ گیا ہے۔ اگر تم نے جنگ سے پہلوتہی کی تو ہم چڑھائی کر کے سلطانیہ تک تمہارے تعاقب میں بالکل تامل نہیں کریں گے۔ اس جنگ کے بعد ہی فاتح اور مفتوح کا فیصلہ ہو گا۔"

تیمور نے اس خط کا فی الفور تو کوئی جواب نہ دیا تاہم کچھ روز بعد ایک مختصر خط ارسال کر کے یہ مطالبہ سامنے رکھ دیا کہ بایزید کے قرا یوسف اور سلطان احمد کا ساتھ چھوڑ دینے سے جنگ ٹل سکتی ہے۔

بایزید نے اس بار نہایت غیر شائستگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سفارتی اخلاقیات کی سبھی حدود سے تجاوز کر لیا۔ اس نے سرنامے پر اوپر اپنا نام آب زر سے لکھ کر اس کے نیچے سیاہ حروف میں تیمور لنگ کا نام لکھوا دیا۔ اس خط کے مندرجات میں تیمور کے لیے قابلِ طیش ترین امر یہ تھا کہ بایزید نے تیمور کی چہیتی بیوی کی عصمت دری کا دعویٰ کیا تھا۔

اب عملی جواب بے حد ضروری ہو چکا تھا۔ تیمور نے جنگی تیاریوں کا آغاز کرتے ہوئے سب سے پہلے اپنی بیگمات کو ان کے درباروں سمیت سلطانیہ روانہ کر دیا۔ اس کا مقصد بہرحال یہی تھا کہ انہیں خطرے سے باہر رکھا جا سکے۔

اس روانگی کے بعد اس نے اپنی راہ میں آنے والے ہر علاقے کو تخت و تاراج کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ اس کی سپاہ نے گھنے جنگلوں میں سے گزر کر عیسائی افواج کو فیصلہ کن شکست دی۔ تمام علاقے کو لوٹ مار اور آتش زنی کا نشانہ بنایا، گرجا مسمار کروا دیے، انگوروں کی کیاریاں روند ڈالیں۔ تیمور نے صلح کی شرائط پیش کرنے یا کسی کو بھی امان دینے سے مکمل پہلوتہی کر رکھی تھی۔

میدانِ جنگ میں صف بستہ دشمن فوجوں کے لیے تیمور کے دل میں کبھی بھی رحم کی ہلکی سی رمق بھی نہیں ہوتی تھی۔ اس بار تو معاملہ بایزید کا تھا جس نے اس کے نجی

معاملات اور خانگی زندگی میں غیر اخلاقی دراندازی کی تھی۔

اس کے بعد تیمور نے اپنی سپاہ کو ارض روم کے راستے ایشیائے کوچک کا رخ کرنے کا حکم صادر کر دیا جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ موسم گرما کے وسط تک "سیواس" تک تمام تر شہر فتح کیے جا چکے تھے۔ سیواس ایشیائے کوچک کا ایک کلیدی شہر تھا۔ ترکوں کی سرحدی فوج کے پیچھے ہٹتے ہی تاتاریوں نے شہر پناہ پر حملہ کر دیا۔ دیواروں تلے سرنگیں کھود کر بنیادیں کھوکھلی کر دی گئیں۔ اس کے بعد دو دیواروں کو لکڑیوں پر روک کر ان لکڑیوں کو نذر آتش کر دیا گیا۔ دیواریں مسمار ہوتے ہی تیموری فوج شہر کے اندر در آئی۔

تیمور کے حکم کے موجب مسلمان آبادی کو تو کچھ نہ کہا گیا البتہ اس چار ہزار ارمنی فوج کو خندق کھود کر زمین میں زندہ دفن کر دیا گیا جس نے تاتاریوں کی ہر قدم پر مزاحمت کی تھی۔

شہر کے فتح ہوتے ہی تیمور نے مسمار شدہ فصیل کی مرمت کروائی اور مختلف اطراف میں نمودار ہونے والے ترکمانی دستوں کو بھی مار بھگایا۔

اس کے بعد جارحانہ پیش قدمی میں تیمور نے عنتاب، حلب، شام تسخیر کرتے ہوئے دمشق تک رسائی حاصل کر لی۔ دمشق پر حملہ ایک مکمل ہولناکی تھی۔ شہر بھر کو اس زبردست طریقے سے نذر آتش کیا گیا کہ آگ کئی روز تک بھڑکتی رہی۔ مکانات سوختہ ہو کر مسمار ہوئے تو مقتولین کی لاشیں بھی ان کھنڈروں تلے دب گئیں۔

اس دوران سلطان مصر نے ایک آخری کوشش کے طور پر کسی فدائی کو حشیش پلا کر اس کے ہاتھ میں خنجر تھمایا اور تیمور کے قتل کے لیے روانہ کر دیا لیکن یہ کوشش ناکام ہو گئی اور تیمور نے اس فدائی کے پرزے اڑا دیے۔

اس قاتلانہ حملے کے بعد اس نے اپنی آتش انتقام بھرپور انداز میں سرد کی۔ تیمور کا مزاج متضاد کیفیات کے زیر اثر تھا۔ ایک جانب جنگی جنون سوار تھا تو دوسری سمت جمالیاتی حس بھی اپنی تسکین کے لیے کوئی نہ کوئی راہ تلاش کر رہی تھی۔ دمشق کی سوختگی کے دوران تیمور کو مسجد کا ایک گنبد اس قدر پسند آیا کہ اس نے فوری طور پر ہو بہو نقشہ تیار کرنے کا حکم دے دیا۔

اس گنبد کی ساخت بے حد خوشنما تھی۔ یہ ساخت چپٹی نوک دار وضع کے روایتی تاتاری گنبدوں سے یکسر مختلف تھی۔ اس کی ہیئت انار جیسی تھی اور گولائی لیے ہوئے بالائی سمت جا کر نوک دار چوٹی پر ختم ہوتی تھی۔

دمشق کا یہ خوبصورت گنبد تو شہر کی دیگر عمارتوں کی طرح جل کر خاکستر ہو گیا تاہم اس کے بعد تیمور اور اس کے جانشینوں کی جانب سے تعمیر شدہ ہر عمارت پر ایسا ہی گنبد تعمیر کروایا گیا۔

☆☆☆

تیمور کی خونی مہمات ایک بھرپور شدت سے رواں تھیں۔ ان مہمات اور جنگی حکمت عملیوں سے قطع نظر تیمور سمرقند کے حالات سے بھی بے خبر نہ تھا۔ اس نے تبریز کے مستقر سے سلسلہ مواصلات قائم کر رکھا تھا اور جن امراء کو وہاں چھوڑ کر آیا تھا ان سے متواتر اطلاعات حاصل کرتا رہتا۔

سمرقند کے حالات سے آگاہی ایک معمول تھی۔ اس نئے انتظام کے تحت وہ سیواس سے موصول ہونے والی ہفتہ وار خبروں سے بھی آگاہ ہوتا رہتا۔ انہی انتظامات کے باعث اسے بغداد میں بھیجے جانے والے امراء کی جانب سے ایک پیغام ملا۔ اس پیغام کے تحت بغداد کی محافظ فوجوں کے سپہ سالار "فراج" نے شہر ان کے حوالے نہ کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ ماضی قریب میں بغداد کے حاکم سلطان احمد نے فرار ہو کر بایزید کے پاس جاتے وقت اسے یہ حکم دیا تھا کہ تیمور کے بغداد پہنچنے کی صورت میں شہر بے شک اس کے حوالے کر دے تاہم اس کے بذات خود نہ آنے کی صورت میں ترکوں کے تاتاریوں پر حملہ آور ہونے تک مقابلہ کرتا رہے۔

یہ خبر سن کر تیمور کے لیے خاموش رہنا ناممکن تھا۔ وہ کجاوے میں بیٹھ کر اپنی فوج کے ہمراہ منزلیں مارتا ہوا جنوبی شاہراہ پر روانہ ہو گیا۔ بغداد پہنچنے کے بعد سلطان احمد کے افسران کو اندرون شہر مطلع کیا گیا تاہم فراج، سلطان احمد کے حکم پر عمل در آمد سے متامل ہونے لگا۔ اہل شہر اور سپاہ کے لیے اس کی نئی حکمت عملی حیران کن تھی۔

وہ اس حقیقت سے بھی باخبر تھے کہ تاتاریوں نے چالیس سال کی پے در پے جنگوں میں ایک بار بھی محاصرہ نہیں اٹھایا تھا۔ اس کے باوجود بغداد کو تیمور کے حوالے نہ کرنے کی وجہ بہرحال یہی تھی کہ فراج کو اس بات کی توقع تھی کہ تاتاری اس گرمی کی تاب نہ لا سکیں گے جس سے وادی دجلہ تنور بنی ہوئی تھی۔ اس گرمی کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ اپنا محاصرہ اٹھانے پر مجبور ہو جاتے۔

اس گمان کی ایک وجہ بہرحال یہ بھی تھی کہ اہل بغداد کو اپنے شہر پناہ کی سنگین دیواروں کا بھی بے حد گھمنڈ تھا۔ ان کے گمان اور توقعات کے برعکس تیمور بغداد کا طویل محاصرہ کرنا ہی نہ چاہتا تھا۔ اس کی فوج تقریباً دو سال سے بلاتعطل

وآرام جنگ آزما تھی۔ اس کے علاوہ فوج کا ایک کثیر حصہ ترک پیش قدمی روکنے کے لیے تبریز کے نو تعمیر مستقر میں جمع تھا۔ گو تیمور کو بھی اپنی سابقہ حکمتِ عملی کے مطابق اس وقت وہیں موجود ہونا چاہیے تھا تاہم اس نئی مہم کی تکمیل بھی بے حد ضروری تھی۔

بغداد پہنچتے ہی مقابل کی مزاحمت کے باعث اسے تپتے ہوئے بنجر میدان میں خوراک اور چارے کی قلت برداشت کرنی پڑ رہی تھی۔ تیمور نے ان حالات و واقعات کا جائزہ لینے کے بعد فوری طور پر اپنا منصوبہ تبدیل کیا اور بیٹے شاہ رخ کے پاس قاصد بھیج کر یہ پیغام پہنچایا کہ مہندس وآلات محاصرے کے ساتھ دس آزمودہ کار لشکر لیے فوری بغداد روانہ ہو جائے۔

اس کے بعد تیمور نے ناظروں کی ایک جماعت ایشیائے کوچک میں ترکوں پر نگاہ رکھنے کے لیے روانہ کی اور خود سمرقند میں موجود شہزادہ پیر محمد کے لیے حکم جاری کیا کہ وہاں موجود تمام تر سپاہ کے ہمراہ جنوب کی طرف پیش قدمی کا آغاز کر دے۔

اسی اثنا میں شاہ رخ بھی وہاں چلا آیا۔ شاہ رخ کی آمد کے بعد حالات میں تیزی سے تغیرات رونما ہوئے۔ تیمور نے بغداد کی دیواروں تلے اپنی گھڑسوار فوج کا ایک رسمی معائنہ کیا اور ایک لاکھ تاتاریوں کو علم بلند کر کے نقارے و شہنائیاں بجاتے ہوئے اہلِ شہر کے سامنے اپنی طاقت کے مظاہرے کا حکم دے دیا۔

تیمور کی توقعات کے برعکس اہلِ بغداد پر اس نمائش کا کوئی خاطر خواہ اثر نہ ہوا۔ شہریوں کی اس بے نیازی پر تیمور نے برافروختہ ہو کر بغداد کو نیست و نابود کرنے کی تیاریوں کا آغاز کر دیا۔ تیمور کے حکم کے موجب شہر کے جنوب میں دجلہ پر کشتیوں کا ایک پل تعمیر کروایا گیا تاکہ محاصرہ کرنے والوں کی دریا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک... آمد و رفت ہو سکے اور دریا کے راستے فرار کی راہیں بند ہو جائیں۔

اس کے بعد شہر کے مضافات پر حملہ کر کے اسے زمین کے ساتھ ہموار کرنے کے بعد وہاں تاتاری فوج پھیلا دی گئی۔ اس طرح شہر کے گرداگرد بارہ میل تک محاصرین کا قبضہ ہو گیا۔ دور کے جنگلوں سے درختوں کے بڑے بڑے تنے کاٹ کر لائے گئے اور شہر پناہ کے قریب ٹیلوں پر چوبی اہرام کھڑے کر کے ان کی چوٹیوں پر منجنیقیں نصب کر دی گئیں تاکہ شہر پناہ اور اس کے اندر بھاری پتھر پھینکے جا سکیں۔

اسی اثنا میں نقب لگانے والوں نے شہر پناہ کی دیواریں کھودنے کا آغاز کر دیا۔ چند ہی روز کے اندر دیوار میں مختلف مقامات پر رخنے پیدا ہو گئے۔ دوسری جانب اہلِ بغداد بھی بھرپور انداز میں مزاحم تھے۔ انہوں نے شہر پناہ کی دیواروں کے عقب میں پتھر اور چونے کی نئی دیواریں تعمیر کر کے ان کی حفاظت کے لیے ''نار رومی'' سے کام لینا شروع کر دیا۔ مزاحمت کی اس لہر سے تیمور کے جرنیلوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ اپنے امیر سے شہر پر حملہ آور ہونے کی التجا کرنے لگے۔

ان کی اس التجا کا ایک سبب بہرحال موسم کی شدت بھی تھا۔ گرمی ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی۔ حبس اس قدر شدید تھا کہ پرندے آسمان سے مر مر کر گرنے لگے تھے۔ جلتی ہوئی ریت کی تپش میں بھبکے چھوڑتی ہوئی دیواروں کی بنیادیں کھودنے والے سپاہیوں کے جسم زرہ بکتر تلے تنور میں روٹی کی طرح پکتے محسوس ہوتے۔

ان حالات سے آگاہی کے باوجود تیمور نے حملے کا حکم جاری نہ کیا۔ ایک ہفتہ اسی کشمکش میں بیت گیا۔ اس کا لشکر صرف دوپہر اور سہ پہر کو ذرا دیر کے لیے سائے میں جاتا تھا۔ بصورتِ دیگر دن بھر اسی قیامت خیز گرمی میں کام جاری رہتا۔

دھیرے دھیرے سپاہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا۔ انہیں تیمور کی خاموشی بے بسی نما جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی اور پھر بالآخر وہ لمحہ بھی چلا آیا جب تیمور نے عین دوپہر کے وقت اچانک ہی حملے کا حکم دے دیا۔ وہ لمحہ سخت بلا خیز تھا۔ دھوپ کی تیزی سے آنکھیں چندھیائی جا رہی تھیں۔ تیمور کا فیصلہ سپاہ کے لیے حیران کن تھا۔ انہیں علم نہیں تھا کہ اس نے نہایت باریک بینی سے ہی یہ حکمتِ عملی طے کی ہے۔ اس وقت شہر کا دفاع کرنے والوں نے چنیدہ پاسبان فصیل پر متعین کیے ہوتے تھے جبکہ دیگر سپاہ آرام کیا کرتی۔

تیمور کے حکم پر چند تاتاری رسالے اپنی سایہ دار جگہوں میں سے کمندیں اور سیڑھیاں لیے نکل پڑے۔ اس اچانک حملے سے شہر فی الفور فتح ہو گیا۔ نورالدین نے سب سے پہلے فصیل تک رسائی حاصل کی اور اوپر پہنچتے ہی سنہری ہلال، گھوڑے کی دم والا تاتاری جھنڈا وہاں گاڑ دیا۔

جھنڈے کے گڑتے ہی فضا نقارے کی گرج سے مرتعش ہو گئی۔ شہر کے اس رخ پر موجود تمام تر تیموری لشکر دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ اس کے بعد طے شدہ حکمتِ عملی کے

مطابق نورالدین شہر میں اترا اور اس کے پیچھے پیچھے تاتاری سپاہی بھی فصیل سے کود کر نیچے اترنے لگے۔ تاتاریوں کا جوش وجذبہ اس قدر مہمیز تھا کہ سہ پہر تک بے پناہ گرمی کے باوجود انہوں نے شہر کے ایک حصے پر قبضہ کر کے اہلِ بغداد کو دریا کی طرف دھکیل دیا۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ شہر کا دریا پار کا حصہ حملہ آوروں کے رحم وکرم پر تھا۔ تیمور کی سپاہ تکالیف برداشت کرنے اور بھاری نقصانات اٹھانے کے بعد غصے ودیوانگی سے مغلوب ہو چکی تھی۔ ان کی ازلی وحشت مکمل طور پر عود آئی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ انسانیت کا جامہ اتار کر خون آشام عفریت کا روپ دھار چکے ہیں۔ اہلِ بغداد بھیانک وہولناک ترین مظالم کی لپیٹ میں آ گئے۔ اس روز دارالسلام بغداد ''جہنم'' کا منظر پیش کر رہا تھا۔ کماندار فراج نے کشتی میں بیٹھ کر فرار ہونے کی کوشش کی لیکن اسے کناروں سے ہی تیروں کی زد میں رکھ کر ہلاک کر دیا گیا۔ اس کی لاش دریا میں سے نکال کر کنارے پر لائی گئی۔

اس خونی مہم میں تقریباً نوّے ہزار شہری ذبح کیے گئے تھے۔ مقتولین کے سروں پر مشتمل ''ایک سو بیس کلہ'' مینار بھی تعمیر کیے گئے۔ اس کے بعد تیمور نے اپنی سپاہ کو فصیل مکمل طور پر ڈھانے اور مسجدوں، گرجاؤں کے علاوہ تمام تر عمارتیں نذرِ آتش کرنے کا حکم صادر کر دیا۔

اس وحشت ناک حملے کے بعد بغداد صفحۂ ہستی سے ہی مٹ گیا۔ اس کی دلکشی ومثالی خوبصورتی ہمیشہ کے لیے اپنا وجود کھو بیٹھی۔ بغداد کی تباہی کی خبر تیموری مملکت میں ہر جگہ پہنچا کر بایزید کو بھی مطلع کر دیا گیا۔ بغداد کے غیر حاضر حاکم سلطان احمد نے یہ طوفان بلاخیز تھمتے ہی لوٹنے کا قصد کیا تو تیمور نے اس کی گرفتاری کے لیے ایک رسالہ روانہ کر دیا۔ سلطان احمد خوفزدگی کے عالم میں دریا کے راستے دوبارہ فرار ہو گیا۔ اس کے بدن پر چیتھڑوں کی صورت میں محض ایک قمیص تھی۔ وہ اس عبرتناک حالت میں کسی نہ کسی طور بایزید کے پاس دوبارہ پہنچ گیا۔ تیمور اپنے چند جرنیلوں اور شاہ رخ کے ہمراہ تبریز پہنچا اور فوج کے بیشتر حصے کو محاصرے کے ہتھیاروں، منجنیقوں سمیت پیچھے چھوڑ دیا تاکہ وہ بعد میں اطمینان سے کوچ کر لیں۔

تیمور کی طے شدہ جنگی حکمتِ عملی مکمل طور پر کامیاب ہو چکی تھی۔ اس نے تقریباً ڈیڑھ برس کے عرصے میں دو بڑی اور ان گنت چھوٹی لڑائیاں فاتحانہ انداز میں پایۂ تکمیل تک پہنچائی تھیں۔ درجن بھر مستحکم شہر فتح کرنے کے بعد بایزید کے تمام حلیف اس کے میدان میں اترنے سے قبل ہی ختم ہو چکے تھے۔ اس کے بعد ترکوں کے خلاف پیش قدمی کا مرحلہ درپیش تھا لیکن اس کے لیے موسم غیر مناسب تھا۔ تیمور نے یہ لڑائی اگلے سال تک موخر کر دی۔

اسی دوران ایک روز نیشاپور سے تبریز آنے والی سڑک پر پیر محمد نقاروں کی صدائیں بلند ہوئیں۔ تیمور کی فوج کے جرنیل بے حد سنسنی محسوس کرنے لگے۔ کچھ ہی لمحوں میں یہ سنسنی حیرت میں تبدیل ہونے لگی۔ اس فوج کے ہر لشکری کی آب وتاب نگاہوں کے لیے خیرہ کن تھی۔ ہر علم کا رنگ دوسرے سے یکسر مختلف تھا۔ سبز، سرخ، نیلے اور کئی متفرق رنگوں کی یہ بہار بے حد دلفریب محسوس ہو رہی تھی۔ مختلف لشکر کے سواروں کی وردیاں بھی مختلف رنگوں کی تھیں۔ مزید متاثر کن بات یہ تھی کہ ان کے گھوڑوں کی زینیں، ساز، کمانوں کے خانے اور ڈھالیں بھی اسی رنگ کی تھیں۔

تیمور کے اطراف ہندوستان سے لے کر بحیرۂ خزر تک اور دوسری سمت فلسطین تک مہمات سر کر کے آنے والے آزمودہ کار سپاہی بظاہر اس نمود ونمائش پر ناخوشی کا اظہار کر رہے تھے تاہم حقیقت یہی تھی کہ وہ دل میں رشک وحسد کے جذبات میں بھی مبتلا ہونے لگے تھے۔

کچھ ہی عرصے بعد تیمور نے وہاں ایک پرانی نہر کی کھدائی ازسرِنو شروع کروادی۔ یہ نہر یونانیوں نے ''دریائے ارس'' سے نکالی تھی لیکن اب مٹی سے اٹے ہونے کے باعث اپنی افادیت کھو چکی تھی۔ یہ تعمیری سرگرمیاں جاری کرنے کے علاوہ تیمور افریقا اور یورپ کی تجارتی شاہراہوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے لگا۔ اس نے سلطانیہ کے ایک بشپ ''جان'' کے توسط سے شاہ فرانس چارلس ششم کو خیرسگالی کے جذبات پر مشتمل ایک مراسلہ ارسال کیا۔ اسی دوران جنیوا کے گماشتے بھی تیمور کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ ان گماشتوں کا معمول یہ تھا کہ وہ دور دور آیا جایا کرتے تھے تاکہ تاتاری امیر ان کے حال پر اہلِ وینس سے زیادہ نظرِ عنایت کرتا رہے۔ انہی کے توسط سے قسطنطنیہ کے عیسائی شہنشاہ نے تیمور سے خفیہ طور پر امداد کی درخواست بھی کی کیونکہ وہ اس وقت بایزید کے رحم وکرم پر تھا۔

☆☆☆

تیمور کی مہمات کے ساتھ عالمی افق میں بھی نت نئی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں جنہیں مستقبل قریب اور بعید میں تیمور کی مہمات پر براہِ راست اثر انداز ہونا تھا۔ قسطنطنیہ کے یونانی شہنشاہ اب قدیم رومی شہنشاہوں کے محض ہیولے

ہی رہ گئے تھے۔ یہ شہنشاہ دو پشتوں سے اپنی قوت، ترکوں کو منتقل ہوتے دیکھ کر شدید تاسف میں مبتلا تھے۔ یہ ترک درحقیقت ایشیائے کوچک سے اٹھنے کے بعد بلقانی ملکوں اور بحیرۂ اسود کے ساحلوں کو اپنی جولان گاہ بنا رہے تھے۔

کسوبا کے میدان میں عثمانی ترکوں نے قوی ہیکل اہل سربیا کو مغلوب کر کے ہنگری کے لیے اپنی راہ ہموار کی تھی۔ ہنگری میں داخل ہونے کے بعد وہ نہایت نظم وضبط سے قدم جما کر اپنے مخالفین سے برسرپیکار رہے تھے۔ یہ نہایت جوش وجذبے کے حامل افراد تھے۔ اپنے شہنشاہوں کے لیے ان کی عقیدت، اطاعت اور وفاداری مثالی تھی۔ ان کے گھڑسوار ''سپاہی'' کہلاتے تھے۔ یہ سپاہی اعلیٰ درجے کے جنگجو تھے تاہم ان کی ''ینی چری'' کہلائی جانے والی پیادہ فوجیں بہادری وفراست میں بے مثل تھیں۔

عثمانی ترکوں نے مشرقی بحیرۂ روم کے ساحلی ممالک میں شادیاں کرنے کے بعد اپنی یونانی اور سلاوی کنیزوں کو بھی حرم نشین کر لیا تھا۔ اس طرح ان کے توسط سے ایک نئی نسل اور قوم وجود میں آ رہی تھی۔ بایزید یلدرم میں اپنی قوم کے عیب اور خوبیاں دونوں ہی بدرجہ اتم موجود تھیں۔ وہ بیک وقت عالی ہمت اور طوفانی مزاج کا حامل تھا لیکن اس کے ساتھ ہی لائق اور نہایت سفاک بھی تھا۔ تخت نشین ہونے کے بعد اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے بھائی کو گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا۔ بایزید یلدرم کو اپنی فتوحات پر بے حد ناز تھا۔ وہ فخریہ اس بات کا اعلان کرتا تھا کہ آسٹریا کو شکست دینے کے بعد فرانس پر یلغار کرے گا اور فتح حاصل کر کے اپنے گھوڑے کو ''سینٹ پیٹر'' کے گرجا کے منبر پر رکھ کر راتب کھلائے گا۔

بایزید کی طاقت واختیارات کا یہ عالم تھا کہ قسطنطنیہ کا عیسائی شہنشاہ ''مینوئیل'' بھی اس کا برائے نام ہی حکمران تھا۔ بایزید کا علاقہ قسطنطنیہ کی فصیل تک وسعت اختیار کر چکا تھا۔ شہر کی اکثر عدالتوں میں اسی کے مقرر کردہ قاضی اپنے فرائض سرانجام دیتے تھے اور وہاں کم از کم دو مساجد کے میناروں سے روزانہ پانچ وقت اذان کی صدا بلند ہوتی تھی۔ مینوئیل کی باج گزاری کے علاوہ وینس اور جنیوا کے والیانِ ریاست بھی اس سے اسی طرح پیش آتے تھے گویا مستقبل میں وہی قسطنطنیہ کا مالک ہو گا۔

ترکوں کے لیے تمناؤں کا اصل مرکز ''استنبول'' تھا اور وہ اسے حقیقی معنوں میں اپنی ملکیت سمجھتے تھے۔ اسلامی قلم رو قیصروں کے اس شاہی شہر کے اردگرد تک وسعت اختیار کر چکی تھی جو ابھی تک اپنی بلند وبالا فصیلوں اور یورپی اقوام کے جنگی جہازوں کی حفاظت میں ہونے کی وجہ سے ہی محفوظ تھا۔ بایزید نے اس پر بھی قابض ہونے کی ٹھان رکھی تھی۔ اس کے بعد کچھ ہی عرصے میں اس نے محاصرے کی تیاری بھی کر لی۔ اسے مصدقہ خبر ملی تھی کہ یورپ میں ترکوں سے صلیبی جنگ کے لیے افواج اکٹھی کی جا رہی ہیں۔ یہ مہم درحقیقت ہنگری کے بادشاہ سگمنڈ نے اٹھائی تھی کیونکہ سگمنڈ کو ہی یلدرم کی پیش قدمی سے سب سے زیادہ خطرہ تھا۔ اس مہم میں اسے برگنڈی کے بادشاہ فلپ کی تائید بھی حاصل تھی۔

دیگر ممالک میں صورتِ حال کچھ اس طرح تھی کہ یورپی ممالک کی سیاسی فضا میں ٹھہراؤ پیدا ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود کلیسا کی پکار پر عیسائی جاگیردار صلیبی جنگ کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جنگی جنون میں مبتلا شاہ فرانس ہنگری کے بادشاہ کی مدد کے لیے تیار ہو گیا۔ انگلستان اور نیدرلینڈ سے بھی رضاکار جوق در جوق آنے لگے۔ یورپ کے بھی شاہی خاندان اس جنگ میں حصہ لینے کے لیے میدان میں اتر آئے تھے۔ ان خاندانوں میں سیوائے کا نواب، پروشیا کے شہسواروں کا سردار، ہنز ولورن خاندان کا سرخیل فریڈرک، جزائر رہوڈوز کا حاکم اعلیٰ، سینٹ یوحنا کے نائٹ، جرمنی کے بادشاہ منتخب کرنے والے نواب، بڑے بڑے امراء اور رئیسوں کے علاوہ اختیارات یافتہ افراد بھی شامل تھے۔ سب سے طاقتور لشکر فرانس سے تھا۔ کم وبیش بیس ہزار سردار اور ان کے مسلح سپاہی گھوڑوں پر سوار ہو کر مغرب کی جانب روانہ ہوئے اور سگمنڈ کی فوجوں سے جا ملے۔ سگمنڈ کے پاس ایک لاکھ سپاہیوں کا لشکر موجود تھا جن کے لیے شراب اور عورتیں بلاتعطل فراہم کی جاتی تھیں۔ اس سپاہ کو اپنی عددی کثرت پر اس قدر گھمنڈ تھا کہ وہ بہانگ دہل ایک ہی بات کہا کرتے۔

''اگر آسمان بھی گرے گا تو ہم اسے اپنے نیزوں پر روک لیں گے۔''

اپنی شجاعت وکثرت پر نازاں ان فرانسیسی انگریز اور المانی شہسواروں کو علم ہی نہیں تھا کہ انہیں درپیش معرکے میں درحقیقت کیا حالات پیش آنے والے ہیں۔ گو وہ ترک سلطان کے نام سے بھی ناواقف تھے اس کے باوجود انہیں بھی اندیشہ کھائے جا رہا تھا کہ وہ سلطان مصر، عراق اور ایران سمیت دنیا بھر کے مسلمانوں کو عیسائیوں کے خلاف برسرپیکار ہونے کے لیے قسطنطنیہ میں متحد کر لے گا۔

اس کے علاوہ انہیں یہ فکر بھی لاحق تھی کہ اگر سلطان

ان کے پہنچنے سے قبل جان بچا کر فرار ہو گیا تو وہ ارضِ مقدس کی جانب پیش قدمی کی مہم میں تاخیر کا شکار نہ ہو جائیں۔ اس موقع پر ہنگری کے بادشاہ نے انہیں مطمئن کرنے کے لیے اس بات کی بھرپور یقین دہانی کروائی کہ وہ جنگ لڑے بغیر واپس نہیں جائیں گے لیکن نتیجہ عیسائیوں کی توقعات کے برعکس برآمد ہوا۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ دریائے ڈینیوب کے کنارے پیش رفت کے دوران وینس کے وہ جہاز بھی ان سے آن ملے جو دریا کے دہانے سے چڑھاؤ کی طرف آئے تھے۔ حالات فی الوقت ان کے موافق تھے۔ ترکوں کی سرحدی چوکیوں کے چھوٹے چھوٹے دستوں نے مزاحمت ترک کرکے ہتھیار ڈال دیے۔ صلیبی سردار اپنی طاقت کے نشے میں اس قدر دھت ہو گئے تھے کہ انہوں نے دیہاتی بستیوں کے باشندوں کو سربیا کے عیسائی ہونے کے باوجود تہ تیغ کرڈالا۔ اس کے بعد انہوں نے نیکوپولس کا محاصرہ کرنے کے لیے پُرفضا علاقے میں لشکرگاہ بھی قائم کرلی۔ یہیں انہیں یہ اطلاع بھی موصول ہوئی کہ بایزید ایک کثیر لشکر کے ہمراہ نہایت تیز رفتاری سے ان کی جانب پیش قدمی کررہا ہے۔

اتحادی لشکر کو اس خبر کی صداقت میں شبہ تھا۔ ان کے تئیں ترک سلطان میں اتنی ہمت نہیں ہوسکتی تھی کہ وہ ان کے مقابل آئے۔ اتحادی لشکر کا یہ گمان سگمنڈ کی جانب سے ختم کیا گیا۔ سگمنڈ کی تصدیق شدہ اس اطلاع کے بعد عیسائی افواج نے صف بستہ ہونے کا آغاز کردیا۔ ترکوں کی طاقت سے آگاہ ہونے کے باعث سگمنڈ نے یورپی سرداروں کو یہ مشورہ دیا کہ اس کی ہنگری اور ولاچیا کے جنگجو باشندوں پر مشتمل پیادہ فوج مسلمانوں کی پیدل فوج کو روکنے کے لیے آگے رکھی جائے۔ سوار فوجیں البتہ پیچھے رہتیں۔

سگمنڈ کے اس مشورے پر سردار غصے میں آگئے۔ یہ دونوں فریقین ابھی بحث وتکرار میں ہی الجھے تھے کہ بایزید کے قراول دستے نمودار ہوگئے۔ فرانسیسی اور جرمن سردار اسی زعم میں تھے کہ سگمنڈ انہیں دھوکا دے کر جنگ سے الگ رکھنا چاہتا ہے تاکہ فتح کا سہرا صرف اپنے سر سجا سکے۔ وہ بلا سوچے سمجھے اپنا علم بلند کیے جوش وولولے میں نعرہ زن تھے۔

”خدا اور سینٹ جارج کا نام لے کر آگے بڑھو۔“

اس پیش قدمی میں بھی سردار اپنے زرہ پوش دستوں سمیت رواں دواں تھے۔ انہوں نے روانگی سے قبل اپنے ترک اور سربیائی جنگی قیدیوں کو تہ تیغ کردیا تھا۔ مختلف شہزادوں، سرداروں، مسلح جنگجوؤں پر مشتمل یہ لشکر نیزوں کی نوکوں پر پھریرے اڑاتے، ڈھالیں تانے، خاردار تاروں کی جھولیں پڑے گھوڑوں پر سوار اپنی پیش رفت جاری رکھے ہوئے تھا۔

اس لشکر نے جارحانہ انداز میں بایزید کے ان قراول دستوں پر دھاوا بول دیا جو اپنی فوج سے الگ ہوکر لڑنے کے لیے آئے تھے۔ اس حملے کے نتیجے میں وہ مقابل کو بہت آسانی سے منتشر کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس کے بعد وہ ایک طویل ڈھلان چڑھ کر پہاڑی پر پہنچے اور وہاں موجود سبھی تیراندازوں کے ٹکڑے ٹکڑے کردیے پھر وہ نووارد ترکی ”سپاہیوں“ کے رسالوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے اپنی صفیں درست کرنے لگے۔

بایزید کے یہ رسالے درحقیقت اس کے ہراول کی اگلی تین صفیں تھیں۔ عیسائی شہسواروں نے اپنی تمام تر قوت انہی پر صرف کرتے ہوئے خود کو بے طرح تھکا لیا جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ جب وہ تھکے ہارے دوسری پہاڑی پر پہنچے تو وہاں بایزید کی ساٹھ ہزار تازہ دم فوج ان کے استقبال کے لیے تیار تھی۔ درمیان میں سفید عماموں والے ینی چری تھے اور ان کے دونوں اطراف نیم دائرے میں زرہ پوش سوار فوج ”پرا“ جمائے کھڑی تھی۔ اس نے جوابی حملہ کرکے اپنے سپاہی ضائع کرنے کے بجائے عیسائی سواروں کے گھوڑوں کو تیروں سے نشانہ بنانا شروع کردیا۔ ان گھوڑوں کے زخمی ہوکر ہلاک ہونے سے گھڑسواروں کو پیدل لڑنا پڑا مگر بوجھل زرہ بکتر زیب تن ہونے کے باعث لڑائی جاری رکھنا مشکل ہورہا تھا۔

ان سپاہیوں میں سے چند ایک نے کسی نہ کسی طور لڑائی جاری رکھی تاہم وہ سپاہی جن کے گھوڑے تاحال سلامت تھے، باگیں موڑ کر فرار ہوگئے۔ ترک افواج نے اب صلیبی جنگ بازوں کو نرغے میں لے لیا تھا۔ ان صلیبی افواج نے جب دیکھا کہ مدد کے لیے آنے والے لشکر ان سے بہت دور ہیں تو بیشتر نے ہتھیار ڈال دینے میں ہی عافیت سمجھی۔

اس دوران میں سگمنڈ نے اپنی فوج کا ایک بھی سپاہی ضائع نہیں ہونے دیا۔ وہ ترکوں پر دھاوا بولنے والے کی حماقت کرنے والے شہسواروں کے پیچھے تھوڑی دور تک آیا ضرور تھا تاہم انہیں کوئی بھی مدد فراہم نہیں کرسکا تھا۔

شہسواروں کی اس شکست سے عیسائی یہ لڑائی ہار گئے۔ جب ان کی پیادہ فوج نے اپنے تھکے ہوئے زخمی سواروں کو بھاگتے اور ترکوں کو ان کا تعاقب کرتے دیکھا تو

ان کی ہمت بھی شکستہ ہوگئی۔ دائیں بائیں اطراف میں اہلِ ولاچیا بھی منتشر ہوگئے۔ سگمنڈ کی سپاہ نے قدرے بہادری سے مزاحمت کا حق ادا کیا لیکن بہت جلد سگمنڈ اور اس کے سرداروں کو اپنی جانیں بچانے کے لیے دریا کی طرف فرار ہونا پڑا تا کہ اہلِ وینس کے جہازوں میں پناہ لے سکیں۔

گرفتار شدگان یورپی شہسواروں کے لیے بایزید کے ارادے بہت خطرناک تھے۔ اس نے جنگ کے آغاز سے قبل ترک قیدیوں کو بے دردی سے قتل کروا دیا تھا اور دورانِ جنگ بھی ترکوں کو طرح طرح کے نقصان پہنچائے تھے تو اب ان یورپی شہسواروں کی کیا بساط تھی۔

بایزید کے حکم پر جب یہ شہسوار اس کے سامنے پیش کیے گئے تو ان کے بدن پر محض قمیصیں سلامت تھیں۔ بایزید چند لمحوں تک سرد مہری سے انہیں دیکھتا رہا۔ اس کے بعد منہ پھیر کر ان سب کے قتل کا اشارہ کر دیا۔ شہسواروں کو برہنہ تلواریں تھامے جلادوں کے سامنے لایا گیا اور پھر وہ نہایت سفاکی سے قتل کر دیے گئے۔

دس ہزار صلیبیوں کے قتل کے بعد ترک امراء بایزید سے سفارش کر کے تقریباً چوبیس ہزار عیسائی سرداروں کی جان بچانے میں کامیاب ہوگئے۔ ان خوش قسمت افراد میں شاہ فرانس کا پوتا، نیوروز کا نواب اور فرانس کا "بوچی کاٹ" بھی شامل تھے۔

ترکوں نے شاہ فرانس کے پوتے اور اس کے ساتھیوں کے عوضِ زرِ فدیہ دو لاکھ اشرفیاں طلب کر لیں۔ ان کی نگاہ میں تو یہ رقم کچھ زیادہ نہیں تھی تاہم یورپ کے خزانے اس سے خالی ہوگئے تھے۔ انہوں نے کسی نہ کسی طور رقم ادا کر کے قیدی رہا کروا لیے۔ ان کی رہائی کے وقت بایزید نہایت کروفر سے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"نئی افواج جمع کر کے مقابلے کے لیے تیار رہنا کیونکہ میں جنگی کارنامے دکھا سکتا ہوں اور مجھے عیسائی ممالک میں مزید فتوحات سے روکنے کی کسی میں بھی تاب نہیں۔"

نیوروز کے نواب اور اس کے ساتھیوں نے یہ الفاظ تا عمر ذہن نشین کر لیے تھے۔ آخری صلیبی جنگ عیسائیوں کی ذلت آمیز شکست پر منتج ہوئی تھی۔ یورپی درباروں میں صفِ ماتم بچھ چکی تھی تو دوسری جانب قسطنطنیہ کے عیسائیوں کو بھی کم مایوسی نہیں ہوئی تھی جو صلیبیوں کی آمد پر یہ گمان کیے بیٹھے تھے کہ انہیں بایزید کی گرفت سے آزادی مل جائے گی۔ اس شکست کے بعد اب انہیں موت اپنے سر پر رقصاں دکھائی دینے لگی تھی۔

بایزید نے فوری طور پر قسطنطنیہ کے محاصرے کا آغاز کر دیا۔ اس کے ساتھ وہ یونان کو بھی اپنی مملکت کا حصہ بنانا چاہتا تھا۔ بوچی کاٹ کے پانچ سو زرہ پوش شہسواروں اور چنیدہ جہازوں سے قسطنطنیہ کے عیسائیوں کے حوصلے تو بلند ہوئے تاہم ان کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی تھی۔

ترک مملکت کے نصف ایشیائی حصے اور ان کے یورپی مقبوضات کے درمیان ایک سمندر حائل تھا۔ اس موقع پر وینس اور جینوا کے بحری بیڑے ترکوں پر حملہ کر کے قسطنطنیہ کو بچا سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا کوئی بھی قدم اٹھانے سے گریز ہی کیا۔ اس فیصلے کی وجہ بہرحال یہی تھی کہ وینس اور جینوا کی ریاستوں میں ایشیا کی تجارت پر قبضے کے لیے کشمکش کا آغاز ہو چکا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو تباہ کرنے کی فکر میں مبتلا تھے۔ ان حالات کا مدبرانہ انداز میں جائزہ لیتے بایزید نے دونوں فریقین سے ہی راہ و رسم استوار کر رکھی تھی۔ وہ انہیں مساوی طور پر ایشیا کی تجارت کا لالچ دیتا رہا جس کے نتیجے میں دونوں ریاستیں اسے تحائف پیش کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں ہلکان رہتی تھیں۔ اسی لیے جب یورپ قسطنطنیہ کو بچانے کے لیے ملتجی تھا تو کسی نے بھی اس التجا پر کان نہ دھرے۔ یورپ کے جو حکمران اس صلیبی جنگ میں اپنی زندگیاں بچانے میں کامیاب ہو گئے تھے، وہ اپنے آبائی ملک میں واپس پہنچتے ہی پہلے کی طرح ایک بار پھر خانہ جنگی میں مبتلا ہو گئے۔

عیسائی افواج کی شکست نے قسطنطنیہ کے حالات ابتر کر دیے۔ وہ شہر ماضی کی عظمت اور شان و شوکت کی محض ایک پرچھائیں بن کر رہ گیا تھا۔ کبھی زمانے میں دنیا کے اس عظیم ترین شہر کی حفاظت کے لیے سیکڑوں یونانی سردار اور یونانی امراء کے زرخرید سپاہی ہمہ وقت موجود رہتے تھے اور اب یہ عالم تھا کہ اس کے باشندے عظیم الشان عمارات میں بود و باش ہونے کے باوجود اس قدر مفلس و تنگدست ہو گئے تھے کہ بوچی کاٹ کی اس بحری سپاہ کو خوراک تک فراہم نہ کر سکے جو بایزید سے ان کی گلوخلاصی کا عزم لیے ہی وہاں وارد ہوئی تھی۔ اس سپاہ کو بحری قزاقوں کی طرح ترکوں کے رسدی جہازوں کی لوٹ مار کے بعد اپنی گزر بسر کرنا پڑ رہی تھی۔

قسطنطنیہ کے باشندوں کے ساتھ ان کا عیسائی شہنشاہ بھی تنگدستی کی ایک نئی معراج تک جا پہنچا تھا۔ وہ اپنی سپاہ کو تنخواہ دینے سے قاصر تھا۔ اسے اپنے دفاع کے لیے درکار سپاہ اور سرمائے کی بھیک مانگنے یورپی ممالک میں روانہ ہونا پڑا تو اس کے ہمراہ درباریوں کی کسمپرسی کا یہ عالم تھا کہ ان

کے تن پر ڈھنگ کے کپڑے بھی موجود نہ تھے۔ ان کی مناسب ستر پوشی کے لیے ایک اطالوی نواب نے لباس سلوا کر۔۔۔ فراہم کیے۔ قسطنطنیہ کا وہ عظیم شہنشاہ امداد کی غرض سے کئی ممالک میں دربدر رہا۔ ان ممالک میں اس کی بھرپور خاطر مدارات کے علاوہ ہمدردی بھی خوب ملی لیکن امداد کہیں سے بھی مل کے نہ دی۔

اس صلیبی جنگ میں بایزید کی شاندار فتح کا نتیجہ یہ بھی برآمد ہوا کہ یورپی سرداروں میں مذہب کے لیے جنگ کا جذبہ ختم ہوگیا۔ انہوں نے خود کو تجارتی معاملات اور اس دور کی سیاسی حد بندیوں میں مصروف کرلیا۔ ان کے تئیں یہ معاشی استحکام کسی بھی مذہبی جنگ سے زیادہ اہم و ناگزیر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کلیسا کے اعلانات اور قیصر مینوئیل کی جانب سے امداد کی درخواستیں بے اثر ثابت ہو رہی تھیں۔

اس صورت حال سے مینوئیل نہایت دل شکستہ ہو چکا تھا۔ قسطنطنیہ کے باشندے محاصرے کے دنوں میں شہر کی فصیل سے ترکوں کی طرف اتر کر ان کے سامنے خوراک کی بھیک مانگنے لگے تھے۔ بوچی کاٹ نے شہر کو اس کے حال پر چھوڑ کر واپسی کی راہ لی تھی اور قسطنطنیہ میں مقیم شہنشاہ کا بھتیجا شہر بایزید کے حوالے کرنے کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے شرائط بھی مرتب کر رہا تھا۔

ان دگرگوں حالات میں تغیر کی یکدم لہر اٹھی اور اس محصور شہر کو امان ملتی دکھائی دینے لگی۔ مشرق سے تاتاریوں کی غیر متوقع آمد ہوئی تھی۔ انہوں نے ایشیائے کوچک کے دروازے ''سیواس'' پر حملہ کیا اور اسے فتح کر کے اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔ بایزید کو قسطنطنیہ سے محاصرہ اٹھا کر فوری طور پر ایشیا کا رخ کرنا پڑا تھا۔ اس کے بعد یورپ میں مقیم سبھی ترک افواج کو ہتھیار سنبھالنے کا حکم جاری کر دیا گیا۔ انہیں جہازوں میں سوار کر کے ایشیا پہنچایا گیا۔ قسطنطنیہ کے حکمران نے بایزید سے یہ عہد کیا کہ تیمور کی شکست کی صورت میں شہر اس کے حوالے کر دیا جائے گا۔

جنگجوئے صف شکن کی آمد نے ہر جانب ایک کھلبلی پیدا کر دی تھی۔

☆☆☆

1402ء کے موسم گرما کا آغاز ہوا تو مشرقی یورپ کے فاتح بایزید نے فاتح ایشیا تیمور کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی تمام تر فوج اکٹھی کرلی۔ ایک جانب کسوبا اور نیکوپولس کی آزمودہ کار سپاہ کو بحیرۂ مارمورا کے قریب عثمانی ترکوں کے پایۂ تخت ''بروصہ'' میں جنگ کے لیے تیار کیا گیا تو دوسری جانب اناطولیہ کی افواج اور سربیا کے بادشاہ ''لزارس'' کے بیس ہزار سپاہیوں نے بھی ان کے ساتھ الحاق کرلیا۔

ان سپاہیوں کی تیاری کا یہ عالم تھا کہ وہ سرتاپا فولاد میں اس طرح غرق تھے کہ ان کی آنکھوں کے سوا جسم کا کوئی بھی حصہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس مقام پر یونانی اور ولاچیائی افواج بھی اپنے نئے آقا سلطان بایزید کی مدد کے لیے صف بستہ ہوگئیں۔ بایزید کی افواج اب مجموعی طور پر اڑھائی لاکھ تک وسیع ہو چکی تھی۔

بایزید کی سپاہ نے عمر بھر فتوحات کا امرت ہی نوش کیا تھا۔ اس کے سپاہی اور ینی چری ہمہ وقت ہتھیار بند رہتے تھے۔ اس سپاہ کا نظم وضبط بھی مثالی تھا اور اس کا ہر ایک فرد بایزید کا کسی غلام ہی کی طرح وفادار تھا۔ اپنی سپاہ کی اہلیت، وفاداری اور عسکری صلاحیتوں پر نازاں بایزید کو فتح کے خورشید کے مشرق سے طلوع ہونے جیسا ہی یقین کامل تھا۔ اس نے تیمور کی آمد تک کے ایام جشن منانے میں بسر کر دیے۔

تیمور کی پیش قدمی کا رخ ترکوں کی جانب تھا اور ترک اس امر سے بے حد خوش تھے۔ ان کی طاقت کا انحصار اپنی پیادہ فوج پر تھا جس کے جوہر ہمیشہ دفاعی جنگ میں ہی کھلتے تھے۔ اس کے علاوہ ایشیائے کوچک کا وہ حصہ بھی پیادہ فوج کے لیے خاص طور پر موزوں تھا جو ناہموار ہونے کے ساتھ ساتھ جنگلات سے اٹا ہوا تھا۔ سیواس سے مغرب کی طرف صرف ایک سڑک آتی تھی اور ترکوں کو اسی سڑک پر تیمور سے مقابلے کی توقع تھی۔

بایزید نے اپنی فوج کے ہمراہ قدرے سست روی سے پیش قدمی کرتے ہوئے انقرہ تک رسائی حاصل کی اور یہاں اپنا مستقر قائم کرلیا۔ اس کے بعد وہ دریائے ہیلس عبور کرتا ہوا پہاڑی علاقے میں داخل ہوگیا۔ اس مقام پر پہنچتے ہی اس کے قراولوں نے مطلع کیا کہ تیمور اس سے ساٹھ میل کی مسافت پر سیواس میں موجود ہے۔ بایزید نے اپنی پیش قدمی روک دی اور سپاہ کو مناسب مقامات پر متعین کر کے تیمور کا انتظار کرنے لگا۔ اسے کامل یقین تھا کہ تیمور سے فوری طور پر مڈبھیڑ کے نتیجے میں وہ اسے عبرتناک انداز میں زیر کرنے میں کامیاب ہوجائے گا لیکن تقدیر اس کے تمام تر منصوبوں پر خندہ زن تھی۔

ہوا کچھ یوں کہ بایزید کا یہ انتظار ایک ہفتے کی طوالت کے بعد بھی لاحاصل اور بے نتیجہ ہی رہا۔ تاتاری سپاہ کی کہیں کوئی ''رونمائی'' ہو کر ہی نہ دی۔ بایزید کے قراول سیواس

سے چند افراد کو پکڑ لائے جن سے یہ تشویشناک خبر موصول ہوئی کہ سیواس میں اس وقت تاتاریوں کے چند دفاعی دستے ہی موجود ہیں۔ بقیہ فوج تیمور کے ہمراہ ترک روانہ ہو چکی ہے۔

یہ خبر سنتے ہی بایزید کی پیشانی پر بل پڑ گئے کیونکہ تیمور کا سیواس اور ترک فوج کے درمیانی علاقے میں کہیں نام ونشان نہ تھا۔ وہ اپنے ہاتھیوں سمیت نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔

ترکوں کو اس سے قبل ایسی صورتِ حال سے کبھی پالا نہیں پڑا تھا۔ تیمور انہیں ہلکان کر کے زیر کرنے کے درپے تھا۔ وہ مختلف مقامات پر پڑاؤ ڈالتا انہیں اپنے تعاقب پر مجبور کرتا اور ان کی آمد سے قبل ہی کسی اگلی منزل کی جانب روانہ ہو جاتا۔ روانگی سے قبل وہ اس مقام پر موجود پانی کے ذخائر میں غلاظت ڈلوا دیتا تھا۔ ترک فوج تھکاوٹ اور بھوک پیاس سے بے حال ہونے لگی تھی۔

بایزید کی فوج کو اس نفسیاتی دباؤ میں لانے کے بعد تیمور نے انقرہ جنگ کا طبل بجا دیا۔ ترک اپنے روایتی آہنی حوصلے سے جنگ آزما تو ہوئے تاہم حقیقت یہی تھی کہ بایزید تلواریں نیاموں سے نکلنے سے قبل ہی جنگ ہار چکا تھا۔ محاذِ جنگ کی وسعت پندرہ میل سے بھی زائد تھی۔ تاتاری فوج کا ایک بازو دریا کے کنارے تھا تو دوسرا دوری کے باعث حدِ نگاہ سے ہی دور تھا۔

تیمور آخری لمحے تک گھوڑے پر سوار ہی نہیں ہوا تھا۔ اس کے سپہ سالار ماہرانہ انداز میں فوج کو لڑاتے رہے۔ تیمور ایک چھوٹی سی پہاڑی پر بہ مشکل چالیس گھڑسواروں کے ہمراہ موجود تھا۔ لشکر کا قلب اس کے پوتے شہزادہ محمد اور میمنہ معتمد سردار نور الدین کے سپرد تھا۔

بایزید کے لشکر میں انتشار برپا کرنے کے بعد تیمور کے حکم پر ترک افواج میں زرہ پوش ہاتھی گھسا دیے گئے۔ ان دیو قامت حیوانوں پر ہودج رکھے ہوئے تھے جن سے آتشیں سیال برسایا جا رہا تھا۔ اس ناقابلِ برداشت شور وغل اور گرد وغبار کے طوفان میں تھکے ماندے ترک بے بسی سے موت کے گھاٹ اترنے لگے۔ اس قیامت خیز شور سے گھبرا کر فرار ہونے والے ترک تھکاوٹ کی تاب نہ لاتے ہوئے زندگی کی بازی ہار گئے۔

بایزید نے آخری لمحے تک مزاحمت ترک نہ کی۔ اس نے ایک ہزار ینی چری لے کر ایک پہاڑی سے تاتاریوں کو مار بھگایا اور خود تیر کمان سنبھالے تیسرے پہر تک بے جگری سے لڑتا رہا لیکن بے سود۔

شام ہوتے ہی میدانِ جنگ کا یہ عالم تھا کہ بایزید گھوڑے پر سوار ہوا اور چند سواروں کو ساتھ لے کر تاتاری فوج کی صفوں میں سے لڑ بھڑ کر نکل جانے کی ایک بھرپور آخری کوشش کر ڈالی۔

تاتاری سپاہ نے بھرپور ولولے سے بایزید کا تعاقب کیا اور اس کے کئی ساتھی یکے بعد دیگرے ہلاک کر دیے۔ گھوڑے کو بھی تیروں کی بوچھاڑ سے زمین بوس ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ بایزید کو البتہ غروبِ آفتاب کے وقت مشکیں باندھ کر تیمور کے خیمے میں لے جایا گیا۔ تیمور اس وقت شاہ رخ کے ساتھ شطرنج کھیلنے میں مصروف تھا۔ اس نے بایزید کو آتے دیکھا تو پہلی ہی نظر میں اس کے چہرے پر اس مصیبت کی گھڑی میں بھی دکھائی دینے والے شاہانہ جلال سے کافی حیرت زدہ ہوا۔

تیمور اپنی نشست سے اٹھ کر خیمے کے دروازے تک آیا اور اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

”خوش آمدید اے بہادر! خوش آمدید۔“

بایزید نے نگاہ غلط اس کی جانب دوڑائی اور پرحکمت انداز میں گویا ہوا۔

”خدا کی جانب سے مصیبت زدگی کے شکار انسان کے حال پر ہنسنا اچھی بات نہیں ہے۔ وقت تو کبھی کسی لمحے بھی بدل سکتا ہے۔“

تیمور نے محظوظ ہو کر اس کی جانب دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

”میں تو اس لیے مسکرا رہا ہوں کہ خدا کی مصلحتیں بھی عجیب تر ہیں۔ ہم انسانوں کی فہم وادراک اس کی وسیع تر حکمت کا احاطہ کر ہی نہیں سکتی۔ اب خدا ہی جانے کہ مجھ سے لنگڑے اور تجھ جیسے نابینا کو دنیاوی اقتدار بخش دینے میں اس کی کیا حکمت ہے؟“

تیمور نے اتنا کہہ کر ایک توقف کیا اور پھر قدرے سنجیدگی سے گویا ہوا۔

”یہ بات تو خیر بھی جانتے ہیں کہ اگر یہ حکومت تمہیں حاصل ہوئی ہوتی تو میرا اور میرے ساتھیوں کا کیا حشر ہو سکتا تھا؟“

بایزید نے اس کے جواب میں خاموشی ہی سادھے رکھی۔

”اس کی مشکیں کھول دو۔ یہ ایک جلیل القدر سلطان ہے۔ میں اسے مسند پر اپنے پاس بٹھاؤں گا۔“

اہلکاروں نے فوری طور پر حکم کی تعمیل کر دی۔

تیمور نے کچھ پل اسے اپنے ساتھ نشست عنایت کی

اور اس کے بعد بایزید کی باوقار نظر بندی کا پروانہ جاری کردیا۔ بایزید اس کے حسنِ سلوک اور اندازِ تخاطب سے کافی حیرت زدہ تھا۔ کچھ روز بعد اس نے تیمور کے اخلاق سے قدرے ہمت پاکر اپنے بیٹوں کی تلاش کی التجا کردی۔ تیمور نے اس کی یہ خواہش فوراً پوری کردی۔

بایزید کے ایک بیٹے موسیٰ کو قیدی بنا کر لایا گیا تھا۔ تیمور نے اسے خلعت بخش کر باپ کے پاس ہی ایک نشست فراہم کی اور متانت سے کہنے لگا۔

''تمہارا دوسرا بیٹا لڑائی میں مارا جاچکا ہے جبکہ باقی بچ کر نکل گئے ہیں۔''

بایزید اس خبر پر گہری سانس بھر کر رہ گیا۔ بیٹے کی دائمی جدائی کا دکھ شدت سے محسوس کرتے ہوئے اس کے دل و دماغ میں ایک اور سوال نہایت شدت سے میخ کی طرح گڑا تھا کہ تیمور کی یہ عنایات بلاسبب تو نہیں ہوسکتی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ ان دنوں کن مہمات اور عسکری سرگرمیوں میں الجھا ہوگا؟ وہ خاموش اور بے حرکت رہ کر وقت گزارنے والوں میں سے تو بالکل بھی نہ تھا۔

بایزید کی یہ سوچ اور خدشات اپنی جگہ بالکل درست تھے۔ تیمور نے فتح کے بعد چاروں اطراف میں لشکر روانہ کیے تھے اور بچ نکلنے والے ترک سپاہیوں کا سمندر تک تعاقب جاری رکھنے کا حکم صادر کر رکھا تھا۔

انہی دنوں نور الدین نے عثمانی ترکوں کے دارالسلطنت ''بروصہ'' پر قبضہ کرلیا تھا۔ اس نے بروصہ سے تیمور کو سلطان کا خزانہ اور اس کی ان گنت حسین و جمیل کنیزیں بھی روانہ کی تھیں۔ یہ کنیزیں رقص و سرود میں لاثانی تھیں۔ اس کے علاوہ تاتاری سپاہیوں کی جانب سے لایا جانے والا مالِ غنیمت بھی مختلف اور نادر اشیا پر مشتمل تھا۔

تیمور نے کسی خیال کے تحت یورپی شرابوں اور حسین و جمیل عورتوں کی شمولیت کے ساتھ ایک بھرپور جشن منانے کا حکم دیا اور بایزید کو بھی اس جشن میں مدعو کرلیا۔ جشن کے روز بایزید کو جبری طور پر تیمور کے پاس لاکر اس کی نشست کے قریب ہی بٹھا دیا گیا۔ بایزید کی چھٹی حس اس لمحے سخت مضطرب تھی۔ اگلے چند ہی لمحوں میں اس کے اضطراب اور خدشات نے عملی روپ دھار لیا۔

''بروصہ کے مالِ غنیمت سے سلطان ترکی کا شاہانہ لباس حاضر کرو۔'' اس نے اپنے امراء کو مخاطب کیا۔

تیمور کے اس حکم کی فوری تعمیل کردی گئی۔

''سلطان کو یہ لباس زیب تن کروادو بھئی!'' اس نے اگلی فرمائش جڑی۔

امراء نے فوری طور پر وہ لباس جبری طور پر بایزید کو پہنایا اور جڑاؤ عمامہ سر پر رکھ کر اس کی شہنشاہی کی علامت سنہری عصا بھی ہاتھ میں تھما دیا۔

''سلطان کو وہی مشروب پیش کرو جس کی لذت ان کی نوکِ زبان پر یقیناً آج بھی مچلتی ہوگی۔'' تیمور نے بے نیازی سے کہا۔

بایزید بے بسی کے عالم میں کھڑا رہا۔ اس کے سامنے مختلف النوع مشروبات لائے گئے لیکن اس نے جھنجلاہٹ سے انہیں جھٹک دیا۔ اس کی مضطرب نگاہیں ان حسین و جمیل کنیزوں پر مرکوز تھیں جو بے پیرہن تاتاری فاتحین کو شراب و کباب پیش کررہی تھیں۔

انہی کنیزوں کے جھرمٹ میں اسے ایک مانوس چہرے کی جھلک نے مزید مضطرب کردیا۔ وہ چہرہ ''ڈیسپینا'' کا تھا۔ ڈیسپینا سربیا کے بادشاہ پیٹر کی بہن تھی اور بایزید کی اس سے چاہت کا یہ عالم تھا کہ اس نے ڈیسپینا کو حرم کا حصہ بنانے کے لیے مسلمان ہونے پر بھی مجبور نہیں کیا تھا۔

ڈیسپینا کے علاوہ بے شمار سیمیں بدن عورتیں بھی وہاں تاتاریوں کی خدمت گزاری میں جتی تھیں۔ ان خواتین کو بایزید نے جنگی قیدیوں میں سے ان کے بے مثل حسن و جمال کی وجہ سے پسند کیا تھا اور وہ ماضیٔ قریب میں اس کی ہم آغوش بھی رہی تھیں۔ لوبان کے دھوئیں میں اپنے مرمریں پیکروں کی نمائش کرتی ان خواتین کی دید بایزید کا خون کھولا رہی تھی۔

ان میں سیاہ بالوں والی ارمنی دوشیزائیں، کوہ قاف کی سنہری گیسوؤں والی پریاں، فربہی مائل حسین ترین رومی لڑکیاں اور آنکھوں میں ستاروں کی چمک لیے یونانی پری وشوں نے حرم سرا کی چار دیواری کے باہر پہلے کبھی قدم تک نہ رکھا تھا اور اب ان کے جسمانی خدوخال تاتاریوں کے لیے دعوتِ نظارہ بنے ہوئے تھے۔

اس دلخراش منظر کی کرب و اذیت برداشت کرتے بایزید کو اندازہ ہی نہ ہوا کہ وہ اس جشن میں شریک ایشیائے کے تاجداروں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ ان میں سے چند ایک اس کے حال پر تعجب زدہ تھے تو کچھ اس کا مضحکہ اڑا رہے تھے۔ کئی ایک اس سے نرمی برتتے جانے پر چیں بہ جبیں تھے۔

ان کی متفرق کیفیات سے بے نیاز بایزید نے کنیزوں سے نظریں چرائیں اور گزشتہ سال تیمور کو لکھے

جانے والے خطوط کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کا تن بدن طیش و بے بسی سے بھسم ہو رہا تھا تاہم خودداری کے تقاضے اسے غصہ پی جانے پر مجبور کر رہے تھے۔ اپنی اس ذہنی کیفیت اور کشمکش میں بایزید نے دسترخوان سے ایک لقمہ بھی نہیں اٹھایا تھا۔ اس کے دل و دماغ پر نئی سوچیں حملہ آور تھیں۔

کیا یہ جشن تیمور کی جانب سے بے اعتنائی کا ایک مظاہرہ تھا؟ کیا وہ بایزید کو حقیقتاً اس کے شاہی لباس میں دیکھنے کا خواہش مند تھا اور اس طرح اپنے تئیں معزز قیدی کی عزت افزائی کا مظاہرہ کر رہا تھا؟ کہیں یہ جشن اس کا تمسخر اڑانے کے لیے تو نہیں منایا جا رہا تھا؟ حقیقت کیا تھی اور کس طرح آگہی ہو سکتی تھی؟

بایزید کتنی ہی دیر اسی ادھیڑ بن میں رہا۔ کرب واذیت سے اس کے بدن پر رعشہ طاری ہونے لگا تھا تاہم اس نے حتی الامکان اعصابی مضبوطی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے عصا پر گرفت مضبوط تر کر دی۔ وہ اپنے اعصاب میں کسی بھی قسم کا انتشار ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس روز حالات بالکل ناموافق تھے۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ تاتاریوں نے اس کی خصوصی مطرباؤں کو محفل میں بلا کر ان سے ترک زبان کے عشقیہ گیت سنانے کی فرمائش جڑ دی۔

"رات نے تمہارے
گیسوؤں کی سیاہی چرائی ہے
خورشید کی شفق تمہارے
رخساروں کی لالی کے سامنے ماند ہے
سنہری فصلیں تمہارے
دلنشیں رنگ و روپ سے شرماتی ہیں
سبک ندیاں تمہاری
چال کا عکس لیے ہوئے ہیں
تمہارے لبوں کا گداز
پھول کی پنکھڑیاں معلوم ہوتا ہے
تمہارا مرمریں پیکر
قدرت کا ایک حسین شاہکار ہے
مجھے فخر ہے کہ تم
ترک سرزمین کی مٹی سے گندھی
ایک لازوال مورت ہو
تم ترک بہادروں کے لیے
ایک انمول تحفہ ہو"

بایزید کی آنکھیں جلنے لگیں۔ ترک سرزمین کی ان دوشیزاؤں کو یوں بے پیرہن اپنے علاقائی نغمے الاپتے دیکھنا ایک ہولناک تجربہ تھا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ایک مقامی مغنی تیمور کی شان میں رطب اللسان ہو گیا۔

"دنیا کی حکمرانی کا تاج اس کے سر کی زینت کے لیے ہی بنا ہے
اس بہادر کے سر پر سب سے گہرے زخموں کے نشان ہیں
اس کے سینے پر سب سے زیادہ گھاؤ ہیں
وہ غصے میں آتا ہے تو اس کی آنکھوں سے بجلیاں کوندتی ہیں
اس کی پیشانی کی شکنوں کی لکیروں میں
انتقام، جنگ، موت اور بے رحمی پروان چڑھتی ہے
کیونکہ اس میدان میں جس کی سطح
ایک ارغوانی مائع کے پردے سے ڈھکی ہو
اور جس پر مقتول مردوں کے مغز کا چھڑکاؤ ہوا ہو
اسی کا شاہی تخت آگے بڑھایا جائے گا
بس وہی تو ہے جو اس مسند نشینی کا اہل ہے
کیونکہ اسے تلوار بدست ٹھوڑی تک
خون میں ڈوب کر چلنا آتا ہے۔"

بایزید کے دل میں نفرت کی ایک لہر اٹھی اور پل بھر میں ہی اس کا وجود شرابور کر گئی۔ اس کی نوکِ زبان پر بے اختیار یہ الفاظ مچل کر رہ گئے۔

"بے رحم، شیطان، دہقان، بے خبر
جائز ہتھیاروں سے اور عسکری تنظیم سے
اس کا کام لوٹ مار اور قتل و غارت ہے
غلام نے جنگ کے عظیم الشان نام پر قبضہ کر لیا ہے۔"

بایزید کی قوتِ برداشت کا پیمانہ اب لبریز ہو گیا تھا۔ وہ غصے واذیت سے کانپتا اٹھ کھڑا ہوا اور اشارے سے خود کو دروازے تک پہنچانے کا عندیہ دے دیا۔ اہلِ محفل میں سے کسی نے بھی اسے روکنے کی زحمت نہیں کی۔ دو تاتاری افسران فوری طور پر اٹھے اور اس کے بازو تھام کر جشن گاہ کے باہر چھوڑ آئے۔ بایزید کی کپکپاہٹ شدید تر ہو چکی تھی۔ اس کا شاہی عمامہ بردار سر اس قدر جھک گیا تھا کہ ٹھوڑی سینے پر جا لگی تھی۔

کچھ ہی روز گزرے تھے کہ تیمور نے ڈسپنا کو بایزید کے پاس بھیج کر ایک پیغام ارسال کرتے ہوئے کہا۔

"ہم کسی کی اہلیہ کے متعلق دشنام طرازی تو دور کی بات، اس کے متعلق غلط سوچنا بھی گناہ تصور کرتے ہیں۔ تمہاری چہیتی بیوی تمہیں بہت مبارک!"

بایزید کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ عیش وعشرت اور اب جنگ کے مصائب سے اس کی صحت تو پہلے ہی تباہ ہو چکی تھی، اب ان پے در پے جذباتی صدمات اور غرور فتح مندی پاش پاش ہونے کی اذیت نے اسے مزید شکستہ کر دیا۔ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ وہ چند ہی ماہ بعد اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

☆☆☆

بایزید کی موت اور تاتاریوں سے پہلی ہی لڑائی میں عبرت ناک شکست سے ترکوں کی کمر ہی ٹوٹ گئی تھی۔ انہوں نے تاتاریوں سے مزید الجھنے سے گریز ہی کیا۔ انقرہ نے ہتھیار ڈال دیے۔ بروصہ اور حنقیہ میں بھی تاتاریوں نے ترکوں کا تعاقب کرنے کے دوران قبضہ کر لیا۔ ترکوں کے انتشار کا یہ عالم تھا کہ شہزادے، امراء اور فوجی افسران سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہے تھے۔ ایشیائے کوچک میں ساحل سمندر تک ان کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ چکے تھے۔ انہوں نے ماہی گیروں اور رئیسوں کی کشتیاں لے کر غول در غول اپنے وجود ان میں ٹھونسے اور دوسرے جزائر کا رخ کر لیا۔

یونان اور جنیوا والوں کی کشتیوں نے بھی انہیں ایشیا سے فرار ہو کر یورپ میں پناہ لینے میں بھرپور مدد کی تھی۔ ترکوں کے ایشیائے کوچک خالی کرنے کے دوران میں قرا یوسف اور سلطان احمد کو بھی بہت تلاش کیا گیا لیکن وہ اپنی جان بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ حاکم بغداد مصر میں مملوکوں کے دربار میں پناہ گزین ہو گیا تھا جبکہ ترکمان خان نے صحرائے عرب کی مسافت اختیار کی تھی۔

ترکمان خان کا یہ فیصلہ دانش مندانہ ثابت ہوا کیونکہ صحرائے عرب مصری دربار سے زیادہ محفوظ ثابت ہوا تھا۔ تاتاریوں کے حملے کی زد میں آنے والے مصر نے فوری طور پر اطاعت قبول کرتے ہوئے خراج دینے کا وعدہ کر لیا۔ وہاں کی مساجد میں تیمور کے نام کا خطبہ بھی پڑھا جانے لگا۔ قسمت کے مارے سلطان احمد کو پابندِ سلاسل کر کے قید خانے کی زینت بنا دیا گیا۔

تیمور کی ان فتوحات اور بایزید کی موت پر منتج ہونے والی شکست سے یورپ کے بادشاہ تجسس، تحیر، اطمینان اور خوشی کے متفرق جذبات میں مبتلا ہونے کے علاوہ کہیں نہ کہیں ہراس بھی محسوس کر رہے تھے۔ یورپ کی دہلیز پر دستک دینے والے اس معجزاتی حد تک حیران کن انقلاب نے انہیں ششدر کر رکھا تھا۔ انہوں نے اپنے آباؤ اجداد سے ترکوں کی ایک صدی سے زائد حکمرانی کے قصے سن کر عثمانی سلطنت کی شان وشوکت کا از خود مشاہدہ بھی کیا تھا۔ اس عظیم الشان سلطنت کو غیر معروف علاقے سے نمودار ہونے والے کسی تاتاری فاتح نے متزلزل کر دیا تھا۔

اب ایشیائے کوچک میں بایزید اور اس کی فوج کا نام ونشان تک موجود نہ تھا۔ انگلستان کے بادشاہ ”ہنری ششم“ نے تیمور کو ایک مساوی کھلاڑی کی حیثیت دیتے ہوئے مبارک باد کا خط لکھا۔ اس موقع پر فرانس کے حکمران ”شہنشاہ چارلس ششم“ کو بھی تاتاریوں کا وہ پیغام یاد آ گیا جو سلطانیہ کے اسقف یوحنا نے اسے پہنچایا تھا۔ اس نے موقع غنیمت سمجھتے ہوئے فوری طور پر اسقف کو طلب کیا اور اس کے توسط سے تیمور کی خدمت میں تحائف وخطوط روانہ کر دیے۔

شہنشاہ قسطنطنیہ نے بھی حالات کا یہ تغیر اپنے موافق سمجھا۔ وہ قبل ازیں یورپ میں دربدر پھر رہا تھا۔ تیمور کی فتح کی خبر ملتے ہی وہ اپنے شہر قسطنطنیہ لوٹا اور اس کی خدمت میں اطاعت نامہ روانہ کر کے خراج کی ادائیگی کا ذمہ بھی لے لیا۔

ان حالات وواقعات کا بغور مشاہدہ کرتے ہوئے تیمور نے یورپ میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے دل میں اس دخل در اندازی کا رتی بھر بھی ولولہ نہیں تھا۔ دوسری جانب اس کی سپاہ بھی سمرقند واپسی کے لیے بے تاب تھی۔ انہیں بایزید کے شہروں سے کثیر دولت کے علاوہ نادر اشیا اور چاندی کے مختلف دروازے بھی ملے تھے۔ ان دروازوں پر نصرانی ولیوں پیٹر اور پال کی شبیہیں کندہ تھیں۔ ان کے علاوہ بازنطینی کتب خانہ بھی نوادرات سے کم نہ تھا۔

اس فتح کے بعد تیمور کچھ عرصے تک سیاسی امور میں الجھا رہا۔ اسے ایک جانب خراج کی وصولی کا انتظام کرنا تھا تو دوسری سمت ترکوں کے نئے صوبیدار مقرر کرنے تھے۔ مختلف ملکوں کی سفارتوں کی باریابی اس کے علاوہ تھی۔ اس مصروفیت کے باوجود اس کے ذہن میں ایک نئی مہم کا نقشہ سر ابھار رہا تھا۔ وہ مکمل انہماک سے اس مہم کے خطوط پر غور وخوض کرنے لگا تاہم ایک ناگہانی اطلاع نے پہلی بار اس کے اعصاب بے طرح منتشر کر دیے۔

یہ اطلاع شہزادہ محمد کی سخت علالت کے بارے میں تھی۔ یہ علالت درحقیقت اسے انقرہ کی لڑائی کے دوران زخموں کی صورت میں ملی تھی۔ یہ خبر سن کر تیمور کا اطمینان وسکون یکسر رخصت ہو گیا۔ وہ فوری طور پر پوتے سے ملنے کے لیے روانہ ہو گیا۔ روانگی سے قبل اس نے پوتے کے علاج پر بہترین طبیب مقرر کرنے کا حکم بھی صادر کر دیا تھا لیکن موت کی آمد اب کوئی دوا دارو نہیں روک سکتی تھی۔ تیمور کے لشکرگاہ میں پہنچنے تک شہزادہ محمد کی زبان بند ہو چکی تھی۔

طبیب اس کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے اور پھر وہ سخت ترین لمحہ بھی چلا آیا جب شہزادہ محمد اپنے آخری سفر پر روانہ ہوگیا۔

تیمور کے اعصاب میں پہلی مرتبہ اس قدر انتشار پیدا ہوا کہ اسے اپنے جذبات پر قابو رکھنا دشوار ہونے لگا۔ اس کی اولاد میں سے جہانگیر اور پھر عمر شیخ پہلے ہی داغِ مفارقت دے چکے تھے۔ میراں شاہ حکومتی معاملات میں نہایت نااہل تھا۔ شاہ رخ جوانی کے دور سے گزر چکا تھا اور وہ یوں بھی کبھی جنگ وجدل کی طرف مائل نہیں رہا تھا۔ تیمور کی امیدوں کا مرکز شہزادہ محمد ہی تھا جس کی دلیری اور بے جگری کے باعث فوج اس پر جان قربان کردینے کے لیے بھی ہمہ وقت تیار رہتی تھی۔

شہزادے کی لاش کو تطہیر کے بعد سمرقند واپس لایا گیا۔ لشکر کے رنگین پرچم سیاہ رنگ میں تبدیل کردیے گئے۔ شہزادہ محمد کی والدہ خانزادہ اس لمحے سراپا اشک تھی۔ تیمور نے خانزادہ سے ملاقات کے وقت تو خود کو کسی نہ کسی طور سنبھالے رکھا تاہم تبریز میں اس کے چھوٹے چھوٹے بچوں سے سامنا ہوا تو اس کے فولادی اعصاب ناقابلِ یقین شکستگی میں مبتلا ہونے لگے۔ تیمور کئی روز تک اس قدر سوگوار رہا کہ اپنے خیمے تک ہی محدود ہوکر رہ گیا۔

☆☆☆

تیمور کا وجود اب بڑھاپے کی زد میں تھا۔ وہ تنہا بیٹھا ماضیِ بعید کے واقعات یاد کرکے ان سے نتائج اخذ کیا کرتا تھا۔ ان لمحات میں اپنوں سے دائمی جدائی کی خلش روح وقلب کے لیے آزار بننے لگتی تھی۔ اپنی اولاد اور پوتے کی اموات کے بعد اولوالعزم اور جاںنثاروں کی رحلت بھی کم صبر آزما نہ تھی۔ سیف الدین، جاکو برلاس اور آق بوغا کی دائمی رخصت کے بعد صرف نور الدین اور ملک شاہ ہی قابلِ اعتبار امیر تھے۔ یہ دونوں لڑائی میں تو اپنی ذہانت وا[illegible] ثابت کرچکے تھے لیکن مملکت کا نظم ونسق چلانے کے [illegible] نہیں تھے۔ انہی دنوں [illegible] ور نے ایک نیا معمول اختیار کرلیا۔ وہ اکثر لشکرگاہ سے باہر نکل کر کسی نہ کسی گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر اپنی عسکری قوت کے بارے میں تجزیہ ومشاہدہ کیا کرتا۔

تیمور کی فوج پیشہ ور جنگجوؤں پر مشتمل ایک مستقل نوعیت کی بہت بڑی قوت تھی۔ یہ فوج ہمیشہ اس کے ہمراہ ہی رہتی تھی۔ گزرتے ماہ وسال کے ساتھ اس کی قوت وسلطنت میں اضافہ ہوا تو قدرتی طور پر فوج میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔ ابتدائی ایام میں تیمور نے تقریباً تمام فوجی خانہ

بدوش ترکوں اور منگول گھڑسواروں میں سے بھرتی کیے تھے اور یہی سپاہ پورے دورِ حکومت میں اس کی قوت کی اساس بنے رہے تھے۔ فوج کا کثیر حصہ خانہ بدوش قبائل سے تعلق ہونے کے باوجود مثالی نظم وضبط کا حامل تھا۔

تیمور نے اپنی فوج کی تنظیم چنگیز خان کے وضع کردہ نظام کے تحت کی تھی۔ اس میں وہ پیغام رساں بھی شامل تھے جو منگول جنگوں میں نہایت اہم کردار ادا کرتے رہے۔ اس کے علاوہ تیمور نے نامہ بر کبوتروں پر مشتمل ایک نہایت اعلیٰ نظامِ ڈاک بھی تشکیل دیا تھا۔ اسے اپنی سپاہ کی آہنی تنظیم پر بے حد فخر تھا۔ اس کے ایک بھی لفظ کی ادائیگی کے بغیر صفیں خودبخود آراستہ ہوجایا کرتیں۔ نقارے پر چوٹ پڑنے کی صدا گونجنے سے پہلے حکم کا اندازہ لگالیا جاتا۔ نامساعد سرزمین میں طویل اور نہایت دشوار پیش قدمیوں کے دوران بھی نظم وضبط میں شاذ ہی کوئی کوتاہی دیکھنے کو ملتی تھی۔

تیمور کو اکثر ایک واقعہ فخر وغرور میں مبتلا کردیتا جب کسی طویل پیش قدمی کے دوران ایک فوجی گھوڑے پر بیٹھا بیٹھا سوگیا تھا۔ تیمور نے آتشیں نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے خودکلامی کی۔

”ایسے آدمی کا تو سرہی قلم کردینا چاہیے۔“

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ایک افسر نے اس بدقسمت فوجی کا سر تیمور کی خدمت میں لاکر پیش کردیا۔

ان حالات وواقعات کا اعادہ کرتے ہوئے جانے کیوں تیمور کو چند ہی لمحوں بعد ایک بے نام سی خلش اور اضطراب گھیر لیتے تھے۔ ایسی خلش جس کا کہیں کوئی درماں نہیں تھا اور ایسا اضطراب جس کا کہیں کوئی سکون نہیں تھا۔

☆☆☆

تیمور کی زندگی ایک نئے آزار میں مبتلا ہونے لگی تھی۔ معاملہ کچھ یوں تھا کہ کسی بھی امیر کی لاش سمرقند لائے جانے کی صورت میں علمائے دین تعزیت، فاتحہ خوانی اور دعائیں شروع کردیتے لیکن اب تیمور کو راتوں میں عجیب وغریب خواب دکھائی دینے لگے تھے۔ ان خوابوں کے باعث اس کی نیند اڑ جایا کرتی۔ کچھ عرصے بعد اسے خواب میں وہ خوانین نظر آنے لگے جو ماضیِ بعید میں عظیم الشان لشکر لیے صحرائے گوبی سے گزرتے ہوئے ملک خطا (چین) پر حملہ آور ہوئے تھے۔

ان دنوں تیمور کا ذہن متفرق محاذوں پر الجھا ہوا تھا۔ وہ ایک سمت بغداد اور دیگر تباہ شدہ شہروں کی تعمیرِ نو کروانے میں مصروف تھا تو دوسری جانب چین کی بابت تصورات بھی ہمہ وقت ستایا کرتے۔ ان تصورات کی ایک وجہ بہرحال یہ بھی تھی کہ ماضیِ قریب میں چین کے ”منگ شہنشاہ“ کی ایک سفارت سمرقند آئی تھی۔ اس سفارت نے تیمور کے لائے ہوئے پیغام میں اسے اطاعت گزار کے طور پر مخاطب کیا تھا۔ تیمور کے لیے یہ اہانت ناقابلِ برداشت تھی۔ دھیرے دھیرے یہ طیش وغضب اس قدر غالب آیا کہ اس نے چین پر منگول تسلط بحال کرنے اور ایشیا کے اس گنجان آباد ترین خطے میں اسلام کا علم بلند کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

کچھ عرصے بعد تیمور نے یہ منصوبہ تشکیل دیا کہ وہ صحرائے گوبی میں لشکر داخل کرکے دیوارِ چین سے گزر کر دنیا کی اس آخری طاقت کو زیر کرلے گا جو کسی بھی وقت اس کے لیے خطرے کا باعث بن سکتی تھی۔ اس منصوبے کی جزئیات طے کرتے ہوئے تیمور نے اپنے افسران کو مکمل طور پر لاعلم ہی رکھا تھا۔ وہ کسی بھی لشکرکشی سے قبل اپنی سلطنت کے انتظامی معاملات کی اصلاح کرنا چاہتا تھا کیونکہ پے در پے جنگوں نے ملک کی حالت ابتر کررکھی تھی۔

ان معاملات کو نمٹاتے ہوئے تیمور موسم بہار میں اپنی فوج اور دربار سمیت سمرقند واپس پہنچا اور باغ دلکشا میں مقیم ہوگیا۔ اس کے بعد وہ نوتعمیر شدہ شاہی مسجد کے معائنے پر روانہ ہوگیا۔ اپنی عدم موجودگی میں امورِ سلطنت کے ذمے دار وزرا کی کارکردگی کا جائزہ بھی لیا اور ان کی اسی کارکردگی کی بنیاد پر چند ایک کو تختہ دار پر جھولنے کی سزا اور بقیہ ماندہ کو خوب انعام واکرام سے نوازا۔

بڑھاپے سے قویٰ میں در آنے والے اضمحلال کے باوجود وہ بھرپور قوتِ ارادی سے شہزادہ محمد کا سنگ موسیٰ وسنگ مرمر سے بنا اور سنہری گنبد پر مشتمل ایک نیا مقبرہ تعمیر کروایا۔ اس مقبرے میں آبنوس اور ہاتھی دانت کا استعمال کیا گیا تھا۔ چھت البتہ چاندی کے ستونوں پر مشتمل تھی۔

ان تعمیری سرگرمیوں میں الجھے تیمور نے بڑھاپے کے مختلف ”تنبیہی جھٹکے“ نظرانداز کررکھے تھے۔ اسے اس بات کی بھی پروا نہیں تھی کہ اس کی عمر اب سات دہائیوں کا سفر طے کرنے والی ہے اور گزشتہ دو سال سے اس کی بصارت میں تشویش ناک حد تک کمی آنے لگی ہے۔ اس کے پپوٹے گرے رہنے لگے تھے جس کے باعث مقابل کو ہمہ وقت اس کی خوابیدگی کا تاثر ہی ملتا۔

تیمور نے ان جسمانی تبدیلیوں سے صرفِ نظر ہی کر رکھا تھا۔ اس نے لشکرگاہ، ایک باغ اور ایک شہر کو ملا کر اپنے

تصور کے مطابق جنت تعمیر کر رکھی تھی اور اس جنت میں دو ماہ تک نہایت شاندار جشن منانے کا حکم دے دیا۔ یہ دو ماہ سحر انگیزی میں اپنی مثال آپ تھے۔ خزاں کا سورج جس وقت پہاڑیوں کے نیلگوں ٹیکروں کے عقب میں چھپا ہوتا تو سمرقند اپنی آرائش اور رنگا رنگ قمقموں کی بدولت جنات کے شہر کا سا تاثر دیا کرتا تھا۔

اس جشن کے دوران محلات کی رونق بھی نرالی تھی۔ کہیں صحنوں میں پھولوں اور پھلوں کے انبار لگے ہوتے تو کہیں ایسے جگمگاتے تخت رواں اور پالکیاں دکھائی دیتی تھیں جن میں لعل و گہر پیوست تھے۔ یہاں مختلف مقامات پر براجمان لڑکیاں نغمہ سرا رہتیں۔ ان کے ساتھ نوجوان لڑکے بانسریوں کی تانیں اڑاتے ہوئے چلتے۔ اس کے بعد شیر اور سنہری سینگوں کی بکریاں دکھائی دینے لگتیں۔ یہ بکریاں در حقیقت حسین و جمیل لڑکیاں تھیں جنہیں سمرقند کے پوستین سازوں نے اپنا کمال دکھانے کے لیے ان جانوروں کی کھالیں اس خوبی و نفاست سے پہنا رکھی تھیں کہ وہ دیکھنے والوں کو شیر اور بکریاں ہی دکھائی دیتی تھیں۔

اس رونق اور رنگ و بو کے علاوہ سمرقند میں ایک اور محل کی شان بھی بے مثل تھی۔ کپڑے سے بنا یہ محل مسجد کے میناروں سے بھی بلند تر تھا۔ سمرقند کے پارچہ بافوں اور خیمہ سازوں نے قرمزی کپڑے سے اس محل کی تعمیر میں اپنا تمام تر ہنر سمو دیا تھا۔ دن کے مخصوص اوقات میں ہاتھیوں کی لڑائیاں ہوا کرتیں۔ ہندوستان اور صحرائے گوبی سے سمرقند آنے والے تاتاری شہزادے تیمور کی خدمت میں نوادرات کے روپ میں انواع واقسام کے تحائف پیش کیا کرتے۔ ان شہزادوں کے لیے سمرقند کی تفریحات اور تقریبات بے حد متاثر کن تھیں۔

یہ محافل رنگ و بو نہایت طمطراق سے دو ماہ تک جاری رہیں۔ اس کے بعد سفیروں کو رخصت کر دیا گیا۔ جشن کے ہنگامے سرد ہوتے ہی تیمور نے شہزادوں اور امیروں کے لیے قرولتائی کا اہتمام کیا اور حاضرین سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

''اس لمحے ہم ایشیا بھر کے فاتح ہیں۔ ان فتوحات میں ایک خلش تا حال باقی ہے۔ ایشیائی سرزمین میں ایک خطہ ہنوز ناقابل تسخیر ہے۔ میرے دل و دماغ میں شدت سے ایک ہی تمنا مچلتی ہے کہ ہم نے طاقتور ترین بادشاہوں کو تخت و تاج سے محروم کیا ہے۔ ہماری فتوحات کئی نسلوں تک یاد رکھی جائیں گی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ فتوحات تم لوگوں کی مدد، خلوص بھرے تعاون اور توانائی کے بغیر ممکن ہی نہ ہو پاتیں۔ اس وقت ایک بار پھر اسی جوش وجذبے کی ضرورت ہے۔ ہمارا اگلا شکار چین ہے اور مجھے یقین ہے کہ اسے فتح کرنے کے لیے زیادہ طاقت کی ضرورت نہیں ہوگی۔ تو ساتھیو! تیار ہو جاؤ، اب تم لوگ میرے ساتھ چین کی طرف پیش قدمی کرو گے۔''

تیمور کی اس ولولہ انگیز تقریر نے قرولتائی کے شرکاء کا خون گرما دیا۔ ان کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ تیمور نے چین پر حملے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ وہ اپنی سلطنت کی سرحدیں اپنے پیش رووں سے بھی وسیع تر کرنے کے لیے اس کہنہ سالی میں بھی بھرپور توانا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور حقیقت بھی کسی روزِ روشن کی طرح عیاں تھی کہ یہ مہم ممکنہ طور پر تیمور کی زندگی کا آخری سفر ہو سکتا ہے۔

تیمور کا یہ ولولہ دیکھ کر اس کے جرنیل اور سپاہی علم بلند کیے جانے کے لیے نعرہ زن ہو گئے۔ تیمور نے فوری طور پر سمرقند میں موجود اپنے دو لاکھ جنگ آزماؤں کو مختلف جیشوں میں تقسیم کر کے ان لشکر گاہوں کی جانب روانہ کر دیا جو چین جانے والی شاہراہ پر تعمیر شدہ تھیں۔ اس مرعوب کن متنوع لشکر میں منگول، وسطی ایشیا اور اناطولیہ کے ترک، ایرانی اور افغانی بھی شامل تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب موسم سرما نے اپنی آمد کی بھرپور دستک دے دی تھی۔ سطح مرتفع پامیر پر برفباری کا آغاز ہو چکا تھا۔ تیمور کو اصولی طور پر اس برفباری کے رکنے اور جمع شدہ برف پگھلنے کا انتظار کرنا چاہیے تھا لیکن اسے کسی بھی طور سکون میسر ہو کر ہی نہ دے رہا تھا۔

تیمور نے شہزادہ خلیل کو فوج کے میمنہ کے ہمراہ شمال کی جانب روانہ کر دیا اور خود قلب کا لشکر سنبھال لیا جس کی کمان قبل ازیں شہزادہ محمد کے سپرد ہوتی تھی۔ تاتاریوں کے ہمراہ بڑی بڑی گاڑیاں اس قدر وافر مقدار میں تھیں کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کوئی چوبی شہر رواں ہو گیا ہو۔ تیمور نے ان گاڑیوں میں برسہا برس کے لیے سامان رسد جمع کر لیا تھا کیونکہ راستے میں رسد فراہم ہونے کی بالکل کوئی امید نہ تھی۔ پیکنگ تک پہنچنے کے لیے لشکر کو ساڑھے پانچ ہزار کلومیٹر کا سفر طے کرنا تھا۔ اس سفر میں صحرا، گھاس کے میدان اور زرعی زمینیں بھی عبور کی جانی تھیں۔

تاتاری فوج نے سمرقند کا دریا عبور کیا تو تیمور نے اپنے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے پلٹ کر شہر کی جانب ایک خاموش نگاہ دوڑائی اور گہری سانس بھر کر رہ گیا کیونکہ بصارت کی کمزوری کے باعث اسے شہر کے مینار اور گنبد دکھائی ہی نہیں

دے رہے تھے۔

سفر میں مزید پیشرفت ہوئی تو سردی کی شدت میں بھی مزید اضافہ ہوگیا۔ شمالی سطح مرتفع کی سرد ہواؤں نے میدانی فضا کو یخ بستہ کردیا تھا۔ ژالہ باری کے طوفان سے ٹھٹھرتے تاتاری اپنے لشکر گاہ کے خیموں تک محدود ہوگئے۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے خیموں سے نکل کر جب دوبارہ سفر کا آغاز کیا تو قرب وجوار نے برف کی سفید چادر اوڑھ رکھی تھی۔ ندیوں میں پانی جم چکا تھا اور راستوں پر جابجا برف کے تودے دکھائی دے رہے تھے۔

موسم کی اس قہرناکی سے سپاہی اور گھوڑے ٹھٹھرتے ہوئے مرنے لگے۔ لیکن تیمور کا جنگی جنون اس قدر شدید تھا کہ وہ واپسی کے لیے بالکل بھی تیار نہیں تھا۔ کچھ ہی عرصے میں جنون کا یہ عالم تھا کہ تیمور نے شہر ''سنگ'' کی اس سرمائی قیام گاہ میں پناہ لینے سے بھی انکار کردیا جہاں شہزادہ خلیل نے اپنے لشکر کو جاڑا ختم ہونے تک جھونپڑیوں میں ٹھہرایا تھا۔ اس کے حکم پر فوج نے برف پر نمدے بچھائے اور برف کو کچلتے ہوئے اس پر گاڑیاں اور اونٹ گزارے۔

جاڑے کی ہولناکی ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی ہی جارہی تھی۔ برف و باراں کے طوفان اب شب و روز جاری رہنے لگے تھے۔ برف پر ترچھے سورج کی زرد دھوپ کی چمک سے آنکھیں چندھیانے لگتی تھیں۔ تیموری لشکر سہج سہج کر چلتا پہاڑی علاقے میں داخل ہوگیا۔ اس علاقے میں پہاڑیوں کے کہر میں چھپی ہونے کی وجہ سے گھاٹیاں ان کے مقابلے میں بالکل ہی زمین میں دھنسی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ لشکر کے سپاہیوں اور باربرداری کے جانوروں کی حالت دیکھ کر بالآخر تیمور نے اترار میں پڑاؤ کا فیصلہ کرلیا۔ اس کے ذہن میں یہی منصوبہ پنپ رہا تھا کہ گرما کا آغاز ہوتے ہی وہ پیشرفت کا دوبارہ آغاز کردے گا لیکن قدرت نے اس کی روانگی کے لیے ایک اور پڑاؤ مقسوم کررکھا تھا۔

☆☆☆

کڑاکے کی سردی میں جنگی جنون کے تحت کٹھن ترین سفر نے تیمور کو سخت علالت میں مبتلا کردیا۔ اس کے صاحب فراش ہونے کی خبر نے سپاہ میں اضطراب کی ایک لہر دوڑا دی۔ حصار کی چوبی دیواروں کے باہر امیر، سردار اور ہر درجے کے افسران برف میں کھڑے تھے۔ دیوان میں بوڑھی ملکہ سرائے خانم اپنی خواصوں کے ہمراہ تشویش سے بے حال دکھائی دے رہی تھی۔ وہ تیمور کی علالت کی خبر سن کر سمرقند سے اترار پہنچ کر ایک کہرام برپا کرچکی تھی۔

تیمور کے کمرے کے باہر باریش امام اور علماء کھڑے تلاوت قرآن پاک میں مگن تھے۔ یہ تلاوت اور دعائیہ سرگرمیاں کئی ہفتوں سے بلاتعطل جاری تھیں۔ علمائے کرام اور امام صاحبان قرآن پاک کی آیات پڑھتے ہوئے اس کی صحت یابی کے لیے دعاگو تھے لیکن اب ایسا واضح نظر آنے لگا تھا کہ یہ دعائیں قبولیت کا شرف نہیں پائیں گی۔ تیمور کے اہل خانہ اور امراء کی سماعت میں ملک الاطبا مولانا تبریز کے الفاظ رہ رہ کر گونجتے۔

''اب کوئی چارہ نہیں، وقت آپہنچا ہے۔''

ان الفاظ کی گونج سے بدن کا ہر مسام پسینا اگلنے لگتا اور نظریں تیمور کے جھریوں سے بھرے چہرے پر الجھنے لگتیں جو ڈھلے ہوئے کپڑے کی طرح سفید پڑچکا تھا۔ برف سے سفید بالوں کے جھنڈ تکیے پر منتشر تھے۔ اس کے سرہانے انگیٹھیاں دہک رہی تھیں، بدن پر شدید بے چینی کا غلبہ تھا۔ امراء اور اہل خانہ کو اب واضح طور پر محسوس ہونے لگا کہ جنگجوئے صف شکن پر نزع کا عالم طاری ہوچکا ہے لیکن اس کے باوجود اس کے آہنی اعصاب اور ذہنی مضبوطی کا یہ عالم تھا کہ وہ قدرے ہوش میں آتے ہی امراء کو ہدایات دینے لگتا۔

''اپنی تلواروں کی حفاظت زندگی سے بھی بڑھ کر کرنا۔ اتفاق کا دامن کبھی نہ چھوڑنا۔ نفاق تباہی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ خطا کی مہم بہرصورت مکمل کرنی ہے۔''

امراء اس کے انداز ونصائح پر مغموم انداز میں سر جھکالیتے۔ اس کی آواز اب اتنی نحیف ہوچکی تھی کہ بات مکمل طور پر سننے کے لیے کان ہونٹوں سے لگانے پڑتے تھے۔ کچھ لمحوں بعد تیمور نے ایک بار امراء کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میرے مرنے کے بعد پاگلوں کی طرح کپڑے پھاڑ کر اِدھر اُدھر بھاگنا نہ شروع کردینا۔ اس طرح بدنظمی پھیل جائے گی جو دشمن کو تقویت دے گی۔''

''اللہ رحم فرمائے امیر! ایسی مایوس کن باتیں کیوں کررہے ہیں؟ پروردگار آپ کو بہت جلدی صحت یابی عطا فرمائے گا۔'' نورالدین تڑپ کر بولا۔

تیمور کے ہونٹوں پر ایک پژمردہ مسکراہٹ بکھری اور وہ گہری سانس بھرتے ہوئے کہنے لگا۔

''میں جہانگیر کے بیٹے پیر محمد کو اپنا جانشین مقرر کرتا

ہوں۔ اسے بہر صورت سمرقند میں رہ کر فوجی انتظامات ومعاملات پر مکمل اختیارات حاصل کرنے ہوں گے۔"

تیمور نے اتنا کہہ کر ایک توقف کیا اور نورالدین، شاہ ملک سے اجتماعی طور پر مخاطب ہوتے ہوئے کہنے لگا۔

"میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم اپنی زندگیاں اس کی خدمت کے لیے وقف کر دینا۔ اس کی ہر ممکن امداد کرتے رہنا۔ سمرقند کی طرح مملکت کے دور دراز صوبے بھی پیر محمد کے ہی ماتحت ہونے چاہئیں۔ اگر تم نے اس سے پہلوتہی کی تو تخت و تاج کے لیے ایک طویل کشمکش شروع ہونے کا خدشہ ہے۔"

"ہم آپ کے ہر حکم کی تابعداری کریں گے امیر!" نورالدین اور شاہ ملک نے خلوص سے یقین دہانی کروائی۔ اس کے بعد نورالدین متذبذب ہو کر کہنے لگا۔

"امیر! اس ناچیز کی التجا مانیے تو ایک بار اپنے پوتوں کو بھی طلب کر لیجیے۔ بہتر ہوگا کہ وہ بھی آپ کی وصیت ایک بار اپنے کانوں سے سن لیں۔"

تیمور کے ہونٹوں پر ایک ستم ظریفانہ مسکراہٹ رینگ گئی۔ اس کے لیے سانس لینا بھی اب دوبھر ہونے لگا تھا۔ وہ بدقت تمام گویا ہوا۔

"اپنے افسران اور فوجیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے میں نے کبھی سونا اور ہیرے جواہرات اپنے لیے جمع کر کے نہیں رکھے۔ میں نے اپنے جوانوں کو ہمیشہ دسترخوان پر ساتھ بٹھایا ہے۔ اس اپنائیت اور اعتماد کے بدلے انہوں نے میدان جنگ میں میرے لیے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے ہیں۔ میں نے ہمیشہ تقسیم میں فیاضی سے کام لیا ہے۔ اپنے فوجیوں کے ہر دکھ سکھ میں شریک ہوا ہوں۔ مجھے ان کی وفاداری پر اٹوٹ یقین ہے۔"

"امیر! اس ذرہ نوازی اور قدردانی کے لیے ہم سبھی آپ کے مشکور ہیں...... لیکن امیر! اپنی یہ وصیت ایک بار سبھی پوتوں کے گوش گزار دیجیے۔" نورالدین ایک بار پھر ملتجی ہوا۔

تیمور کے چہرے پر جھنجلاہٹ نمودار ہونے لگی۔ وہ بیزاری اور چڑچڑے پن سے کہنے لگا۔

"نہیں...... یہ آخری دربار ہے۔ خدا کو یہی منظور ہے۔"

نورالدین سمیت سبھی امراء کی رنگت متغیر ہو گئی۔ وہ ہراس بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔ تیمور نے نقاہت سے آنکھیں موندلیں اور ایک توقف سے نحیف و ڈوبتی آواز میں کہنے لگا۔

"اب تو بس ایک ہی تمنا ہے کہ شاہ رخ کی صورت ایک بار پھر دیکھ لیتا...... لیکن...... یہ...... نا...... ممکن...... ہے۔"

اتنا کہہ کر تیمور کو اپنے ہی الفاظ کسی تازیانے کی طرح رسید ہوتے محسوس ہوئے۔ اس کی سات دہائیوں پر مشتمل زندگی میں یہ لفظ پہلی بار زبان پر آیا تھا۔ آہنی اعصاب کے حامل اس جنگجوئے صف شکن نے زندگی بھر مشکلات کے پہاڑ چیرتے ہوئے ہر راستہ خود تخلیق کیا تھا اور آج موت کی آمد نے اسے کس قدر بے بس کر دیا تھا کہ بیٹے کی صورت دیکھنا غیر یقینی صورت حال بن کر خلش محسوس ہونے لگی تھی۔

تیمور کے لیے اب سلسلۂ کلام جاری رکھنا دشوار ہونے لگا تھا۔ اس نے نقاہت سے آنکھیں موندلیں۔ بدن میں سرد لہریں سرایت ہوتی محسوس ہونے لگیں۔ اعضا بے جان ہونے لگے تو آنکھوں کے گوشے احساس بے بسی سے بھیگنے لگے۔ اس کی یہ حالت اور پھر بدن کے قفس کو روح سے خالی ہوتے دیکھ کر کئی امراء کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ خواتین کی جانب بھی ایک کہرام برپا ہو چکا تھا۔ مولانا تبریز نے کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے تیمور کا چہرہ سفید چادر سے ڈھک دیا۔

☆☆☆

تیمور کی وفات کے بعد نورالدین کے سبھی خدشات یکے بعد دیگرے مجسم ہونے لگے۔ نورالدین نے سب سے پہلے تیمور کی لاش شاہ رخ کے بڑے بیٹے "الغ بیگ" کی سپردگی میں اس مقام پر بھیج دی جہاں اس کی دونوں بیگمات منتظر تھیں۔ پیر محمد کی جانب نہایت عجلت میں قاصد روانہ کیے گئے۔ دور کے صوبوں کے والیوں اور شہزادوں کو مطلع کرنا بھی ضروری تھا چنانچہ ان کی طرف بھی تیز رفتار قاصد روانہ کر دیے گئے۔

اس موقعے پر نورالدین کو پہلا ذہنی جھٹکا اس وقت برداشت کرنا پڑا جب میمنہ کے امیروں نے میراں شاہ کے بیٹے خلیل کی وفاداری کا حلف اٹھا کر اسے سمرقند کے تخت پر بٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ نورالدین نے اس موقعے کی نزاکت بھانپتے ہوئے دیگر امراء سے مشورہ کیا اور بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ مرکزی حکومت میں انتشار پیدا ہو جانے کے باعث چین کی مہم جاری رکھنا بے سود ہے۔ وہ پلٹ کر تیز رفتاری سے سمرقند کی جانب روانہ ہوئے تاکہ دریائے سیر پر جنازے کے ساتھ شریک ہو جائیں۔

سمرقند پہنچتے ہی دوسرا ذہنی جھٹکا ان کے استقبال کے لیے منتظر تھا۔ شہر کے دروازے اپنے لیے بند پا کر وہ ساکت

وصامت تھے۔ ان کے ساتھ تیمور کا تابوت، ملکہ سرائے خانم اور تیموری طبل وعلم بھی تھے لیکن اس کے باوجود حاکم شہر نے خلیل کی وفاداری کا حلف اٹھا لینے کے باعث ان کے لیے دروازہ کھولنے سے انکار کردیا۔ اس نے تیموری امراء کو دوٹوک جواب دیتے ہوئے پیغام پہنچایا۔

''پیر محمد کے ہندوستان سے سمرقند پہنچنے تک کسی نہ کسی کو تخت پر بٹھانا ضروری ہے۔''

شاہ ملک، نورالدین اور دیگر تمام امراء اب شدت سے پیر محمد کے سمرقند پہنچنے کے منتظر تھے لیکن نتائج قطعی برعکس ثابت ہوئے۔ سمرقند تک رسائی حاصل کرنے والا شخص ماضی قریب میں ایک کنیز کے عشق میں رسوا ہونے والا شہزادہ خلیل تھا جس کی والدہ خانزادہ نے اسے اس مقام تک پہنچانے کے لیے بے شمار جوڑتوڑ بھی کیے تھے۔ اسی کے اثر رسوخ کا نتیجہ تھا کہ امراء کی ایک کثیر تعداد خلیل کا ساتھ دینے کے لیے آمادہ ہوگئی تھی۔

سمرقند کے باشندے اس صورتِ حال پر سخت مخمصے میں مبتلا تھے۔ تیمور کی وفات سمرقند سے باہر ہوئی تھی اور اس کے احکام شاہی خانوادے میں سے کسی نے سنے ہی نہ تھے۔ نتیجتاً خلیل کے تخت نشین ہوتے ہی اسے شہنشاہ تسلیم کرلیا گیا۔ نورالدین اور شاہ ملک حالات کے اس تغیر پر بے حد آزردہ تھے تاہم وہ تیمور کی وصیت اور شخصی ادب کے باعث اس کے پوتوں کی اطاعت وفرماں برداری پر مجبور تھے۔

نورالدین نے موجودہ حالات وواقعات کے پیشِ نظر دیگر امراء سے مشاورت کی اور اس بارہ دری میں پہنچ گیا جہاں تیموری علم نصب تھا۔ اس مقام پر پہنچنے کے بعد تیمور کا نقارہ تڑوادیا گیا۔ ان وفادار امراء کو یہ گوارا ہی نہیں تھا کہ جونقارہ ان گنت مرتبہ تیمور کی فتح کی خبر دینے کے لیے گرج چکا ہے، اس پر کسی اور کے اعزاز میں چوٹ پڑے۔

امراء اور اہلِ خانہ کے لیے تیمور کی موت کا غم ابھی کم نہ ہوا تھا کہ خلیل کے عجلت پسندانہ فیصلے اور نااہلی زخموں پر مزید نمک چھڑکنے لگی۔ خلیل تخت نشین ہوتے ہی اپنی منظورِ نظر کنیز شادی ملک سے عقدِ نکاح میں بندھ گیا۔ اپنی محبت کے حصول کی سرمستی، بے بہا دولت اور اقتدار کے نشے نے اسے بالکل ہی بے قابو کردیا۔ اس کے شب وروز جشن کی تقریبات کے اہتمام اور شادی ملک کی شان میں قصیدہ گوئی کرتے بیتنے لگے۔ خزانے کا منہ تو روزِ اول ہی کھول دیا گیا تھا۔ سمرقند کے باغات میں نہایت دھوم دھام سے راگ رنگ کی محفلوں کا اہتمام ہوتا، ہیرے جواہرات زمین پر بکھیرنے کے بعد حاضرین کو دعوتِ عام دی جاتی کہ جسے جو جواہرات ملیں، وہی اس کا مالک ہوگا۔ فواروں میں سے پانی کی جگہ شراب گرتی تھی۔

اس بے جا اسراف اور شان وشوکت کے باعث خوشامد پسند مصاحبین اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ ان کی چرب زبانی نے خلیل کی سوچنے سمجھنے کی محدود صلاحیتیں مزید زنگ آلود کردیں۔ دوسری جانب شادی ملک نے سرائے خانم کے خلاف محاذ کھول رکھا تھا۔ اسے کہنہ سال ملکہ کے تمام تر اختیارات بھی اپنی دسترس میں درکار تھے۔ ان دونوں کی اس عاقبت نااندیش حرکات نے کچھ ہی عرصے میں ملک میں خانہ جنگی کا آغاز کردیا۔

اسی اثنا میں پیر محمد ہندوستان سے سمرقند پہنچا لیکن خلیل کی فوج کو زیر نہ کرسکا۔ پیر محمد کے بعد کئی اور امیروں نے بھی سمرقند پر حملہ کیا اور خلیل کی فوج سے سازباز کرکے بالآخر اسے شکستِ فاش دینے میں کامیاب ہوگئے۔ خلیل کو پابند سلاسل کرکے شادی ملک کو سرعام رسوا کیا گیا۔ اس انتشار اور نفسانفسی کو متوازن ڈگر پر لوٹانے کے لیے شاہ رخ پہلی مرتبہ حرکت میں آیا اور خراسان سے ماوراء النہر کی جانب بڑھ کر سمرقند پر قابض ہوگیا۔ اس نے دولت وعظمت سے محروم ہوچکے سمرقند کو اپنے بیٹے ''الغ خان'' کے سپرد کردیا۔

شاہ رخ اور الغ خان کی باہمی کوششوں سے تیموری سلطنت ہندوستان سے عراق تک برقرار رہ پائی تھی۔ یہ دونوں افراد ہی امن پسند، علم دوست اور ہنرنواز تھے۔ ان کی سرتوڑ کوششوں سے ایک بار پھر خوشحالی کا دور شروع ہوگیا۔ سمرقند کے ریگستان میں نئی عمارات تعمیر کروائی گئیں، ایرانی معماروں، فنکاروں اور شاعروں کی سرپرستی کی گئی۔ ان تعمیری اقدامات کے باوجود وہ سمرقند کو تیمور کے عہدِ حکومت کے ''پایہ'' تک نہ پہنچا سکے۔

جنگجوئے صف شکن دنیا کا آخری فاتح تھا۔ اس کے بعد کوئی انسان تلوار کے زور پر ایسی طاقت حاصل نہ کرپایا۔

(ختم شد)

ماخذات: امیر تیمور، از ہیرلڈلیم

آلۂ قتل

غوثیہ شبیر

دور قدیم ہو یا عہد حاضر... عزت ہر دور کے انسانوں کے لیے سب سے بڑی ضرورت رہی ہے... ہر وہ شخص جس کا معاشرے میں ایک مقام... ایک بھرم ہو، خود پر فخر کرتا ہے... مگر افسوس ایک شریف آدمی نے دوسرے شریف آدمی کا قتل اس طرح کیا کہ کوئی اسے قتل تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا... کیونکہ آلۂ قتل نے قاتل کی ذہنی حالت کو مشکوک ثابت کر دیا تھا۔

معاشرے میں ایک عزت دار اور شریف النفس انسان کی خودداری کے بھرم کا تماشا

تیل اور گھی کے کارٹن، دال، چاول، آٹے کے پیکٹس، کچھ مسالا جات اور ایسی کئی چیزیں جو روزمرہ استعمال کا حصہ ہوتی ہیں، بابر اسٹور روم سے لاکر گاڑی کی ڈکی میں رکھتا جا رہا تھا اور ڈکی تقریباً بھرنے ہی والی تھی۔
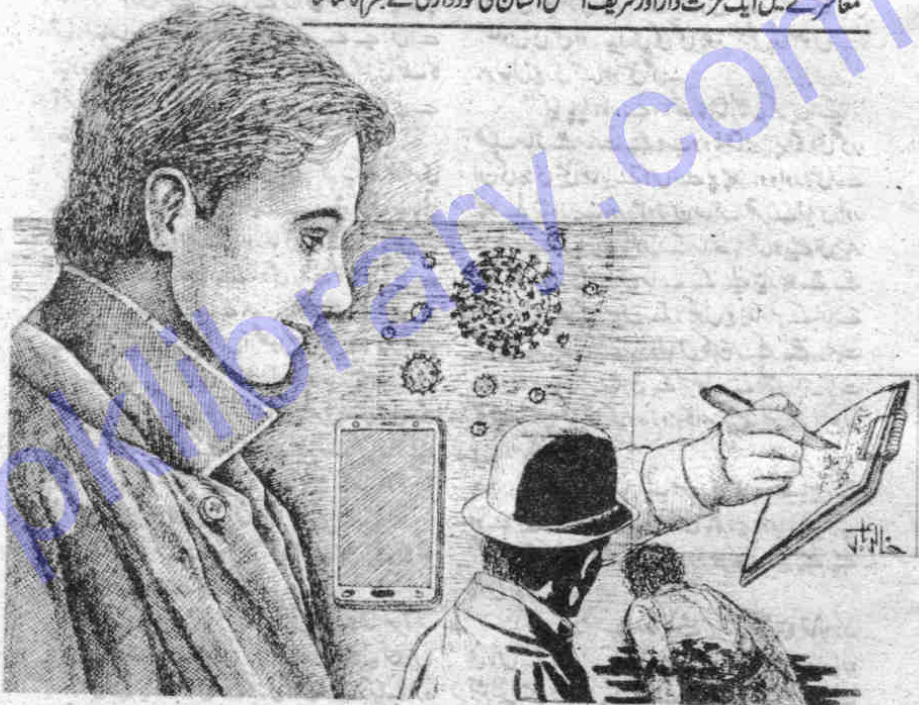
کار پورچ میں کھڑی اس کی بیوی عمارہ یہ ساری کارروائی بالکل خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔ وہ کئی گھنٹے صرف کر کے ابھی دو دن پہلے ہی اس ساری گروسری کی خریداری کر کے لائی تھی تاکہ ڈیڑھ دو ماہ سکون سے گزر جائیں اور اسے اپنی

مصروفیات سے وقت نکال کر بار بار اس جھنجٹ میں نہ پڑنا پڑے۔ ایک وجہ بار بار باہر جانے سے بچنا بھی تھی۔ کورونا کی وجہ سے کسی بھی عوامی جگہ پر جانے کے لیے اچھی طرح ایس او پیز کا اہتمام کرنا پڑتا تھا پھر بھی یہ خدشہ رہتا تھا کہ کہیں وہ وائرس کو گھر تک لانے کا سبب نہ بن جائیں۔

بچوں کے معاملے میں وہ دونوں میاں بیوی ہی بہت حساس تھے اور اس عرصے میں انہوں نے سخت احتیاط کی تھی کہ بچوں کا باہر کے کسی فرد سے براہِ راست واسطہ نہ پڑے۔ ننھیال اور ددھیال کے قریبی رشتے داروں سے بھی وہ بس فون اور انٹرنیٹ کے ذریعے ہی جڑے ہوئے تھے اور انہیں یہ بات اچھی طرح باور کروادی گئی تھی کہ محفوظ رہنے کے لیے محدود رہنا بہت ضروری ہے۔

”سوری! مجھے احساس ہے کہ اس ساری شاپنگ پر تمہارا خاصا وقت صرف ہوا ہے لیکن میرے لیے اس سے زیادہ تاخیر کرنا ممکن نہیں ہے۔“ اسٹور سے گاڑی تک کا آخری چکر لگانے کے بعد وہ عمارہ کے قریب رکا اور اس سے معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔

”اٹس او کے۔ میں جانتی ہوں کہ یہ کتنا ضروری ہے۔“ ایک اچھی بیوی کی حیثیت سے وہ شوہر کی جذباتی کیفیت سے خوب واقف تھی اور جانتی تھی کہ وہ کس قلبی اور ذہنی تکلیف سے گزر رہا ہے۔ آدھی رات کو وصول ہونے والی اس فون کال کو سننے کے بعد سے اب تک کا وقت اس نے بستر پر کروٹیں بدلتے بس آنکھوں ہی میں کاٹا تھا۔ عمارہ کی جب جب آنکھ کھلی تھی، اس نے اسے جاگتے ہوئے ہی پایا تھا اور اب فجر ہوتے ہی وہ گاڑی کی بھری ہوئی ڈکی کے ساتھ گھر سے روانہ ہونے کے لیے تیار تھا۔ اس سارے سازوسامان کے ساتھ اس نے ایک اچھا خاصا پھولا ہوا لفافہ بھی اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔

”واپسی کب تک ہوگی؟“ وہ گاڑی میں بیٹھنے لگا تھا جب عمارہ نے اس سے پوچھا۔

”زیادہ دیر نہیں لگاؤں گا۔ کوشش ہوگی ناشتا گھر آکر بچوں کے ساتھ ہی کروں۔ اگر تاخیر ہوئی تو کال کردوں گا۔“ اس نے کہا اور تیزی سے گاڑی نکال کرلے گیا۔ عمارہ نے گیٹ بند کیا اور خود واپس اندر جا کر لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گئی۔ آفس نے اسے سہولت دے رکھی تھی کہ وہ باہر نکلنے کا خطرہ مول لیے بغیر گھر سے کام کرتی رہے چنانچہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے لیپ ٹاپ کے ساتھ مصروف دکھائی دیتی تھی۔ کچھ ایسا ہی حال بابر کا بھی تھا لیکن اس سارے معمول میں انہیں عام دنوں کی بہ نسبت بچوں کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کا موقع مل رہا تھا اور اس چیز سے لطف اندوز ہونے کے لیے ان کی کوشش ہوتی تھی کہ اپنی مصروفیات کو بچوں کے معمولات کے ساتھ ہم آہنگ کرسکیں۔ اب بھی اس نے سات بجتے ہی لیپ ٹاپ بند کردیا اور بچوں کے کمرے میں جا کر انہیں جگایا۔ بچے فریش ہونے گئے تو وہ خود کچن میں آکر ناشتے کی تیاری میں مصروف ہوگئی۔

کورونا ایس او پیز کی وجہ سے آج کل اس نے اپنی گھریلو مددگار خاتون کو آنے سے منع کیا ہوا تھا اور جملہ گھریلو امور خود انجام دے رہی تھی۔ بابر اور بچے بھی حسب مزاج اس کی کچھ مدد کردیا کرتے تھے اس لیے سب کچھ پرسکون طریقے سے چل رہا تھا۔ زندگی میں واحد کمی دوستوں اور رشتے داروں کے ساتھ جمنے والی محفلوں کی تھی اور یہ ایسی کمی تھی جو ڈیجیٹل رابطوں سے بہرحال پوری نہیں ہوسکتی تھی۔

”کیا پاپا ہمارے ساتھ ناشتا نہیں کریں گے؟“

ٹھیک ساڑھے سات بجے جب وہ ناشتا میز پر لگا چکی تھی، ان کی بڑی بیٹی عنایا نے اس سے پوچھا۔ وہ اور اس سے چھوٹے شاہ زیب اور شاہ زین صاف ستھرے لباس اور سلیقے سے بنائے گئے بالوں کے ساتھ بالکل ویسے ہی تیار تھے جیسے روز صبح اسکول جانے کے لیے تیار ہوتے تھے لیکن فرق یہ تھا کہ انہوں نے اسکول یونیفارم کے بجائے گھر میں استعمال کے سادہ لباس پہن رکھے تھے۔ بہت سے اسکولوں کی طرح ان کے اسکول نے انہیں اس بات کا پابند نہیں کیا تھا کہ وہ زوم کلاسز لیتے ہوئے اسکول یونیفارم پہنیں۔

”آپ کے پاپا ایک ضروری کام سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ شاید انہیں واپسی میں کچھ دیر ہوجائے۔ آپ لوگ ناشتا کرلیں تاکہ کلاس شروع ہونے سے پہلے پہلے فارغ ہوجائیں۔“

اگرچہ بابر حسب وعدہ ناشتے پر نہیں پہنچ سکا تھا اور نہ ہی اس نے کال کرکے کوئی اطلاع دی تھی لیکن وہ زیادہ تشویش میں مبتلا نہیں تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ بعض اوقات جذباتی صورت حال میں پھنسا انسان اپنی کمٹمنٹ پوری کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتا اور بابر کے بارے میں اسے پورا یقین تھا کہ وہ ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہوچکا ہے۔

”کل ہمارا آف ہوگا۔ کل آپ روٹین سے ہٹ

کر کوئی اسپیشل ناشتا بنایئے گا۔'' ڈبل روٹی کے ایک پیس پر مارجرین اور دوسرے پر جیم لگانے کے بعد شاہ زیب نے انہیں ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر لقمہ لیا اور عمارہ سے فرمائش کی۔ وہ ساتویں کلاس میں پڑھتا تھا اور کھانے پینے میں ورائٹی کا شائق تھا اس لیے تینوں بچوں میں سے سب سے زیادہ فرمائشیں اسی کی طرف سے آتی تھیں۔

''اگر آپ لوگوں نے میری ہیلپ کی تو شیور!'' عمارہ کا جواب واضح تھا۔

''کوکنگ میں، میں آپ کو ہیلپ آؤٹ کروں گی لیکن ڈش واشنگ اور کلیننگ ان دونوں کی رسپانسبلیٹی ہوگی۔'' نہم کی طالبہ عنایا نے اسکول کی ان طویل چھٹیوں میں اس کے ساتھ رہ کر کچھ ہلکی پھلکی کوکنگ سیکھ لی تھی اس لیے اب خود کو شیف والی جگہ پر رکھا کرتی تھی اور اس کے خیال میں دوسرے چھوٹے موٹے کام اس کی شان کے خلاف تھے۔

''مگر میں تو چھوٹا ہوں نا، میں کیسے ڈش واشنگ اور کلیننگ کرسکتا ہوں۔'' پنجم جماعت میں زیر تعلیم شاہ زین گیارھویں سال میں لگ گیا تھا لیکن گھر کا چھوٹا بچہ ہونے کے ناتے خود کو ہمیشہ ذمے داریوں سے بچانے کی کوشش کرتا تھا۔ اب بھی اس نے چہرے پر بے حد بھولپن طاری کرلیا تھا۔

''اسے بڑا کرنے کی کوئی ترکیب نکالیں مما...... ورنہ لگتا ہے یہ کالج بھی ہمارے کندھوں پر بیٹھ کر جائے گا۔'' شاہ زیب نے کچھ ایسی بے چارگی سے یہ جملہ کہا کہ سب ہنس پڑے۔

خوشگوار ماحول میں ناشتا ختم کیا گیا۔ ناشتے کے بعد میز پر سے برتن سمیٹ کر کچن تک پہنچانے میں تینوں بچوں نے عمارہ کی مدد کی پھر اپنے گیجٹس لے کر کلاس کے لیے تیاری کرنے لگے۔ عنایا اور شاہ زیب لیپ ٹاپ کا استعمال کرتے تھے جبکہ شاہ زین فی الحال عمارہ کے موبائل سے کام چلا رہا تھا۔ عمارہ کو اپنے کام کے لیے لیپ ٹاپ کی ضرورت ہوتی تھی اس لیے اس نے شاہ زین کے لیے موبائل کا انتخاب خود کیا تھا۔

بچوں کی کلاسز شروع ہوگئیں تو وہ کچن سمیٹنے میں مصروف ہوگئی۔ کام کے دوران اس کا دھیان کئی بار بابر کی طرف گیا۔ وہ نہ تو ابھی تک واپس آیا تھا، نہ ہی اس نے رابطہ کیا تھا۔

''شاید شاہ زین کی کلاس کے خیال سے کال نہ کی ہو۔ کچھ دیر میں آتے ہی ہوں گے۔'' توجیہہ بھی اس نے خود ہی تلاش کرلی۔ بہت سے لوگوں کی طرح محکمے کی خراب کارکردگی کی وجہ سے انہوں نے بھی لینڈ لائن کا استعمال ترک کردیا تھا اور رابطے کے لیے کلی طور پر موبائل پر انحصار کرنے لگے تھے۔

''فارغ ہوجاؤں تو ستارہ سے اس ایپ کا پتا کروں گی جس کے ذریعے اس نے آن لائن گروسری کی تھی۔ تعریف کررہی تھی کہ سب چیزیں بہت اچھی کوالٹی کی ہیں۔ اچھا ہے میں بھی سپر اسٹور میں خوار ہونے سے بچ کر گھر بیٹھے ہی سب منگوالوں گی۔'' ہاتھوں کے ساتھ ساتھ اس کا دماغ بھی مسلسل کام کررہا تھا اور اس نے اپنے ایک بڑے مسئلے کا حل سوچ لیا تھا۔ کچن سمیٹ کر گوشت کو گلنے کے لیے کُکر میں چڑھا کر وہ آفس کے کام کے لیے لیپ ٹاپ لے کر بیٹھی تو خاصی مطمئن تھی، بس بابر کی طرف سے ہلکی سی پریشانی تھی۔ کام نے کچھ اس طرح الجھایا کہ یہ معاملہ بھی دماغ سے نکل گیا۔ دو گھنٹے بعد کچھ سانس لینے کی مہلت ملی تو خیال آیا۔ بابر ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ اس نے جا کر شاہ زین کو چیک کیا۔ ابھی ابھی اس کا ایک سیشن ختم ہوا تھا اور دوسرا شروع ہونے تک اسے اتنی مہلت مل سکتی تھی کہ وہ ایک عدد کال کرلے۔

اس نے بابر کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے موبائل پاورڈ آف ہونے کی اطلاع دی جارہی تھی۔ یہ بابر کی عادت کے خلاف تھا۔ اس کے ماتھے پر شکنیں پھیل گئیں اور بابر سے رابطے کے دوسرے طریقے پر غور کرنے لگی۔ وہ جہاں گیا تھا، وہاں کا نمبر اس کے موبائل میں بھی محفوظ تھا لیکن وہ یہ غور کررہی تھی کہ موجودہ حالات میں وہاں کال کرنا مناسب ہوگا بھی یا نہیں۔

''مما! موبائل دیں۔ میری نیکسٹ کلاس کا لنک آگیا ہوگا۔'' اس کے کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے شاہ زین نے شور مچانا شروع کردیا تو اسے موبائل اس کے حوالے کرنا پڑا۔

''ہوسکتا ہے موبائل کی چارجنگ ختم ہوگئی ہو۔ رات بھر موبائل استعمال کرتے رہے تھے اور صبح اتنا ہوش نہیں تھا کہ چارجنگ پر لگانے کا خیال آتا۔'' ایک بار پھر اس کے مصروف دماغ نے توجیہہ ڈھونڈ لی تھی۔ اسے آفس کا کام نمٹانے کے ساتھ ساتھ دوپہر کے لیے کھانا بھی تیار کرنا تھا۔

☆☆☆

صاف ستھرے لباس میں، شکل سے ہی تعلیم یافتہ اور خوشحال دکھائی دینے والا وہ شخص خود گاڑی چلاتا ہوا پولیس اسٹیشن پہنچا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے ایک سپاہی سے تھانہ انچارج سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ تھانے میں ایسی فرمائشیں آسانی سے پوری نہیں ہوتیں لیکن جانے سپاہی کا موڈ اچھا تھا، اس کی شخصیت زیادہ متاثر کن تھی یا پھر وہ خوش قسمت ثابت ہوا تھا کہ بنا کسی حیل وحجت کے اسے انچارج کے کمرے میں پہنچا دیا تھا۔

''جی فرمایئے، کیا خدمت کرسکتا ہوں میں آپ کی؟''

انچارج کو نان چھولوں اور ملائی والی چائے پر مشتمل اس ناشتے کی آمد تک فرصت تھی جسے ایک سپاہی علاقے کے مشہور حلوائی کی دکان سے لینے گیا ہوا تھا۔ اس لیے آنے والے کو اپنی نظرِ کرم سے نوازنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا تھا۔ ناشتا آچکا ہوتا تو البتہ صورتِ حال مختلف ہوتی۔

''مجھے آپ کو ایک جرم کی اطلاع دینی ہے۔'' آنے والے نے انچارج سے نظریں ملائے بغیر دونوں ہاتھوں کو آپس میں مسلتے ہوئے جواب دیا تو انچارج کو احساس ہوا کہ اس کی شخصیت کتنی ہی متاثر کن سہی، وہ اس وقت کچھ گھبرایا اور سٹپٹایا ہوا ہے۔

''کیسا جرم...... کہاں ہوا ہے اور کس نے کیا ہے؟''
اس نے اپنی نظریں اس کے چہرے پر گاڑ کر قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔

''قتل...... ایک شخص کا قتل ہوگیا ہے اور قاتل......''
وہ اپنی بات پوری نہیں کرسکا اور انچارج نے اس کے گلے میں گلٹی سی ابھرتی ڈوبتی دیکھی۔

''کس قتل کی بات کررہے ہو اور قاتل کہاں ہے؟''
صبح صبح ناشتے سے بھی پہلے کسی قتل کی اطلاع نے انچارج کو بدمزہ کردیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اگر مقتول کوئی اہم شخص ہوا تو اسے ناشتے پر فاتحہ پڑھ کر کام سے لگنا پڑے گا۔

''میں ایک شریف، عزت دار اور غیرت مند آدمی کے قتل کی بات کررہا ہوں جسے...... جسے......'' وہ ایک بار پھر بات پوری کیے بغیر رک گیا۔

''جسے کے آگے بھی بک دو حضورِ والا...... بے شک میں یہاں عوام کی خدمت کے لیے بیٹھا ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ خالی پیٹ بیٹھ کر یہ رام لیلا ہی سنتا رہوں۔'' انچارج کے ضبط کی انتہا ہو چکی تھی۔

''میں یہاں گرفتاری دینے آیا ہوں کیونکہ قاتل میں ہوں۔'' وہ جواب تک اٹک رہا تھا، کچھ ایسی روانی سے کہہ گیا کہ انچارج کو لگا اس کی سماعت نے اسے دھوکا دیا ہو۔

''کیا کہا تم نے...... کس نے قتل کیا ہے؟'' وہ سوال کرنے کے ساتھ ساتھ جانچنے کی بھی کوشش کررہا تھا کہ اس کے سامنے بیٹھے شخص کی دماغی حالت صحیح ہے یا نہیں۔

''میں نے کیا ہے قتل اور میں یہاں اعترافِ جرم کرتے ہوئے گرفتاری دینے آیا ہوں۔'' اس بار اس کا لہجہ مضبوط تھا لیکن انچارج کو اس کے اندر کچھ بہت عجیب محسوس ہورہا تھا۔ شاید اس کے چہرے پر وحشت تھی لیکن یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ عموماً قاتلوں کے چہرے وحشت زدہ ہی نظر آتے ہیں۔ غم، غصے یا انتقام کے بھڑکتے ہوئے جذبات آدمی سے قتل جیسا جرم تو کروا دیتے ہیں لیکن پھر اس کا بوجھ اٹھانا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔ وہ شخص بھی اسی مشکل میں گرفتار دکھائی دے رہا تھا لیکن اس کے سوا بھی کچھ اور تھا۔ شاید اس کی آنکھوں میں تیرتی نمی اور اس نمی میں گھلا احساسِ ندامت۔

''کیسے قتل کیا ہے اور کیوں کیا ہے؟ پوری تفصیل بتاؤ۔ آلۂ قتل کہاں چھپایا ہے؟'' انچارج کو یہی مناسب لگا کہ زیادہ سوچ میں پڑنے کے بجائے سیدھے سیدھے سوالات کرلیے جائیں۔ ناشتا پہنچ چکا تھا اور اسے امید تھی کہ قاتل گرفت میں ہونے کے باعث وہ موقعِ واردات پر پہنچنے سے قبل ناشتے کی مہلت نکال سکتا ہے۔

''آلۂ قتل میں اپنے ساتھ لے کر آیا ہوں۔'' اس نے نہایت سادگی سے کہتے ہوئے اپنی پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ انچارج اچھل پڑا۔ قاتل مہلک آلۂ قتل کے ساتھ اتنی دیر سے آرام سے اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور اسے خطرے کا احساس تک نہیں ہوسکا تھا۔ بے ساختہ ہی اس نے گھنٹی کا بٹن پوری قوت سے دبا دیا۔

''یہ رہا جی آلۂ قتل۔'' دو سپاہی گھنٹی کی تیز آواز پر لپک کر اندر آئے ہی تھے کہ اس نے جیب سے برآمد کردہ بقول خود اس کے آلۂ قتل میز پر رکھ دیا۔ انچارج نے ایک نظر میز پر رکھی جانے والی شے پر ڈالی اور پھر اسے تیز نظروں سے گھورتے ہوئے سرد لہجے میں بولا۔

''یہ کیا بکواس ہے؟ کیا تم یہاں کسی قسم کا مذاق کرنے آئے ہو؟''

''نہیں۔'' اس نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔
''میں نے قتل کیا ہے اور آلۂ قتل سمیت آپ کے سامنے اعترافِ جرم کرنے آیا ہوں۔'' وہ سو فیصد سنجیدہ تھا۔

''سر جی! مجھے تو یہ شخص دہشت گرد لگتا ہے۔ یہ شاید

کہیں بم بلاسٹ کر کے آیا ہے۔'' آنے والے سپاہیوں میں سے ایک نے آنکھیں پھیلا کر اپنا خیال پیش کیا تو اپنے ماتحت کی ذہانت پر اَش اَش کرتے انچارج کی آنکھیں بھی پھیل گئیں۔ بالآخر اس کے ہاتھ ایک ایسا کیس لگ گیا تھا جو اس کی برسوں سے رکی ہوئی ترقی کی راہ میں حائل ساری رکاوٹیں ہٹا سکتا تھا۔

☆☆☆

''السلام علیکم بھابی! کیسی ہیں آپ؟'' اپنی منزل پر پہنچ کر بابر نے اطلاعی گھنٹی بجائی تو دروازہ فاکہہ بھابی نے کھولا اور اسے سامنے دیکھ کر ان کے چہرے پر ایک ساتھ کئی رنگ دوڑ گئے۔

''وعلیکم السلام! تم اتنی صبح صبح...... میں اس وقت تمہاری آمد کی امید نہیں کر رہی تھی۔'' وہ اسے علی الصباح اپنے دروازے پر دیکھ کر اتنی کھسیائی ہوئی سی دکھائی دے رہی تھیں کہ اندر بلانا بھی بھول گئی تھیں۔

''میں نے تو رات بھی مشکل سے کاٹی ہے بھابی! اگر مصلحت کا تقاضا نہ ہوتا تو میں رات کو ہی یہاں پہنچ گیا ہوتا۔'' اس نے تکلیف دہ تاثر کے ساتھ ان کی بات کا جواب دیا پھر لہجے کو ذرا سا بشاش بناتے ہوئے بولا۔

''اچھا آپ گیٹ تو پورا کھولیے، میں گاڑی اندر لے کر آؤں گا۔'' اپنی بات کہہ کر وہ پلٹ کر گاڑی میں جا بیٹھا۔ فاکہہ نے گیٹ پورا کھول دیا۔ مین گیٹ اور رہائشی کمروں کے درمیان موجود مختصر سی جگہ اس کے گاڑی اندر لے جانے پر بھر سی گئی۔ پہلے جب بھی وہ یہاں آیا تھا، گاڑی باہر ہی کھڑی چھوڑ دیتا تھا البتہ اس جگہ سے گزر کر ڈرائنگ روم میں جاتے ہوئے ہمیشہ اسے ایک سپر پاور کی بائیک کھڑی دکھائی دیتی تھی لیکن آج وہ بائیک موجود نہیں تھی۔

''میں نے تمہیں کال کر تو دی تھی لیکن شفیق کی وجہ سے پریشان بھی ہوں۔ انہیں یقیناً یہ سب ناگوار گزرے گا۔'' وہ ڈکی کھول کر اس میں سے سامان نکال رہا تھا جب انہوں نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پھنسائے پریشان اور شرمسار سے لہجے میں اس سے کہا۔

''آپ نے بالکل ٹھیک کیا بھابی بلکہ میں شرمسار ہوں کہ مجھے پہلے ان حالات کی خبر کیوں نہیں ہو سکی۔ مجھ سے کوتاہی نہ ہوئی ہوتی تو آپ کو کال کرنے کی زحمت ہی نہ اٹھانا پڑتی۔'' بابر کے لہجے میں گہرا خلوص بول رہا تھا۔

''جیتے رہو۔ میں جانتی ہوں تمہارے خلوص کو اسی لیے اس مشکل وقت میں تمہیں زحمت دی ہے۔'' وہ ممنونیت

سے بولیں لیکن چہرے پر پریشانی ہنوز تھی۔

"مجھے خوشی ہے کہ آپ نے مجھے اس لائق سمجھا۔ اب یہ بتائیے کہ یہ سب کہاں رکھنا ہے تاکہ میں اس کام سے فارغ ہوکر شفیق بھائی سے بھی دو دو ہاتھ کرسکوں۔" اس نے دانستہ اپنا لہجہ بے پروا سا رکھا ہوا تھا تاکہ فاکہہ بھابی کو لگے کہ یہ بہت عام اور معمولی سی صورتِ حال ہے۔

"ارے نہیں، تم کہاں تکلیف کرو گے۔ میں خود ہی اٹھالوں گی یہ سب۔" انہیں اسے مزید زحمت دینا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"کوئی تکلیف نہیں ہورہی مجھے۔ بس آپ مجھے گائیڈ کردیں۔" اس نے اصرار کیا تو فاکہہ کو اس کی بات ماننا پڑی۔ وہ خود بھی ساتھ ساتھ کم وزن والا سامان اٹھاتی جارہی تھی۔ صبح کے سناٹے میں بغیر کسی مداخلت کے منٹوں میں یہ کام نمٹ گیا۔

"یہ کچھ کیش ہے بھابی! پلیز، یہ بھی رکھ لیں۔" سامان رکھا جاچکا تو اس نے جیب سے لفافہ نکال کر ان کی طرف بڑھایا۔

"بالکل نہیں۔ تم نے جتنا کردیا ہے وہ ہی بہت ہے۔ اس کی تو بالکل بھی ضرورت نہیں ہے۔" انہوں نے یوں ہاتھ پیچھے کیا جیسے لفافے میں کرنٹ دوڑ رہا ہو جو چھونے پر انہیں لگ جائے گا۔

"ضرورت کیوں نہیں ہے؟ کیا میں نہیں جانتا کہ اس تھوڑے سے راشن کے سوا بھی ایک گھر کے بہت سے بنیادی اخراجات ہوتے ہیں جن کے لیے رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ پلیز، آپ تکلف نہ کریں اور یہ رکھ لیں۔" اس نے ان کے لفافہ نہ تھامنے پر خود ہی کچن کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ فاکہہ کی آنکھوں میں بے اختیار نمی امڈ آئی اور ہونٹ کچھ کہنے کی کوشش میں لرز کر رہ گئے۔

"خود پر اتنا بوجھ نہ ڈالیں بھابی! میں جانتا ہوں کہ آپ لوگ خود ہمیشہ دینے والوں میں سے رہے ہیں اس لیے آپ کو یہ سب بہت مشکل لگ رہا ہے لیکن یقین جانیے یہ میرا آپ پر قطعی کوئی احسان نہیں ہے بلکہ اس قرض کی ادائیگی کا بہت معمولی سا حصہ ہے جو شفیق بھائی نے مجھ پر چڑھا رکھا ہے۔ جو کچھ انہوں نے بلکہ آپ نے بھی میرے لیے کیا، وہ تو میں کبھی چکا ہی نہیں سکتا۔" یہ سب کہتے ہوئے وہ خود آبدیدہ ہوگیا تھا اور اسے وہ وقت یاد آگیا تھا جب وہ محض ایک طالب علم تھا اور ایک چھوٹے سے علاقے سے اس بڑے سے شہر میں آکر اپنے بہتر مستقبل کے لیے ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ شفیق نے دور پرے کی رشتے داری کا لحاظ کرتے ہوئے اسے اپنے گھر میں رہائش اور کھانے پینے کی سہولت دے رکھی تھی۔

وہ اپنے دیگر اخراجات پورے کرنے کے لیے تعلیم کے ساتھ ساتھ پارٹ ٹائم ملازمت کرتا تھا۔ اسے انجینئر بننے کا بے حد شوق تھا اور اس شوق کی تکمیل کے لیے پڑھائی میں بے تحاشا محنت کرنے کے ساتھ ساتھ انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلے کے لیے رقم بھی جوڑتا رہتا تھا۔ داخلے کا وقت آنے سے پہلے اس نے اپنی ضرورت سے کچھ بڑھ کر ہی رقم جمع کرلی تھی اور بہت مطمئن اور خوش بڑی بہن کی شادی میں شرکت کے لیے گھر گیا تھا۔

شادی والے گھر میں گہما گہمی اور رونق کے ساتھ ساتھ امی، ابا اور آپا کے ماتھے پر بڑی فکرمندی کی لکیریں زیادہ دیر تک اس سے چھپی نہ رہ سکی تھیں۔ کریدنے پر معلوم ہوا کہ باقی سارے انتظامات تو کسی نہ کسی طرح ہوگئے ہیں لیکن فرنیچر کی رقم پوری نہیں ہے اور فرنیچر والے نے صاف کہہ دیا ہے کہ بقایا رقم کی ادائیگی کے بغیر وہ ہرگز بھی فرنیچر نہیں اٹھانے دے گا۔

مہندی والے روز یعنی بس ایک دن چھوڑ کر فرنیچر آپا کے سسرال پہنچنا ضروری تھا اور ادھر رقم ہی پوری نہیں ہورہی تھی۔ ابا نے فرنیچر والے کے منت ترلے کرکے بھی دیکھ لیے تھے اور جان پہچان والوں سے قرض لینے کی کوشش بھی لیکن کہیں سے کامیابی نہیں ملی تھی۔ ایسے میں ایک بھائی ہونے کا فرض ادا کرنے کی خاطر اس نے داخلے اور دیگر اخراجات کے لیے سنبھال کر رکھی رقم چپکے سے ابا کے حوالے کردی تھی اور آپا کو رخصت کرکے شہر واپس آگیا تھا جہاں اس کا شاندار رزلٹ اور پُرجوش سے شفیق بھائی اس کے منتظر تھے۔

انہوں نے اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ مل کر اس خوشی میں گھر پر اس کی چھوٹی سی دعوت بھی کی تھی اور ہر روز بہت اشتیاق سے پوچھتے تھے کہ اس نے داخلے کا فارم جمع کروادیا ہے یا نہیں۔ کئی دن آئیں بائیں شائیں کرنے کے بعد بالآخر ایک دن اسے بتانا پڑا تھا کہ داخلے کے لیے جمع کردہ رقم وہ کس مد میں خرچ کر بیٹھا ہے۔ اس وقت شفیق بھائی خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے تھے لیکن اگلے دن شام کو انہوں نے اسے اس کی مطلوبہ رقم فراہم کردی تھی۔ یوں وہ اپنے خواب کی تعبیر پانے کے لائق ہوسکا تھا اور بہت عرصے بعد کسی اتفاق کے نتیجے میں اسے علم ہوا تھا کہ رقم شفیق بھائی کے پاس بھی نہیں تھی لیکن دونوں میاں بیوی نے باہمی

مشاورت سے بری کا کچھ زیور بیچ کر اس کے داخلے کے لیے رقم کا انتظام کیا تھا۔

وہ انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلے کے بعد شفیق بھائی کا گھر چھوڑ کر کچھ دوستوں کے ساتھ یونیورسٹی کے قریب ہی ایک اپارٹمنٹ میں شفٹ ہوگیا تھا۔ اس سے ایک تو وقت اور کرائے کی بچت ہوجاتی تھی، دوسرے اسے آس پاس اچھی ٹیوشنز بھی مل گئی تھیں جن کی وجہ سے اسے اپنے اخراجات پورے کرنے میں بہت سہولت ہوگئی تھی۔

گھر چھوڑنے کے بعد بھی شفیق بھائی نے اس سے رابطہ توڑا نہیں تھا۔ وقتاً فوقتاً اس کی خبر گیری کرتے رہتے تھے۔ اکثر فاکہہ بھابی کے ہاتھ کی پکی کوئی چیز بھی ساتھ لے آتے تھے۔ وہ بھی کسی فرصت کے دن ان کے گھر چلا جاتا تھا اور اس دن تو وہاں اس کی باقاعدہ دعوت کا انتظام ہوتا تھا۔ شادی کے دس بارہ برس تک ان کی کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی لیکن دونوں قسمت پر صابر شاکر ہنستے مسکراتے جی رہے تھے۔ ایک ایسی زندگی جس میں دوسروں کا بہت سارا حصہ تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ بابر جانتا گیا تھا کہ ایک وہ ہی نہیں تھا جس پر شفیق بھائی کی نظر کرم تھی۔ وہ جہاں جس کو ضرورت مند پاتے تھے، ہاتھ تھام کر کھڑے ہونے کو سہارا دے دیتے تھے۔ خود مست الست آدمی تھی۔ بابر نے انہیں کتابوں کے سوا کچھ بھی ذوق شوق سے خریدتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ یہاں تک کہ انہوں نے ساری زندگی کرائے کے مکانات میں گزاری تھی۔ سواری کے نام پر ایک بائیک تھی جس پر دونوں میاں بیوی خوش باش گھومتے پھرتے تھے۔

اس خوش باش زندگی میں ان کی اکلوتی بیٹی رمشا اس وقت شامل ہوئی تھی جب بابر تعلیم سے فارغ ہوکر اچھی ملازمت کے حصول کے بعد عمارہ کے ساتھ نئی زندگی شروع کرنے جا رہا تھا۔ وہ وقت آنے تک اماں، ابا جنت مکانی ہو چکے تھے اور آپا اپنی سسرالی مصروفیات میں اتنی بری طرح گھری ہوئی تھیں کہ ملاقات کی نوبت مہینوں بعد آتی سو آتی۔ فون پر بھی کم کم ہی رابطہ ہوتا تھا۔ ایسے میں اس کے ذاتی رشتے داروں کے حوالے سے تو بس شفیق بھائی اور فاکہہ بھابی ہی رہ گئے تھے۔ ہاں، عمارہ کا خاندان اور حلقۂ احباب دونوں وسیع تھے۔

''بہت شکریہ بابر! اگر رمشا کا ساتھ نہ ہوتا تو میں جیسے تیسے ان حالات کو سہہ لیتی لیکن اس وقت اس کی وجہ سے مجبور ہوگئی تھی۔'' فاکہہ بھابی کی طرف سے اب بھی ممنونیت اور شرمندگی کا اظہار جاری تھا۔

''رمشا میری بھتیجی ہے اور مجھے حق ہے کہ ایک چچا کی حیثیت سے اس کے لیے جو چاہے کروں۔ اس لیے اب آپ مزید کچھ نہیں کہیں گی اور نہ ہی میں آپ کے شوہر نامدار کو کچھ کہنے کی اجازت دوں گا۔ کہاں ہیں وہ مجھے بتائیں تا کہ میں ان سے بھی دو دو ہاتھ کرلوں۔'' اس بار اس نے ذرا رعب کا مظاہرہ کیا۔

''وہ رات سے اسٹڈی میں ہیں۔ تم جا کر مل لو۔ میں بھی رمشا کو جگا کر ناشتا بناتی ہوں۔'' فاکہہ کے ہونٹوں پر بھی بالآخر مسکراہٹ آگئی۔

''میرے لیے صرف چائے بنائیے گا۔ ناشتا میں گھر جا کر عمارہ اور بچوں کے ساتھ کروں گا۔'' اس نے اسٹڈی کے طور پر استعمال ہونے والے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے انہیں جواب دیا۔

شفیق بھائی چاہے ساری زندگی کرائے کے مکانات میں رہے تھے لیکن ان کے ہر مکان میں ایک کمرے کو اسٹڈی کا درجہ ضرور حاصل ہوتا تھا۔ وہ تخلیق کار آدمی تھے اور اپنے کام کے لیے ایک الگ تھلگ کمرا ان کی ضرورت تھی۔ جب ان پر لکھنے کا موڈ طاری ہوتا تھا تو خود کو اس کمرے میں بند کرلیتے تھے اور اکثر پوری پوری رات کام کرتے رہتے تھے۔ گزری رات بھی شاید وہ اسی موڈ میں تھے جب ہی ابھی تک وہاں سے باہر نہیں نکلے تھے۔

''مے آئی کم ان سر؟'' اسے شفیق بھائی کی اسٹڈی میں جانے کے لیے کبھی بھی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی تھی چنانچہ دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر ہنسی کے انداز میں پوچھا اور ہینڈل گھما کر دروازہ کھول دیا۔

سامنے کے منظر نے اس کے دل کو دھچکا سا لگایا۔ چھت کو چھوتا بڑا سا دیوار گیر بک شیلف تقریباً خالی پڑا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ شفیق بھائی نے بہت شوق اور محنت سے یہ ساری کتابیں جمع کی تھیں جو ان کی بیروزگاری کی نذر ہو کر ایک ایک کر کے بک گئی تھیں۔ ہاں، شفیق بھائی ان بدقسمت لوگوں میں سے تھے جو کورونا کے ساتھ آنے والے بیروزگاری کے عذاب کی زد میں آگئے تھے۔ ایک ایسا شخص جو کرائے کے گھر میں رہتا تھا اور جس نے کبھی مال جوڑ کر رکھنے پر یقین نہیں کیا تھا، اس عذاب کو کیسے سہہ سکتا تھا۔ موٹر سائیکل سمیت گھر میں موجود چند ایک قیمتی چیزیں ایک ایک کر کے بکنے کے بعد ان کی عزیز کتابوں کی باری بھی آگئی تھی اور یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ ان کتابوں کو کوئی قدردان مل سکا تھا

یارڈی کے بھاؤ ہی بکی تھیں۔

کل رات فاکہہ بھابی نے اسے کال کر کے ان سب باتوں کی خبر دی تھی اور وہ صبح ہوتے ہی یہاں دوڑا آیا تھا۔ اسے افسوس تھا کہ بھابی نے اسے دیر سے اطلاع دی ورنہ وہ کم از کم ان کتابوں کو تو بچا ہی لیتا۔

"السلام علیکم!" افسردگی پر بشاشت کی تہ چڑھائے اس نے دروازے پر سے ہی زوردار سلام کیا اور قدم اندر رکھتے ہوئے گردن کو دائیں جانب موڑا۔ اسے معلوم تھا کہ شفیق بھائی کمرے کے اس حصے میں اپنی رائٹنگ ٹیبل پر جھکے کچھ لکھنے میں مصروف ہوں گے۔

وہ وہیں تھے...... لیکن منظر کچھ ایسا تھا کہ اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔

☆☆☆

"وبا بڑے بڑے عزت داروں کا بھرم کھا گئی ہے۔ لوگوں کے پندار ٹوٹ رہے ہیں۔ میں اس وقت شدید شاک کی کیفیت میں ہوں۔ کچھ دیر پہلے میرے پاس ایک ایسی ہستی کی بیوی کا مدد کے لیے فون آیا ہے جو بھلے دنوں میں خود کئی لوگوں کا سہارا تھے۔ جن کی سخاوت کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی مدد کی درخواست کر دے تو یہ نہیں دیکھتے تھے کہ مہینے کے آخری دنوں میں خود ان کے اپنے گھر کا خرچ کیسے چلے گا۔ جو شخص دوسروں کا مستقبل سنوارنے کے لیے اپنی بیوی کا زیور تک بیچ دے، اس سے زیادہ سخی کون ہوگا؟ آج اس ہستی کے حالات جان کر میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے اور بس نہیں چل رہا کہ کیسے اس رات کی سویر کو جلد کھینچ لاؤں۔"

یہ تھی وہ پوسٹ جو اس نے فاکہہ بھابی کا فون آنے کے بعد فیس بک پر لگائی تھی۔ اس پوسٹ پر کئی لوگوں نے سیڈ ری ایکٹ کرنے کے ساتھ ساتھ افسوس بھرے کمنٹس بھی کیے تھے۔ چھوٹے بڑے ان بہت سارے کمنٹس کے درمیان ایک کمنٹ اس کے کولیگ کا بھی تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

"یقیناً آپ جرنلسٹ شفیق انصاری کی بات کر رہے ہیں۔ آپ نے کافی پہلے ہم سے اپنی زندگی کی جو اسٹوری شیئر کی تھی، اس میں اس بات کا ذکر تھا کہ انجینئرنگ یونیورسٹی میں آپ کے داخلے کی فیس جمع کروانے کے لیے شفیق انصاری صاحب نے اپنی بیوی کا زیور بیچ ڈالا تھا۔ اتنے بہترین انسان کے یہ حالات پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔ اللہ ان کی مدد فرمائے اور ان کے تمام مسائل کو حل کرے، آمین۔"

اس طویل کمنٹ کے جواب میں بھی کئی کمنٹس کیے گئے تھے۔ کئی لوگوں کو بابر کی سوشل میڈیا پر لکھی خودنوشت یاد آ گئی تھی۔ مشوروں، نصیحت، اظہارِ افسوس اور دعاؤں کا تانتا سا بندھ گیا تھا۔ بابر نے شفیق بھائی کے گھر جلدی پہنچنے کے چکر میں فجر کی اذان سے پہلے ہی بستر چھوڑ دیا تھا۔ اس لیے دوبارہ فیس بک پر نہیں جا سکا تھا اور نہ ہی اس نے یہ سارے کمنٹس پڑھے تھے۔ پڑھ بھی لیتا تو شاید اسے اپنی غلطی کا احساس نہ ہو پاتا کیونکہ پچھلے چند سالوں میں وہ سوشل میڈیا کے استعمال اور اس پر اپنی نجی اور پیشہ ورانہ زندگی کے معاملات بیان کرنے کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ اس کے لیے ہر بات عام سی بات ہو کر رہ گئی تھی لیکن شفیق انصاری جیسے خوددار آدمی کے لیے یہ بات عام نہیں تھی۔ ان کی خودداری کا بھرم بیچ چوراہے پر پھوٹ گیا تھا اور جب ایک صحافی دوست نے فون کر کے شکوہ کیا تھا کہ......

"یار شفیق! بتاتے تو سہی کہ تم اتنے مشکل حالات سے گزر رہے ہو۔ زیادہ نہ سہی، ہم دوست مل کر تمہارے گھر راشن ہی ڈلوا دیتے۔"

تو وہ جو اپنا اینڈرائڈ فون بھی بھوک کی بھٹی میں جھونکنے کے بعد آج کل ایک سیکنڈ ہینڈ کی پیڈ والے موبائل سے کام چلا رہے تھے اور سوشل میڈیا سے کلی طور پر کٹے ہوئے تھے، اس بات کو سن کر اتنے شدید صدمے میں مبتلا ہوئے تھے کہ خوددار دل نے دھڑکنے سے انکار کر دیا تھا۔

بابر جس وقت ان سے ملنے پہنچا، وہ اپنی اسٹڈی ٹیبل پر سر رکھے آخری سفر پر روانہ ہو چکے تھے اور ان کے سامنے موجود رائٹنگ پیڈ پر ایک جملہ لکھا تھا۔

"بابر! تم نے مجھے مار ڈالا۔"

اس جملے کو پڑھنے کے بعد بابر کے پاس اعترافِ جرم کے سوا کیا چارہ رہ گیا تھا چنانچہ وہ شفیق انصاری کے قتل میں کلیدی کردار ادا کرنے والے اپنے موبائل سمیت تھانے پہنچ گیا تھا جہاں اس کیس کو ہینڈل کرنے والے پولیس افسر کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کس دفعہ کے تحت بابر پر فردِ جرم عائد کی جائے۔

بابر کی طرف سے آلۂ قتل کے طور پر پیش کیا جانے والا چند انچ کا موبائل کس طرح انسانوں اور ان کے پندار کو قتل کر رہا تھا، یہ سمجھنے کے باوجود اس کے پاس قانون کی ایسی کوئی شق نہیں تھی جس کے تحت ایف آئی آر کاٹی جا سکے۔

⌘⌘⌘
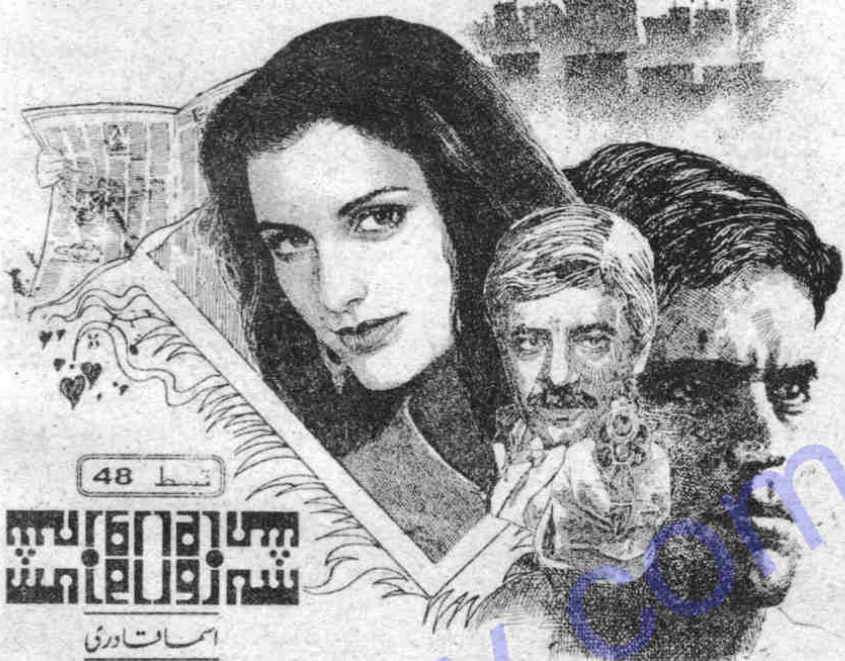
زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب وضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابل شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پرعزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جارہے تھے... اس کی زندگ جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا.. پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا..: اگرچہ تار عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ واردات قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان

گذشتہ اقساط کا خلاصہ
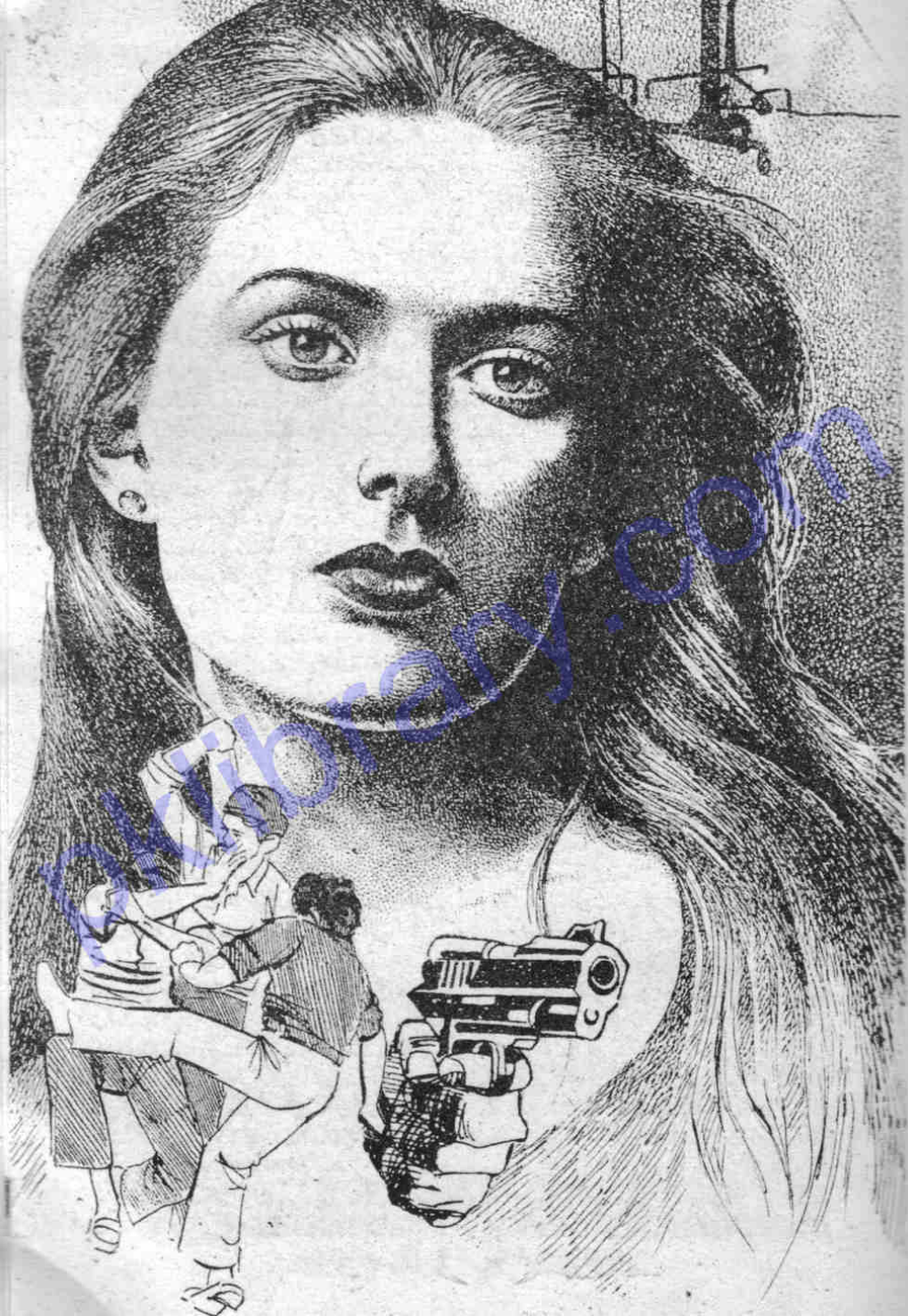
معاذ ایک ذہین لیکن متلون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آ رہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشریٰ نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشریٰ ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس ویران جگہ بھی وہ ایک زیرِ تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشریٰ کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقعے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک دن جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلگ ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بُری طرح زدوکوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے، جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کیمرے سے جب تصویریں نکلوائی جاتی ہیں تو ایک ایسی تصویر بشریٰ کی نظر میں آ جاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشریٰ تحقیق کر رہی تھی۔ بشریٰ کے اپنے والد جرنلسٹ ہوتے ہیں۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشریٰ کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی غنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشریٰ انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشریٰ کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات کے نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گردہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشریٰ بھی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے ہپناٹائز کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ لیفو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں بنتا۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرمد، باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم شاہ، باذل کی قید میں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ ادھر بشریٰ دبئی پہنچ جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے باربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ وہ ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یاتریوں سے بھری بس کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا تہ خانے کے تمام افراد کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ عالم شاہ، بجل اور سرمد انڈیا روانہ ہو جاتے ہیں۔ ائرپورٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ لٹیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرمد کو لے جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرمد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ بنگلے پر پہنچا دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بحفاظت نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ ایک مشن میں زخمی ہو جاتا ہے اور اسے ہندو سادھو اپنی کٹیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرمد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھر لیے جاتے ہیں اور "را" کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ بشریٰ باذل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرمد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے بجل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ علینہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ عیسیٰ

ملک سے باہر نکال دیتا ہے۔ علینہ پاکستان میں ثوبیہ سے رابطہ کرتی ہے جوان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ثوبیہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ وقاص، علینہ اور اس کے گھر والوں کو مار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوا نامی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھر والوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سسرال والے تجل کو بھگانے کی پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں ''را'' کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہوجاتا ہے لیکن عالم اور سرمد کو دیوا کے آدمی کسی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔ ادھر باذل ایک جگہ لالہ عیسیٰ کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کرلیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہوجاتا ہے۔ دیوا گینگ ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں فائرنگ کردیتے ہیں۔ پولیس دیوا کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیوا اور اس کے آدمیوں کو نکالنے کے عوض عالم کا پتا معلوم کرلیتا ہے۔ سونیا اور معاذ حیدرآباد نواب بدرالدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ وہ نواب صاحب کی حویلی میں عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کرکے انہیں رہا کرا لیتے ہیں۔ وہ لوگ نئے ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو وہاں معاذ سے ملنے جارو نامی شخص آتا ہے۔ اسے معاذ نے ''را'' کی قید سے نکالا ہوتا ہے۔ جارو اور معاذ، تجل سمیت اسپتال جاتے ہیں اور پہچان لیے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑجاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک بستی میں پناہ کے لیے گھس جاتے ہیں اور دو لوگوں کو یرغمال بنا کر ان کی جھونپڑی میں قیام کرتے ہیں۔ ادھر سونیا معاذ کی تلاش میں نکلتی ہے اور اسے بستی میں پہنچنے پر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جارو وغیرہ انوپ نامی شخص کے ساتھ اس کے مالک کے بنگلے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرتی ہوئی مذکورہ بنگلے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سرمد بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر لالہ، وقاص، علینہ و دیگر لوگ زندہ ہوتے ہیں۔ وقاص حلیہ بدل کر گلو کا باڈی گارڈ بنتا ہے۔ وہ معاذ کو تلاش کرنے کے لیے انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی گل خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا، معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم وہ جس بنگلے میں ہوتے ہیں وہ دشمن کا ہوتا ہے۔ دشمن سب کو بے ہوش کرکے کہیں لے جارہے ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آجاتا ہے۔ ان سب کو چینی بھکشو طبی امداد دیتے ہیں اور ان سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ تجل کی حالت تشویشناک ہوتی ہے اور اسے وہاں موجود ایک وید دیکھتا ہے۔ ادھر لالہ واپس اپنے لوگوں میں پہنچ کر ایکشن میں آجاتا ہے۔ باذل، معاذ وغیرہ کے ٹھکانے سے باخبر ہوجاتا ہے۔ باذل، معاذ کا پیچھا کرتا ہے اور چینیوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ معاذ چینیوں کے ساتھ مل کر دشمنوں کے خلاف کارروائی کرتا ہے۔ ادھر لالہ عیسیٰ، اعظم کو دشمن کی گرفت سے نکالنے کے لیے کارروائی کرواتا ہے اور موی اور نیلی، اعظم کو نکالنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ معاذ دشمنوں کے کیمپ پر حملہ کرکے وہاں قبضہ کرلیتا ہے۔ موی اور نیلی کی گاڑی پر حملہ ہوتا ہے تاہم مارا ماری کے بعد وہ صداقت شاہ کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ لالہ عیسیٰ صداقت شاہ کو حویلی پر ریڈ کا بتاتا ہے۔ صداقت شاہ اعظم کے محفوظ ٹھکانے کے لیے قربان شاہ کو فون کرتے ہیں۔ اعظم کو وہاں سے نکال لیا جاتا ہے اور دوسری جگہ منتقل کردیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ بیجنگ پہنچ جاتا ہے اور وہاں کے کرتا دھرتاؤں سے بات کرکے پاکستان پہنچنے کی اجازت چاہتا ہے۔ ادھر موی اور نیلی کو پولیس گھیر لیتی ہے اور فائرنگ میں موی مارا جاتا ہے۔ وہ اعظم کو لے جاتے ہیں اور نیلی زخمی حالت میں ان کے قبضے میں آجاتی ہے۔ معاذ اور وکی وغیرہ پاکستان پہنچ جاتے ہیں اور اعظم کی بازیابی کے لیے منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ موی کی تدفین ہوجاتی ہے۔ ادھر باذل، لالہ کی قید سے بھاگ جاتا ہے۔ معاذ، ڈی ایس پی ظہیر کے بنگلے پر دھاوا بولتا ہے اور ڈی ایس پی کو قابو کرنے کے بعد اس سے معلومات لیتا ہے۔ وہ لوگ ظہیر خان کو لے کر وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ باذل قید سے نکل کر مہناز کے پاس پہنچتا ہے اور اسے تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ نیلی قید میں موجود ظہیر کو ٹھکانے لگا دیتی ہے۔ بشریٰ قبرستان جاتی ہے۔ وہاں اس کی دوست ملتی ہے۔ بشریٰ اپنی دوست کے ساتھ جارہی ہوتی ہے کہ باذل کے آدمی اسے اغوا کرلیتے ہیں۔ ادھر معاذ سارے معاملوں کو جلد حل کرنے کے لیے دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے مگر اس کے خیرخواہ اسے میڈم ایکس کے شکنجے سے نکال لیتے ہیں اور اعظم کو بھی بازیاب کرلیتے ہیں۔ زن ہوا سے اپنے ساتھ لے جاتی ہے اور وہاں کرنل سکندر بخت سے ملاقات ہوتی ہے۔ معاذ انہیں دشمنوں کے خلاف کارروائی کرنے کا کہتا ہے۔ باذل، بشریٰ کو لے کر انڈر گراؤنڈ ہوجاتا ہے۔ ادھر وقاص باذل کا پتا چلانے کے لیے ایک کال گرل یمی کے گھر کارروائی کرکے باذل کے ٹھکانے پر پہنچ جاتا ہے۔ وہاں وکی کے ساتھی اور کوئی اور گروپ حملہ کردیتے ہیں۔ وکی زخمی ہوجاتا ہے۔ ادھر باذل، عرفان اللہ کو گولی مار دیتا ہے اور خود بھی شدید زخمی ہوجاتا ہے۔ باذل کے ساتھی اسے ایک اسپتال کے آگے چھوڑ دیتے ہیں۔ وہیں وکی اور بشریٰ بھی داخل ہوتے ہیں۔ معاذ باذل کو پہچان کر اسے بھی وہیں ایڈمٹ کرا دیتا ہے۔ عرفان اللہ جاں بحق ہوجاتا ہے۔ عرفان اللہ کی سیکریٹری صوفیہ کو خفیہ ادارے کے لوگ اٹھا لیتے ہیں لیکن صوفیہ وہاں اپنی جان دے دیتی ہے۔ صداقت شاہ اور ان کی اہلیہ تجل کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ عالم، نیلی اور اعظم بھی وہیں ہوتے ہیں۔ تجل اسپتال میں زیرِ علاج ہوتی ہے۔ باذل کو معذوری کی حالت میں ایک چوک پر پھینک دیا جاتا ہے۔ معاذ... وقاص وغیرہ کے ساتھ علینہ کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ وہاں سے اگلے مشن پر جانا ہوتا ہے۔ سونیا قانون کی قید سے بھاگ نکلتی ہے۔ تجل کی طبیعت بگڑ جاتی ہے۔ یو آن منگ، اینڈریو کے ذریعے تجل کے آپریشن کی تجویز دیتا ہے۔ عالم نہ چاہتے ہوئے بھی راضی ہوجاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

"تسلیمات!
مجھے نہیں معلوم کہ جب آپ کو یہ خط ملے گا تو میں اس دنیا میں موجود ہوں گی بھی یا نہیں۔ حقیقتاً مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ میں آپ کو یہ خط کیوں لکھ رہی ہوں اور بنا کسی تعلق یا رشتے کے آخر اس خط کی کیا گنجائش ہے؟ کہنے کو میں یہ بھی کہہ سکتی ہوں کہ میں نے یہ خط اپنے اس محسن کا شکریہ ادا کرنے کے لیے لکھا ہے جس نے اپنی جان کی بازی لگا کر میرے لختِ جگر کو مجھ تک پہنچایا ہے لیکن یہ کوئی واحد احسان تو نہیں ہے جو آپ نے مجھ پر کیا ہے۔ جب سے آپ میری زندگی میں آئے ہیں مسلسل احسانات ہی کرتے آرہے ہیں۔ ایسی بے غرضی اور بے لوثی میں نے خون کے رشتوں کے علاوہ آج تک کہیں نہیں پائی اور ظاہر ہے ان رشتوں میں تو قدرت کی طرف سے یہ چیز خمیر میں گوندھ دی جاتی ہے لیکن آپ نے کیوں کی مجھ پر اتنی مہربانیاں کہ میں آج اپنا بال بال آپ کے قرض میں جکڑا ہوا محسوس کرتی ہوں۔
شاید میں یہ سوال کر کے آپ کے ساتھ زیادتی کر رہی ہوں۔ نہیں، مجھے ایسا کوئی سوال کر کے آپ کے بے لوث جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچانی چاہیے۔ میں ایک عورت ہوں، وہ بھی ایسی عورت جو دو مردوں کے ساتھ نکاح کے تجربے سے گزر چکی ہے۔ عورت تو خود پر پڑنے والی نظر کے معاملے میں ویسے ہی بہت حساس ہوتی ہے اور اگر مجھ جیسی تجربہ کار ہو تو اس کے لیے پرکھ مشکل نہیں رہتی کہ کس کی نظر میں اس کے لیے کیا ہے؟ اس لیے میں یہ نہیں کہوں گی کہ مجھے آپ کی نظروں کی زبان سمجھ نہیں آتی۔ ہاں یہ ضرور کہوں گی کہ آپ مجھ سے بہت زیادہ اچھی لڑکی ڈیزرو کرتے ہیں۔ کوئی ایسی لڑکی جو خود اور اس کے جذبات ان چھوئے ہوں۔ جس کی زندگی میں آپ کا مقام سب سے اوپر ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جو زندگی کے سفر میں آپ کے شانہ بشانہ چل سکے۔ میں تو وہ چراغ ہوں جس کی بجھتی ہوئی لو کو کسی طرح بچا بھی لیا گیا تو باقی کی ساری زندگی بس اس وجود کو قائم رکھنے میں ہی گزر جائے گی۔ میری ہستی اب کسی کی زندگی میں روشنی نہیں بکھیر سکتی اس لیے میری آپ سے درخواست ہے کہ ایک سراب کے پیچھے بھاگ کر اپنی زندگی کے قیمتی ماہ و سال ہرگز بھی ضائع نہ کیجیے گا۔ کچھ رشتے اور تعلقات اگر بے نام ہی رہیں تو ان کی خوبصورتی سلامت رہتی ہے۔ اس خوبصورتی کو سلامت رکھیں اور خود آگے بڑھ جائیں۔ میں اگر زندہ رہی تو آپ کو ہمیشہ دعاؤں میں یاد رکھوں گی، نہ رہی تو آپ میرے لیے دعائے مغفرت کر دیجیے گا اور اس قرض کو بھی معاف کر دیجیے گا جسے میں چاہ کر بھی چکا نہیں سکوں گی۔"

خط جس طرح بغیر کسی تخاطب کے شروع ہوا تھا اسی طرح لکھنے والی کے نام کے بغیر ہی ختم ہو گیا تھا۔ اسے نام کی ضرورت بھی نہیں تھی کہ اس کے لیے یہی کافی تھا کہ اس سے کلام کیا گیا ہے۔ گو اس کلام میں مستقبل کے لیے کوئی امید یا خوشخبری نہیں تھی لیکن یہ بھی کیا کم تھا کہ دوسری طرف سے اس کے جذبات کو سمجھنے کا اعتراف کر لیا گیا تھا۔ وصل تو ویسے بھی ایک خواب تھا کہ وہ جس راہ کا راہی تھا، اس راہ پر چلنے والوں کو پلٹنے کا راستہ نہیں ملتا۔ ہاں، زادِ راہ مل گیا تھا تو امید تھی کہ سفر کچھ آسان ہو جائے گا۔

☆☆☆

"یہاں کیوں آئی ہو؟" اس سے مخاطب شخص کی رنگت پختہ اور نقوش بھدے تھے لیکن چہرے پر ایسا اعتماد تھا جو ایک بار سامنے والے کو مرعوب ضرور کرتا تھا۔ وہ اپنے جٹاؤں کی شکل میں موجود لمبے اور گندے بالوں میں بے نیازی سے اپنا بھاری سیاہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اس سے یوں مخاطب تھا جیسے کہیں کا حکمران ہو اور حالت یہ تھی کہ اس کے بوسیدہ اور میلے لباس سے اٹھنے والی مچھلی کی بساند اگلی بندی کے دماغ میں گھستی جا رہی تھی۔
"مجھے یہاں سے نکلنا ہے اور اس کے لیے میں اپنے سورسز اس لیے استعمال نہیں کر سکتی کہ ان پر میرے دشمنوں کی نگاہیں پہرا دے رہی ہیں۔" وہ مقابل کے رعب داب کا اپنی بے نیازی سے توڑ کرنا جانتی تھی۔ اسے جامی نامی اس مچھیرے کی حقیقت خوب پتا تھی۔ بظاہر وہ ایک اسمگلر تھا جو اِدھر کا مال اُدھر اور اُدھر کا اِدھر کرنے میں خوب مہارت رکھتا تھا۔ دونوں طرف اس کے رابطے اور انتظامات اتنے پکے ہوتے تھے کہ آج تک ایک بار بھی نہیں پکڑا گیا تھا۔ وہ اسمگلر سے بڑھ کر بھی کچھ تھا۔ یہ بات گنتی کے چند لوگ ہی جانتے تھے اور ان چند لوگوں میں سے ایک سونیا بھی تھی۔
"نکال دیں گے، وہ کوئی بڑی بات نہیں لیکن بھارت ہی کیوں جانا چاہتی ہو؟ کہیں اور بھی تو نکل سکتی ہو؟" وہ اپنی سرخ آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑے گویا اس کے اندر اتر جانا چاہتا تھا۔
"کہیں اور نہیں۔ میں بہت لمبے کرائسس سے گزر کر یہاں تک پہنچی ہوں اور مزید کسی مسئلے میں پھنسے بغیر آسان چینل سے اپنے لوگوں تک پہنچنا چاہتی ہوں اس لیے

میرے لیے بھارت ہی سب سے زیادہ سوٹ ایبل ہے۔''
جامی کی نظروں سے گھبرائے بغیر وہ اپنے مطالبے پر قائم رہی۔ کل جب وہ یہاں پہنچی تھی اور جامی کے آدمیوں کو کچھ ایسے حوالے دیے تھے جن سے اس کا درست ہونا ثابت ہوتا تھا تو اسے یہاں پناہ تو دے دی گئی تھی لیکن جامی نے اس سے ملاقات نہیں کی تھی۔ اسے یہی بتایا گیا تھا کہ جامی فی الحال موجود نہیں ہے لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ اس کے متعلق ساری چھان پھٹک کرنے کے بعد ہی اس سے ملے گا۔ یہ اور بات کہ ظاہر نہ کرے۔

''کچھ بتاؤ کہ کن حالات سے گزر کر آرہی ہو تاکہ میرے پاس بھی اوپر والوں کو دینے کے لیے کوئی کارن ہو۔''
یہ تجسس مصنوعی تھا لیکن سونیا نے اس کا اظہار نہ ہونے دیا اور سنجیدگی سے اپنے معاذ کے ساتھ برف زار میں پہنچنے سے لے کر چائنیز کے ہاتھوں گرفتاری کا احوال مختصراً سنانے لگی۔

''تمہیں پاکستان کے حوالے کر کے چینیوں نے ایک بار پھر ان سے اپنے بھائی چارے کا پرچار کیا ہے۔'' جامی نے ہنکارا بھرا۔

''وہ ایسا کرتے ہی رہتے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ پاکستان کو تمہارے دیش پر فوقیت دی ہے۔'' سونیا نے مزے سے اس کے کمزور پہلو پر ضرب لگائی جو مؤثر ثابت ہوئی اور جامی کی سیاہ رنگت غصے اور توہین سے مزید سیاہ پڑ گئی۔

''ہمیں ان کی ضرورت ہے بھی نہیں۔ ہمارے دوست ان سے زیادہ طاقتور اور پہنچ والے ہیں۔''

''بے شک۔'' اب وہ تھپڑ مار کر سہلانے کا کام کر رہی تھی۔

''مجھے کل کے ہنگامے کا پتا چلا ہے۔ تم نے ان کی قید سے بھاگ کر بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ سالے اپنے زخموں کو سہلاتے پھر رہے ہیں اور بلبلاہٹ نکالنے کے لیے اس سپاہی شفیع محمد کو گرفتار کر لیا ہے جو تمہارے سیل کے باہر پہرا دیتا تھا۔'' جامی کے منہ سے نکلنے والے جملوں نے ثابت کر دیا کہ وہ اس کے فرار سے متعلق تمام باتوں کی تصدیق کرنے کے بعد ہی اس کے سامنے آکر بیٹھا ہے۔

''حالانکہ اصل سزا کے حقدار وہ ہیں جنہوں نے اس احمق کو ڈیوٹی سونپی تھی۔ شاید انہوں نے سونیا خان کے بارے میں ٹھیک سے معلومات نہیں کی تھیں جو اس کی راہ روکنے کے لیے اس سیل کو کافی سمجھ لیا تھا جہاں ان کے خیال میں کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔''

''حسین عورت اپنی جگہ خود کتنا بڑا ہتھیار ہے، یہ بات سب سے پہلے سمجھنے کی ہوتی ہے۔'' جامی نے اپنے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس پر ایک حریص سی نگاہ ڈالی۔

''تم کب تک مجھے یہاں سے نکالنے کا انتظام کر سکتے ہو؟'' سونیا نے اس کی بات اور نظروں دونوں سے ہی پہلو تہی کی اور قدرے خشک لہجے میں پوچھا۔

''تھوڑا ویٹ کرنا پڑے گا۔ اتنے احمق وہ بھی نہیں ہیں۔ تمہیں، تمہاری طرف نہ پا کر وہ ادھر کا ہی رخ کریں گے۔''

''تو ان کے یہاں کا رخ کرنے سے پہلے ہی مجھے یہاں سے نکال دو نا۔''

''پاسیبل نہیں ہے۔ دو دن پہلے ہی ڈیلیوری کی ہے۔ اتنی جلدی دوبارہ پھیرا نہیں لگاتے ہیں۔ خرچہ بڑھ جاتا ہے اور رسک بھی۔'' جامی کا لہجہ یکدم خشک ہو گیا۔ اس کے پاس صبر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ تل ابیب تک کا سفر بہرحال یہیں سے شروع ہونا تھا۔ تل ابیب...... جس کی فضاؤں سے نکلے ایک عرصہ گزر گیا تھا، اسے پکار رہا تھا۔

☆☆☆

''عمار......!'' جھرنے کے شفاف پانی پر نظر لگائے وہ کہیں بہت دور نکلا ہوا تھا کہ ایک نسوانی آواز اسے ماحول میں واپس کھینچ لائی۔ اس نے گردن گھما کر پکارنے والی کی سمت دیکھا۔ اس کے سامنے پری وش کھڑی مسکرا رہی تھی۔

''میں گھر پر گئی تھی لیکن چچی جان نے بتایا کہ تم صبح صبح ہی گھر سے نکل چکے ہو۔ میں سمجھ گئی کہ تم یہاں ملو گے کیونکہ ابھی بازار کھلنے کا وقت تو ہوا نہیں ہے کہ تم دکان پر جا چکے ہوتے۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بولتی ہوئی اس سے کچھ فاصلے پر پڑے ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گئی۔

''ایسا کیا کام پڑ گیا تھا کہ تمہیں صبح صبح میری تلاش میں نکلنا پڑا؟'' اس نے رخ موڑ کر دوبارہ سے بہتے پانی پر نظریں جما دیں اور قدرے خشک لہجے میں پری وش سے دریافت کیا۔ اس لڑکی کی آنکھوں کی چمک اور شوخ مسکراہٹ میں کچھ ایسا تھا جو اول دن سے اسے اس سے محتاط رہنے پر اکساتا تھا لیکن اس کے لیے اس کا گریز جیسے کوئی معنی ہی نہیں رکھتا تھا اور ہر بار اس سے یوں بے تکلفی سے پیش آتی تھی جیسے وہ اس کا ہم جولی ہو۔ بات بھی شاید کچھ ایسی ہی تھی۔ اس نے آغا گل اور زرمینہ بی بی سے جتنے قصے سنے تھے، ان سے یہ بات واضح تھی کہ بچپن ہی سے دونوں بہنوں کا ان کے گھر بہت زیادہ آنا جانا تھا۔ گل وش کم عمری میں شادی ہو کر دور چلی گئی تھی تب بھی اس کی آمد و رفت کا سلسلہ

جاری رہا تھا بلکہ مزید بڑھ گیا تھا اور وہ اپنی تنہائی کو عمار جیسے شریف بچے سے بانٹنے کی کوشش کرتی تھی۔ گل وش اگر عمر کے تفاوت کی وجہ سے اپنی لاڈلی بہن کو بہت رعایت دیتی تھی تو عمار اپنی سادہ فطرت کی وجہ سے اکثر اس کی بے ایمانیوں اور ہٹ دھرمیوں کو خاموشی سے سہہ جاتا تھا۔

''میں تم لوگوں کو رات کے کھانے کی دعوت دینے آئی تھی۔ تم گھر پر نہیں تھے تو یہاں چلی آئی کہ کہیں ایسا نہ ہو تم بے خبری میں کام سے واپسی میں دیر کر دو اور ہم تمہاری راہ دیکھتے رہ جائیں۔'' اس پر اس کی بے رخی کا کوئی اثر نہیں تھا۔

''کیسی دعوت؟'' اتنی تفصیل کے جواب میں وہاں محض دو لفظی سوال تھا۔

''تمہارے آنے کی خوشی میں دعوت رکھی ہے بے بے نے۔ احمد بھائی بھی آنے والے ہیں گل وش کو لینے کے لیے تو بس سب ایک ساتھ مل بیٹھ کر کھانا کھالیں گے۔'' اس نے دعوت کا سبب بتایا پھر بچوں کی طرح چہکتی ہوئی بولی۔

''تمہیں پتا ہے بے بے کھانے میں کیا کیا بنا رہی ہیں؟''

''مجھے بھلا کیسے پتا ہو سکتا ہے۔'' جواباً اس کے لہجے میں بیزاری تھی۔

''سب تمہاری پسند کے کھانے بنیں گے پگلے۔ پلاؤ، راجما، دم آلو اور گشتابہ۔ گشتابہ تو تمہیں بہت ہی پسند تھا۔ مجھے یاد ہے جب بھی کبھی بے بے گشتابہ بناتی تھیں تو تمہارا حصہ ضرور نکال کر رکھتی تھیں۔'' وہ اسے اس ماضی کا حوالہ دے رہی تھی جس کا کوئی عکس اس کی یادداشت میں موجود نہیں تھا۔ ہاں اسلام آباد کے ایک ہوٹل میں کھایا ہوا گشتابہ ضرور اسے یاد آ گیا تھا۔ وہ کوفتے نما ایک ڈش تھی جس کی گریوی بہت لذیذ اور منفرد ذائقے کی حامل تھی۔ اس نے سنا تھا کہ گریوی تیار کرنے کے لیے دودھ اور کھوئے کے ساتھ خاص کشمیری مسالاجات استعمال کیے جاتے تھے جن کی خوشبو ہی اشتہا بڑھانے کے لیے کافی ہوتی تھی۔

''ویسے پسند تو تمہیں دم آلو بھی بہت تھے اور تم اکثر چچی جان سے فرمائش کر کے بنوایا کرتے تھے۔ وہ اور بات کہ تم سے زیادہ میں کھا جاتی تھی۔'' اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ خود ہی ایک کے بعد دوسری بات نکالتی شوخی سے ہنستی جا رہی تھی۔ ہنسنے سے اس کی رنگت مزید گلابی ہو گئی تھی۔

''یہ ساری چھ سال پرانی باتیں ہیں۔ اس وقت تم مشکل سے بارہ تیرہ سال کی ہو گی لیکن یاد سب کچھ ایسے رکھا ہوا ہے جیسے کوئی نانی اماں ہو۔''

''ہاں تو یادداشت تمہاری گئی ہے، کوئی میری تھوڑی۔''

اس نے ترنت جواب دیا اور روانی میں مزید بولی۔

''یوں بھی بارہ تیرہ برس کوئی اتنی چھوٹی عمر بھی نہیں ہوتی۔ گل وش کی تو پندرہ برس کی عمر میں شادی بھی ہو گئی تھی۔''

''تو تمہاری شادی کیوں نہیں کی تمہارے گھر والوں نے؟'' وہ بے ساختہ ٹوک بیٹھا۔

''میں راضی ہوتی تو کر دیتے۔ اب بھی برادری کے کئی لوگ بے بے اور ابا کو طعنے دیتے ہیں کہ شادی کی عمر ہونے کے باوجود لڑکی کو ابھی تک گھر بٹھا کر رکھا ہوا ہے۔ وہ دونوں شاید لوگوں کی باتوں سے گھبرا جاتے لیکن آغا جان نے انہیں سمجھایا کہ پری وش کو پڑھنے دو۔ ہمیں اپنی نسلوں کو سنوارنے کے لیے پڑھی لکھی عورتوں اور خصوصاً لیڈی ڈاکٹرز کی بہت ضرورت ہے۔ دیکھا نہیں تھا میرے بے وقت چھٹی لے کر آنے پر کتنے ناراض ہو رہے تھے۔''

''لیکن تم پر ان کی ناراضی کا کوئی اثر ہوا تو نہیں۔ ابھی تک یہیں بیٹھی ہوئی چھٹیوں کے مزے لے رہی ہو۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہنگاموں کی وجہ سے کالج بند کر دیا گیا تھا اس لیے میں رک گئی ورنہ آغا جان کی بات تو میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔'' اس بار وہ قدرے بُرا مان گئی تھی۔

''تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں کل صبح واپس جا رہی ہوں۔''

''یہ تو اچھی خبر ہے۔ واپس جا کر خوب دل لگا کر پڑھنا۔ یہ نہ ہو کہ چند دن بعد پھر کسی بہانے سے چھٹی لے کر آ جاؤ۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ تمہیں لگتا ہے میں جھوٹے بہانے بناتی ہوں۔'' عمار کی نصیحت اسے غصہ دلا گئی۔

''بناتی ہی ہو گی جب ہی تو آغا جان تمہارے چھٹی لے کر آنے پر خفا ہو رہے تھے۔'' اس پر پری وش کے غصے کا کوئی اثر نہیں ہوا اور بے نیازی کے اظہار کے لیے پاس پڑا ایک چھوٹا سا چکنا پتھر گھما کر پانی میں پھینکا۔

''ایک تو میں تمہارے آنے کا سن کر خاص طور پر تم سے ملنے آئی تھی اور تم ہی مجھے طعنے دینے لگے۔ ٹھیک ہے، اب کل جاؤں گی تو تم سب کے ناک رگڑنے تک دوبارہ ملنے نہیں آؤں گی۔ سمجھ کیا رکھا ہے پری وش کو۔ میں کوئی نالائق اور فالتو لڑکی ہوں جو بہانے سے پڑھائی سے جان چھڑا کر بھاگ کر گھر آ جاتی ہے۔'' غصے سے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا لیکن اس نے جواباً کسی معذرت کا اظہار نہیں کیا۔ وہ اٹھی اور پیر پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد وہ بھی کچھ اداس اور پژمردگی کی کیفیات میں گھرا وہاں

سے اٹھ کر چل پڑا۔ پری وش کا دل دکھا کر اسے اچھا نہیں لگا تھا لیکن یہ ضروری بھی تھا۔ ابھی کل ہی تو یہ بات اس کے علم میں آئی تھی کہ ماضی میں عمار اور پری وش کی نسبت طے کیے جانے پر غور ہوتا رہا تھا۔ نسبت طے پاتی اس سے پہلے ہی عمار غائب ہو گیا اور اب اتنے برسوں بعد وہ واپس نہیں آیا تھا تو برادری میں اس معاملے میں چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں۔ کچھ لوگوں نے تو زرینہ بی بی سے براہ راست پوچھ بھی لیا تھا کہ دونوں کی شادی کے متعلق ان کا کیا ارادہ ہے۔ زرینہ بی بی نے سوال کرنے والوں کو فی الحال یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ ابھی پری وش پڑھ رہی ہے اور عمار کو بھی معاشی طور پر سیٹ ہونے کے لیے وقت چاہیے۔

''سوری پری وش! لیکن میرے پاس تمہارا دل دکھانے کے سوا کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں ہے۔ میں اس عجیب و غریب قسمت کا مالک شخص ہوں جس کی راہ میں محبت قدم قدم پر بانہیں پھیلائے کھڑی ہوتی ہے لیکن میں خود اس سے دامن جھٹک کر گزر جانے پر مجبور ہوں۔'' وہ دل ہی دل میں پری وش سے معذرت کرتا ہوا کب دکان پر پہنچ گیا، خود اسے بھی پتا نہیں چلا۔

''گڈ مارننگ جنٹل مین! کن خیالوں میں ڈوبے چلے آ رہے ہو؟'' کاؤنٹر پر بیٹھے انکل بنجامن کی آواز نے اسے چونکایا۔

''گڈ مارننگ انکل! میں بس یونہی کچھ سوچ رہا تھا۔'' وہ انہیں اپنی سوچوں کے بارے میں کیا بتاتا۔

''دماغ پر زیادہ زور مت دیا کرو، اس سے اسٹریس بڑھتا ہے۔ تم جیسے ہو، ویسے ٹھیک ہو۔ گاڈ کی مرضی ہوئی تو تمہاری میموری بھی کسی دن خود بخود واپس آ جائے گی۔''

''جی انکل!'' وہ ان کی محبت اور خلوص کے جواب میں اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔ چند دن کے اندر ہی وہ اسے بہت پسند کرنے لگے تھے۔ بقول ان کے، اتنے عرصے سے کاروبار کر رہے تھے لیکن اس جیسا محنتی اور ذہین ورکر پہلی بار ملا تھا۔ وہ کشمیری مسالا جات اور خشک میوؤں کے تاجر تھے۔ بازار میں موجود ان کی دکان ایک چھوٹا سیٹ اپ تھا۔ ان کی اصل آمدنی ان اشیا کی برآمدات سے ہوتی تھی۔ وہ اس سارے سلسلے کے حساب کتاب کو سنبھال رہا تھا اور چند دنوں میں ہی پچھلا ریکارڈ بھی اچھا خاصا مین ٹین کر دیا تھا۔ انکل بنجامن اس کی کارکردگی سے بہت خوش تھے اور برملا اس کی تعریف کرتے تھے۔

''میں اپنے لیے ناشتا منگوا رہا ہوں، تمہارے لیے بھی منگوا لوں؟''

''میں ناشتا کر کے آیا ہوں انکل! بی بی مجھے ناشتا کیے بغیر گھر سے نکلنے دے سکتی تھیں؟'' انہیں جواب دیتے ہوئے وہ ہنس پڑا۔

''وہ بیٹے کی محبت میں ترسی ہوئی ماں ہے ینگ بوائے! ہمارے مشرق کی ماؤں کے پاس اپنی محبت کے اظہار کا سب سے بڑا ذریعہ یہی ہے کہ اولاد کو مزے مزے کے کھانوں سے آسودہ کرتی رہے۔''

''جی، یہ تو ہے۔'' انکل بنجامن سے اتفاق کرتے ہوئے اس کے ذہن پر کئی یادوں نے دستک دی۔ وہ دوڑ دوڑ کر کام کرتی، ہر بچے کے لیے اس کی پسند کے مطابق صاف ستھرا صحت بخش کھانا تیار کرنے والی ماں بہت دور چلی گئی تھی لیکن یادداشت کے خانے میں اس کے پکائے کھانوں کی خوشبو آج بھی تازہ تھی۔

''تم اپنا کام شروع کرو، میں تمہارے لیے چائے بھجواتا ہوں۔'' انہوں نے نرمی سے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا تو وہ اپنی مخصوص کرسی پر کمپیوٹر کے سامنے جا بیٹھا۔ دکان کے دیگر ملازمین بھی اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ آہستہ آہستہ وہاں گاہکوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ انکل بنجامن میٹھے لہجے والے بہت بااخلاق شخص تھے۔ ان کے لیے کوئی گاہک چھوٹا بڑا نہیں تھا۔ لاکھوں کی ڈیل کرنے والے سے لے کر چند سو کی چیز خریدنے والے تک ہر شخص کو ان سے ایسی عزت ملتی تھی کہ جو ایک بار ان سے رابطہ کر لیتا تھا پھر کہیں اور نہیں جاتا تھا۔

دوپہر کے کھانے تک وہ بلا تعطل کام کرتا رہا۔ ٹھیک دو بجے دکان کے باہر ''closed'' کی تختی لگا کر شٹر گرا دیے گئے۔ انکل بنجامن کا اصول تھا کہ کھانے کے وقفے میں کوئی ڈیلنگ نہیں کرنی۔ ان کا کہنا تھا کہ آدمی روٹی کے لیے تو ساری بھاگ دوڑ کرتا ہے تو کم از کم اسے وہ روٹی تو سکون سے کھانے کے لیے ملے۔ دوپہر کا کھانا پورے اسٹاف کے لیے ان کی طرف سے ہوتا تھا اور وہ سب کے ساتھ مل کر خود بھی وہی کھانا کھاتے تھے۔ آج بھی اسی معمول کو دہرایا گیا اور پھر حسب معمول قہوے کے دور کے ساتھ ہی دوبارہ کام شروع ہو گیا۔ وہ خود بھی دوبارہ کمپیوٹر کے سامنے جا بیٹھا۔ موجودہ حساب کتاب دیکھنے میں کوئی مشکل نہیں تھی لیکن پرانا حساب مین ٹین کرنے میں اسے مشکل کا سامنا تھا۔ زیادہ تر ریکارڈ رجسٹروں پر ہاتھ سے لکھا ہوا تھا اور خاصا گنجلک تھا اس لیے کبھی کبھی اسے انکل بنجامن سے مدد لینا پڑتی تھی۔ اس وقت بھی اسے ضرورت پیش آئی

تو رجسٹر اٹھا کر کاؤنٹر پر پہنچ گیا۔ کسی پرانے اکاؤنٹ کا لکھا وہ حساب خاصا پیچیدہ تھا۔ انکل بنجامن بھی کچھ دیر کے لیے غور وفکر میں پڑ گئے۔ ان کی طرف سے جواب کا منتظر وہ اِدھر اُدھر نظریں دوڑا رہا تھا کہ دکان کی طرف آنے والے راستے پر آغا گل کو آتے دیکھا۔ وہ اپنی سفید چھڑی کے سہارے خراماں خراماں چلے آرہے تھے۔

''آغا جان......!'' اس نے ان کے سیڑھیاں چڑھ کر دکان تک آنے سے قبل خود نیچے اتر کر انہیں سہارا دیا۔

''میں کرلیتا ہوں یہ سب بیٹے! تم کیوں میری عادت بگاڑتے ہو؟'' انہوں نے اسے ٹوکا۔

''مجھے آپ کی خدمت کر کے خوشی ملتی ہے آغا جان!'' اس نے ان کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔

''لیکن مجھے اس سہارے کی عادت پڑ گئی تو جینا زیادہ مشکل ہو جائے گا۔'' ان کی بات اس کے دل پر لگی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔

''ویلکم، ویلکم! مائی ڈیئر فرینڈ ویلکم! یہ عمار کے قدموں کی برکت ہے کہ اب مجھے اکثر تمہارا چہرہ دکھائی دینے لگا ہے۔'' بنجامن نے بھی آغا گل کو دیکھ لیا تھا اور بلند آواز میں گرمجوشی سے ان کا استقبال کررہا تھا۔

''جوان بیٹے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوجائیں تو بوڑھا باپ ایک بار پھر خود کو جوان محسوس کرنے لگتا ہے۔ میں بھی آج کل ساری کمزوری اور بڑھاپے کو بھولا ہوا ہوں۔'' آغا گل اسے وہیں کھڑا چھوڑ کر آگے بڑھ گئے تھے اور بنجامن سے مخاطب تھے۔

''بیٹا تو تمہارا واقعی ہیرا ہے۔ میں بہت خوش ہوں اس کے کام سے۔'' بنجامن نے پوری دیانت داری سے اسے سراہا پھر اس کی طرف رخ موڑ کر بولا۔

''وہیں کیوں اسٹل ہو گئے ینگ مین؟ اندر آؤ اور اپنے آغا جان کے لیے کچھ قہوے وغیرہ کا انتظام کرواؤ۔''

''جی ضرور۔'' وہ جلدی سے حرکت میں آیا۔

''سچ مچ بہت ٹیلنٹڈ بوائے ہے۔ چند دنوں میں ہی میرے کئی بگڑے کام سنوار دیے ہیں۔''

''ٹیلنٹڈ تو ہے پر ڈگری وگری کوئی نہیں ہے اس کے پاس۔ ڈگری کے بغیر ادھر اُدھر سے اپنی ذہانت کے بل بوتے پر سیکھا ہوا کام کوئی اچھی نوکری تو نہیں دلا سکتا اسے۔'' بنجامن کی تعریف کے جواب میں آغا گل نے افسوس کا اظہار کیا۔

''کیا مطلب؟ میرے پاس کام کرنے سے تم اس کے فیوچر سے سیٹسفائی نہیں ہو؟'' بنجامن کو صدمہ سا ہوا۔

''یہ بات نہیں ہے دوست! میں چاہتا ہوں کہ عمار کو کہیں باہر سیٹل کردوں۔ یہاں کے حالات تم جانتے ہی ہو۔ بس اب حوصلہ نہیں ہوتا کوئی دکھ اٹھانے کا۔ دل میں یہی خیال ہے کہ بھلے نظروں سے دور رہے لیکن دل کو یہ اطمینان تو ہو کہ صحیح سلامت ہے۔'' دھیمے لہجے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے وہ بنجامن کو کچھ پریشان سے لگے۔

''کوئی پرابلم ہے تو کھل کر بتاؤ آغا! مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ کوئی چیز ہے جو تمہیں اندر سے پریشان کررہی ہے۔'' اس نے ہمدردی سے پوچھا۔

''تمہیں پتا ہے کہ ہم یہاں اپنی مرضی سے کھل کر سانس بھی نہیں لے سکتے ہیں۔ ہماری ایک ایک جنبش پر نظر رکھی جاتی ہے۔ عمار کی واپسی کی خبر بھی پہنچ چکی ہے ان کے پاس اور چھپے چھپے اس کے بارے میں انوسٹی گیشن کرتے پھر رہے ہیں۔''

''کرنے دو انوسٹی گیشن۔ عمار کون سا کوئی کرمنل ہے۔'' بنجامن نے انہیں تسلی دی۔

''کرمنل تو وہ سارے بھی نہیں تھے جو اب تک تاریک راہوں میں مارے گئے۔ ہمارا سب سے بڑا جرم تو مسلمان ہونا اور اپنی مرضی کی زندگی کی خواہش رکھنا ہے۔'' ان کی آنکھوں میں گہرا کرب تھا۔

''تم کیا چاہتے ہو؟'' بنجامن نے جس وقت یہ سوال کیا، فضا میں قہوے کی خوشبو محسوس ہوئی اور عمار نے بھاپ اڑاتے قہوے کی پیالیاں ان دونوں کے سامنے رکھیں۔

''تم خود کیوں لے کر آئے ینگ مین؟ کسی ملازم سے کہہ دیا ہوتا۔'' بنجامن نے اسے ٹوکا۔

''میں اپنی خوشی سے اپنے ہاتھوں سے بنا کر لایا ہوں۔ آپ دونوں میرے بزرگ ہیں اور مجھے آپ کی خدمت کر کے اچھا لگتا ہے۔'' اس نے ادب سے جواب دیا جسے سن کر بنجامن کا چہرہ کھل اٹھا۔

''گاڈ بلیس یو مائی سن!'' اس نے دل سے دعا دی پھر آغا گل سے مخاطب ہو کر بولا۔

''یہ لڑکا خود ایک بلیسنگ ہے تمہارے لیے۔ تم اس کی فکر نہ کیا کرو۔ وقت خود اس کی راہیں کھولے گا بلکہ سمجھو کھل ہی گئی ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' آغا گل حیران ہوئے۔

''تمہیں تو پتا ہے میرے بیٹوں کا کہ اب میرے بزنس میں کوئی دلچسپی نہیں اس لیے ایکسپورٹ پر بہت اثر پڑا ہے۔ میں عمار کو اس سلسلے میں ٹریننگ دینے کا سوچ رہا

ہوں۔ ذہین بچہ ہے، جلد کام سیکھ جائے گا۔ اس کے بعد دیکھتے ہیں کہ اسے صرف وزٹ پر دوسرے کنٹریز میں بھیجا جائے یا مستقل کہیں سیٹل کر کے وہیں سے کام کو چلوائیں۔ میرے چھوٹے والے نے بھی کئی برس کینیڈا میں بیٹھ کر کام دیکھا تھا لیکن اب وہ کہتا ہے پاپا! مجھ پر میرے اپنے کام کا بہت برڈن ہے۔ میں آپ کے بزنس کو اور نہیں دیکھ سکتا۔ سوچو ذرا جس بزنس نے انہیں پالا، اب انہیں وہ بیکار لگتا ہے اور چاہتے ہیں کہ میں بھی اب اس کی جھنجٹ سے نکل آؤں۔'' بنجامن کو عمار کے سلسلے میں اپنی منصوبہ بندی بتاتے بتاتے بیٹوں کا رویہ یاد آ گیا تو لہجے میں اداسی گھلنے لگی۔ آغا گل کو ان سب باتوں کا علم تھا لیکن ہر بار کی طرح انہوں نے اس وقت بھی بنجامن کا دکھ پوری توجہ سے سنا اور تسلی بھی دی۔

''جانے دو دوست! ہم تم اپنی زندگیاں جی چکے۔ تمہارے لیے یہی شکر کا مقام ہونا چاہیے کہ بیٹے اپنی اپنی زندگیوں میں کامیاب ہیں اور تمہاری محنت رائگاں نہیں گئی ورنہ کتنے ہی والدین اس بات پر آٹھ آٹھ آنسو بہا رہے ہوتے ہیں کہ جس اولاد پر ساری زندگی لگا دی، وہ کسی کام کی نہیں نکلی۔''

''یہ تو ہے۔ آئی ایم تھینک فل ٹو گاڈ کہ اس نے مجھے بیٹوں کی ناکام زندگی کا دکھ نہیں دیا۔'' بنجامن ایسا ہی تھا، جلد بہل جانے اور قائل ہو جانے والا سادہ مزاج انسان جب ہی تو معاشی تفاوت کے باوجود اس کی آغا گل سے اتنی گہری دوستی تھی۔ یہ دوستی بچپن سے ہی چلی آ رہی تھی۔ شاید اس کی ہمدردفطرت نے اسے آغا گل کی مدد کے خیال سے ان کے قریب کیا تھا پھر آہستہ آہستہ اس پر کھلا کہ ان کی شکل میں بہت اچھا دوست اور سامع میسر آ چکا ہے چنانچہ دوستی ہمدردی سے نکل کر برابری کی بنیاد پر استوار ہو گئی۔

حسبِ معمول دونوں دوست مل کر بیٹھے تو محفل طویل ہو گئی۔ کاروباری معاملات نمٹاتے گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ قہوے کا دور بھی دوبارہ چلایا گیا۔ وہ اپنا کام نمٹاتے گاہے گاہے دونوں دوستوں پر بھی نظر ڈالتا رہا۔ جیسے ہی محفل برخاست ہوتی دکھائی دی، تیزی سے اٹھ کر باہر آیا اور دکان کی بلندی کو سڑک سے ملاتی گنتی کی ان چند سیڑھیوں کو طے کرنے میں ان کی مدد کرنے لگا۔

''یعنی تم باز نہیں آؤ گے۔'' اس بار وہ اس کی اس حرکت پر ہنس دیے۔

''جب تک موجود ہوں بالکل نہیں۔'' اس نے بھی قطعیت سے جواب دیا۔

''سارا مسئلہ ہی موجودگی کا ہے۔ جس کے جلد جدا ہو جانے کا ڈر ہو خود کو اس کا عادی بنا لینے سے دل میں اندیشے جاگتے ہیں کہ بعد میں گر جو یہ میسر نہ ہوا تو ہم کیسے زندگی گزاریں گے۔'' وہ ملول تھے یا شاید حقیقت پسندی سے کام لینا چاہتے تھے۔

''اس طرح کے اندیشوں میں گھرا انسان تو دنیا کی کسی نعمت سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا کیونکہ دنیا کی کسی نعمت کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ہمارے پاس ہمیشہ رہے گی۔ جب زندگی ساتھ چھوڑ دیتی ہے تو پھر کسی اور شے کا کیا بھروسا؟''

''سچ کہا تم نے، زندگی بڑی ظالم ہے۔ جب منہ موڑتی ہے تو یہ نہیں دیکھتی کہ کس کس کا کلیجا نوچ کر لے جا رہی ہے۔'' ان کی بے نور آنکھیں دور کہیں کسی خلا میں بھٹک رہی تھیں۔ وہ ان سے کچھ نہ کہہ سکا، بس ان کے ہاتھ پر اپنے ہاتھوں کا دباؤ ڈال کر ایک خاموش دلاسا دیا۔

''میری بنجامن سے بات ہوئی ہے۔'' وہ اپنی ٹرانس جیسی کیفیت سے جلدی سے باہر نکلے اور اسے اپنے اور بنجامن کے درمیان ہونے والی گفتگو سے آگاہ کرنے لگے۔

''بالکل ٹھیک۔ سب کچھ ویسا ہی چل رہا ہے جیسا ہم نے سوچا تھا۔'' وہ سن کر اطمینان کا اظہار کرنے لگا۔

''ہاں، لیکن کبھی کبھی میں دوست کو دھوکے سے استعمال کرنے پر شرمندگی محسوس کرتا ہوں۔ اگر اس کام میں انسانیت اور خصوصاً مسلم امہ کی بھلائی کا لالچ نہ ہوتا تو میں ہرگز بھی اس سب کے لیے راضی نہ ہوتا۔'' وہ کچھ کچھ ناخوش بھی تھے۔

''آپ فکر نہ کریں۔ میری پوری کوشش ہوگی کہ میری ذات سے آپ کے دوست کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔'' اس کے پاس بھی فقط تسلیاں ہی تھیں۔

''اچھا چھوڑو ان باتوں کو، یہ بتاؤ حاجی شیر خان کے ہاں آج کی دعوت کا تو علم ہے نا؟ وقت پر پہنچ جاؤ گے دعوت میں؟'' انہوں نے خود ہی موضوع بدل دیا۔ وہ دونوں دکان سے اتر کر ایک فٹ پاتھ پر کھڑے تھے لیکن گفتگو کا سلسلہ تھا کہ طول ہی پکڑتا جا رہا تھا۔

''میں نہیں آؤں گا۔ آپ ان سے کہہ دیجیے گا کہ کام بہت تھا۔ میرا آنا ممکن نہیں ہو سکا۔''

''ان لوگوں نے بہت محبت سے بلایا ہے بیٹے!'' انہوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''جب ہی نہیں جانا چاہتا۔ وہ سادہ سے لوگ ہیں۔ میں دعوت میں شرکت کروں گا تو وہ میری ذات سے جانے کون کون سی امیدیں وابستہ کرلیں گے اور آپ جانتے ہیں کہ میں ایک بھی امید پر پورا نہیں اتر سکتا۔''

اس کے جواب نے انہیں ایک پل کے لیے چپ سا کردیا پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولے۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ ٹھیک ہے، تم شریک نہ ہونا، میں بہانہ بنا دوں گا۔'' وہ اس کا شانہ تھپتھپا کر وہاں سے رخصت ہو گئے۔ وہ دور تک انہیں سفید چھڑی کے سہارے خراماں خراماں جاتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔ زندگی نے اسے قدم قدم پر پیار کرنے والوں سے نوازا تھا لیکن ظلم یہ تھا کہ وہ اسے اس کے ہر پیارے سے جدا کر دیتی تھی۔ جدائی اس کے مقدر میں لکھ دی گئی تھی۔

☆☆☆

عالم شاہ دونوں ہتھیلیاں آپس میں جوڑے ان پر ٹھوڑی ٹکائے بیٹھا تھا، اس کی آنکھوں میں گہرا اضطراب کروٹیں لے رہا تھا لیکن لب بالکل ساکت تھے۔ ایک قریبی صوفے پر نیلی سر پر دوپٹا اوڑھے ہاتھ میں تسبیح لیے بیٹھی تھی اور تسبیح کے گرتے دانوں کے ساتھ اس کے ہونٹ مسلسل حرکت کر رہے تھے۔ اعظم کو کچھ دیر قبل اس نے سلا دیا تھا اس لیے وہاں کوئی آواز پیدا کرنے والا نہیں تھا۔ سکینہ شاہ اور صداقت شاہ کو عالم نے خود اسپتال سے رہائش گاہ بھجوا دیا تھا۔ صورتِ حال اتنی سنگین تھی کہ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کب کیا ہو جائے گا۔ کسی بری خبر کے لیے خود کو ذہنی طور پر کتنا ہی تیار کرتا، اسے معلوم تھا کہ اگر کوئی بری خبر سننی پڑ گئی تو اسے خود اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے بھی مہلت درکار ہو گی۔ ایسے میں وہ ان دونوں کو کیسے سنبھالتا اس لیے وہی اسپتال کی طرف سے اجازت نہ ہونے کا پرانا بہانہ بنا کر انہیں وہاں سے روانہ کر دیا تھا۔

''مما...... مما!'' اعظم سوتے میں بڑبڑایا تو کمرے کی خاموش فضا میں ذرا سا ارتعاش پیدا ہوا۔ نیلی جلدی سے اٹھ کر اس کے قریب گئی اور پائنتی بیٹھ کر اسے ہولے ہولے تھپکنے لگی۔ اسی وقت ہلکی سی دستک کے ساتھ دروازہ آہستہ سے کھلا۔ نیلی اور عالم دونوں نے بیک وقت دروازے کی طرف دیکھا۔ انہیں وہاں سفید بالوں اور سفید ہی بھوؤں والے ڈاکٹر یوان منگ کا چہرہ دکھائی دیا۔ چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ وہ دونوں ہی مضطرب سے ہو کر کھڑے ہو گئے۔

''سجل......؟'' نظریں آپس میں ملیں تو عالم شاہ کی زبان سے فقط ایک ہی لفظ نکل سکا۔

''ہمت سے کام لو۔'' یوان منگ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر جیسے ہی یہ سہ حرفی جملہ بولا، اس کے دل نے اپنی ایک دھڑکن کھو دی۔

''میں سارا وقت آپریشن تھیٹر میں موجود تھا اور پورے یقین سے اس بات کی گواہی دے سکتا ہوں کہ اس آپریشن کو کرتے ہوئے پروفیسر اینڈریو نے اپنا پورا تجربہ جھونک دیا تھا لیکن......''

''میں نے کہا تھا نا کہ وہ انسانیت سے عاری درندہ ہے۔'' عالم شاہ کے لیے لیکن سے آگے کی داستان سننا ممکن نہیں تھا۔ وہ چیخ پڑا اور اس کے پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ نیلی بے اختیار اسے سہارا دینے آگے بڑھی۔

''تم غلط سمجھ رہے ہو۔'' یوان منگ کو گڑبڑ کا احساس ہوا۔

''کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ جو درندہ اتنے سارے بے گناہ انسانوں کی جان لے چکا ہے، وہ میری سجل کے ساتھ کوئی رعایت کیسے کرے گا۔'' اس نے اپنے شانے پر رکھا یوان منگ کا ہاتھ جھٹکا۔

''ایسا کچھ نہیں ہوا ہے۔ تمہاری بہن زندہ ہے اور اسے آپریشن تھیٹر سے آئی سی یو میں منتقل کیا جا رہا ہے۔ ہمیں فکر صرف یہ ہے کہ اس آپریشن کے بعد اس کی باڈی کیسے رسپانس کرے گی۔ اس کا ایک ہاتھ پہلے ہی کام کرنا بند کر چکا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہوش میں آنے کے بعد کیا نتیجہ سامنے آتا ہے۔ ہوسکتا ہے کوئی معجزہ ہو جائے، ہوسکتا ہے کوئی ایک عضو یا پھر پوری باڈی ہی پیرالائز ہو جائے۔ تم لوگوں کو ذہنی طور پر ہر چیز کے لیے تیار رہنا ہو گا۔'' یوان منگ نے اپنی بات پوری کی تو عالم شاہ کی رکی ہوئی سانسیں بحال ہوئیں اور دل نے بھی ایک بار پھر دھڑکنا شروع کر دیا۔ شکر گزاری کا احساس کب اس لمبے چوڑے مرد کی آنکھوں میں آنسو لے آیا، اسے خود بھی پتا نہیں چل سکا۔

''اللہ نے چاہا تو وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ ان کے ساتھ ہم سب کی دعائیں ہیں اور سب سے بڑھ کر اعظم ہے۔ اعظم کی محبت انہیں اپنی بیماری کو شکست دینے پر مجبور کر دے گی۔'' نیلی جو ڈاکٹر یوان منگ اور عالم شاہ کی گفتگو کے دوران دم سادھے کھڑی رہی تھی، اس جذباتی موقع پر آگے بڑھی اور عالم کو حوصلہ دیا۔

''ان شاء اللہ!'' وہ جواباً فقط اتنا ہی کہہ سکا۔

''تم لوگ ریسٹ کرو۔ فی الحال سجل کو انڈر

آبزرویشن رکھا جائے گا اور کسی کو اس سے ملاقات کی اجازت نہیں ہوگی۔ چاہو تو اس عرصے میں اپنی رہائش گاہ پر بھی جاسکتے ہو۔'' ڈاکٹر یوان منگ کو پاکستان میں رہنے کا تجربہ تھا اور وہ پاکستانی قوم کی جذباتیت سے واقف تھا اس لیے براہِ راست اسے اسپتال سے جانے کا کہنے کے بجائے محض مشورہ دینے پر اکتفا کیا۔

''شکریہ ڈاکٹر! میں یہیں رہوں گا۔''

''ایز یو وش۔'' چونکہ عالم کا جواب خلافِ توقع نہیں تھا اس لیے ڈاکٹر یوان منگ مسکرا کر کہتے ہوئے واپس چلا گیا۔

''میرے خیال میں تم اعظم کو لے کر رہائش گاہ چلی جاؤ۔ وہاں یہ بھی آرام سے رہے گا اور تم بھی تھوڑا ریلیکس کرلو گی۔'' اسے معلوم تھا اسپتال کا یہ کمرا کتنا ہی آرام دہ سہی، نیلی کو مختلف وجوہات کی بنا پر بندھا بندھا سا رہنا پڑتا تھا اور اعظم کو بھی اسپتال کے پروٹوکولز پورے کرنے کے لیے باندھ کر رکھنا پڑتا تھا۔ اس لیے جیسے ہی یہ واضح ہوا کہ ابھی لمبے عرصے تک اعظم کو بکل کے سامنے لے جانے کی نوبت نہیں آئے گی، نیلی کو مشورہ دیا۔

''کہہ تو آپ ٹھیک رہے ہیں لیکن میرے خیال میں آپ کو بھی ہمارے ساتھ چلنا چاہیے۔''

''نہیں، میں یہیں رہوں گا۔ باہر سرمد موجود ہے۔ تم دونوں اس کے ساتھ چلے جاؤ۔'' اس نے فوراً انکار کردیا۔

''ڈاکٹر یوان آپ کو بتا چکے ہیں کہ فی الحال آپ کی یہاں کوئی ضرورت نہیں ہے تو بہتر ہوگا آپ بھی ذرا ہمارے ساتھ چلیں۔ آپ فون پر اپنے والدین کو باخبر کریں، اس کے مقابلے میں اگر خود جاکر انہیں ساری صورت حال بتائیں تو انہیں زیادہ تسلی ہوگی۔'' نیلی آہستہ آہستہ ان لوگوں سے بے تکلف ہوتی جارہی تھی اس لیے عالم کے انکار کے باوجود اس سے اصرار کی ہمت کربیٹھی۔

''خدانخواستہ یہاں کوئی ایمرجنسی ہوگئی تو؟'' وہ متذبذب تھا۔

''تو اسے سنبھالنے کے لیے یہاں ڈاکٹرز موجود ہیں۔ سرمد کو بھی یہیں رہنے دیجیے گا۔ اللہ نہ کرے کوئی مسئلہ ہوا تو رہائش گاہ بھی کوئی اتنی زیادہ دور نہیں ہے کہ پہنچنے میں گھنٹوں لگ جائیں۔ چند منٹ ہی کی تو ڈرائیو ہے۔ یوں چٹکی بجاتے پہنچ جائیں گے آپ یہاں۔'' اس کے اتنے اصرار کے پیچھے عالم کی ابتر حالت تھی۔ بظاہر اس عرصے میں وہ خود کو سنبھالے رہا تھا لیکن نیلی نوٹ کررہی تھی کہ وہ بہت تھکا ہوا اور اعصاب زدہ ہے۔ اس کی آنکھوں کی سرخی گواہی دے رہی تھی کہ وہ مسلسل نیند سے محروم رہی ہیں۔ ایسے میں اسے آرام کی اشد ضرورت تھی لیکن اس نے اسے براہِ راست آرام کا مشورہ دینے کے بجائے اس سے اس کے والدین کے حوالے سے بات کی تھی۔ ان لوگوں کے ساتھ رہتے ہوئے اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ اپنے خاندان کے ساتھ کتنی گہری وابستگی رکھتا ہے اور ان کے لیے کس حد تک جاسکتا ہے۔

''کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو لیکن......'' وہ اب بھی تذبذب کا شکار تھا۔

''ٹھیک بات کو مانا جاتا ہے۔ اس کے آگے لیکن کی گنجائش نہیں ہوتی۔'' نیلی نے ذرا دھونس بھرے لہجے میں کہا تو وہ مسکرا دیا۔ اس لڑکی سے مختصر عرصے میں ان کے خاندان کا اپنائیت کا رشتہ بن گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ خود اس کا دل زخمی تھا اور وہ دوسروں کے دکھ کو زیادہ بہتر طور پر سمجھنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ اس کے اور اعظم کے سنگ اسپتال سے روانہ ہوا تو ایک حسین چہرے نے یادداشت میں اپنی جھلک دکھائی۔ یہ چہرہ اجالا کا تھا۔ اس خود پسند اور خودسر لڑکی نے زندگی میں پہلی بار اس کے دل کے تاروں کو چھیڑا تھا لیکن حالات ہی ایسے نہیں تھے کہ وہ اس سے حالِ دل کہہ

ہوم ورک ایک ایسی چیز ہے کہ جب ٹی وی پر بچوں کا پسندیدہ پروگرام آرہا ہو تو وہ کہتے ہیں کہ آج اسکول میں ہوم ورک ہی نہیں ملا لیکن جب سونے کا وقت ہوتا ہے تو اچانک انہیں یاد آجاتا ہے کہ کس کس ٹیچر نے کیا کیا کام دیا تھا۔

باپ (بیٹی سے) ''کتنی بری بات ہے کہ تم ابھی تک اپنی ماں کے کپڑے پہنتی ہو۔ اب تو تمہیں اس کے کپڑے پہننے سے باز آجانا چاہیے۔ جیسے کہ تم ایک شوہر کی بیوی بن چکی ہو۔''

بیٹی: ''مگر یہ تو سوچیے ابو! شوہر کے کپڑوں میں، میں کتنی بھدی لگوں گی۔''

''بتاؤ اسلم! انسان کے جسم کی وہ ہڈی کون سی ہے جس کا بہت کم استعمال ہوتا ہے؟''

''انسان کی کھوپڑی!''

پاتا اور اب تو ملاقات کا امکان بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ بالفرض ملاقات ہو بھی جاتی تو وہ اس سے اپنے دل کا حال نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کا تعلق اس گھرانے سے تھا جس نے سجل کی زندگی برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ان میں سے کسی بھی فرد کو دوبارہ سجل کے سامنے لا کر وہ اس کو دکھ نہیں دے سکتا تھا اس لیے بہتر تھا کہ دل میں پھوٹنے والی اس کرن کو وہیں بجھا کر راکھ کر دیتا۔ شاید وہ لاشعوری طور پر ایسا کر بھی رہا تھا لیکن پھر جانے کیوں آج وہ یاد آ گئی تھی۔ کچھ حیرانی سے وجہ کھوجتے ہوئے اس کی نظر ساتھ والی نشست پر بیٹھی نیلی کے چہرے پر پڑی تو ٹھٹک گیا۔ اگرچہ وہ لڑکی اجالا کی طرح خوبصورت اور خوش لباس نہ تھی لیکن اس کا دل بہت خوبصورت تھا۔ خوبصورت چہروں کے مقابلے میں خوبصورت دل رکھنے والے لوگ زندگی کے سفر کو آسان بنانے کے لیے زیادہ عمدہ انتخاب ہوتے ہیں۔ یہ خیال بھی اچانک ہی اس کے ذہن میں آیا تھا اور وہ پہلی بار نیلی کو کسی اور زاویے سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی بدلتی سوچ سے بے نیاز وہ کھڑکی سے باہر دیکھتی بے خیالی میں اپنی گود میں سوئے ہوئے اعظم کو تھپکتی جا رہی تھی۔ ایک سادہ اور عام سی لڑکی، جس کا اپنا دل زخمی تھا لیکن وہ دوسروں کا درد بانٹنے کا ہنر جانتی تھی۔

☆☆☆

"تم ابھی تک گھر نہیں گئے عمار؟" بنجامن کی عادت تھی دکان بند ہونے کے بعد بھی بہت دیر تک وہاں ٹھہرتا تھا۔ حساب کتاب، دکان کی سیٹنگ، ملنے والے آرڈرز کا جائزہ لینا...... یہ سارے کام وہ سب کے جانے کے بعد فرصت میں ضرور نمٹاتا تھا اور جس دن، جس سے، جہاں جو غلطی ہوتی تھی اگلے دن اس کی گوشمالی بھی ضرور ہوتی تھی۔ شاید یہ اس کے کامیاب کاروباری ہونے کا ایک راز تھا کہ وہ ہمیشہ "نوازشیں سو سو پر حساب پائی پائی کا" والے اصول پر عمل پیرا رہتا تھا۔ اس کے ملازمین اس کی سخاوت کے معترف رہتے تھے لیکن انہیں یہ بات بھی اچھی طرح معلوم تھی کہ کام میں کوئی کوتاہی اپنی شامت کو آواز دینے کے مترادف ہوگا۔

"میں بس جانے ہی لگا تھا۔ اصل میں کچھ کام رہتا تھا تو میں نے سوچا نمٹا کر ہی جاؤں۔" وہ بنجامن کو تعظیم دینے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

"کمال ہے، میں اپنے کام میں اتنا مصروف تھا کہ اندازہ ہی نہیں ہوا۔ تم ابھی تک یہاں موجود ہو۔ وہ تو بس ابھی دکان کا جائزہ لے رہا تھا تو تمہیں دیکھا۔" انہیں اس کی اب تک یہاں موجودگی پر حیرت ہو رہی تھی۔

"یہ غلط بات ہے۔ آغا کیا سوچے گا کہ میں دوستی میں اس کے بیٹے کو رعایت دینے کے بجائے اس سے ضرورت سے زیادہ کام لے رہا ہوں۔"

"آغا جان ایسا کچھ نہیں سوچیں گے۔ انہوں نے خود مجھے سختی سے ہدایت کر رکھی ہے کہ محنت سے دل لگا کر کام کرنا۔ کوئی کمی بیشی ہوئی تو بنجامن سے پہلے میں تمہارے کان کھینچوں گا۔" اس نے اتنی سادگی سے یہ بات بتائی کہ بنجامن ہنس پڑا لیکن پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

"تمہارے پیرنٹس نے تمہارے بنا بہت لمبا ٹائم کاٹا ہے۔ کوشش کیا کرو کہ انہیں زیادہ ٹائم دو۔"

"جی، مجھے احساس ہے اس بات کا لیکن آج وہ دونوں چاچا شیر خان کے ہاں انوائٹڈ تھے تو مجھے ان کی فکر نہیں تھی۔" اس نے بنجامن کی نصیحت کے جواب میں وضاحت پیش کی۔

"حاجی شیر خان کی بات کر رہے ہو نا جس کی ایک بیٹی کسی بڑے شہر میں رہ کر پڑھ رہی ہے؟" بنجامن کو آغا گل کے سارے میل جول والوں کا پتا تھا۔

"جی، جی...... وہی۔" اس نے تصدیق کی۔

"کہیں تمہاری ڈیٹ فکس کرنے تو نہیں گئے وہاں جو تم شرما کر یہاں چھپے بیٹھے ہو؟" بنجامن واقعی واقف حال تھا چنانچہ مزے سے اسے چھیڑا۔

"ایسا کچھ ہوتا تو آغا جان آپ کو ضرور بتاتے۔ وہ تو بس ان کی بڑی بیٹی سسرال واپس جا رہی تھی تو انہوں نے یونہی دعوت رکھ لی۔" بنجامن کی چھیڑ چھاڑ کا اس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

"اس یونہی سی دعوت میں تمہاری شرکت پر پابندی تھی کیا؟" بنجامن اس کی سنجیدگی کے باوجود باز نہیں آیا تھا۔

"میں کیا کرتا وہاں جا کر۔ میری عمر کا کوئی لڑکا تو ہے نہیں وہاں۔" اس نے اپنا انداز برقرار رکھا۔

"ویری بورنگ۔ یو نو، جب میری انگیجمنٹ ہوئی تھی تو میں بہانے بہانے سے میری کے گھر جاتا تھا۔ ہم آج بھی اس دور کو یاد کر کے ہنستے ہیں۔" انہیں اس سے بات کرنے میں لطف آ رہا تھا۔

"میرے اور آپ کے حالات میں بہت فرق ہے۔ میں کسی عام آدمی کی طرح لائف کو انجوائے نہیں کر سکتا۔" اس کے لہجے میں خود بخود اداسی گھل گئی جسے محسوس کر کے

بنجامن تھوڑا سا شرمندہ ہو گیا۔

"سوری مین! واقعی میموری لاس کی وجہ سے تمہارے لیے کافی مشکل رہتی ہوگی۔ شاید ابھی تو تمہارا دماغ بہت سے لوگوں اور رشتوں کو ایکسیپٹ ہی نہ کر رہا ہو۔"

"اٹس او کے انکل! آپ سوری کہہ کر مجھے شرمندہ نہ کریں۔"

"او کے۔ نہیں کرتا پر ایک شرط پر۔"

"کیسی شرط؟" وہ حیران ہوا۔

"تم ڈنر میرے ساتھ کرو گے۔ میں ماریا سے اپنی فیورٹ ڈش کی فرمائش کر کے آیا تھا۔"

"لیکن......" وہ تذبذب کا شکار ہوا۔

"کوئی لیکن ویکن نہیں۔ میری بات ماننا ہے ورنہ......" انہوں نے ورنہ سے آگے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"اچھا چلیں، جیسی آپ کی مرضی۔" بالآخر اسے ہتھیار ڈالنے پڑے۔

بنجامن کا کشادہ سا گھر دکان کے پیچھے ہی تھا اور دکان کے اندر سے ہی ایک راستہ گھر میں بھی جاتا تھا۔ وہ اسے اسی راستے سے گزار کر گھر لے گیا۔

"ہم فرسٹ فلور پر رہتے ہیں۔ گراؤنڈ کو میں نے گودام بنا لیا ہے۔ پہلے بیٹے یہاں تھے تو گودام دوسری جگہ تھا لیکن اب کچھ عرصے سے یہیں شفٹ کر لیا ہے۔ اتنی بڑی جگہ یونہی بیکار پڑی ہوئی تھی۔"

اسے اپنے ساتھ لے کر سیڑھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے بنجامن نے اسے آگاہ کیا تو اسے اس بوڑھے کی تنہائی کا شدت سے احساس ہوا۔ وہ بھی تو اپنے پیچھے ایک ایسے ہی تنہا اور اداس بوڑھے کو چھوڑ کر آیا تھا۔ بس تسلی تھی تو اتنی کہ جو کچھ کیا تھا، کسی مادی فائدے کے لیے نہیں بلکہ مقصد کے لیے کیا تھا اور جب انسان بڑے مقاصد کے حصول کے لیے کوشاں ہو تو قربانیاں بھی بڑی دینا پڑتی ہیں۔

"یہ لو بھئی دیکھو، تمہاری اسپیشل ڈش کے لیے بہت اسپیشل گیسٹ ساتھ لے کر آیا ہوں۔ اب جلدی سے ڈنر سرو کر دو تا کہ ہم دو ہنگری مین، اینگری ینگ مین میں تبدیل نہ ہوں۔" وہ درمیانی قامت کی بنجامن سے دو چار برس چھوٹی عورت تھی جو دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی سامنے آ گئی تھی اور بنجامن نے اس پر نظر پڑتے ہی بہت لہک لہک کر اس سے یہ الفاظ کہے تھے۔

"تم آج لیٹ ہو ڈارلنگ اور سرونٹ آف کر کے جا چکا ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ ایسی سچویشن میں ہمارے درمیان کیا ڈیل ہو چکی ہے۔" مسز ماریا بنجامن نے پہلے اسے ایک استقبالی مسکراہٹ سے نوازا پھر اپنے شوہر سے مخاطب ہوئی۔

"مطلب آج ڈنر سرو کرنے کی میری باری ہے؟" بنجامن نے معصوم سی شکل بنائی۔

"نو ڈارلنگ! ڈنر تو میں ہی سرو کروں گی۔ تمہاری آج کھانے کے بعد ڈش واشنگ کی ٹرن ہے۔" ماریا کے لہجے میں لطف لینے والی کیفیت تھی۔

"کیا سچ مچ؟" بنجامن نے معصوم شکل بنائی۔

"یو نو، میں کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔" ماریا کی آنکھوں میں شرارت اور شوخی تھی۔ ان کے ساتھ گزارے سارے وقت میں وہ ان میاں بیوی کے درمیان جاری نوک جھونک دیکھتا رہا۔ یہ شاید اپنی تنہائی کو بانٹنے کا ایک طریقہ تھا۔ بیٹوں کے چلے جانے سے گھر کی جو رونق روٹھ گئی تھی، وہ اسے اپنی شوخیوں سے بحال کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ بہترین کھانا اپنی جگہ، اس کو ان کی صحبت نے بہت لطف دیا۔ وہ بھی اس کی موجودگی سے خوش نظر آتے تھے۔ اس نے ان کے بہت روکنے پر بھی کھانے کے بعد برتن دھونے کی ذمے داری خود سنبھال کر گویا ان کے دل ہی جیت لیے۔ ان کے ساتھ بہت خوشگوار وقت گزار کر جب وہ وہاں سے رخصت ہوا تو ماریا اس سے دوبارہ جلد آنے کا وعدہ لے چکی تھی۔

وہ بہت اچھے موڈ کے ساتھ ان سے رخصت ہوا۔ وقت اگرچہ کافی زیادہ ہو گیا تھا لیکن اسے پیدل گھر کی طرف جاتے ہوئے کوئی بوجھ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ بنجامن نے اسے اپنی گاڑی پر ڈراپ کرنے کی پیشکش بھی کی تھی لیکن اس نے انکار کر دیا تھا کہ وہ تاخیر سے کھائے گئے کھانے کے بعد کچھ چہل قدمی کا متمنی تھا اور اس کی اس خواہش نے بنجامن کو بھی زیادہ اصرار نہیں کرنے دیا تھا اور اب وہ خراماں خراماں گھر کی جانب گامزن تھا۔ اپنے رہائشی علاقے میں پہنچ کر حاجی شیر خان کے گھر کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے وہاں ہونے والی دعوت کا خیال آیا۔ وہ دعوت جس کا مینیو اس کی پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے طے کیا گیا تھا اور جس میں اس نے جان بوجھ کر شرکت نہیں کی تھی۔

اسے معلوم تھا کہ اس کی عدم شرکت سے سب سے زیادہ پری وش ہرٹ ہوئی ہوگی لیکن وہ کیا کرتا کہ اسے ہرٹ کرنا ضروری تھا۔ کبھی کبھی کسی کو آگے کی بڑی تکلیف سے بچانے کے لیے چھوٹی تکلیف سے گزارنا پڑتا ہے۔ اس نے بھی پری وش کے ساتھ یہی کیا تھا۔

"سوری!" وہ دل ہی دل میں اس سے کہتا خاموشی

سے اس کے گھر کے آگے سے گزر گیا۔ اب تھوڑا ہی راستہ باقی رہ گیا تھا۔ آخری تاریخوں کے چاند کی وجہ سے آسمان روشن نہیں تھا لیکن کہیں کہیں گھروں سے باہر آتی روشنی نے ماحول کو مکمل تاریک ہونے سے بچایا ہوا تھا۔ وہ اس مدھم روشنی میں مزے سے آگے بڑھتا جا رہا تھا کہ خود سے کافی آگے جاتے ہوئے ایک ہیولے پر نظر پڑی۔ پہلی نظر میں ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کوئی عورت ہے جس نے دونوں ہاتھوں میں کچھ اٹھا رکھا ہے۔ یہاں کی عورتوں کی بہادری اس سے چھپی ہوئی نہیں تھی پھر بھی اس وقت کسی عورت کو تنہا دیکھ کر تھوڑی سی حیرت ہوئی۔ حیرت تجسس میں ڈھلتی، اس سے قبل ہی خاموش ماحول میں کسی موٹر سائیکل کے انجن کی آواز نے ارتعاش پیدا کیا۔ اس آواز نے عورت کو بھی ٹھٹکا دیا اور اس نے یوں بے چین ہو کر اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں جیسے کوئی آڑ یا پناہ گاہ ڈھونڈ رہی ہو لیکن بدقسمتی سے وہ ایسے کھلے حصے میں تھی جہاں قریب میں کوئی مکان وغیرہ نہیں تھا۔ اسے چھپنے کے لیے پیچھے اس طرف آنا پڑتا جہاں وہ موجود تھا لیکن اسے اس کی بھی مہلت نہیں مل سکی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ روشنی میں نہا گئی۔ یہ روشنی اس موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹ کی تھی جس کی آواز پل بھر قبل سنائی دی تھی۔ وہ جو موٹر سائیکل کی آواز پر ہی اضطراری طور پر آڑ میں ہو چکا تھا، روشنی میں نمایاں ہوتی پری وش کو دیکھ کر چونک گیا۔ موٹر سائیکل سواروں کے جسم پر موجود وردی کی وجہ سے ان کی شناخت تو ویسے ہی واضح تھی کہ وہ بھارتی فوج کے سورما ہیں۔

''اے لڑکی! کہاں جا رہی ہے؟'' موٹر سائیکل چلانے والے نے سخت لہجے میں پری وش سے پوچھا جبکہ اس کا پیچھے بیٹھا ساتھی اتر کر پری وش کی طرف بڑھنے لگا۔ یہ منظر دیکھ کر اس کا دل چاہا کہ آڑ سے نکل کر پری وش کے ساتھ جا کھڑا ہو لیکن اسے خود کو ملنے والی ہدایات یاد تھیں۔ اسے حتی الامکان ایسے کسی بھی معاملے میں پڑنے سے بچنا تھا جس میں الجھ کر اپنے مقصد سے دور ہونے کا اندیشہ ہو۔ خود کو قابو میں رکھے وہ اس امید پر ان کے درمیان ہونے والا مکالمہ سننے لگا کہ شاید وہ لوگ معمولی پوچھ گچھ کے بعد پری وش کو جانے کی اجازت دے دیں۔

''بتایا نہیں تو نے، کہاں جا رہی ہے؟'' پری وش نے جواب نہیں دیا تھا اس لیے موٹر سائیکل سے اتر کر اس کے قریب آنے والے نے اپنے ساتھی کا سوال دہرایا۔

''اپنے چچا کے گھر جا رہی ہوں۔'' پری وش کے لہجے سے ظاہر تھا کہ اس نے خود پر بہت جبر کر کے اس کے سوال کا جواب دیا تھا۔

''اور اس میں کیا ہے؟'' اس نے پری کے ہاتھ میں موجود ٹفن کی طرف اشارہ کیا۔

''ٹفن میں کھانے کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟'' نہ نہ کرتے بھی پری کے لہجے میں تلخی آ ہی گئی۔

''تم لوگ تو کچھ بھی لے جا سکتے ہو۔ کوئی بم، کوئی ہتھیار، کارتوس وغیرہ وغیرہ۔'' جواباً اس کا لہجہ بھی زہریلا ہو گیا پھر اس کے ہاتھ سے ٹفن چھینتے ہوئے بولا۔

''لا دے، چیک کروں، تو اس سے کس فوڈ پانڈا سروس پر نکلی ہوئی ہے۔'' پری وش نے ہلکی سی مزاحمت کے بعد ٹفن چھوڑ دیا۔

''ارے واہ، کھشبو (خوشبو) تو بڑی کھترناک (خطرناک) آ رہی ہے۔ لگتا ہے کوئی بڑھیا کشمیری پکوان تیار کر کے لے جا رہی ہے اپنے چاچے کے لیے۔'' وہ ٹفن کھولتے ہوئے اسے چڑانے والے انداز میں تبصرہ کر رہا تھا۔ کھل گیا تو دو انگلیاں سالن میں ڈبو کر منہ میں ڈال کر چوسیں اور آنکھیں میچ کر بولا۔

''سوادش ہے، کشمیر کے حسن کے جیسا۔''

''چھوڑو اسے۔ کیوں اپنے ناپاک ہاتھ ڈال کر پلید کرتے ہو کھانا؟'' پری وش تلملا گئی اور اس کے ہاتھ سے ٹفن جھپٹنے کی کوشش کی لیکن ظاہر ہے ایک طاقتور سپاہی کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ پہلے تو اس نے پری وش کو اس کی کوشش میں کامیاب نہیں ہونے دیا پھر ٹفن اٹھا کر نیچے زمین پر پھینک دیا جس سے لازماً سارا کھانا ضائع ہو گیا۔

''کمینے کہیں کے، تم کتوں کو بربادی پھیلانے کے سوا کوئی کام نہیں ہے۔'' پری وش یکدم ہی آگ بگولا ہو کر سپاہی پر جھپٹی۔ وہ جو آڑ میں کھڑا یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا اور سمجھ چکا تھا کہ اس کی دعوت میں شرکت نہ کرنے کے بعد پری وش یہ کھانا اس کے لیے پیک کر کے لے جا رہی ہے، اس بدلتی ہوئی صورت حال پر یکدم چوکنا ہو گیا اور بے ساختہ ہی اپنی پنڈلی سے بندھا خنجر کھینچ کر نکال لیا۔

''دفع کیوں نہیں ہو جاتے تم یہاں سے؟ اجاڑ کر رکھ دیا ہے ہماری جنت کو۔'' سپاہی اس کو قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ بپھری شیرنی کی طرح اس پر جھپٹے جا رہی تھی۔

''رکھ کر دے ایک سسری کی کنپٹی پر اور کندھے پر ڈال کر لے چل۔ پھر ہم اسے بتائیں گے کہ پلید ہونا کیا ہوتا ہے۔'' موٹر سائیکل چلانے والا جو اب تک اپنی جگہ بیٹھا صورت حال سے لطف اندوز ہوتا رہا تھا، پری وش کے

جارحانہ انداز کو زیادہ برداشت نہیں کرسکا اور بلند آواز میں اپنے ساتھی کو مشورہ دیا۔

''کھیلنے میں مجا (مزہ) آرہا تھا بلبل کے ساتھ پر چل ٹھیک ہے، باقی کا مجا اب اپنے ٹھکانے پر چل کر ہی کریں گے۔'' پری وش کے ساتھ الجھے سپاہی کے الفاظ نے جہاں پری وش کو ٹھٹکا دیا وہیں آڑ میں کھڑا وہ بھی غصے سے بل کھا کر رہ گیا اور خود کو قابو میں رکھنے کے لیے اسے بڑے جبر سے کام لینا پڑا۔

''چپ کیوں ہوگئی میری بلبل! تھوڑا اور چہک لے۔ بستر پر تو ویسے ہی ساری چہکنا بھول جاتی ہیں۔'' سپاہی نے پری وش کے ٹھٹکنے کو محسوس کرکے اس کا مذاق اڑایا اور پھر پھرتی سے اس کی طرف لپکا۔ اس نے چیخ مارتے ہوئے بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس کی تیزی کا مقابلہ نہیں کرسکی۔ آڑ میں کھڑا وہ بھی بس پری وش کو لڑکھڑا کر گرتے ہی دیکھ سکا۔ سپاہی نے اسے مکمل زمین بوس ہونے سے پہلے اپنے ہاتھوں میں سنبھالا اور پھر کسی بوری کی طرح کندھے پر لاد کر موٹر سائیکل کی طرف بڑھا۔

بس اب اس سے زیادہ برداشت نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے تاک کر نشانہ لگایا۔ خنجر سنسناتا ہوا اڑ کر گیا اور سپاہی کی پشت میں گھس گیا۔ اس نے ایک فلک شگاف چیخ ماری اور پری وش کو چھوڑ کر زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اب تک وہاں جو ہوتا رہا تھا، مکانات قدرے فاصلے پر ہونے کے باعث سوئے ہوئے مکینوں کو اس کا علم نہیں ہوسکا تھا۔ سپاہی کی بلند چیخ نے ان کی نیندوں میں خلل ڈالا اور اِکا دُکا مکانات میں بیداری کے آثار نمودار ہوئے۔ ابھی تک موٹر سائیکل پر ہی سوار زخمی سپاہی کے ساتھی نے صورتِ حال بگڑتے دیکھی تو بوکھلا کر اپنا پسٹل نکالا اور پے در پے کئی فضائی فائر کرڈالے۔ فائرنگ کی آواز نے باقی ماندہ سوئے ہوؤں کو بھی نیند سے بیدار کردیا اور بند لائٹیں، کھڑکیاں اور دروازے کھلنے لگے۔ موٹر سائیکل سوار کو موت سر پر نظر آئی تو زخمی ساتھی کو اس کے حال پر چھوڑ کر موٹر سائیکل کو ریس دی اور وہاں سے رفو چکر ہوگیا۔ اس کے لیے بھی مزید وہاں رکنا ممکن نہیں تھا چنانچہ پلٹا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس مقام سے دور ہٹتا چلا گیا۔ پری وش کے بارے میں اسے اطمینان تھا کہ اہلِ علاقہ خود اسے اس کے گھر پہنچادیں گے۔

☆☆☆

وہ بہت تیز دوڑ رہی تھی۔ اتنی تیز کہ لگتا تھا پیروں کے ساتھ پر باندھ لیے ہوں اور یہ پر اسے اڑا کر لے جارہے ہوں لیکن وہ جا کہاں رہی تھی؟ یہ واضح نہیں تھا۔ اس کے سامنے ایک لامحدود سی وسعت تھی جس کے پار کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ نہ کوئی منزل، نہ منزل کا نشان۔ بس یہ احساس تھا کہ کسی اجنبی اور انجان سرزمین کی طرف سفر جاری ہے اور ایسے سفر تو ہر ایک کے دل میں خدشات پیدا کردیتے ہیں۔ وہ بھی بری طرح گھبرائی ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود قدموں کو روکنے پر قادر نہیں تھی۔

''وجل......!'' تیزی سے آگے بڑھتے کسی کی پکار نے اسے ٹھٹکا دیا لیکن سفر اب بھی جاری تھا۔

''رک جاؤ وجل! میں تمہیں ہرگز بھی نہیں جانے دوں گا۔'' اس بار آواز مزید قریب سے آئی تھی۔

''میں خود کو روک نہیں سکتی۔ یہ میرے بس میں نہیں ہے۔'' اسے پہلی بار احساس ہوا کہ وہ جس جانب گامزن ہے، خود بھی اس جانب نہیں جانا چاہتی۔

''تم کوشش تو کرکے دیکھو۔''

''کررہی ہوں کوشش لیکن مجھ سے نہیں ہو پارہا۔'' اس نے بے بسی سے ہاتھ پیر مارے۔

''اچھا تو اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔ میں خود تمہیں روک لوں گا۔''

اتنے یقین سے دعویٰ کیا گیا کہ اس کے پاس انکار کی گنجائش نہیں رہی اور خودکار سے انداز میں اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ فوراً ہی ایک مضبوط مردانہ ہاتھ نے اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ کو تھام لیا۔ ہاتھ کا تھاما جانا تھا کہ دوڑتے قدم رک گئے اور ہر طرف چھائی دھند چھٹنے لگی۔ اس نے نمودار ہونے والی روشنی میں اپنا ہاتھ تھامنے والے کی شکل دیکھنا چاہی لیکن روشنی اتنی تیز تھی کہ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

''یہ جاگ رہی ہیں۔ آپ کو ہر طرح کے حالات کے لیے تیار رہنا ہوگا اور خیال رکھنا ہوگا کہ صورتِ حال جو بھی ہو، آپ کا ردِعمل نارمل ہو۔'' یہ ایک ڈاکٹر تھا جو اس کے بیڈ کے قریب کھڑا عالم شاہ کو ہدایت دے رہا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کی بات توجہ سے سنی اور سمجھنے کے انداز میں سر کو جنبش دی۔

''معاذ......!'' وہ جو اپنے سرہانے کھڑے افراد کی گفتگو سے قطعی بے نیاز تھی، اپنی چندھیا جانے والی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر بلند آواز میں پکاری لیکن کچھ دی جانے والی دواؤں کا اثر تھا اور کچھ پیاس سے خشک پڑے حلق اور زبان کے باعث، اس کے ہونٹوں سے برآمد ہونے والا معاذ کا نام کسی کی سمجھ نہیں آیا اور یوں لگا کہ وہ تکلیف سے

چیخی ہو۔

"سجل...... سجل! کیسی ہو میری گڑیا؟ گھبراؤ مت، دیکھو میں تمہارا ادا سائیں تمہارے پاس ہوں اور سب کچھ بالکل ٹھیک ہے۔ اللہ سائیں کی مہربانی سے تمہیں ایک نئی زندگی ملی ہے اور تم اپنے موذی مرض سے نجات پا چکی ہو۔" عالم شاہ بے قراری سے اس پر جھکا بولتا جارہا تھا۔ الفاظ نے دھیرے دھیرے اس کے دماغ تک رسائی حاصل کی اور بہت دیر تک بند رہنے کے بعد کھلنے والی آنکھیں بھی روشنی کو برداشت کر کے کچھ دیکھنے کے قابل ہونے لگیں۔

"ادا سائیں......!" اپنے عین سامنے موجود دکھائی دیتے عالم شاہ کے چہرے کو دیکھ کر اس کی آنکھوں سے بھل بھل آنسو بہنے لگے۔

"روتی کیوں ہو پگلی! یہ تو خوشی اور شکر کا مقام ہے۔" عالم نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے اس کے بہتے آنسو پونچھتے ہوئے اسے ٹوکا۔ یہ اور بات تھی کہ ایسا کرتے ہوئے اس کی اپنی آنکھوں میں بھی نمی اتر آئی تھی۔ ہمیشہ سے عزیز بہن اپنے پچھلے عرصے کے صبر، ایثار اور بیماری کی وجہ سے پہلے سے کہیں زیادہ دل کے قریب ہو چکی تھی۔ کوئی اپنا جب ہاتھوں سے نکلنے لگتا ہے تو انسان پر اس کی اہمیت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ عالم شاہ کو بھی لگ رہا تھا کہ کئی دنوں سے اٹکی اس کی سانسیں اب جا کر بحال ہوئی ہیں۔

"اب آپ باہر جائیے۔ مریضہ کو فی الحال آرام کی ضرورت ہے۔" ساتھ کھڑے ڈاکٹر نے اسے ٹوک کر احساس دلانے کی کوشش کی کہ اس قدر جذباتی دباؤ سجل کی صحت کے لیے مناسب نہیں ہے۔

"آئی ایم سوری ڈاکٹر!" عالم شرمندہ ہوا پھر سجل کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے نرمی سے بولا۔

"ابھی تم آرام کرو۔ میں بعد میں دوبارہ تم سے ملنے آؤں گا اور اماں سائیں اور بابا سائیں کو بھی اپنے ساتھ لاؤں گا۔"

"آ...... اعظم!" اس نے گویا عالم شاہ کو یاد دلایا کہ ملاقاتیوں کی فہرست میں اس کے بیٹے کا نام شامل نہیں ہے۔

"اعظم تو یہیں اسپتال میں مس نیلوفر کے ساتھ موجود ہے۔ ڈاکٹرز جیسے ہی اجازت دیں گے، ہم اس سے تمہاری ملاقات کروا دیں گے۔" عالم شاہ نے اسے اطمینان دلایا۔

"پلیز مسٹر شاہ! ہمیں ہمارا کام کرنے دیں۔" ڈاکٹر نے اسے ایک بار پھر ٹوکا تو وہ سجل کو اشارے سے تسلی دیتا ہوا باہر نکل گیا۔ ان کے لیے مخصوص کمرے میں نیلی، اعظم کو کچھ کھلانے کی کوشش کر رہی تھی اور وہ نخرے دکھا رہا تھا۔

"کیسی ہیں سجل...... انہیں مکمل ہوش آ گیا...... کیا کہتے ہیں ڈاکٹرز ان کے بارے میں؟" عالم کی شکل دیکھتے ہی اس نے جس طرح تابڑ توڑ سوالات شروع کیے، اس سے ظاہر تھا کہ وہ بھی مسلسل سجل کے لیے فکرمند رہی ہے۔

"وہ بہتر ہے۔ اسے ہوش آ گیا ہے اور میری اس سے تھوڑی بات چیت بھی ہوئی ہے۔ میرے حساب سے مینٹلی تو وہ بالکل ٹھیک تھی، اب دیکھنا یہ ہے کہ ڈاکٹرز مکمل چیک اپ کے بعد کیا رائے دیتے ہیں۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہوگا۔" نیلی نے اس کی فکرمندی دیکھ کر خلوص سے تسلی دی اور ایک بار پھر اپنے سابقہ کام میں مصروف ہو گئی۔ عالم نے اس کی اور اعظم کی بانڈنگ کو دلچسپی سے دیکھا۔ وہ بہت آرام سے اسے بہلا پھسلا کر ایک کے بعد دوسرا نوالہ کھلاتی جا رہی تھی۔

"اعظم بہت زیادہ اٹیچ ہو گیا ہے آپ سے۔"

"بچے پیار کی زبان سمجھتے ہیں۔ ان کے ساتھ پیار سے پیش آؤ تو فوراً آپ کے ہو جاتے ہیں۔" اس نے توجہ اعظم کی طرف ہی مبذول رکھتے ہوئے عالم کی بات کا جواب دیا۔

"پرہیز تو بڑوں کا بھی نہیں بتایا ڈاکٹرز نے پیار سے۔" وہ جتنی بے ساختگی سے بولا، اتنی ہی تیزی سے نیلی نے سر اوپر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"مطلب؟" غیر شعوری طور پر اس کے لہجے میں سختی در آئی تھی۔

"کوئی مطلب نہیں، بس ایسے ہی ایک بات آ گئی تھی ذہن میں۔" وہ تھوڑا سا سٹپٹایا پھر بات بدلتے ہوئے بولا۔

"بابا سائیں، اعظم اور سجل، دونوں ہی کی طرف سے بہت فکرمند ہو رہے تھے۔ سجل کے بارے میں ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں اور کیا نہیں، اس سے قطع نظر بھی یہ طے ہے کہ وہ کافی طویل عرصے تک اعظم کی پراپر دیکھ بھال کرنے کے لائق نہیں ہو سکے گی۔ کہنے کو تو حویلی میں بہت ملازمین ہیں لیکن کوئی ایسا فرد بہت ضروری ہے جو اعظم کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کو سمجھ کر اسے طریقے سے ہینڈل کر سکے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خود اعظم اس فرد کو ماں کے نعم البدل کے طور پر قبول کر لے۔"

"ماں کا نعم البدل ہونے کا دعویٰ تو نہیں اور نہ ہی سجل کے ہوتے ہوئے اس کی ضرورت ہے لیکن اب تک میں یہ سمجھتی رہی ہوں کہ آپ لوگ اعظم کے حوالے سے میری

ذات سے مطمئن ہیں لیکن اس گفتگو کو سن کر مجھے شک ہو رہا ہے کہ مجھ سے اس کے سلسلے میں کوئی کوتاہی ہوئی ہے۔'' نیلی دلبرداشتہ دکھائی دینے لگی تھی۔

''ارے نہیں، ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ ہم سب تو دل سے آپ کے شکرگزار ہیں کہ آپ نے اس عمدگی سے اعظم کی ذمے داری سنبھال رکھی ہے کہ ہمیں ایک لمحے کے لیے بھی اس کی طرف سے فکرمند نہیں ہونا پڑا لیکن......''

''لیکن کیا؟'' نیلی کو عالم کا لمحاتی توقف بھی بے چین کر گیا۔

''ذہن میں ایک ابہام سا ہے کہ شاید اب آپ یہاں سے واپس نہ جانا چاہیں۔ آئی مین یہاں پاکستان کے مقابلے میں زیادہ سہولیات اور ترقی کے زیادہ مواقع ہیں اور پیچھے آپ کے ایسے رشتے ناتے بھی نہیں جن کی خاطر آپ کا واپس جانا ضروری ہو تو ہو سکتا ہے آپ یہاں سیٹل ہونا پسند کریں۔'' عالم نے ذرا وضاحت کی تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اسے ہنستے دیکھ کر اعظم بھی اس کے ساتھ ہنسنے لگا۔

''کمال ہی کرتے ہیں آپ کے ماموں سائیں۔ جو بات دور دور تک میرے خیال میں بھی نہیں، یہ بیچارے اس پر جانے کیا کیا سوچ کر ہلکان ہوئے جا رہے ہیں۔ ارے انہیں بتاؤ کہ ہمیں کسی کی ترقی اور خوشحالی سے کچھ لینا دینا نہیں۔ ہم تو صرف اور صرف اپنے اعظم کی خاطر یہاں ہیں۔'' وہ مخاطب اعظم سے تھی لیکن سنا عالم کو رہی تھی۔ معصوم بچہ اس کی بات سمجھے بغیر بس اس لیے ہنسے جا رہا تھا کہ وہ ہنستی ہوئی اس سے مخاطب تھی۔

''اگر اعظم کے ماموں سائیں آپ سے درخواست کریں کہ آپ تازندگی اس کے قریب رہیں تو کیا آپ یہ درخواست قبول کر لیں گی؟'' نیلی کی شوخی کے مقابلے میں عالم کا انداز خاصا سنجیدہ تھا۔ وہ کچھ ٹھٹک سی گئی اور متعجب نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''کیا آپ مجھے لائف ٹائم جاب کی آفر کر رہے ہیں؟''

''وہ بھی ود آؤٹ سیلری۔'' وہ شریر سا مسکرایا۔

''میں سمجھی نہیں۔'' ٹھٹک کچھ اور بھی بڑھ گئی۔

''میں آپ کو اپنا فیملی ممبر بنانا چاہتا ہوں۔ فیملی ممبر کو اس کے حقوق دیے جاتے ہیں، سیلری نہیں۔''

''جو کچھ کہنا ہے کھل کر کہیں۔ یوں اشاروں کنایوں میں بات کرنا مجھے پسند نہیں۔'' نیلی کے ماتھے پر بل آ گیا۔

''میں آپ کو پروپوز کر رہا ہوں خاتون! ول یو میری می!'' عالم شاہ کو خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ نیلی کو اتنی جلدی پروپوز کر دے گا۔ ابھی تو اس نے اس کے کردار سے متاثر ہو کر اس کے بارے میں سوچنا ہی شروع کیا تھا اور یوں اچانک بات اس کے لبوں پر آ گئی تھی۔

''آپ...... آپ ایسا سوچ بھی کیسے سکتے ہیں؟'' نیلی نے غصے سے دانت کچکچائے۔ چہرہ پہلے ہی سرخ ہو چکا تھا اور یہ سوچ سوچ کر خون کھول رہا تھا کہ مومی کی بیوہ کی حیثیت سے واقف ہوتے ہوئے بھی وہ ایسی جرأت کیسے کر سکتا تھا کہ اسے پروپوز ہی کر ڈالے۔

''نہ صرف میں بلکہ کوئی بھی شخص ایسا سوچ سکتا ہے۔ ایسا سوچنے میں کوئی شرعی اور قانونی قباحت نہیں ہے۔'' اس کے مشتعل انداز کے مقابلے میں عالم شاہ کا لہجہ بے حد پرسکون تھا۔

''لیکن میں نہیں سوچ سکتی۔ میری زندگی میں جو مقام مومی کا ہے، وہ کسی اور کو نہیں مل سکتا۔'' اس نے تیوری چڑھائی۔

''مجھے اس کی تمنا بھی نہیں۔ کوئی باشعور انسان کسی دوسرے شخص کا مقام چھیننے کی کوشش نہیں کر سکتا لیکن انسانی قلب و ذہن میں اتنی وسعت ہوتی ہے کہ وہاں دوسرے لوگوں کو بھی جگہ دے سکے۔ زندگی کسی ساتھی کے ساتھ گزارنا انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ جو لوگ اس تقاضے کو نظرانداز کرتے ہیں وہ اپنے ساتھ ظلم کرتے ہیں۔''

''میرے سارے تقاضے مومی کی ذات کے ساتھ ختم ہو گئے اور ساری تمنائیں اس کے ساتھ ہی قبر میں دفن ہو چکی ہیں۔'' عالم کے دلائل کے جواب میں اس کے پاس ایک بے معنی سی تلملاہٹ کے سوا کچھ نہیں تھا۔

''یہ محض ایک جذباتی مکالمہ ہے جو کسی تین گھنٹے کی فلم میں تو ناظرین کو تالیاں بجانے پر مجبور کر سکتا ہے لیکن حقیقی زندگی میں اس پر عمل کرنے کی کوشش کرنے والوں کے حصے میں زخموں اور پچھتاوؤں کے سوا کچھ نہیں آتا۔'' عالم شاہ پر اس کے جذباتی ردعمل کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ فضا کچھ ایسی بن گئی تھی کہ ناسمجھ اعظم بھی دم سادھے ٹکر ٹکر دونوں کی شکلیں دیکھ رہا تھا۔

''یونہی سہی، لیکن یہ میری زندگی ہے اور مجھے پورا حق ہے کہ اس بات کا فیصلہ کر سکوں کہ مجھے اسے کیسے گزارنا ہے۔'' وہ اپنی ضد پر اڑی ہوئی تھی۔

''مجھے آپ کا حق تسلیم ہے اور میں آپ کے ہر فیصلے کا احترام بھی کرتا ہوں لیکن میری آپ سے گزارش ہے کہ فیصلہ کرنے میں جلدبازی سے کام نہ لیں۔ پہلے اس بارے میں

اچھی طرح غور وخوض کریں اور چاہیں تو اپنے کسی دوست یا خیر خواہ سے مشورہ بھی لے لیں۔'' عالم شاہ کو خود بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ اتنے تحمل کا مظاہرہ کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ اس کا تحمل ہی تھا کہ نیلی مزید سخت ردِعمل کا مظاہرہ نہیں کرسکی۔

''اس موقع پر میں آپ کو اپنے بارے میں یہ وضاحت بھی دینا چاہتا ہوں کہ میرے دل کا کاغذ بھی بالکل کورا نہیں ہے۔ اس کاغذ پر بھی کسی کا نقش ثبت ہوا ہے لیکن زندگی نے مجھے یہ بات سکھائی ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ دل میں جگہ پانے والوں کے لیے زندگی میں بھی جگہ بن سکے۔ وجہ کوئی بھی بن سکتی ہے لیکن جب محبوب سے جدا رہنا مرقوم ہوجائے تو عقل کا تقاضا ہے کہ کسی ایسے اچھے انسان کو اپنے لیے چن لیا جائے جو زندگی کی طویل مسافت کو آپ کے لیے آسان بنادے۔ میں نے آپ کے اندر وہ خوبیاں دیکھی ہیں جو میری زندگی کو آسان کرسکتی ہیں۔ آپ بھی انکار یا اقرار سے پہلے میری ان خوبیوں کو کھوجیں اور پھر کوئی فیصلہ سنائیں۔'' بہت دھیمے لہجے میں اسے یہ سب سمجھا کر وہ اس کے کچھ بھی کہنے سے قبل کمرے سے باہر نکل گیا۔ نیلی گم صم سی دوبارہ اعظم کو کھانا کھلانے لگی۔ وہ اتنی ڈسٹرب تھی کہ عالم کے پروپوزل کے بارے میں کچھ سوچ نہیں پارہی تھی لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ اب غصے میں نہیں تھی اور یہ بہت اچھی علامت تھی۔ غصہ انسان سے غلط اور جذباتی فیصلے کرواتا ہے۔ وہ اپنی موجودہ اسٹیج سے گزر جانے کے بعد جو بھی فیصلہ کرتی، اس میں غلطی کا امکان کم ہوتا۔

☆☆☆

''یہ اچھا نہیں ہوا، بالکل بھی اچھا نہیں ہوا۔'' اس کے پاس اتنی رات گئے بنجامن کے گھر واپس جانے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ بنجامن جو کہ شب خوابی کا لباس زیب تن کرچکا تھا اور بستر سے اٹھ کر آیا تھا، اسے دوبارہ اپنے دروازے پر دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا لیکن باہر ہی کسی قسم کے سوال جواب کرنے کے بجائے اسے اندر بلالیا تھا۔ اس نے بنجامن کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اسے سب کچھ سچ سچ بتاڈالا جسے سن کر بنجامن پریشانی میں ڈوب گیا۔

''میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اگر میں ایسا نہیں کرتا تو وہ درندے پری وش کو اٹھا کرلے جاتے۔'' وہ خود بھی مضطرب تھا۔

''میں سمجھتا ہوں، میں یہ سب سمجھتا ہوں لیکن میں اس ری ایکشن سے ڈر رہا ہوں جو اپنے ایک سپاہی پر حملہ ہونے کے بعد انڈین آرمی کی طرف سے آئے گا۔ میں اقلیتی آبادی میں سے ہوں اور بائے دا گریس آف گاڈ اچھی پوزیشن پر بھی ہوں اس لیے انڈینز کو مجھ سے کوئی ایشو نہیں ہے۔ میرے دوستوں میں ہندو اور مسلم دونوں شامل ہیں لیکن مین انصاف سے کام لوں تو یہ بات بالکل صاف ہے کہ انڈین فورسز مسلمانوں پر چڑھائی کا کوئی چانس مس نہیں کرتیں۔ یہ واقعہ بھی انہیں بری طرح بھڑکا دے گا اور وہ ہر ممکن کوشش کریں گے کہ مجرم ان کے ہاتھ آجائے۔'' بنجامن وہاں کا رہائشی تھا اور اسے بھارتی فوج کے سارے ظلم وستم کا علم تھا اس لیے اس کی فکرمندی بجا تھی۔

''آغا جان میرے لیے پریشان ہو رہے ہوں گے۔ کیا انہیں کال کرکے میری خیریت کی اطلاع دی جاسکتی ہے؟'' تشویش اسے بھی تھی کہ جو کچھ کر آیا تھا اس کی وجہ سے بہت کچھ تباہ ہوسکتا تھا۔ اس کے اس جذباتی ردعمل نے اس سب کو بھی خطرے میں ڈال دیا تھا جس کے لیے پوری پلاننگ کرکے وہ یہاں آیا تھا۔ آغا گل کو فون کرنے کے پیچھے بھی یہ خواہش تھی کہ کوئی رابطہ ہو تو حالات سے آگہی ہو۔

''بالکل بھی نہیں۔ اگر ہماری کال پکڑی گئی تو تم سیدھے شک کی زد میں آؤ گے۔ آرام سے یہاں بیٹھے رہو۔ کوئی انویسٹی گیشن ہوئی تو میں کہہ دوں گا کہ رات بہت دیر ہوگئی تھی اس لیے میں نے تمہیں یہیں روک لیا تھا۔'' بنجامن نے قطعیت سے انکار کردیا پھر بولا۔

''میں تمہارے لیے گیسٹ روم کھول دیتا ہوں۔ سکون سے وہاں سوجاؤ۔ جو ہوگا صبح دیکھا جائے گا۔''

''جیسا آپ کہیں۔'' اس کا ذہن اگرچہ بے شمار سوالات میں الجھا ہوا تھا لیکن بنجامن کو مختصر جواب دینے پر ہی اکتفا کیا۔ بنجامن اسے اپنے ساتھ گیسٹ روم میں لے گیا۔ صاف ستھرا آرام دہ گیسٹ روم گویا کسی مہمان کی راہ دیکھ رہا تھا۔

''عام ضرورت کا سارا سامان یہاں موجود ہے پھر بھی اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو تم مجھے یا اپنی آنٹی کو بتاسکتے ہو۔''

''تھینک یو انکل! بس رات ہی تو گزارنا ہے اور اس کے لیے ایک عدد بستر کے علاوہ سب کچھ اضافی ہی ہے۔'' اس نے بنجامن کی پیشکش کے جواب میں مسکرا کر کہا لیکن اس کی مسکراہٹ میں پھیکا پن تھا۔ ہونے والے واقعے کا ردِعمل اس کے دماغ میں اندیشے جگا رہا تھا۔ ایک طرف ان کی اپنی ساری منصوبہ بندی پر پانی پھرنے کا خدشہ تھا تو دوسری طرف پری وش سمیت باقی لوگوں کے انجام کی فکر تھی۔

''ٹھیک ہے، تم آرام کرو پھر صبح بریک فاسٹ پر ملتے ہیں۔'' بنجامن نے اس کا شانہ تھپک کر باہر جانے کے لیے قدم اٹھائے لیکن دروازے کے قریب جا کر رک گیا۔

''عمار......!''

''جی انکل۔''

''اس خنجر پر تمہارے فنگر پرنٹس بھی تو ہوں گے۔'' بنجامن نے ایک ایسا نکتہ اٹھایا جو شروع ہی سے اس کے ذہن میں موجود تھا۔ وہ موقع ہی ایسا تھا کہ اسے کسی بھی قسم کی احتیاطی تدبیر کا موقع نہیں ملا تھا اور اب خطرے کی تلوار سر پر لٹک رہی تھی۔

''یہ بہت برا ہوا۔ اتنے سالڈ ایویڈنس کے بعد ان کے لیے تمہیں پھانسی پر لٹکانا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہوگا۔'' اس کی خاموشی نے بنجامن کو جواب دے دیا تھا چنانچہ اس کی تشویش میں مزید اضافہ ہوگیا۔

''کشمیریوں کے خون سے ہاتھ رنگنا ان کے لیے کبھی بھی مسئلہ نہیں رہا۔'' اس نے تلخی سے جواب دیا۔

''ابھی تم آرام کرو۔ صبح حالات دیکھنے کے بعد سوچ سمجھ کر فیصلہ کرتے ہیں کہ کیا کرنا ہے۔'' بنجامن اس تلخی کی وجوہات سے واقف تھا اس لیے بات کو بڑھانے کے بجائے رسان سے کہتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ اس نے بھی بستر سنبھال لیا لیکن یہ طے تھا کہ آج کی رات اسے نیند نہیں آنے والی تھی۔

☆☆☆

سپاہی کے گرنے سے اس کے کندھے پر لدی پری وش بھی زمین بوس ہوئی تھی اور ایک پل کے لیے اس کے حواس جواب دے گئے تھے لیکن سپاہی کی چیخ و پکار، اس کے ساتھی کی فائرنگ، کھلنے والے دروازوں، کھڑکیوں کی کھڑکھڑاہٹ اور پھر لوگوں کے بولنے کی آوازوں نے ماحول کو اتنا پُرشور کر دیا کہ وہ اپنے حواسوں میں واپس لوٹ آئی۔

''ارے یہ تو حاجی شیر خان کی بیٹی ہے۔'' زخمی سپاہی کا ساتھی موٹر سائیکل دوڑا کر وہاں سے بھاگ نکلا تھا اور آنے والے اس کے اور زخمی سپاہی کے گرد جمع ہوگئے تھے۔ ان میں سے چند کے ہاتھوں میں ٹارچیں بھی تھیں اور ان ٹارچوں کی روشنی میں کسی نے پری وش کو شناخت کر لیا تھا۔

''تم اتنی رات کو اکیلی کیا کر رہی ہو بیٹی اور اسے کس نے زخمی کیا ہے؟'' ایک بزرگ نے قریب آ کر اس سے دریافت کیا۔ اس نے ان کے سوال کا جواب تو نہیں دیا لیکن دھیان اس شخص کی طرف چلا گیا جس نے عین وقت پر سپاہی کو خنجر مار کر اسے اس کے مکروہ عزائم سے بچایا تھا۔ وہ شخص منظر پر نہیں آیا تھا اور وہ جانتی تھی کہ اسے آنا بھی نہیں ہے۔ بھارتی فوجیوں کا مسلمانوں کے ساتھ یہاں جو سلوک تھا اس کے بعد اگر کسی نے اتنی بھی ہمت کر لی تھی کہ ایک لڑکی کی آبرو بچانے کے لیے حرکت میں آگیا تھا تو یہ بھی کم نہیں تھا۔ سامنے آ کر اپنی اس جرأت کا اعتراف کرنا خود کو ہلاکت میں ڈالنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

''لگتا ہے یہ مرنے والا ہے۔'' زخمی سپاہی کی چیخ و پکار دھیرے دھیرے دم توڑ گئی تھی اور اب وہ اپنے ہی خون میں لت پت زمین پر بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ کسی نے قریب آ کر اس کا جائزہ لینے کے بعد یہ تبصرہ کیا تھا۔ ایک انڈین سپاہی کی موت کا کیا نتیجہ ہوسکتا ہے، یہ اس سمیت وہاں موجود ہر شخص جانتا تھا۔ قاتل کی تلاش میں وہ زمین و آسمان بھی تہ و بالا کر دیتے تو کم تھا۔

''مجھے اسے بچانا ہوگا۔'' وہ زیرِ لب بڑبڑائی اور بے جان پڑے سپاہی کی پشت میں گڑا خنجر ہاتھ بڑھا کر کھینچ لیا۔ خنجر کھینچنا تھا کہ اس کے زخم سے پہلے سے کہیں زیادہ تیزی سے خون بہنے لگا۔ اس نے اس بہتے خون کی پروا کیے بغیر خنجر کو اپنی اوڑھنی سے صاف کرنا شروع کر دیا۔ اس کی اوڑھنی پر خون کے دھبے پڑ گئے لیکن ان دھبوں سے بے نیاز وہ خنجر کو رگڑ رگڑ کر صاف کرتی رہی اور اسے اس وقت ہی ہاتھ سے چھوڑا جب یہ اطمینان ہوگیا کہ خنجر سے اجنبی محسن کے فنگر پرنٹس مٹ چکے ہوں گے۔

''چلو بیٹی! میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں۔ تمہارا مزید یہاں رکنا مناسب نہیں ہے۔'' وہ بزرگ جو پہلے اس سے مخاطب ہوئے تھے، انہوں نے ہی دوبارہ اس سے کہا تو اس بار وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنی اوڑھنی سنبھالتے ہوئے ان کے پیچھے چل پڑی۔ ہجوم بھی چھٹنا شروع ہوگیا۔ وہ سب ہی تشویش کا شکار تھے اور اس واقعے کے سخت ردِعمل کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

''پری...... پری وش! کیا ہوگیا بیٹی؟ یہ سب کیا ہوگیا اور تم یہاں کیسے؟'' ابھی اس نے بزرگ کے ساتھ گھر واپسی کا آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ حاجی شیر خان ایک نوجوان کے ساتھ بدحواسی کے عالم میں تیز تیز چلتا نمودار ہوا اور پری وش کے دونوں شانے تھام کر پریشانی سے پوچھنے لگا۔

''میں آغا جان کے گھر جا رہی تھی بابا! عمار دعوت میں نہیں آیا تھا تو اس کے لیے کھانا پہنچانے۔'' اس نے باپ کے سوال کا جواب دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"مجھ سے کہہ دیا ہوتا بیٹی!" حاجی شیر خان بیٹی کی اس حماقت پر اسے سرزنش بھی نہیں کر سکا اور بے بس سے انداز میں اتنا ہی کہا۔ وہ ایک باشعور آدمی تھا جس کے لیے سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ یہ ایک کم عمر لڑکی کا جذباتی اقدام تھا جس کے لیے اسے کچھ بھی کہنا بیکار تھا۔

پری وش کو بھی اب اپنی حماقت کا احساس ہو رہا تھا۔ اصل میں عمار کے دعوت میں شریک نہ ہونے پر وہ بہت رنجیدہ ہوئی تھی۔ تھوڑی سی امید تھی کہ دیر سے ہی سہی، وہ آجائے گا لیکن پہلے گل وش اور اس کا خاوند اور پھر آغا گل اور زرمینہ بی بی رخصت ہو گئے پر عمار نے اپنی جھلک نہ دکھلائی۔ مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد اس نے سارا پھیلاوا سمیٹا، برتن دھو دھلا کر باورچی خانہ صاف کیا اور بچے ہوئے کھانے کو محفوظ کرنے کے بعد بستر پر آلیٹی لیکن نیند کا تو کوئی نام و نشان ہی نہیں تھا۔ دن بھر ماں کے ساتھ مل کر کام نمٹاتے ہوئے کھانے پینے کا ہوش نہیں رہا تھا اور دعوت میں عمار کے آنے کے انتظار میں نہیں کھایا تھا۔ سب کے بلاوے پر بھوک نہ ہونے اور کاموں کا بہانہ بناتی رہی تھی اور اب بستر پر لیٹی تھی تو خالی پیٹ دہائیاں دے رہا تھا۔ پیٹ کی دہائیوں پر دل کی دہائیاں غالب تھیں۔ ناقدری کا احساس بھی آنکھیں بھگو دیتا تھا تو کبھی وجود میں طیش کروٹیں لینے لگتا تھا۔ غم و غصے کی اس ملی جلی کیفیت نے اسے وقت کا خیال کیے بغیر بستر چھوڑ کر کھڑے ہونے اور گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ دعوت میں تیار کیے جانے والے سارے کھانے ایک بڑے سے ٹفن میں پیک کر کے اپنے ساتھ لے گئی تھی کہ انہیں عمار کو پیش کر کے اسے شرمندہ کرے گی اور اسے احساس دلائے گی کہ یہ اتنا سب کچھ جو اس کے لیے بطورِ خاص تیار کیا گیا تھا، یونہی نہیں بن گیا تھا۔ اس سب کو بنانے میں اس کا بہت وقت اور محنت لگی تھی لیکن اس سب کی نوبت ہی نہیں آسکی تھی اور راستے میں وہ پیش آگیا تھا جس کا اس نے گمان بھی نہیں کیا تھا۔

"یہ وقت باتوں کا نہیں ہے حاجی صاحب! میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آپ کو اطلاع دینے اس لیے بھاگا آیا تھا کہ آپ جلد از جلد اپنے بچاؤ کے لیے کوئی قدم اٹھا سکیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ کچھ دیر میں یہاں کیا صورتِ حال ہوگی۔ بہتر ہوگا کہ اس سے پہلے پہلے آپ اپنے گھر والوں کے ساتھ یہاں سے نکل کر کسی محفوظ مقام پر چلے جائیں۔" حاجی شیر خان کے ساتھ آنے والے جوان نے دونوں باپ بیٹی کے مکالمے کو طول نہ پکڑنے دیا اور درمیان میں ہی انہیں ٹوک دیا۔

"یہ بچہ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے شیر خان! تم بالکل بھی وقت ضائع نہ کرو اور اس بچی سمیت اپنے سب گھر والوں کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔" پری وش کے ساتھ آنے والے بزرگ نے بھی نوجوان کی تائید کی۔

"ہاں، ہاں جاتا ہوں میں۔ آؤ پری بیٹا!" بوکھلایا ہوا شیر خان پری وش کو لے کر گھر کی طرف چل پڑا۔ گھر میں ماں اور اس کا چھوٹا بھائی پریشان بیٹھے تھے۔

"ہمیں ابھی ابھی گھر چھوڑنا ہوگا۔ سامان سمیٹنے کا وقت نہیں ہے، بس رقم اور سونا ساتھ لے لو تاکہ ضرورت کے وقت کام آسکے۔" شیر خان نے گھر میں داخل ہوتے ہی اعلان کیا تو ماں حیران پریشان اس کے حکم کی تعمیل کے لیے بھاگی۔ سوال اس لیے نہیں کیا کہ شیر خان کے لہجے سے ظاہر تھا کہ اس کی مہلت نہیں ہے۔ ایسا وقت وادی میں کبھی بھی، کسی بھی گھرانے پر آجاتا تھا اس لیے جو کچھ ہو رہا تھا، پریشان کن ضرور تھا لیکن زیادہ انوکھا نہیں۔

وہ لوگ گھر سے نکلے تو ایک آخری حسرت زدہ نظر ڈال کر نکلے۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ دوبارہ اس گھر کو دیکھنا نصیب بھی ہوگا یا نہیں۔

☆☆☆

"میرے خیال میں مجھے گھر جا کر حالات معلوم کرنے چاہئیں۔" صبح ہوتے ہی وہ گھر جانے کے لیے بے چین ہو گیا تھا۔

"نو..... ابھی تم سکون سے ناشتا کرو اور پھر روٹین کے مطابق اپنے کام پر بیٹھو۔ حالات جو بھی ہوں، خود ہی معلوم ہو جائیں گے۔ یہاں کون سا کوئی بات چھپتی ہے۔" بنجامن نے اسے واضح طور پر منع کر دیا۔ وہ اس کی بات ماننے کا پابند نہیں تھا لیکن اس لیے مان گیا کہ ایک تو اس کے خلوص پر پورا اعتماد تھا، دوسرا وہاں کا قدیمی رہائشی ہونے کی وجہ سے بنجامن حالات سے اس کی نسبت زیادہ واقف تھا۔

رات کے کھانے کی طرح ماریا بنجامن نے ناشتے پر بھی خاصا اہتمام کیا تھا لیکن اس کا کچھ بھی کھانے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ مشکل سے بس ایک توس چائے کی مدد سے حلق سے نیچے اتارا اور ہاتھ روک لیا۔

"تم کچھ کھا کیوں نہیں رہے ہو ینگ مین؟ میں نے اتنی محبت اور محنت سے تمہارے لیے اتنا کچھ بنایا ہے اور تم نے کسی چیز کو ہاتھ ہی نہیں لگایا۔" ماریا نے اسے یوں ہاتھ روکتے دیکھا تو ناراضی کا اظہار کرنے لگی۔

''سوری آنٹی! رات کو اتنی لیٹ، وہ بھی ہیوی ڈنر کیا تھا تو اب طبیعت کچھ کھانے کی طرف مائل نہیں ہو رہی۔'' اس نے معذرت کی۔

''وہ ہیوی ڈنر تو تمہارے انکل نے بھی کیا تھا لیکن دیکھو اب بریک فاسٹ سے بھی کتنا بھرپور انصاف کر رہے ہیں۔'' ماریا نے بنجامن کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اپنے سامنے ایک ساتھ دو پیالیاں رکھے بیٹھا تھا۔ ایک پیالی میں فروٹ سلاد اور دوسرے میں خشک میوہ جات اور دودھ شامل کر کے بنایا گیا جو کا دلیا بھرا ہوا تھا۔ وہ باری باری دونوں پیالیوں سے کھا رہا تھا۔

''میرے کھانے پینے پر نظر نہ رکھا کرو مائی ڈیئر وائف! میری عمر کے بندے کے لیے اچھی اور ہیلتھی ڈائٹ بہت ضروری ہے۔ اس عمر میں بندہ ڈائٹ کے زور پر ہی چلتا ہے۔ ہاں جوانوں کی بات الگ ہے۔ جوانی کا اپنا زور اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ دو چار ٹائم کی فاسٹنگ سے بندے کا کچھ نہیں بگڑتا۔''

''لیکن تم نے تو جوانی میں بھی کبھی کسی ایک ٹائم کا کھانا نہیں چھوڑا۔'' ماریا نے اسے یاد دہانی کروائی۔

''جس کی وائف اتنا ٹیسٹی کھانا بناتی ہو، وہ کوئی احمق ہی ہوگا جو خوامخواہ فاقے کرے۔'' جواب حاضر تھا جسے سن کر ماریا ہنس پڑی۔ اس کے ہونٹوں پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

''ہیپی لائف گزارنے کی یہ ٹرک سیکھ لو۔ وائف کی تعریف کرتے رہنا بہت ضروری ہے۔ تعریف سے عورتوں کا موڈ ٹھیک رہتا ہے اور شوہر کی لائف سکون میں گزرتی ہے۔'' بنجامن نے اس کی طرف جھک کر سرگوشی میں اسے سمجھایا جس پر اس نے مشکل سے اپنی مسکراہٹ ضبط کی۔ شکر ہے کہ ماریا ان کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ وہ ملازم کو کوئی ہدایت دے رہی تھی۔ باورچی خانے کے کاموں کے علاوہ یہ ملازم دن بھر دیگر چھوٹے بڑے کاموں میں بھی ان کی مدد کرتا تھا۔ صفائی وغیرہ کے لیے البتہ الگ ملازم تھا۔ گھر کے کسی گوشے سے آتی کھٹ پٹ کی آوازوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ملازم بھی آچکا ہے اور گھر میں صفائی ستھرائی کا کام جاری ہے۔

''تم نے مجھ سے کچھ کہا؟'' ماریا ملازم سے فارغ ہوئی تو بنجامن سے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ بس میں عمار سے کہہ رہا تھا کہ بریک فاسٹ کے سارے آئٹم ٹیسٹ کرے اور پھر ڈیسائڈ کرے کہ کل جو اس نے ڈنر کھایا تھا وہ زیادہ اچھا تھا یا یہ بریک فاسٹ؟'' بنجامن نے شوخ لہجے میں ماریا کو جواب دیا تو اس نے محسوس کیا کہ بنجامن کی آواز معمول سے کچھ بلند تھی۔ یکدم ہی اسے احساس ہوا کہ وہ یہ سب کچن اور قریبی کمرے میں کام کرتے ملازمین کے کانوں تک پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا اور مقصد یقیناً انہیں گواہ بنانا تھا کہ وہ رات سے یہیں ہے۔

''عمار کو چھوڑو، یہ بیچارہ تو بڑے تکلف سے کھاتا پیتا ہے لیکن تم جو رات کے بعد اب بھی ڈٹ کر کھا رہے ہو، تم بتاؤ کہ ڈنر زیادہ ٹیسٹی تھا یا بریک فاسٹ؟'' ماریا نے الٹا بنجامن کو ہی گھیر لیا۔

''ارے مجھ غریب کی کیا پوچھتی ہو۔ میں تو آج تک یہ ڈیسائڈ نہیں کر پایا کہ تم ویڈنگ نائٹ پر زیادہ حسین لگی تھیں یا اس کے بعد آنے والے ہر نئے دن۔''

''تم سے تو بس باتیں بنوالو۔'' بنجامن کے جواب پر ماریا کا چہرہ گلابی ہو گیا اور کچھ اس ادا سے بولی جو بس اسی کی نسل کی مشرقی خواتین کا خاصہ تھا۔ بدلتی اقدار نے عورتوں کو جہاں پریکٹیکل کیا تھا وہیں اس طرح کے ردعمل سے بھی دور کر دیا تھا۔

''تم ہماری گفتگو سے بور تو نہیں ہو رہے عمار؟'' بنجامن، ماریا کے ردعمل پر مسکرایا اور پھر اس سے پوچھا۔

''بور ہونے کے ساتھ ساتھ بیچارے کے سر میں بھی درد ہو گیا ہوگا اور سوچ رہا ہوگا کہ یہ اولڈ مین اور اولڈ لیڈی دن رات چونچیں لڑانے کے سوا کوئی کام نہیں کرتے کیا۔'' اس سے پہلے ماریا نے جواب دیا۔

''بالکل بھی نہیں آنٹی! میں تو رات سے بہت انجوائے کر رہا ہوں۔ آغا جان اور بی بی کے درمیان ایسی مزیدار جھڑپیں نہیں ہوتیں۔ بی بی، آغا جان کا اتنا احترام کرتی ہیں کہ شاید کبھی ان کے سامنے اونچی آواز سے بولی بھی نہ ہوں۔'' اس نے وہاں اسٹیج ہونے والے ڈرامے میں اپنا کردار کامیابی سے ادا کیا۔ اسے یقین تھا کہ میز پر سے خالی برتن اٹھا کر لے جاتے ملازم نے اس کے الفاظ اچھی طرح سنے ہوں گے۔

''زرینہ بھابی کا تو اسٹائل ہی الگ ہے۔'' بنجامن نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

''اور ان ہی کو سوٹ بھی کرتا ہے۔ تم اتنی ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھر کر مجھے ان جیسی وائف بننے پر قائل نہیں کر سکتے۔'' ماریا نے فوراً شوہر کو جتایا تو وہ ہنس پڑا۔

خوش گپیوں کے ساتھ ختم ہونے والے ناشتے کے

سلسلے کے بعد وہ اور بنجامن دکان پر پہنچ گئے۔ ابھی دیگر ملازمین نہیں پہنچے تھے۔ بنجامن نے اپنے معمولات کے ساتھ دن کا آغاز کرنے کے بجائے اپنی سیٹ سنبھالی اور اسے پکارا۔

"عمار! یہاں آؤ اور میری بات سنو۔"

"جی انکل!" وہ جو ابھی سسٹم آن ہی کرنے لگا تھا، بنجامن کے لہجے کی گمبھیرتا کو محسوس کر کے فوراً اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"یہاں بیٹھو۔" بنجامن نے اپنے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"کوئی مسئلہ ہے انکل؟" وہ کرسی پر بیٹھ تو گیا لیکن لہجے میں تشویش تھی۔

"مسئلہ تو ہے۔ تمہارے ہاتھوں زخمی ہونے والا انڈین سولجر کافی سیریس کنڈیشن میں اسپتال میں ہے اور......" بنجامن کی زبان لڑکھڑائی۔

"اور کیا؟" خدشات میں گھرے اس نے اونچی آواز میں پوچھا۔

"انڈین آرمی نے رات ہی تمہارے رہائشی علاقے کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ گھر گھر تلاشی کے دوران کئی جوانوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور...... اور......" بنجامن کی زبان ایک بار پھر کچھ کہنے سے انکاری ہوئی۔ اس نے زبان سے کچھ پوچھنے کے بجائے سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر جمادیں۔

"انہوں نے حاجی شیر خان کے گھر کو آگ لگادی تھی۔ سنا ہے پورا گھر جل کر راکھ ہوگیا ہے۔"

"اور حاجی شیر اور ان کی فیملی؟" وہ بے چین ہوا۔

"وہ لوگ پہلے ہی نکل گئے تھے۔ اب انڈینز اپنے سپاہی کو زخمی کرنے والے کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کو بھی زور وشور سے تلاش کر رہے ہیں۔ وادی میں کافی ٹینشن پھیلی ہوئی ہے۔" بنجامن نے ساری صورتِ حال اس کے سامنے رکھی۔

"آغا جان تو بہت پریشان ہوں گے۔ مجھے گھر جا کر انہیں تسلی دینی چاہیے۔" وہ وہاں جانے کے لیے پر تولنے لگا۔

"ابھی نہیں۔ سچویشن پوری طرح کلیئر ہوجائے۔" بنجامن نے اسے روکا جس پر اسے نہ چاہتے ہوئے بھی رکنا پڑا۔ کچھ دیر میں دکان پر کام کرنے والے دوسرے ملازمین بھی آنا شروع ہوگئے۔ آنے والوں کے پاس مزید خبریں تھیں۔ سب سے اہم بات جو پتا چلی وہ یہ تھی کہ تا حال وقوعہ والے پورے علاقے میں کرفیو نافذ تھا اور گھر گھر تلاشی کے ساتھ تفتیش و گرفتاریوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

کئی بار اس کا دل چاہا کہ اس شخص سے رابطہ کرے جس کے متعلق جبار علی نے اسے خصوصی ہدایات دی تھیں۔ وہ شخص اس کا جبار علی سے رابطہ بھی کروا سکتا تھا اور پھنس جانے کی صورت میں محفوظ راستے سے نکالنے کی کوشش بھی لیکن کوئی چیز تھی جو اسے ایسا کرنے سے روک رہی تھی۔ شاید دل کا وہ تعلق جو قیام کے اس عرصے میں ان لوگوں سے جڑ گیا تھا۔ آغا جان، زرینہ بی بی، حاجی شیر خان اور اس کا خاندان۔ سب ہی لوگ تو اتنے سے عرصے میں بہت پیارے لگنے لگے تھے اور دل نہیں مانتا تھا کہ ان لوگوں کو اس مصیبت میں گھرا چھوڑ کر اپنے لیے کوئی محفوظ راستہ تلاش کرے۔

دوپہر تک کا سارا وقت اسی بے چینی اور پریشانی میں گزرا۔ دکان کے ملازمین میں سے کئی لوگ جانتے تھے کہ وہ اسی علاقے کا رہائشی ہے۔ انہوں نے اس سے اس بارے میں معلومات لینے کی کوشش کی لیکن اس نے ہر ایک کو یہی بتایا کہ وہ رات سے بنجامن کے گھر میں رکا ہوا ہے اس لیے اسے بھی بس اتنا ہی معلوم ہے جتنا باقی لوگوں کو۔ اس نے آغا جان اور بی بی کے لیے تشویش کا اظہار بھی کیا مگر مسئلہ وہی تھا کہ ان کی خیریت معلوم کرنے یا انہیں اپنے بارے میں تسلی دینے کا کوئی ذریعہ ہی نہیں تھا۔ کرفیو کی وجہ سے کسی کا آنا جانا ممکن نہیں تھا اور فون سروس آرمی والوں نے خود بند کردی تھی۔ وہ بے دلی سے کی پیڈ پر انگلیاں چلاتا مارے باندھے معمول کا کام نمٹاتا رہا۔ دوپہر کے کھانے کا وقفہ ہونے میں کچھ دیر ہی باقی تھی کہ پہلے دکان کے باہر ٹائروں کی تیز چرچراہٹ سنائی دی پھر کھٹاکھٹ گاڑیوں کے دروازے کھلنا شروع ہوئے۔ متاثرہ علاقے میں جو بھی صورتِ حال تھی سو تھی، عمومی طور پر پوری وادی میں تناؤ کی سی کیفیت تھی اس لیے ان آوازوں کو کوئی بھی شخص معمول کی آوازوں کی طرح نظر انداز نہیں کر سکا۔ جو جہاں تھا اس نے اپنی جگہ چھوڑ کر یا کم سے کم گردن گھما کر ان مخصوص آوازوں کی وجہ جاننے کی کوشش ضرور کی۔ وہ خود ان لوگوں میں شامل تھا بلکہ وجہ جاننے کی کوشش کرنے والوں میں سب سے آگے کھڑا تھا اس لیے اسی نے سب سے پہلے بھارتی سپاہیوں کے یونیفارم کی جھلک دیکھی اور ان کا جارحانہ انداز میں سیڑھیاں چڑھ کر دکان میں داخل ہونا بھی محسوس کیا۔

ظلم وجبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان کی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب ناک تھا باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

"تو تم نے وہاں جانے کا پکا ارادہ کرلیا ہے؟" خشک پتوں کو جمع کرتے ہوئے نیچے جھکے جھکے جارج نے سوال کیا۔

"ہاں، بالکل پکا ارادہ...... اور اس فرائیڈے کو ہم روانہ ہو رہے ہیں۔" جارڈن نے حتمی لہجے میں اطلاع دی۔ جارج کام چھوڑ کر یکدم سیدھا کھڑا ہوگیا۔

"ہم، یعنی تم چاروں؟ تم کوئی سیکیورٹی گارڈ وغیرہ ساتھ نہیں لے جارہے؟" جارج کے لہجے میں تشویش تھی۔

"نہیں، بس ہم چاروں ہی جارہے ہیں۔ کسی سیکیورٹی کی ضرورت نہیں۔ ہم خود ہی کافی ہیں اپنی حفاظت کے لیے۔ تم بے فکر رہو۔" واٹسن نے مسکراتے ہوئے اسے تسلی دی۔

سحر انگیز جنگل میں شوخ و شریر چند دوستوں کی بدحواسیاں

کچھ لوگ زندگی کی مصروفیات سے بمشکل وقت نکال کر ضروری کام کرتے ہیں اور کچھ لوگ وقت کے سرمائے کو خرچ کرنے کے لیے غیر ضروری مصروفیات تلاش کرتے ہیں... وہ بھی وقت گزاری کے لیے پکنک کا پروگرام بنا کر مہم جوئی کا شوق پورا کرنے نکلے تھے مگر... مہم جوئی کے نام پر خطرات کو دعوت دے بیٹھے تھے... اور پھر وہی ہوا، نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم... لوٹ کے بدھو گھر کو آگئے۔

خطرناک درندہ

عیوق بخاری

"اور دیکھنا تم، چند دن بعد تمہارے فرینڈز یہاں بیٹھے تمہیں خطرناک سفر کی دلچسپ روداد سنا رہے ہوں گے۔" ایڈم بھی مسکرا رہا تھا۔

"میں تو کہتا ہوں تم بھی ساتھ چلو۔ تمہارے بھی چند دن اچھے اور ایڈونچر سے بھرپور گزر جائیں گے۔" کرسی پر نیم دراز رالسٹن نے جارج کو دعوت دی۔

"نہیں بھئی، میں تو تمہیں روک رہا تھا اس خطرناک سفر سے لیکن تم نہیں مانے۔ خیر، جاؤ مگر مجھے معاف ہی رکھو۔" جارج نے فوراً معذرت کی۔

"تم اکتائے نہیں روٹین لائف سے؟ چلو نا ہمارے ساتھ۔" ایڈم نے اصرار کیا۔

وہ چاروں اس وقت جارج کے نہایت وسیع و عریض لان میں کرسیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ لان کے ایک حصے میں پھول، پودے، گھاس تھی جبکہ آدھے حصے میں مختلف درخت اس طرح لگائے گئے تھے کہ وہ حصہ جنگل لگتا تھا۔ جارج اسی حصے کی صفائی کررہا تھا۔ جارڈن، رالسٹن، ایڈم اور واٹسن چاروں کے مختلف بزنس تھے جبکہ ان کے پانچویں فرینڈ یعنی جارج کا ڈیری فارم تھا۔ اپنی اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر وہ چاروں سنڈے کو کبھی کسی کے، کبھی کسی فرینڈ کے گھر اکٹھے ہوتے تھے۔

کچھ دنوں سے ایڈم کو ایک نئے شوق کا پتا چلا تھا۔ اس نے اس میں اتنی دلچسپی لی کہ باقی دوستوں کو اس میں مبتلا کرلیا، سوائے جارج کے۔ شوق کی تفصیل کچھ اس طرح سے تھی کہ ان کے شہر کے ساتھ جڑے شہر کے نواح میں قصبے اور اس سے کچھ فاصلے پر ایک گھنا جنگل تھا۔ اس کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ وہاں انتہائی قیمتی جڑی بوٹیاں اور قیمتی پتھر ہیں۔ پہلے تو وہ سب دوست اس معلومات پر ہنسے کہ اتنے عرصے سے کیا یہ چیزیں باقی لوگوں کی پہنچ میں نہیں آسکیں اور جنگل میں جڑی بوٹیوں کی موجودگی تو سمجھ میں آتی ہے لیکن قیمتی پتھر تو کہیں اور ہی پائے جاتے ہیں۔ جنگل کی مٹی، جھاڑیوں میں ان کا کیا کام؟ لیکن جب چھان بین کرکے تفصیلات سامنے آئیں تو ثابت ہوگیا کہ ایسا ہی ہے۔

اس جنگل میں ایسی ایسی بوٹیاں تھیں جو بہت سی ادویات بنانے کے کام آتی تھیں اور قیمتی پتھروں کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ بہت عرصہ قبل کوئی دولت مند شخص یہاں سے اپنا خزانہ جس میں ہیرے جواہرات تھے، لے کر گزرا تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی طوفان میں پھنس گئے۔ وہ بہ مشکل اپنی جان بچا کر تو نکل گئے لیکن اپنا قیمتی سامان یہیں چھوڑ گئے۔ مختلف اوقات میں کچھ لوگ وہاں گئے تو انہیں جڑی بوٹیوں کے علاوہ قیمتی پتھر بھی ملے لیکن ایسا چند بار ہی ہوا۔ دراصل جنگل کے گرے پتوں، مٹی و غبار نے انہیں ڈھانپ لیا تھا اور جنگلی جانوروں کے چلنے پھرنے سے یہ کہیں کے کہیں پہنچ چکے تھے۔

"یعنی اگر دھیان سے مٹی، پتوں کو اٹھا کر دیکھا جائے تو بہت سی دولت ہاتھ لگ سکتی ہے۔" رالسٹن نے بڑے اشتیاق سے کہا۔

"ہاں اور وہاں کی جڑی بوٹیاں تو اتنی قیمتی ہیں کہ منہ بولے داموں بک سکتی ہیں۔" ایڈم نے بتایا۔

"ہاں تو پھر کیا کہتے ہو ایڈم؟" واٹسن نے سوال کیا۔

"مجھے تو بہت شوق ہو رہا ہے کہ وہاں جائیں اور میں پہلی فرصت میں...... میرا مطلب ہے اس بار مصروفیات سے وقت نکال کر وہاں جانا چاہتا ہوں۔" ایڈم نے اطمینان سے جواب دیا۔ وہ واقعی وہاں جانے کے لیے تیار تھا۔

"تم نے انہیں وہ بات بتائی جس کا ذکر ہم ان کے آنے سے پہلے کررہے تھے؟" کافی دیر سے خاموش بیٹھے جارج نے یکدم پوچھا تو سب چونک پڑے۔

"کون سی بات ایڈم؟" جارڈن نے سیدھا بیٹھتے ہوئے کہا۔

"وہ...... وہاں کے خطرناک درندوں کے بارے میں بات کررہے تھے ہم۔ دیکھو، کسی بھی جنگل میں جنگلی جانوروں، درندوں کا خطرہ ہوتا ہی ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی ہے۔ سنا ہے کافی انوکھے اور کافی خطرناک درندے ہیں وہاں پر لیکن ان کے بارے میں یہ پتا چلا ہے کہ وہ دن کی روشنی میں ہرگز نہیں نکلتے۔ یعنی اپنے ٹھکانوں کے اندر یا جھنڈ وغیرہ میں چھپے رہتے ہیں اور بالکل بھی جنگل میں نہیں نکلتے لیکن جب شام گہری ہوجاتی ہے تو وہ باہر نکل آتے ہیں اور پھر رات کی تاریکی میں جنگل میں گھومتے پھرتے ہیں اور پھر صبح کی روشنی نمودار ہوتے ہی کونوں کھدروں میں چھپ جاتے ہیں۔ یعنی دن کی روشنی میں کام کیا جاسکتا ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں نہیں ڈرنا چاہیے۔ صحیح کہا میں نے؟" ایڈم نے پوری بات بتائی۔

"ہاں، کوئی بہت بڑی خطرناک بات تو نہیں ہے۔" رالسٹن جھٹ جانے کو تیار ہوگیا۔

"لیکن ہم ٹھہریں گے کہاں؟ دن کی روشنی میں ایڈونچر کرنے کے بعد کیا جلدی جلدی واپس شہر آجائیں گے؟" واٹسن نے بڑا اہم سوال کیا۔

"اس کا بھی انتظام ہوگیا ہے۔ جنگل میں داخل ہونے کے بعد محض چند فرلانگ پر ایک عمارت ہے جو کسی زمانے میں یقیناً گورنمنٹ کے استعمال میں رہی ہے۔ جس سے پوچھا تھا وہ بتا رہا تھا کہ بہت مضبوط عمارت ہے۔ وہاں ہم رہ سکتے ہیں۔ سارا دن مل کر جنگل کے کسی بھی کونے کی خاک چھانا کریں گے اور پھر شام سے پہلے واپس وہاں اپنی عارضی رہائش میں آجایا کریں گے۔ ہاں پانی، روشنی کے لیے جنریٹر کا انتظام کرنا پڑے گا۔" ایڈم کافی تیاری کرچکا تھا۔

"اگر اتنی دیر ہوجائے کہ لوٹتے لوٹتے شام گہری ہوجائے تو؟" جارج متفکر دکھائی دے رہا تھا۔

"بھئی ہم نے کون سا ہر صورت کوئی ٹاسک پورا کرنا ہے۔ بس سیر و تفریح، ایڈونچر کے لیے ہی جا رہے ہیں نا اس لیے بس اتنے ہی فاصلے پر جایا کریں گے جہاں سے واپسی دن کی روشنی میں ہی ہوجائے۔" ایڈم نے اطمینان سے یہ مسئلہ بھی حل کردیا۔ سب تیار ہوگئے کہ سیر بھی ہوگی، ایڈونچر بھی ہوگا اور شاید دولت بھی مل جائے۔ زیادہ نہیں تو کچھ جڑی بوٹیاں اور دو چار پتھر تو مل ہی جائیں گے۔ بس جارج نہیں مان رہا تھا۔

"چلو، ہیرے پتھر کا تو پتا چل جائے گا۔ چمکتی چیز یا اس سے ملتی جلتی کو ہم اٹھالیں گے لیکن جڑی بوٹیوں کے بارے میں تو ہمارا علم بالکل بھی نہیں ہے۔ وہ وہاں سے کس طرح اکٹھی کریں گے۔ میرا مطلب ہے اتنی ساری اقسام میں سے بغیر کسی علم اور تجربے کے کیسے پتا چل سکتا ہے کہ فلاں ہمارے کام کی ہے اور فلاں نہیں؟" رالسٹن نے سوال کیا۔

"لگ جائے گا پتا۔ معلومات حاصل کرنا آج کل کون سا مشکل رہا ہے اور ہم یہ بھی تو کرسکتے ہیں کہ کافی ساری جڑی بوٹیاں بغیر دیکھے بھالے یا سمجھے اکٹھی کر لائیں۔ یہاں لاکر کسی ماہر کے ذریعے پتا چل جائے گا کہ کون سی کارآمد اور کون سی فضول ہیں۔" ایڈم نے بڑا آسان اور قابلِ عمل حل بتایا۔

سارا دن اس موضوع پر بات ہوتی رہی لیکن اس سنڈے چاروں مل کر بھی جارج کو نہ منا سکے اور پھر انہوں نے اس کے بغیر ہی اس ایڈونچر بھرے ٹرپ کا فیصلہ کیا۔ آج وہ اپنی مکمل تیاری کرنے کے بعد جارج کے گھر اس سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ جارج نے پہلے تو انہیں روکا تھا لیکن جب وہ نہیں مانے تو اس نے انہیں مشورہ دینا شروع کردیا کہ کوئی سیکیورٹی گارڈ بلکہ گارڈز لے کر جاؤ لیکن دوستوں نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ وہ خود ہی اپنی حفاظت کرلیں گے۔

"ہمارے پاس ضروری اسلحہ یعنی پسٹل اور تیز دھار بڑے چاقو ہوں گے اور ویسے بھی کیونکہ درندے دن کے وقت نہیں نکلتے اس لیے ہمیں خاص خطرہ تو ہوگا نہیں۔ تم فکر نہ کرو، ہم دن کی روشنی کی موجودگی میں ہی کام کریں گے اور اسی میں واپس اپنی قیام گاہ پر آجائیں گے۔" واٹسن نے جارج کو یقین دہانی کروائی۔

"پھر بھی دھیان رکھنا۔ جنگل ہے، کئی خطرناک چیزیں اور بھی ہوسکتی ہیں۔" اپنے لیے چائے بناتے ہوئے جارج نے خبردار کرنا ضروری سمجھا۔

"اوکے بھئی، رکھیں گے دھیان۔" واٹسن نے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر ہنستے ہوئے کہا۔ وہ پانچوں ہلکی پھلکی باتیں کرتے ہوئے چائے پینے لگے۔ چائے سے فارغ ہوتے ہی وہ چاروں اٹھ کھڑے ہوئے۔

"خطرناک درندوں سے بچ کر جلدی آجانا، میں انتظار کررہا ہوں۔" جارج نے اونچی آواز میں پیچھے سے کہا۔ جواباً وہ ہنس کر سر ہلاتے ہوئے رخصت ہوگئے۔ جارج انہیں گاڑیوں میں بیٹھتے دیکھتا رہا۔ وہ مسلسل ان کی جانب دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلا رہا تھا۔ وہ اپنے عزیز دوستوں کے بارے میں بہت فکرمند تھا۔

☆☆☆

"لگتا ہے یہ جگہ آسیب زدہ ہے۔" رالسٹن نے اپنی عارضی قیام گاہ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ وہ دن کی روشنی میں وہاں پہنچ چکے تھے۔ کافی لمبا سفر اور پھر یہاں تک پہنچنا، سب تھکا دینے والا تھا۔ انہوں نے سب سے پہلے گیٹ کی مضبوطی چیک کی۔ واقعی عمارت اس قابل تھی کہ اس میں بہ حفاظت رہا جاسکے۔ ایک جگہ پر اپنا سامان، تھیلے وغیرہ رکھ کر انہوں نے ایک کمرا اس قابل بنالیا کہ رات کو وہاں سویا جاسکے۔ صفائی کے بعد وہ اتنے تھک گئے کہ کھانا بھی بہ مشکل کھایا اور آڑے ترچھے گر کر سوگئے۔ سونے سے پہلے اتنی تھکاوٹ کے باوجود وہ یہ فیصلہ کرچکے تھے کہ صبح ہوتے ہی جنگل میں نکل جانا ہے۔

☆☆☆

"امید ہے وہ جنگل میں خطرناک درندوں کی موجودگی کے باوجود خیریت سے ہوں گے۔" جارج نے آنکھیں بند کیے ہوئے کہا۔ مخاطب تو اس نے اپنی بیوی کو کیا تھا لیکن دراصل وہ خود کو ہی تسلی دے رہا تھا۔

''یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ تم فکر نہ کرو۔'' آئینے کے سامنے بیٹھی بال سنوارتی اس کی بیوی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ جب سے وہ چاروں سفر کے لیے روانہ ہوئے تھے، جارج کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

''ویسے مجھے سمجھ نہیں آتی کہ ایڈم کو یہ خطرناک اور فضول شوق کیوں لاحق ہوا جو اس نے رالسٹن، واٹسن اور جارڈن کو بھی لگا دیا۔'' جارج آنکھیں کھول کر تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

''اور مجھے سمجھ نہیں آتی کہ تم جو پانچ دوستوں کے گروپ کے ہر کام میں شامل ہوتے ہو، اس دلچسپ سفر پر کیوں نہیں گئے؟'' اس کی بیوی نے کہا۔

''مجھے شوق نہیں خطروں میں پڑنے کا۔ بے وقوفی ہے سراسر۔'' جارج نے سر جھٹکا۔

''تمہارا مطلب ہے تمہارے چاروں دوست بے وقوف ہیں؟'' جارج کی بیوی جینی بے اختیار ہنسی۔

''ہاں شاید میں یہی کہہ رہا ہوں۔'' جارج بھی ہنس دیا اور ریموٹ اٹھا کر ٹی وی چینلز بدلنے لگا۔

☆☆☆

''صبح کی روشنی کے باوجود یہ جگہ واقعی آسیب زدہ لگ رہی تھی۔'' جارڈن نے ناشتا کرنے کے بعد چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے تو آتے ہی کہہ دیا تھا۔'' رالسٹن ہنسا۔

''اگر واقعی بھوت پریت ہوئے تو؟'' جارڈن نے رالسٹن سے پوچھا۔

''تو...... تو پھر ہم فوراً بھاگ جائیں گے کیونکہ میں اتنا بہادر نہیں کہ بھوت پریت، بدروحوں کے باوجود اپنا کام جاری رکھوں۔ درندوں کی بات اور ہے۔ ان سے تو دروازہ بند کر کے بچا جاسکتا ہے لیکن یہ بھوت پریت تو بند دروازوں میں سے بھی آسکتے ہیں۔'' رالسٹن نے اپنا بیگ کھول کر سامان باہر نکالتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''تم نے غلط کہا میرے دوست کہ ہم بھاگ جائیں گے۔ یوں کہنا چاہیے کہ وہ ہمیں بھگا دیں گے۔'' جارڈن نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''بھاگتے ہوئے بس ایک دھیان رکھنا ہوگا۔'' ایڈم نے گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے کہا۔

''کیا؟'' جارڈن اور رالسٹن نے اس کی جانب دیکھا۔

''ہم ان بدروحوں یا بھوتوں سے درخواست کریں گے کہ پلیز ہمیں رات کی تاریکی میں مت بھگائیں کیونکہ اس وقت آپ کے جنگل کے درندے واک پر نکلتے ہیں۔ جتنا بھی ہم پر غصہ ہے، دن کی روشنی میں نکالیں۔'' ایڈم نے بڑی دلچسپ بات کہی۔

''تمہارا خیال ہے کہ وہ تمہاری بات آرام سے سن لیں گے۔'' واٹسن نے پوچھا۔

''ہاں، کوشش تو کریں گے کہ معاملات طے پا جائیں ورنہ یہ ڈر ہوگا کہ بھوتوں کے بعد اب درندے خطرہ بنیں گے۔'' ایڈم ہنسا۔

''میرا خیال ہے فضول کافی بول چکے ہیں، اب ذرا جنگل گھوم آئیں۔'' جارڈن نے یکدم سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ سب جلدی جلدی تیار ہوئے اور باہر نکل آئے۔ بعض جگہوں پر تو کافی... اندھیرا سا محسوس ہوتا تھا۔ وہ چاروں خاموشی سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے چل رہے تھے کہ رالسٹن نے خاموشی توڑی۔

''کچھ جگہ پر کافی اندھیرا سا لگتا ہے۔ کہیں درندے اسے شام کی تاریکی سمجھ کر باہر نہ آجائیں۔'' اس نے دل کا خدشہ زبان پر لاتے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں، ڈرو مت۔ اگر ایسا ہوتا کہ درندے محض اندھیرے یا کم روشنی میں بھی باہر نکل آتے ہیں تو معلومات دینے والے ضرور بتاتے لیکن ایسا نہیں ہے۔ وہ درندے ہیں، مخصوص وقت پر ہی نکلیں گے جبکہ ہم تو اس وقت تک اپنی محفوظ پناہ گاہ میں پہنچ چکے ہوں گے۔'' ایڈم نے پوری بات بتاتے ہوئے تسلی دی۔

''کچھ بوٹیاں نظر آرہی ہیں۔'' واٹسن نے اچانک ایک طرف دیکھتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ وہ چاروں جلدی سے اس جانب چلے جدھر واٹسن نے اشارہ کیا تھا۔ بوٹیوں کے نزدیک پہنچ کر وہ رک گئے اور غور سے دیکھنے لگے۔ روزمرہ زندگی میں اردگرد نظر آنے والی خودرو بوٹیوں، جھاڑیوں سے وہ کافی مختلف لگ رہی تھیں۔ جارڈن نے دستانے پہنے اور انہیں توڑ توڑ کر ایک بیگ میں ڈالنے لگا۔

''ہمیں یہ کہہ دینا چاہیے کہ ہمیں پہلی کامیابی مل گئی ہے کیونکہ یہ جڑی بوٹیاں کافی اہم دکھائی دے رہی ہیں۔ یعنی جتنا میرا تھوڑا بہت علم ہے اس کے مطابق۔'' ایڈم نے جارڈن کے ہاتھوں میں موجود جڑی بوٹیوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، کہہ سکتے ہیں۔'' واٹسن نے تائید کی۔

''بھئی میں تو کامیابی تب کہوں گا جب کوئی قیمتی ہیرا، پتھر وغیرہ ملے گا۔'' رالسٹن نے ہنس کر دل کی بات کہی۔

"لیکن ہمیں یہ ذہن میں رکھنا ہے کہ ہم ایڈونچر اور سیر وتفریح کے لیے آئے ہیں اور کوئی دولت یا قیمتی چیز حاصل کرنا ہمارا مقصد ہرگز نہیں اور ہم کچھ بھی نہ ملنے یا جڑی بوٹیوں کے عام سا ثابت ہونے پر خود کو ناکام نہیں کہیں گے۔" تھیلے میں بوٹیاں ڈالتے ہوئے جارڈن نے بڑی اہم بات کی جانب اپنے دوستوں کی توجہ مبذول کروائی۔

پہلا دن تھا۔ انہوں نے طے کیا کہ زیادہ تھکا نہ جائے اور زیادہ دور بھی نہیں جانا۔ بس اتنے فاصلے تک ہی جانا ہے کہ بھٹکے بغیر اور رات شروع ہونے سے پہلے واپس رہائش گاہ پر پہنچا جاسکے۔ چلتے چلتے وہ رک گئے۔ ایک جگہ بہت خوب صورت نظارہ دے رہی تھی۔ کچھ خشک اور کچھ سبز پتے والی ٹہنیاں ان کے سامنے تھیں۔ زمین پر پتے گرے ہوئے تھے اور دو تین درخت اس طرح گرے ہوئے تھے کہ ان کے تنے بہ آسانی بینچ کا کام دے سکتے تھے۔ وہاں دن کی روشنی بھی خوب پہنچ رہی تھی اور ہلکی ہلکی ہوا بھی چل رہی تھی۔

"بڑا انوکھا اور پُرسکون مقام ہے۔" جارڈن نے ایک ٹہنی اٹھا کر پتوں کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"درست کہا۔ ذرا یہاں بیٹھتے ہیں۔" ایڈم فوراً ایک گرے ہوئے تنے پر بیٹھ کر بولا۔ وہ چاروں تنوں پر بیٹھ گئے اور مزے سے گپ شپ کرنے لگے۔ شہر کے پُرشور ماحول سے دور سکون دیتی خاموشی میں وہ بہت انجوائے کررہے تھے۔

"چلو بھئی اب ہمارا ٹائم ختم اور جنگلی جانوروں کا شروع ہونے والا ہے۔" رالسٹن نے سب کو یاد دلایا کہ اب اٹھنا چاہیے۔ سب جلدی جلدی واپس اپنی قیام گاہ پر پہنچ گئے۔ ایڈم اور والسن کے ذمے رات کا کھانا پکانے کا کام تھا۔

☆☆☆

"بہت بوریت محسوس ہورہی ہے ان چاروں کے بغیر۔" پودوں کی کانٹ چھانٹ کرتے جارج نے جینی سے کہا۔

"حیرت کی بات ہے۔ تم کون سا ہر وقت اکٹھے رہتے ہو۔ ہفتے بعد ہی چند گھنٹوں کے لیے ملنا ہوتا ہے۔ ہاں، ہر وقت سیل فون پر رابطہ رہتا ہے، وہ ذرا ختم ہوگیا لیکن اب ایسا بھی نہیں کہ تم اتنی جلدی بور ہی ہوجاؤ۔" اس کا ہاتھ بٹاتے ہوئے جینی بولی۔

"جینی! تمہیں معلوم نہیں وہ کتنی خطرناک جگہ پر گئے ہیں۔ میں نے ابھی کل ہی اس جنگل کے بارے میں کسی سے بات کی تو اس نے بتایا کہ وہ بہت خوفناک اور خطرناک جنگل ہے۔ وہاں جانے کا سوچنا خودکشی کے مترادف ہے۔" جارج نے کام چھوڑ کر گھاس پر بیٹھتے ہوئے جینی کو بتایا۔

"دیکھو جارج! اب وہ چلے گئے ہیں۔ تم ان کے بارے میں صرف اچھا سوچو اور پلیز...... اپنے دل سے وہم نکال دو اور کسی اور سے بھی اس کے متعلق بات نہ کرو ورنہ تمہارے دل کا ڈر اور لوگوں کی دل دہلاتی باتیں تمہیں تمہارے دوستوں کے آنے تک ڈپریشن کا مریض بنادیں گی۔" جینی نے اس کے پاس بیٹھ کر نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا۔ جارج نے اثبات میں سر ہلایا اور کھڑا ہوکر پھر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ جینی اس کے چہرے کی پریشانی کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

"یہ...... یہ کیسی آواز ہے؟" رالسٹن نے ہڑبڑا کر اٹھتے ہوئے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ جارڈن اس کے قریب ہی لیٹا تھا۔ اس کی آنکھ بھی کھل گئی۔

"کیا ہوا رالسٹن؟" اس نے تیزی سے سوال کیا۔

"میں نے ایک بھیانک سی آواز سنی ہے۔" رالسٹن نے ڈرتے ڈرتے آہستہ سے کہا جیسے اسے ڈر ہو کہ کوئی سن نہ لے۔

"آواز......؟ بھئی ظاہر ہے کوئی جانور وغیرہ ہوگا۔" جارڈن نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اتنی عام آواز نہیں تھی کہ عام سے جانور کی سمجھی جائے۔" رالسٹن نے اتنا کہا ہی تھا کہ وہی آواز پھر اس طرح سنائی دی کہ ایڈم اور والسن کی بھی آنکھ کھل گئی۔ چاروں پھٹی پھٹی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

"کہیں...... کہیں انہیں پتا تو نہیں چل گیا کہ اس عمارت میں انسان ہیں اور...... وہ ہم پر حملہ آور ہونے کی تیاری کررہے ہوں؟" والسن نے کہا۔ اس کی آواز میں واضح طور پر خوف تھا۔ وہ چاروں سمٹ کر بیٹھ گئے جیسے ڈر ہو کہ کوئی خطرناک درندہ اندر آکر ان کے کمرے میں نہ گھس جائے۔ کافی دیر گزر گئی لیکن مزید کوئی آواز نہ سنائی دی۔

"آواز کہیں دور سے ہی آئی تھی۔" رالسٹن نے آہستگی سے بتایا۔

"ہاں، نزدیک کی آواز تو ہرگز نہیں لگ رہی تھی۔" جارڈن نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم محفوظ جگہ پر ہیں۔ ہمارے پاس اسلحہ بھی ہے۔ ویسے بھی واقعی وہ یہاں قریب ہرگز نہیں ہیں۔" ایڈم نے تسلی دی۔

"ویسے آواز تو کافی اونچی تھی، دور سے کیسے......؟" وائسن نے کہا۔

"رات کی تاریکی اور اس خاموشی میں بہت دور کی آواز بھی واضح سنائی دیتی ہے۔" ایڈم نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ایسی ہی تھوڑی سی گفتگو کے بعد وہ سونے کے لیے لیٹ گئے۔

☆☆☆

"کیا خیال ہے، نکلیں پھر جنگل میں؟" ایڈم نے باقی تینوں سے پوچھا۔

"ظاہر ہے ہم ایک جگہ بیٹھنے کے لیے تو یہاں نہیں آئے۔ نکلنا تو پڑے گا۔" جارڈن نے کہا۔ دن کے اجالے میں رات والا خوف ختم ہو چکا تھا۔

"اور دن کی روشنی میں کوئی خطرہ تو ہوگا نہیں تو پھر ہم ڈر کر کیوں بیٹھیں۔" سب سے پہلے بھیانک آواز سن کر ڈرنے والے رالسٹن نے بڑے اطمینان سے کہا۔ چند ہی منٹ میں سب تیار ہو کر باہر نکل گئے۔ آج انہوں نے پہلے دن سے مختلف راستہ چنا۔ وہ آپس میں ہنسی مذاق کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ رات والے خوف کا شائبہ تک نہ تھا۔

"میرا خیال ہے ہم اتنا فاصلہ طے کر چکے ہیں جتنا کرنا چاہیے۔ اب یہاں بیٹھتے ہیں۔" واٹسن نے رک کر اپنے کندھوں پر لدا ہوا چھوٹا سا بیگ نیچے رکھ کر پانی کی بوتل نکالتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہاں کوئی جڑی بوٹیاں نظر نہیں آرہیں۔" ایڈم نے مسکرا کر کہا۔

"بھئی یہ تو ہم طے کر کے چلے تھے کہ کچھ حاصل کرنا یا کوئی ٹاسک پورا کرنا ہمارا مقصد نہیں ہوگا تو پھر فرق نہیں پڑتا کہ یہاں کل کی طرح بوٹیاں ہیں یا نہیں۔" جارڈن نے کہا۔ وہ ایک سائڈ پر پڑے پتھر پر بیٹھ چکا تھا۔

"جارج بھی آجاتا تو کتنا اچھا ہوتا۔" ایڈم بولا۔

"ہاں، بالکل...... لیکن وہ تو اتنا خوفزدہ تھا کہ ہمیں بھی روک رہا تھا۔" رالسٹن نے ہنستے ہوئے کہا۔

"جب ہم یہاں سے جا کر دلچسپ سفر کی باتیں سنائیں گے تو ضرور پچھتائے گا۔" جارڈن نے کہا۔

"دلچسپ سفر کی باتیں؟ کیا یہ چند جڑی بوٹیاں دکھا کر اسے پچھتانے پر مجبور کریں گے؟" واٹسن نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"ارے بھئی ایک خوفناک جنگل میں آنا، دنیا سے الگ تھلگ ہو کر خطرناک جانوروں کی موجودگی میں رہنا، بہت سی اقسام کے درختوں، بوٹیوں سے بھرے جنگل کی سیر کرنا دلچسپ ہی تو ہے۔" جارڈن نے سمجھایا۔ وہ چاروں مختلف موضوعات پر باتیں کرنے لگے۔ جنگل کی پُرسکون فضا اور خاموش ماحول ان کی طبیعت پر بڑا اچھا اثر ڈال رہا تھا۔

باتیں کرتے کرتے لنچ کا ٹائم ہو گیا۔ اپنے اپنے بیگ میں سے ساتھ لائے ہوئے کھانے کے ڈبے نکال کر انہوں نے لنچ کیا اور پھر اٹھ کر اِدھر اُدھر گھومنے لگے۔ آج انہیں کوئی جڑی بوٹی ایسی نہیں دکھائی دی جسے وہ اپنے بیگ میں بھرتے۔ کچھ سیر کرنے کے بعد واپسی شروع ہو گئی۔ وہ تیز تیز قدموں سے چل کر واپس جا رہے تھے کہ اچانک جارڈن کو زوردار ٹھوکر لگی اور وہ منہ کے بل زمین پر گر پڑا اور خود ہی اٹھنا چاہا لیکن گردن اوپر اٹھاتے ہی وہ رک گیا۔ وہ اپنے سامنے کسی چیز کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہوا جارڈن! اٹھ کیوں نہیں رہے؟" ایڈم نے تشویش سے کہتے ہوئے جھک کر اس کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا۔

"وہ...... وہ دیکھو" جارڈن نے سرگوشی والے انداز میں کہا۔ تینوں نے ادھر دیکھا جدھر جارڈن نے انگلی سے اشارہ کیا تھا۔ سامنے چند چمکدار پتھر نظر آرہے تھے جو یقیناً بہت قیمتی تھے۔ ایڈم نے نیچے جھک کر انہیں اٹھایا۔ چاروں بڑے اشتیاق سے ایڈم کی ہتھیلی کو دیکھ رہے تھے جس پر وہ پتھر پڑے تھے۔ ہتھیلی پر غور کرتے کرتے انہوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور بے اختیار مسکرا دیے۔

واقعی...... وہ قیمتی پتھر تھے...... نہایت قیمتی۔

☆☆☆

"میں نے ایک دوبار سوچا ہے کہ میں بھی ان کے پیچھے چلا جاؤں۔ کس طرف جانا ہے اور کیسے جانا ہے یہ تو مجھے انہوں نے بتا دیا تھا لیکن......" جارج نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ اور جینی رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ آج کل جارج کا یہ حال تھا کہ کھانے کی ٹیبل ہو یا لان، بیڈروم میں ہو یا گاڑی میں، وہ اپنے دوستوں کے بارے میں سوچتا رہتا یا ان کے متعلق بات کرتا رہتا تھا۔ آخر اس کے دوست خطرناک سفر پر گئے ہوئے تھے۔ ان پر سوئی اٹک جانا بلاجواز نہیں تھا۔

"لیکن کیا؟" جینی نے اس کی طرف دیکھا۔

"میں نے سوچا کہ وہ تو ٹیم کی صورت میں گئے ہیں اور نہ جانے کیا مشکلات برداشت کر کے پہنچے ہیں۔ میں اکیلا شاید یہ سب نہ کر پاؤں۔" جارج نے عذر پیش کیا۔

"اگر تم جانا چاہو تو جا سکتے ہو۔ وہ وہاں ہیں تو تم بھی اگر کوشش کرو تو وہاں پہنچ سکتے ہو۔" جینی نے کہا۔

''جینی! ایسا تو ہے نہیں کہ وہ کسی ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔ میں نارمل طریقے سے ڈرائیو کرتا ہوا جاؤں اور ان تک پہنچ جاؤں۔ وہ ایسی جگہ پر گئے ہیں جہاں...... جہاں جانے سے پہلے سو طرح کی تیاری کرنا پڑتی ہے اور خطرناک درندوں کے بارے میں تو اتنا کچھ سن لیا ہے کہ سوچ کر ہی جھرجھری آجاتی ہے۔''

''جارج! کھانا کھانے دو اور تم بھی کھاؤ۔ پلیز! اب میرا دماغ مزید مت کھاؤ۔'' جینی چڑ سی گئی۔

☆☆☆

''ہمیں بہت بڑی کامیابی ملی ہے۔'' رالسٹن نے خوشی سے کہا۔ ''ہمارا آنا بہت فائدہ مند ثابت ہوا ہے۔'' رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ چاروں درمیان میں قیمتی پتھر رکھ کر ان کے بارے میں بات کرنے لگے۔

''رالسٹن! تم نے درست کہا اور مجھے یاد ہے کہ تم نے پہلے ہی دن کہہ دیا تھا کہ کوئی قیمتی ہیرا، پتھر ملنے کو ہی میں بڑی کامیابی کہوں گا۔'' واٹسن نے یاد دلایا۔

''ہاں واقعی، ہم نے بہت بڑی چیز پالی ہے اور اب ہم کل......'' ایڈم نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ کر دوستوں کی طرف دیکھا۔

''ہم کل پھر وہاں جائیں گے جہاں سے یہ ملے ہیں اور وہاں مزید ہیروں کی تلاش کا کام کریں گے۔'' وہ خوشی سے بیک وقت چلائے اور پھر سونے کے لیے لیٹ گئے۔

اس رات بھی انہیں چند آوازیں سنائی دیں لیکن کسی بھی قسم کا نقصان نہ ہونے اور قیمتی پتھر مل جانے کی خوشی نے انہیں زیادہ خوفزدہ بھی نہ ہونے دیا۔ کچھ ہی دیر میں چاروں گہری نیند سو چکے تھے۔

اگلی صبح انہوں نے جلدی جلدی ناشتا کیا اور گزشتہ دن والے مقام پر جا پہنچے۔ وہ اپنے ساتھ چند ایسی چیزیں بھی لے گئے جن سے پتے اور مٹی ہٹانے کا کام لیا جا سکے۔ وہاں پہنچتے ہی انہوں نے جلد ہی کام شروع کر دیا۔ پتوں کے ڈھیر ادھر سے اُدھر کیے، مٹی بھی ہٹائی۔ نتیجہ ان کی توقع کے بالکل مطابق نکلا۔ بہت سے ہیرے ان کے ہاتھ لگے۔

''جلدی جلدی جمع کرلو، واپس جا کر برابر بانٹ لیں گے۔'' جارڈن نے ماتھے سے بال ہٹاتے ہوئے سرشاری کی سی کیفیت میں کہا۔

''کیا ہم بہت زیادہ دولت مند ہونے والے ہیں؟'' جارڈن نے مسکراتے ہوئے وہ سوال کیا جس کا جواب اسے اچھی طرح معلوم تھا۔

''ہاں جارڈن! تمہارا خیال بالکل درست ہے۔'' واٹسن نے بیگ میں ہیرے ڈالتے ہوئے کہا۔

''تو پھر کیسا رہا میرا پلان؟'' ایڈم اترایا۔

''شاندار۔'' جواب ملا۔

اگلے دن مزید آگے جانے اور دولت تلاش کرنے کا فیصلہ کرنے کے بعد وہ واپسی کے لیے چل دیے۔

اگلے تین دن تک نہ صرف انہوں نے بہت سے قیمتی ہیرے، پتھر، جڑی بوٹیاں جمع کرلیں بلکہ ساتھ ہی کچھ ایسی پرانی چیزیں بھی ہاتھ لگیں جن کا شمار قیمتی نوادرات میں ہوتا تھا۔ وہ ہر روز بیگ بھر کرلے جاتے اور اپنی قیام گاہ میں لے جا کر رکھ دیتے اور اگلے دن مزید چیزیں اور دولت جمع کرنے چلے جاتے۔

''میرا خیال ہے ہمیں لالچ میں نہیں پڑنا چاہیے۔ کافی سے بھی زیادہ دولت ہم جمع کر چکے ہیں۔ اب واپس چلنا چاہیے۔'' رالسٹن نے کہا۔ وہ چاروں جانوروں کی آوازیں سن کر بیدار ہوئے تھے۔ آدھی رات سے زیادہ گزر چکی تھی۔ صرف فائدہ ہی فائدہ پا کر وہ بہت بے فکر ہو گئے تھے لیکن رالسٹن کی توجہ مبذول کراتے ہی انہوں نے بھرپور تائید کی۔

''ہاں واقعی، اب واپس چلنا چاہیے۔ ہم بہت خطرناک جگہ پر رہ رہے ہیں۔ اگر اتنے دنوں سے کچھ نہیں ہوا تو ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ ہماری خوش قسمتی ہے اور کبھی بھی کچھ ہونے کا خدشہ بہر حال ہے۔'' جارڈن نے فوراً تائید کی۔ تھوڑی ہی گفتگو میں بغیر کسی بحث کے یہ طے پایا کہ اگلی صبح وہ بس آخری بار جنگل کا چکر لگائیں گے اور اس سے اگلی صبح واپسی کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔

''اتنی ڈراونے والی اور دہلا دینے والی باتیں سنی تھیں اس جنگل کے بارے میں کہ عجیب اور ڈراؤنی شکل کے خونخوار درندے ہوتے ہیں۔ شدید طوفان آتے ہیں۔ وہاں رہنا تو دور کی بات، چند گھنٹے بھی گزار لینا ناممکن ہے لیکن دیکھو ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔'' ایڈم نے چلتے چلتے بات کرنا شروع کی۔

''ہاں واقعی، ہمارا خوف اور اندازے غلط ثابت ہوئے اور ہم نے اس ٹرپ کا بھرپور فائدہ حاصل کیا ہے۔'' رالسٹن نے کہا۔ باقی دو نے بھی بھرپور تائید کی۔ اس روز کچھ اور ہیرے وغیرہ ہاتھ لگے۔ ان کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ ایک جگہ پر بیٹھ کر وہ گپ شپ کرنے لگے۔

''لو بھئی، آج اس جنگل کی سیر، یہاں کے ایڈونچر،

یہاں کی کھوج کا آخری دن ہے۔ جی بھر کر اسے دیکھ لیں اور اس کے ماحول کو انجوائے کر لیں پھر تو اب ہم اسے دیکھنے یا یہاں آنے کا سوچیں گے بھی نہیں کیونکہ عقل مندی کا یہی تقاضا ہے کہ اگر اس بار کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا تو اگلی بار کسی بھی خدشے کے پیشِ نظر ایسی جگہ پر آنے سے گریز کیا جائے۔'' جارڈن نے ایک تنے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

''درست کہہ رہے ہو تم۔ آج لنچ کے بعد جلدی واپس نہیں جائیں گے بلکہ زیادہ وقت رکیں گے اور پھر شام گہری ہونے سے پہلے جلدی جلدی واپس چلے جائیں گے۔'' واٹسن نے ایک ٹہنی ہاتھ میں پکڑ کر اس کے پتوں کو غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''ہلکے ہلکے بادل ہو رہے ہیں۔'' درختوں کے بیچ میں سے آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے ایڈم نے اطلاع دی۔

''ہاں، لیکن بارش وغیرہ کے آثار ہرگز نہیں لگ رہے۔'' رالسٹن نے بے فکری سے کہا۔ چاروں ہنستے، قہقہے لگاتے، جنگل میں آخری دن بھرپور گزارتے ہوئے وقت کا احساس اور موسم کی تبدیلی بھول گئے۔ چونکے اس وقت جب ان پر بارش کے قطرے پڑے۔

''ارے یہ کیا؟'' اوپر کی جانب دیکھتے ہوئے وہ بولے اور تیزی سے تھیلے اٹھا کر تیز تیز چلنے لگے۔ بارش لمحہ بہ لمحہ تیز سے تیز تر ہونے لگی۔ بادلوں کو دیکھ کر لگایا گیا اندازہ بالکل غلط ثابت ہوا تھا۔ وہ بھاگنے والے انداز میں چل رہے تھے کہ تیز ہوا بھی چلنے لگی۔

''اوہ...... یہ شاید طوفان ہی ہے۔'' جارڈن نے فکرمندی سے کہا۔ قدموں میں مزید تیزی آگئی لیکن چند منٹ بعد ہی انہیں بے اختیار اور خوفزدہ ہو کر رکنا پڑا۔ ایک درخت کا بڑا سا حصہ زوردار آواز کے ساتھ ٹوٹ کر ان کے سامنے آگرا۔ اس طرح کہ ان کا راستہ بند ہو گیا۔

''رکو مت، دوسرے راستے سے چلو۔'' ایڈم چیخ کر بولا۔ وہ سب چند قدم پیچھے ہٹے اور دوسرے راستے پر تیزی سے چلنے لگے۔ بارش اور ہوا کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ اندھیرا بھی چھا رہا تھا۔ یہ بادلوں کی وجہ سے ہونے والا اندھیرا نہیں تھا بلکہ شام گہری ہونے کی وجہ سے تھا۔

☆☆☆

''کافی تیز بارش ہے۔'' کچن سے باہر آتے ہوئے جینی بولی۔ جارج جو لاؤنج کے شیشے سے لان میں برستی بارش کو کافی دیر سے غور سے دیکھ رہا تھا، جینی کی بات سے چونک اٹھا۔

''ہاں بالکل۔ بہت تیز ہے اور لگتا ہے کافی دیر ہوتی رہے گی۔'' وہ جینی کی جانب مڑ کر بولا۔

''اوہ...... تو تم یہ سوچ رہے ہو کہ جہاں تمہارے پیارے دوست گئے ہوئے ہیں، کہیں وہاں بارش تو نہیں ہو رہی؟'' جینی یکدم بولی۔

''وہاں بارش نہیں طوفان آتا ہے...... شدید طوفان۔ یہی سنا ہے میں نے۔'' جارج کے لہجے میں فکر ہی فکر تھی۔

''جارج! تم واقعی پاگل ہو گئے ہو۔ یعنی تم سوچ رہے ہو کہ یہاں سے میلوں دور ایسے ہی تیز بارش ہو رہی ہوگی اور پھر جنگل میں وہ طوفان کی صورت اختیار کر کے تمہارے دوستوں کو پریشان کرے گی۔'' جینی نے تیز لہجے میں کہا۔ وہ جارج کے چند دنوں کے رویے سے تنگ آچکی تھی۔

''پاگل ہو تم۔ سنا نہیں موسم کی پیشگوئی کرنے والے کیا کہہ رہے ہیں؟ انہوں نے بہت سے شہروں اور علاقوں میں بارش و طوفان کے خدشے کے پیش نظر الرٹ رہنے کا کہا ہے۔ اس میں وہ علاقہ بھی شامل ہے جہاں ایڈم، رالسٹن، جارڈن اور واٹسن گئے ہوئے ہیں۔'' جارج نے اسی کے لہجے میں جواب دیا اور کافی کا مگ اٹھا کر منہ سے لگایا پھر باہر دیکھنے لگا۔ جینی سر جھٹک کر دوسری جانب دیکھنے لگی۔

☆☆☆

طوفان تیزی اختیار کر رہا تھا اور وہ چاروں بھاگتے ہوئے اپنی قیام گاہ تک پہنچنے کی کوشش میں تھے۔ آدھا راستہ طے کر لیا تو یکدم طوفان تھم گیا۔ بالکل ویسے ہی جیسے اچانک آیا تھا۔ بارش بہت ہلکی ہو گئی تھی اور ہوا رک گئی تھی۔

''چلو کچھ تو سکون ہوا لیکن دھیان رکھنا ہوگا کہ ہم پتوں کے اوپر چلتے ہوئے پھسلنے والی جگہ سے بچیں اور ہاں...... ٹارچ روشن کر لیتے ہیں۔ اندھیرا ہو رہا ہے۔'' جارڈن نے بیگ سے ٹارچ نکالتے ہوئے کہا۔ وہ سب سنبھل سنبھل کر چلنے لگے۔ چاروں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام رکھے تھے تاکہ پھسلنے یا گرنے کی صورت میں ایک دوسرے کو فوری سنبھالا جا سکے۔

''یہ اندھیرا کچھ زیادہ نہیں ہو گیا؟'' رالسٹن کو اچانک خوفناک احساس ہوا۔

''ہاں، بس جلدی چلو۔ فکر نہ کرو، کچھ نہیں ہوگا۔'' واٹسن نے خود کو اور دوستوں کو دلاسا دیا۔

طوفان تھما تو اب درندوں، جنگلی جانوروں کے خوف نے انہیں گھیر لیا تھا۔ اندر سے ڈر رہے تھے لیکن بظاہر پُرسکون وہ چاروں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے چل رہے تھے کہ

انہیں ایک غراہٹ نما بھیانک سی آواز قریب سے سنائی دی۔ بہت خوفزدہ ہوتے ہوئے انہوں نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر دیکھتے رہ گئے۔ کچھ ہی فاصلے پر بہت بڑے سائز کا انتہائی بھیانک شکل اور خوفناک آنکھوں والا جانور انہیں گھور رہا تھا۔ ایسا ڈراؤنا منظر تھا کہ ان کی سانسیں رکنے لگیں۔ ان کے قدم دہشت کے مارے جم سے گئے۔ خوفناک درندوں کا ایک گروہ وہاں موجود تھا۔ ان آوازوں نے ان کا سکتہ توڑ دیا۔

”بھاگو۔“ رالسٹن نے بہ مشکل منہ سے نکالا۔ زندگی بچانے کی خاطر وہ اندھا دھند بھاگے۔ بھاگتے ہوئے وہ دو تین بار گرے لیکن جان بچانے کا جذبہ انہیں پھر اٹھا دیتا۔ ان کی خوش قسمتی تھی کہ جانوروں کو درختوں کے جھنڈ میں سے نکلتے ہوئے کچھ لمحے لگے۔ یہی لمحے قدرت نے ان کے لیے نئی زندگی دینے والے بنا دیے۔

بھاری جسم کے باوجود درندے بڑی تیزی سے ان کا پیچھا کر رہے تھے۔ چند دن سے وہاں گھومنے پھرنے کی وجہ سے راستوں سے واقفیت ہو چکی تھی اس لیے وہ چھلانگیں لگاتے، اِدھر اُدھر کودتے، راستہ بدل بدل کر بھاگ رہے تھے۔

”ہم...... ہم ان سے دور نکل آئے ہیں...... دیکھو، غور کرو...... آوازیں نہیں آرہیں۔“ ایڈم نے ہانپتے ہوئے بہت بڑی خبر دی۔ واٹسن، رالسٹن اور جارڈن رک گئے اور گہرے گہرے سانس لینے لگے۔ واقعی اب ان کا پیچھا نہیں ہو رہا تھا۔ وجہ جو بھی تھی، اب ان کی آوازیں اور قدموں کی خوفناک دھمک بند ہو گئی تھی۔

”ہم...... بچ گئے ہیں۔“ واٹسن نے ٹارچ جلاتے ہوئے خوشخبری سنائی۔

”ہاں...... ٹھیک کہا تم نے۔“ جارڈن کی آواز میں کپکپاہٹ سی تھی۔ خود کو گھسیٹتے ہوئے وہ چاروں اپنی قیام گاہ پر پہنچے اور کندھوں پر موجود تھیلوں کو اتار کر آڑے ترچھے گر گئے۔ بڑے تھیلے جنہیں وہ گھسیٹ کر لا رہے تھے، وہ تو جان بچانے کے عمل میں وہیں رہ گئے تھے۔

”صبح...... بہت جلدی...... یہاں سے نکل جائیں گے۔“ ایڈم نے غنودگی کے عالم میں اطلاع دی۔

”ہاں بالکل۔ ناشتا بھی جنگل سے نکل کر ہی کریں گے۔“ جارڈن نے رک رک کر کہا۔

☆☆☆

”تمہاری آنکھوں کو دیکھ کر لگ رہا ہے کہ تم رات کو ٹھیک طرح سے سوئے نہیں۔“ جینی نے جارج کے قریب

جواب

دو شیخی خور شیخیاں بگھار رہے تھے۔ ایک شخص نے کہا۔ ”ہمارے علاقے میں اگر تم زور سے کوئی بات کہو تو ٹھیک چار منٹ بعد اس کی بازگشت آکر تم سے ٹکرا جائے گی۔“

دوسرا بولا۔ ”یہ تو کچھ بھی نہیں ہے دوست! میں عموماً اپنے علاقے میں ہرن کے شکار کو جاتا ہوں۔ ہرن ہمیشہ علی الصباح ملتے ہیں۔ چنانچہ میں سرِشام خیمے سے باہر نکل کر زور سے کہتا ہوں ”بس بھائی! خوب سو چکے، اب جاگ اٹھو اور ہرن شکار کرو۔“ یہ کہہ کر میں اپنے بستر پر آکر لیٹ جاتا ہوں۔ ٹھیک چھ گھنٹے بعد میری بازگشت واپس آتی ہے اور مجھے جگا دیتی ہے۔“

(مرسلہ: صبا سحر، کراچی)

ہوشیار ملازم

گھر گھر ڈبل روٹی فروخت کرنے والی کمپنی نے ایک نوجوان پٹھان کو ملازم رکھا۔ پہلے روز جب پٹھان ڈبل روٹیاں تقسیم کرنے گیا تو تھوڑی ہی دیر بعد کمپنی کو فون موصول ہوا۔ ”تم نے روٹیاں تقسیم کرنے کے لیے ایک پٹھان کو ملازم رکھا ہے؟“

”ہاں۔“ جواب دیا گیا۔ ”کوئی خاص بات؟“

”بہت ہی خاص بات ہے۔ وہ ہمارے ہاں آیا اور میری ذرا سی بات پر چراغ پا ہو گیا۔“

”ابھی نیا نیا ہے۔ آئندہ کے لیے اسے ہدایت کر دی جائے گی کہ گاہکوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آیا کرے۔“

”پوری بات تو سنو۔“ فون کرنے والے نے چیختے ہوئے کہا۔ ”اس کی لال پیلی آنکھیں دیکھ کر مجھے بھی غصہ آ گیا اور میں نے فوراً اپنا پستول اس پر تان لیا۔“

”ارے نہیں۔ کہیں تم نے گولی تو نہیں چلا دی؟“

”مجھے بات تو پوری کرنے دو۔ دیکھو جب وہ ڈبل روٹیاں تقسیم کر کے واپس آئے تو اس سے کہنا براہِ مہربانی میرا پستول لوٹا دے۔“

(مرسلہ: نازش علی، مری)

آتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ پودے تھے۔ وہ اور جارج لان میں موسمی سبزیاں لگا رہے تھے۔ جارج نے ناشتا بھی ڈھنگ سے نہیں کیا تھا اور اب لان کی تیاری اور سبزی لگاتے وقت بھی خاموش تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور بال بکھرے بکھرے تھے۔

''ہاں جینی...! میں واقعی رات کو ٹھیک سے نہیں سو پایا۔'' جارج نے ایک پودے کے گرد مٹی ٹھیک کرتے ہوئے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

جینی نے ''کیوں'' کہنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ وہ اس کا جواب جانتی تھی۔

''میں نے رات بہت بھیانک خواب دیکھا۔ خواب دیکھتے دیکھتے میری آنکھ کھل گئی اور پھر اس خواب پر غور کرتے ہوئے میری نیند اڑ گئی۔'' جارج نے خود ہی بولنا شروع کر دیا۔

''بھیانک خواب...... کیا مطلب...... کیا دیکھا تم نے؟'' جینی نے ہاتھ میں پکڑے پودے زمین پر رکھے اور وہیں بیٹھ گئی۔

''خواب میں مجھے اپنے چاروں دوست بہت بُری حالت میں نظر آئے ہیں۔ نہ جانے کیوں یہ اندیشہ ستا رہا ہے کہ وہ کسی بہت بڑی مصیبت میں پھنس چکے ہیں۔'' جارج نے فکرمندی سے کہا۔

''جارج! دراصل تم ہر وقت ان کے بارے میں پریشان رہتے ہو اس لیے دن بھر کے پریشان کن خیالات رات کو بھیانک خواب بن گئے ہیں۔ تم پُرسکون رہو، کچھ نہیں ہوگا انہیں۔'' جینی نے جارج کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی۔ جارج کچھ نہیں بولا۔

''چلو اب باقی کا کام نمٹا لیں۔'' جینی نے کچھ پودے اسے تھماتے ہوئے دھیان بٹانے کی کوشش کی۔

☆☆☆

صبح ہوتے ہی واٹسن، جارڈن، رالسٹن اور ایڈم نے بجلی کی سی پھرتی دکھاتے ہوئے سامان سمیٹا اور جنگل سے باہر نکلنے کی تیاری مکمل کر لی۔

''پہلے تو اتنا خوف محسوس نہیں ہوتا تھا لیکن اپنی آنکھوں سے خوفناک درندوں کو دیکھ کر اب تو دن کی روشنی میں بھی باہر نکلتے ہوئے گھبراہٹ سی محسوس ہو رہی ہے۔'' واٹسن نے ایک تھیلا کندھے پر لٹکاتے اور دو ہاتھوں میں پکڑتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم سب کی زندگی بچ گئی ورنہ کئی بار ایسا لگا تھا جیسے بس اب ہم ان کا شکار بننے ہی والے ہیں۔'' ایڈم نے تائید کی۔

''ہم بہت سی دولت لے کر جا رہے ہیں۔ میرا خیال ہے جان بچ جانے کی خوشی میں ہمیں جارج کو چند قیمتی پتھر تو بطور تحفہ دے دینے چاہئیں۔'' رالسٹن نے مسکراتے ہوئے تجویز دی۔

''کیوں نہیں۔ اتنی دولت میں سے ایک چھوٹا سا گفٹ تو ہم جارج اور مسز جارج کو دے ہی سکتے ہیں۔'' جارڈن نے فوراً کہا۔ ایڈم اور واٹسن نے بھی تائید کی۔

چاروں بہت خوش تھے۔ جنگل کی خطرناک چیزوں، درندوں، طوفان سے بچ کر وہ شہر کی پُررونق زندگی میں جا رہے تھے۔ چاروں نے اپنے تھیلے اٹھائے اور تیز تیز قدم اٹھانے لگے۔ وہ جلد از جلد دن کی روشنی میں جنگل کے اس حصے میں پہنچنا چاہتے تھے جہاں ان کی گاڑی تھی جو انہوں نے جنگل میں داخل ہوتے ہی ایک محفوظ جگہ پر کھڑی کر کے ڈھانپ دی تھی اور ٹیڑے میڑھے راستوں کے ایڈونچر کے لیے پیدل چل دیے تھے۔

''ابھی دن کا آغاز ہوا ہے اور ہم نے کافی فاصلہ طے کر لیا ہے۔ میرا خیال ہے کچھ ہی دیر میں گاڑی تک پہنچ جائیں گے۔'' جارڈن نے جوش و خوشی سے کہا۔

''اور پھر اس کے کچھ ہی دیر بعد سڑک پر اور پھر اس جنگل سے بہت دور اپنے شہر میں۔'' واٹسن ہنسا۔

''فرینڈز! ہم چاروں بہت لکی ہیں۔ ہمارا یہ ٹرپ بہت فائدہ مند رہا ہے۔ جب یہاں آ رہے تھے تو اتنا فائدہ مل جانے کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ بس اتنا ہی بہت سمجھ لیا تھا کہ جان بچا کر یہاں سے واپس چلے جائیں لیکن دیکھو، ہم نہ صرف طوفان اور درندوں سے محفوظ رہے بلکہ گزشتہ شام جنگل میں ہی رہ جانے والے تھیلوں کے باوجود ہم نے خوب جڑی بوٹیاں، قیمتی پتھر اور چند نوادرات بھی جمع کر لیے ہیں اور اب آج صحیح سلامت واپس گھر جا رہے ہیں۔'' ایڈم کی خوشی دیدنی تھی۔

وہ چند قدم ہی چلے تھے کہ انہیں پتوں کے اوپر کسی کے چلنے کی آواز محسوس ہوئی۔

''یہ کیا ہے؟'' واٹسن نے ادھر دیکھا جدھر سے آواز آتی محسوس ہو رہی تھی۔

''کوئی عام سا جانور ہوگا جو......'' جارڈن کی بات ادھوری رہ گئی۔ جن کے قدموں کی آہٹ سنی تھی اب وہ

ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ
کے صفحات پر بہت جلد
ایک نئے سلسلے کا آغاز
جنگل کا قانون نافذ کرنے والے انسانی تذلیل
کے مرتکب درندوں سے
ٹکرا جانے والوں کی خونی داستان
جنگل
امجد جاوید کے قلم سے
pklibrary.com

سامنے موجود تھے۔ چاروں کی آنکھوں میں خوف پیدا ہوگیا۔ وہ قریب آتے جا رہے تھے۔

'ان درندوں سے بچنا شاید ہی ممکن ہو' چاروں کے دل میں ایک ہی خیال آیا تھا۔

☆☆☆

بارش کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ سورج کئی دنوں بعد نکلا تھا۔ جارج اپنے فارم پر موجود تھا اور کام میں مصروف تھا کہ اس کا سیل فون بج اٹھا۔ کوئی اجنبی نمبر تھا۔ جارج کے ''ہیلو'' کے جواب میں دوسری جانب سے جو کہا گیا اسے سن کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ جلدی سے سیل فون آف کر کے وہ گاڑی کی جانب بھاگا اور گاڑی تیزی سے بھگاتا ہوا اس اسپتال جا پہنچا جہاں سے اسے اطلاع ملی تھی کہ اس کے چاروں دوست زخمی حالت میں وہاں موجود ہیں۔

جارج ہانپتا کانپتا جب روم میں داخل ہوا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کے چاروں دوست زخمی حالت میں دکھائی دے رہے تھے۔ بس ایک بات سکون کی تھی کہ وہ چاروں زندہ تھے اور کسی کی حالت تشویشناک نہ تھی۔

''یہ...... یہ سب کیا ہے...... تھینک گاڈ! تم...... تم زندہ ہو لیکن تم زخمی کیسے ہوئے؟'' جارج تیز تیز بولے جا رہا تھا۔

''ساری تفصیل بتا دیں گے، ذرا بولنے چلنے کے قابل تو ہو جائیں۔'' جارڈن نے آہستگی سے کہا۔

''میں نے تم لوگوں کو منع کیا تھا نا وہاں جانے سے۔ دیکھو کیسے سب کے سب زخمی حالت میں پڑے ہو۔'' جارج نے افسردگی سے کہا۔ وہ چاروں ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے۔

''جارج! تم کیسے ہو؟ ہم تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ہم مکمل صحت یاب ہو کر تمہارے سامنے جانا چاہتے تھے لیکن پھر...... سوچا کہ اتنے عرصے سے ملاقات نہیں ہوئی، چلو تمہیں یہیں بلوالیں۔ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ڈاکٹرز کا کہنا ہے زخم زیادہ گہرے نہیں۔ جلد بھر جائیں گے۔'' رالسٹن نے جارج کے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں تم لوگوں کو بہت یاد کرتا رہا ہوں۔ ہر وقت تمہارا ہی خیال رہتا تھا کہ نہ جانے کیسے ہوں گے...... کسی مشکل میں نہ پھنس گئے ہوں اور آج اگر اتنے دنوں بعد ملے ہو تو اس حالت میں۔'' جارج بہت دکھی ہو رہا تھا۔

''لیکن یہ سب ہوا کیسے؟ یعنی جانوروں نے تم پر حملہ کیا یا کوئی اور حادثہ پیش آیا؟ کچھ تو بتاؤ۔'' جارج نے مزید کہا۔

''سب بتا دیں گے...... سب بتائیں گے۔ کہا تو ہے کہ ابھی ساری بات بتانا ممکن نہیں۔ جلد ٹھیک ہو کر بات کرتے ہیں۔ بہت کچھ ہے بتانے والا۔'' ایڈم نے آنکھیں بند کرتے ہوئے جواب دیا۔

☆☆☆

''کیسا رہا ایڈونچر بھرا سفر اور کیسے آئے زخم؟ چلو اب سب بتا دو۔'' جارج نے مسکرا کر پوچھا۔ چاروں صحت یاب ہو گئے تھے۔ چند دن گزر گئے تھے۔ اب حالات پہلے جیسے نہیں رہے تھے اس لیے سب پُرسکون ہو کر اور مسکرا کر بات کر رہے تھے۔ جارج نے انہیں لنچ پر بلایا تھا۔ لنچ کے بعد وہ سب لاؤنج میں آ بیٹھے تھے۔

''سفر اور جنگل میں رہنا بہت اچھا رہا یعنی آغاز بھی اچھا ہوا اور آغاز سے آگے کا کام بھی۔ بس ذرا انجام......'' جارڈن نے بولتے بولتے نچلا ہونٹ دانتوں میں بھینچ لیا۔ جارج نے سوالیہ نظروں سے سب کی طرف دیکھا تو رالسٹن نے بات کرنا شروع کر دی۔ جنگل تک پہنچنے، وہاں رہنے، کھانے پینے، گھومنے پھرنے، بوٹیاں ملنے اور ہیرے ملنے کا بتایا۔ جارج کی آنکھیں یہ سن کر حیرت سے پھیل گئیں کہ طویل عرصے سے جو چیزیں لوگوں کی نظروں سے اوجھل تھیں، وہ اس کے دوستوں کو مل گئیں۔

''پھر؟'' جارج نے بے تابی سے پوچھا۔

''ہم نے دن کی روشنی میں جگہ جگہ پھر کر ہیرے جواہرات اور کچھ ایسی چیزیں جمع کر لیں جن کا شمار نوادرات میں ہوتا ہے۔ جڑی بوٹیاں اس کے علاوہ تھیں۔'' ایڈم نے بات آگے بڑھائی۔

''اور پھر جانوروں کے حملے میں جان بچانے کے دوران وہ سب ہاتھ سے نکل گیا ہوگا...... ہے نا؟'' جارج نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ایڈم، رالسٹن، والسن اور جارڈن نے کوئی جواب دینے کے بجائے بیک وقت ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ ایڈم نے چند لمحے چپ رہ کر بات پھر سے شروع کی اور طوفان اور پھر خطرناک درندوں سے مڈبھیڑ اور وہاں سے بچ نکلنے کا بتایا۔ جارج کی آنکھیں مزید پھیل گئیں۔

''یہاں تک تو تمہاری خوش قسمتی نے تمہارا خوب ساتھ دیا۔'' وہ بولا۔

''لیکن تم لوگوں نے اسلحہ وغیرہ کیوں استعمال نہیں کیا۔ تم فائر وغیرہ کر کے ان درندوں کو ڈرا سکتے تھے۔'' اچانک یاد آنے پر جارج نے سوال کیا۔

"ہماری بے وقوفی کہو اسے جارج کہ ...... ہر روز دولت ملنے اور کوئی بھی نقصان نہ ہونے نے ہمیں اتنا نڈر کر دیا کہ اس روز اسلحہ ساتھ نہ لے کر گئے۔ اس خطرناک جنگل میں یہ ہماری سنگین غلطی تھی لیکن چلو، اس روز ہم بچ ہی گئے۔" جارڈن نے بتایا۔

"ہاں، لیکن ہماری خوش قسمتی نے جنگل سے واپسی کے روز ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔ ہم سڑک اور اپنی گاڑی سے کچھ فاصلے پر تھے کہ ہمیں اردگرد کوئی آہٹ سی سنائی دی۔ ہم بے فکری سے چل رہے تھے کہ دن کی روشنی ہے اور ویسے بھی ہم خطرے کی حد سے باہر نکل آئے ہیں لیکن ہم پر حملہ ہو گیا۔ وہ بھی اس طرح کہ ہمیں سنبھلنے اور اپنے پسٹل نکالنے کا موقع نہیں ملا۔ ان خطرناک درندوں نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ ہم نے مزاحمت کی تو جواباً شدید زخمی ہوئے۔ سارے تھیلے، دولت، نوادرات، قیمتی جڑی بوٹیوں سے محروم کرتے ہوئے انہوں نے ہمیں جان سے مارنے کی پوری کوشش کی۔ ہم نے بھاگ کر گھنے درختوں کے پیچھے چھپ کر جان بچائی اور پھر ان کے وہاں سے جانے کے بعد بڑی مشکل سے گاڑی تک پہنچے تو وہاں سے گاڑی غائب تھی۔ سڑک تک پہنچتے پہنچتے ہم نڈھال ہو چکے تھے۔ زخموں، تھکن سے چُور ہم ساری امیدیں توڑ چکے تھے کہ ایک ٹرالر وہاں سے گزرا۔ اس نے ہمیں اسپتال تک پہنچایا اور ہم جان بچ جانے پر اتنا خوش ہیں کہ ان گنت ہاتھ آئی دولت سے محروم ہونے کا غم بھی نہیں ہے۔" رالسٹن بولتے بولتے چپ ہو چکا تھا۔

"کیسا جانور تھا...... یعنی کیسے قد اور جسامت کے جانور تھے...... تعداد میں کتنے تھے؟" جارج نے سوال کیا۔

"وہ تعداد میں تین تھے اور قد و جسامت ہمارے جتنی تھی۔" ایڈم نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"بہت خوفناک شکل تھی کیا؟" جارج نے پوچھا۔

"نہیں...... شکل تو کافی اچھی تھی ان کی؟" رالسٹن عجیب انداز میں ہنس کر بولا۔

"کیا مطلب؟" جارج شدید حیران ہوا۔

"ہاں واقعی، شکل اچھی تھی ان کی۔ دو کے بال ہلکے بھورے اور ایک کے گہرے بھورے تھے۔ ایک کی آنکھیں نیلی تھیں، باقی دو پر غور نہیں کیا۔" جارڈن بھی رالسٹن کے انداز میں بولا تو جارج چونک پڑا لیکن بولا کچھ نہیں۔

"جن خطرناک درندوں نے ہمیں خطرناک جنگل کی سرحد پر لوٹا، زخمی کیا، ان کا قد، جسامت، نقوش، آنکھیں، ناک، سب ہم سے ملتے جلتے تھے۔ ان کی دو ٹانگیں تھیں اور انہوں نے جینز شرٹ پہنی ہوئی تھی۔" ایڈم نے باہر لان کی جانب دیکھتے ہوئے مکمل حلیہ بیان کر دیا۔

"اوہ...... تو تمہیں "انسان" نے اس بُرے حال تک پہنچایا۔" جارج آہستہ سے بولا۔

"ہاں...... اور ہم بڑی بے بسی سے ان کے ہاتھوں لٹ گئے۔ ہم پر گنیں تانے انہوں نے طنزیہ ہنستے ہوئے کہا کہ وہ ہمارے جنگل میں جانے سے آگاہ تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہم اسی انتظار میں تھے کہ تم اگر زندہ واپس آؤ تو تم سے ضرور پوچھیں کہ اس جنگل سے کیا لائے ہو۔ ہمارا کئی دنوں کا انتظار رنگ لایا ہے۔ تم تو بڑے سخت جان نکلے۔ زندہ بھی بچ گئے اور یہ تھیلے بھی یقیناً بھر کر لائے ہو۔ لاؤ ہمارے حوالے کر دو...... اور یہ تو ہم تمہیں بتا ہی چکے ہیں کہ پھر ہمارا سامان بھی لٹ گیا اور ہم زخمی بھی ہو گئے اور گاڑی بھی یقیناً انہوں نے چرا لی تھی۔ تو جارج! یہ ہے ہمارے ایڈونچر بھرے سفر کی کہانی۔" ایڈم نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ جارج کی آنکھوں میں دکھ اور لٹیروں کے لیے غصہ و نفرت تھی۔

"جب انسان اپنے ذہن سے سوچ سمجھ کر جانوروں جیسی حرکت کرتا ہے تو اس کے لیے درندگی جیسا لفظ بھی کوئی معنی نہیں رکھتا۔" واٹسن نے کہا۔ اس کے چہرے پر پتھریلی سنجیدگی تھی۔

"دیکھو ذرا، اس جنگل کا بھی قانون تھا کہ دن کی روشنی میں نہیں نکلنا اور سارے خونخوار درندے اس قانون پر عمل کرتے تھے لیکن "انسان" پر کیونکہ دن کی روشنی یا رات کا اندھیرا کچھ فرق نہیں ڈالتا اس لیے اس نے جنگل میں اپنا وحشیانہ قانون بنا کر ہمیں نہ صرف دن کی روشنی میں لوٹ لیا بلکہ جان بھی لینے کی کوشش کی۔" رالسٹن نے دکھ سے کہا۔ بہت بڑا خزانہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

'میں اپنے دوستوں کے بارے میں فکرمند رہا کہ شدید طوفان میں انہیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے، خطرناک درندوں سے یہ بچ کر آ جائیں، موذی و مہلک جانوروں، کیڑوں کی فکر نے ستائے رکھا۔ یہ سب سے بچ کر آ گئے لیکن یہ "انسان" سے نہ بچ سکے۔ میں کسی اور کے بارے میں سوچتا رہا، یہ کسی اور سے نقصان اٹھا کر آ گئے۔ واقعی انسان اگر انسان نہ رہے تو اس سے بڑا خطرناک درندہ اور کوئی نہیں۔' تاسف سے چاروں دوستوں کو دیکھتے ہوئے جارج سوچ رہا تھا۔ لاؤنج میں گہری خاموشی چھا گئی تھی۔

⌘⌘⌘

شکنجہ

مرزا امجد بیگ

انسان کا غریب یا امیر ہونا پیدائش کے وقت اس کے اختیار میں نہیں ہوتا البتہ حالات و واقعات اور زندگی کے نشیب و فراز معاشرے میں اس کے مقام کا تعین کرتے ہیں... اس کے بعد اس کا کردار اور اخلاق، عزت و ذلت کی نشاندہی کرتے ہیں... مگر جب کسی کے دل میں کدورت اور نفرت بلاسبب بیٹھ جائے تو اکثر بات انتقام تک چلی جاتی ہے۔ وہ معصوم انسان بھی کسی کی نفرت کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔ اگر امجد بیگ اپنی تفتیش سے سچ کی کھوج اور دلیلوں سے حقیقت کو واضح نہ کرتے تو جیل کی کال کوٹھڑی اس کا مقدر بن جاتی... لیکن سچ کو آنچ نہیں کے مصداق دشمن سچ کی جیت پر منہ دیکھتے رہ گئے۔

قانون کے شکنجے سے بےخبر مجرموں کی نادانیوں کا انجام

کسی معاشرتی نباض کا کہنا ہے کہ اگر کوئی شخص غریب پیدا ہوتا ہے تو اس میں اسے قصوروار نہیں ٹھہرایا جاسکتا کیونکہ یہ کسی انسان کے اختیار میں نہیں کہ وہ کب، کہاں اور کن حالات میں جنم لیتا ہے لیکن اگر کسی شخص کا خاتمہ غربت اور کسمپرسی پر ہوتا ہے تو یہ سراسر اس کی غلطی ہے۔

یہ بات، بات کی حد تک تو درست ہے مگر انسان کی زندگی میں نصیب کے عمل دخل کو یکسر نظر انداز کردینا معقولیت نہیں ہے۔ اگر غربت اور تونگری کامیابی اور ناکامی کے نمائندگان ہیں تو پھر زندگی کے کسی بھی شعبے میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے کے لیے انسان کے پاس تین چیزوں کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ نمبر ایک، مقصد...... نمبر دو، اپنے مقصد کو پانے کی قابلیت اور نمبر تین اچھی قسمت۔ اگر بخت اور اقبال ساتھ نہ دیں تو ساری کوششیں اور ریاضتیں بے سود و بے تاثیر ہوجاتی ہیں۔

اس تمہید کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔

وہ ماہ نومبر کی ایک خوشگوار اور قدرے خنک شام تھی۔ میں حسبِ معمول اپنے آفس میں بیٹھا روزمرہ کے کام نمٹا رہا تھا کہ دو افراد مجھ سے ملنے آگئے۔ ان کے پاس چونکہ میرا اپائنٹمنٹ نہیں تھا اس لیے انہیں آدھے گھنٹے سے زیادہ ویٹنگ روم میں انتظار کی کوفت اٹھانا پڑی تھی۔ ان میں سے ایک مرد اور دوسری ایک عورت تھی۔ بادی النظر میں وہ دونوں مجھے رشتے دار محسوس نہیں ہوئے کیونکہ ان میں ایک خاص قسم کی بیگانگی پائی جاتی تھی۔

میں نے انہیں بیٹھنے کے لیے کہا پھر معذرت آمیز انداز میں اضافہ کردیا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ آپ لوگوں کو کافی دیر تک انتظار کرنا پڑا لیکن یہ میری مجبوری ہے۔“

”معذرت کی ضرورت نہیں وکیل صاحب!“ مرد نے معتدل انداز میں کہا۔ ”میں اپائنٹمنٹ کی اہمیت کو سمجھتا ہوں۔ ظاہر ہے جن لوگوں نے پہلے سے آپ کا وقت لے رکھا ہے، آپ انہیں نظر انداز کرکے بغیر اپائنٹمنٹ والوں

سے ملاقات نہیں کر سکتے نا۔ خیر......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''میرا نام صنوبر حسین ہے۔ میں نارتھ ناظم آباد میں ایک کھانے اور چائے کا ہوٹل چلاتا ہوں۔ ایک معاملے میں آپ کی مدد چاہیے۔ اسی لیے حاضر ہوا ہوں۔''

صنوبر حسین نامی اس شخص کی عمر پچپن سے متجاوز تھی۔ وہ پستہ قامت اور جسیم انسان تھا۔ اس نے مناسب سائز کی ڈاڑھی بھی رکھی ہوئی تھی جس کے کھچڑی بال اسے ایک دانشمند اور بردبار شخص ظاہر کرتے تھے۔ میں نے کاغذ قلم سنبھال لیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جی صنوبر صاحب! بتائیں آپ کا کیا مسئلہ ہے؟''

''مسئلہ میرا نہیں، اس بی بی کا ہے بلکہ اس کے شوہر کا ہے۔'' وہ اپنی ساتھی عورت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جلدی سے بولا۔ ''اس کا نام رحمت جان ہے۔ اس کے شوہر گل زمان کو پولیس نے گرفتار کرلیا ہے۔ اسی لیے ہم آپ کے پاس آئے ہیں۔ مجھے یقین ہے گل زمان بے قصور ہے۔ اسے کسی سازش کے تحت اس معاملے میں پھنسایا گیا ہے۔ اگر آپ اس کا کیس اپنے ہاتھ میں لے لیں تو اسے انصاف مل سکتا ہے۔''

''اوکے......!'' میں نے رف پیڈ پر قلم چلانے کے بعد نظر اٹھا کر رحمت جان کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''آپ کے شوہر کو کس الزام میں گرفتار کیا گیا ہے اور یہ کب کی بات ہے؟''

''گل زمان کو پرسوں صبح گرفتار کیا گیا ہے وکیل صاحب!'' رحمت جان نے بتایا۔ ''اس پر چوری کا الزام لگایا گیا ہے۔ چوری چار دن پہلے ہوئی تھی۔''

''وکیل صاحب! اس واقعے نے رحمت جان کو بہت زیادہ پریشان کر دیا ہے۔ اسی لیے یہ آپ کو صحیح طور پر جواب نہیں دے پارہی۔'' صنوبر حسین نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میرا اس کے ساتھ آنے کا اصل مقصد بھی یہی ہے کہ آپ کو صورتِ حال سے آگاہ کرسکوں۔''

وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے تھما تو میں نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں صنوبر صاحب! آپ اپنی بات جاری رکھیں۔''

ویسے صنوبر حسین نے غلط نہیں کہا تھا۔ رحمت جان حد درجہ نروس دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی عمر کا تخمینہ میں نے تیس کے آس پاس لگایا۔ اس کا صرف چہرہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے اپنے وجود کو ایک گرم چادر میں اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ وہ ایک گوری چٹی اور بلاشبہ خوبصورت عورت تھی، دلکش اور جاذبِ نظر بھی مگر حالات کی ستم ظریفی نے اس کی رعنائی اور شگفتگی کو گہنا دیا تھا۔ وہ بھری جوانی میں اجڑا دیار نظر آتی تھی۔

''گل زمان گلشن اقبال کی ایک رہائشی عمارت میں چوکیدار کی حیثیت سے کام کرتا تھا وکیل صاحب!'' صنوبر حسین وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس بلڈنگ کا نام ''طوبیٰ ہومز'' ہے۔ مذکورہ رہائشی عمارت میں کل بارہ اپارٹمنٹس ہیں یعنی ہر فلور پر چار اپارٹمنٹس۔ یہ عمارت گراؤنڈ پلس ٹو فلورز کیٹگری میں شمار ہوتی ہے۔ اسی بلڈنگ کے فرسٹ فلور کے اپارٹمنٹ نمبر ایک سو دو میں آٹھ نومبر کی صبح چوری کی ایک واردات ہوئی۔ صاحب خانہ کا دعویٰ ہے کہ اس چوری میں گل زمان کا ہاتھ ہے۔ دو دن تک بلڈنگ کی حد تک پوچھ تاچھ اور میٹنگز کا سلسلہ چلتا رہا پھر دس نومبر کی صبح پولیس نے گل زمان کو گرفتار کرلیا اور آج یعنی بارہ نومبر میں رحمت جان کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا ہوں۔ مجھے کل ہی اس واقعے کے بارے میں پتا چلا ہے۔ رحمت جان ایک پردہ دار گھریلو عورت ہے وکیل صاحب! نامحرم مردوں سے اس کا میل جول نہیں ہے اسی لیے گھر بیٹھی اپنے خاوند کے لیے پریشان ہو رہی تھی۔ میں تسلی دلاسا دے کر اسے یہاں لے آیا ہوں۔ میں جانتا ہوں گھر بیٹھ کر پریشان ہونے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ گل زمان کو ایک قابل اور تجربہ کار وکیل کی ضرورت ہے۔ میں آپ کی قابلیت اور ہنرمندی سے اچھی طرح واقف ہوں جناب!''

صنوبر حسین نے یہ نہیں بتایا کہ وہ مجھے کس حوالے سے جانتا ہے۔ مطلب اسے میری لیاقت اور ہنرمندی کا علم کیسے ہوا؟ میں نے بھی اس سے پوچھنا ضروری نہ سمجھا اور معتدل انداز میں کہا۔

''آپ نے بہت اچھا کیا جو ایک وکیل کی مدد لینے اس کے آفس آگئے۔ پولیس نے گل زمان کو چوری کے الزام میں گرفتار کیا ہے تو اب یہ معاملہ لازمی عدالت تک بھی جائے گا اور عدالتی بکھیڑوں کو نمٹانے کے لیے ہر کسی کو وکیل کی ضرورت پڑتی ہے لیکن......!'' میں نے لمحاتی توقف کر کے باری باری ان دونوں کے چہروں پر موجود تاثرات کا جائزہ لیا پھر دوٹوک انداز میں کہا۔

''جب تک مجھے اس چوری کی واردات کی تفصیل معلوم نہ ہو جائے، میں اس کیس کو لینے کا فیصلہ نہیں کرسکتا۔ یقیناً آپ دونوں گل زمان کو بے گناہ سمجھتے ہیں مگر میں بھی گل زمان کی طرف سے مطمئن ہونا چاہوں گا۔ اسے بے گناہ ثابت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ عدالت میں قدم رکھنے

سے پہلے میرے دل و دماغ اس کی بے گناہی کو تسلیم کر چکے ہوں۔ مجھے امید ہے آپ میری بات سمجھ گئے ہوں گے۔''

''آپ نے ایک جائز اور اصولی بات کی ہے وکیل صاحب!'' صنوبر حسین نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''گل زمان اس وقت پولیس کی تحویل میں ہے۔ گزشتہ روز پولیس نے اسے عدالت میں پیش کر کے سات دن کا ریمانڈ حاصل کر لیا ہے۔ آپ تھانے جا کر اگر اس سے ایک ملاقات کر لیں تو مطلوبہ معلومات آپ کو مل جائیں گی۔ اس تمام تر مناقشے کے بارے میں سب سے زیادہ گل زمان ہی جانتا ہے۔'' بات کے اختتام پر اس نے متعلقہ تھانے کا نام بھی بتا دیا۔

''ٹھیک ہو گیا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں کل کسی وقت تھانے جا کر گل زمان کی کہانی سن لوں گا۔ باقی باتیں اس کے بعد۔''

ان دونوں نے میرا شکریہ ادا کیا اور آئندہ روز دوبارہ آنے کا کہہ کر رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں اپنے دیگر کلائنٹس کے ساتھ مصروف ہو گیا۔

آئندہ روز عدالت میں میرا کوئی کیس نہیں لگا ہوا تھا چنانچہ میں گل زمان سے ملاقات کرنے متعلقہ تھانے پہنچ گیا۔ میں نے گزشتہ روز رحمت جان سے اس کے کوائفِ ضروریہ حاصل کر لیے تھے تاکہ وکالت نامہ اور درخواستِ ضمانت کی تیاری میں آسانی رہے۔

ریمانڈ کی مدت کے دوران میں تھانے جا کر کسی ملزم سے ملاقات کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ گرفتارِ مصیبت کوئی شخص اپنی مشکل کو ٹالنے کے لیے جب کسی وکیل کی خدمات حاصل کرتا ہے تو اس کا سیدھا سا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اب اس کی مشکلات کو آسان کرنا اس کے وکیل کی ذمے داری ہے۔ میں سسپنس کے ان صفحات کے توسط سے اپنی برادری (وکلا حضرات) سے یہ کہنا چاہوں گا کہ وہ اس ذمے داری کو ہمیشہ ذہن میں رکھیں۔ یہ اس پیشے کا تقاضا بھی ہے اور بنیادی اخلاقیات کا حسن بھی۔

میں نے بعض مجرب تراکیب کا استعمال کر کے ملزم گل زمان تک رسائی حاصل کر لی۔ گل زمان کی عمر پینتیس کے اریب قریب رہی ہوگی۔ وہ ایک دراز قامت اور متناسب البدن شخص تھا۔ جب میں اس کے سامنے پہنچا تو وہ دیوار سے ٹیک لگائے حوالات کے فرش پر چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے سے پریشانی اور آنکھوں سے ویرانی جھلکتی تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑی تو وہ میکانکی انداز میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کھوئے ہوئے انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

''میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے۔'' میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''گزشتہ روز شام میں تمہاری بیوی، صنوبر حسین کے ساتھ میرے آفس آئی تھی۔ وہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں اس کیس میں تمہاری وکالت کروں۔ تم کیا چاہتے ہو گل زمان؟''

''وکیل صاحب! میں نجات چاہتا ہوں۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں بے گناہ ہوں۔ میں نے چوری نہیں کی۔ مجھے اس چکر میں پھنسایا گیا ہے۔''

''گل زمان! تمہارے کہہ دینے اور میرے سن لینے سے تم بے گناہ نہیں ہو جاؤ گے۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر نرم لہجے میں کہا۔ ''مجھے تمہاری بے گناہی کو عدالت میں ثابت کرنا پڑے گا اور یہ اسی وقت ممکن ہو پائے گا جب تم میری نظر میں بے قصور ٹھہر جاؤ گے۔''

''آپ کو اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کے لیے مجھے کیا کرنا ہو گا وکیل صاحب؟'' اس نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

''کچھ نہیں..... بس تم مجھے اپنی کہانی سنا دو۔ باقی کام میں خود کر لوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''خاص طور پر میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وقوعہ کے روز یعنی آٹھ نومبر کی صبح کیا واقعہ پیش آیا تھا؟''

''یہ ساری کہانی میں کئی بار پولیس والوں کو سنا چکا ہوں لیکن وہ یقین کرنے کو تیار نہیں ہیں۔'' وہ بے بسی سے بولا۔ ''وہ کہتے ہیں اگر میں اس چوری کا اعتراف کر لوں تو میری سزا میں کمی کرانے کی خاطر وہ مجھ پر ہلکی دفعات لگائیں گے لیکن اگر میں نے اپنا جرم تسلیم نہیں کیا تو مجھے پھانسی کی سزا بھی ہو سکتی ہے۔'' بات کے اختتام پر اس کا چہرہ خوف کی آماجگاہ بن گیا۔

''پولیس والے بکواس کرتے ہیں۔'' میں نے اسے ڈر کے حصار سے باہر لانے کی کوشش کرتے ہوئے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''اگر تم نے چوری نہیں کی تو وہ لوگ تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ کیا انہوں نے تمہارے ساتھ کسی قسم کی مار پیٹ بھی کی ہے؟''

''ابھی تک تو انہوں نے مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔''

''وہ تم سے اقبالِ جرم کرانے کے لیے تمہیں تفتیش کے نام پر زدوکوب کا نشانہ بنا سکتے ہیں۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''اگر ایسا ہوا تو ان کے تشدد سے محفوظ

رہنے کے لیے ہر جرم قبول کر لیتا۔ وہ جس کاغذ پر دستخط کرنے کو کہیں، فوراً ان کی بات مان کر دستخط کر دیتا کیونکہ پولیس کی تحویل میں لیے گئے ملزم کے بیان کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوتی۔ تم عدالت میں جا کر اپنے بیان سے منحرف بھی ہو سکتے ہو۔ یہ تمہارا قانونی حق ہے۔"

"کیا واقعی؟" وہ بے یقینی سے مجھے تکنے لگا۔

"ہاں، بالکل۔" میں نے یقینی لہجے میں کہا۔ "اب تم جلدی سے مجھے اس واقعے کے بارے میں بتا دو۔"

آئندہ پندرہ منٹ میں گل زمان نے مجھے اپنی بپتا کا احوال سنا دیا۔ میں بیچ میں اس سے ضروری سوالات بھی کرتا رہا۔ اس کی کہانی کے اختتام تک مجھے اس کی بے گناہی کا احساس ہو گیا تھا۔ میں نے وکالت نامے پر اس کے دستخط کرائے اور اسے تسلی دلاسا دے کر وہاں سے آ گیا۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ آئندہ روز صنوبر حسین اور ملزم کی بیوی رحمت جان دوبارہ مجھ سے ملنے آفس آئے تھے اور میں نے انہیں اپنا فیصلہ سنا دیا تھا کہ میں اس مقدمے میں گل زمان کی وکالت کرنے کو تیار ہوں۔ انہوں نے میری فیس ادا کی اور شکریہ ادا کرنے کے بعد رخصت ہو گئے۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں آپ کو اس کیس کے پس منظر سے آگاہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔ اس میں زیادہ تر باتیں مجھے اپنے مؤکل گل زمان کی زبانی معلوم ہوئی تھیں اور کچھ تحقیق میں نے خود بھی کر لی تھی۔ ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ میں نے حاصل شدہ معلومات میں سے چند چیزیں دانستہ آپ سے چھپالی ہیں۔ ان کا ذکر بعد ازاں مناسب موقع پر کیا جائے گا۔

☆☆☆

گل زمان کی رہائش سہراب گوٹھ کے علاقے میں تھی۔ اس کی شادی کو آٹھ سال ہو گئے تھے۔ اس کا ایک بیٹا تھا جس کا نام عبدالرحمٰن تھا۔ عبدالرحمٰن کی عمر کم و بیش سات سال تھی اور وہ دوسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ اس کی تعلیمی رپورٹ شاندار تھی۔ وہ ہر امتحان میں اول آتا تھا۔

گل زمان پیشے کے اعتبار سے ایک چوکیدار تھا۔ "طوبیٰ ہومز" میں وہ پچھلے پانچ سال سے کام کر رہا تھا۔ اس کی ڈیوٹی صبح آٹھ بجے سے شام آٹھ بجے تک تھی۔ رات میں ایک دوسرا چوکیدار ظاہر شاہ بلڈنگ کی حفاظت اور نگرانی کے تمام معاملات کو دیکھتا تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے طوبیٰ ہومز میں کل بارہ اپارٹمنٹس تھے۔ بلڈنگ کے بیسمنٹ میں کار پارکنگ کا انتظام تھا۔ اس رہائشی عمارت میں صاحب ثروت لوگ آباد تھے جن میں سے ہر کسی کے پاس اپنی گاڑی تھی۔ طوبیٰ ہومز ایک لگژری اپارٹمنٹ بلڈنگ تھی جہاں پر لفٹ کی سہولت بھی موجود تھی۔ وہاں رہنے والے ہر شخص کے ساتھ گل زمان کے بہت اچھے تعلقات تھے، سوائے ایک کے...... اور وہ تھے اپارٹمنٹ نمبر ایک سو دو کے رہائشی۔ چوری والا واقعہ اسی اپارٹمنٹ میں پیش آیا تھا۔

مذکورہ اپارٹمنٹ میں اشفاق محمود نامی ایک بیوپاری اپنی بیوی اور ایک بارہ سالہ بیٹے واصف کے ساتھ رہتا تھا۔ اشفاق محمود چاول، چینی اور دالوں وغیرہ کا کاروبار کرتا تھا اور اسی سلسلے میں اکثر اسے کراچی سے باہر جانا پڑتا تھا اور اس کے یہ کاروباری دورے ہفتہ دس دن سے کم نہیں ہوا کرتے تھے۔ اشفاق کی غیر موجودگی میں اس کا اکلوتا سالا شاکر علی اپنی بہن اور بھانجے کا خیال رکھتا تھا۔ شاکر علی ایک اسٹیٹ ایجنٹ تھا لیکن اس کا باقاعدہ کوئی آفس یا ایجنسی نہیں تھی۔ وہ چلتے پھرتے کمیشن ایجنٹ کا کام کرتا تھا اور اپنے حلقے میں وہ "چلتا پرزہ" کے نام سے مشہور تھا۔ اسٹیٹ ایجنٹ حضرات تو ویسے ہی کافی تیز طرار اور ہوشیار ہوتے ہیں۔ شاکر علی کا شمار ڈیڑھ ہوشیار افراد میں ہوتا تھا۔

اشفاق محمود کو اس بلڈنگ میں آباد ہوئے لگ بھگ ایک سال ہو گیا تھا اور اس دوران میں گل زمان کے ساتھ ان کا مناقشہ چلتا رہا تھا۔ اصل میں گل زمان ایک فرض شناس اور ذمے دار چوکیدار تھا جبکہ اشفاق کا بیٹا واصف اس بلڈنگ کا سب سے شیطان اور شریر بچہ...... اور واصف کی ماں عمرانہ اپنے بیٹے کو دنیا کا سب سے زیادہ تمیز دار بچہ سمجھتی تھی اور وہ ہر معاملے میں واصف کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑی ہوتی تھی۔ واصف اپنے باپ کا بھی لاڈلا تھا لہٰذا وہ اسے قصوروار ماننے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ والدین کے ایسے مزاج اور رویے کے بعد تو لڑائی جھگڑے کا دروازہ خود بخود کھل جاتا ہے۔

گل زمان اور اپارٹمنٹ نمبر ایک سو دو کے مکینوں کے درمیان پہلا پھڈا چند ماہ پہلے شب برات کے موقع پر ہوا تھا۔ واصف اپنے ہم مزاج بچوں کے ہمراہ بلڈنگ کے سامنے کھیل رہا تھا اور ان کا کھیل تھا، پٹاخے پھاڑنا...... ان دنوں ماچس بم (ایک خطرناک پٹاخا) نیا نیا مارکیٹ میں آیا تھا۔ اس کی آواز دل دہلا دینے والی ہوتی ہے۔ آج کل تو ماچس بم کی کہیں زیادہ مہلک اور خوفناک اقسام منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔

''گل بادشاہ!'' ایک پڑوسی نے آکر گل زمان سے شکایت کی۔ ''تمہاری بلڈنگ کا ایک بچہ گلی میں پٹاخے پھاڑ رہا ہے۔ میری ماں دل کی مریضہ ہیں۔ تم جانتے ہو، ایک ماہ پہلے ہی ان کا آپریشن ہوا ہے۔ یہ خوفناک دھماکے میری والدہ کی برداشت سے باہر ہیں۔ میں اگر اس بچے کو کچھ کہوں گا تو اس کی ماں جھگڑا شروع کردے گی۔ وہ بڑی لڑاکا عورت ہے۔''

''تم کس بچے کی شکایت کررہے ہو؟'' گل زمان نے پوچھا۔ ''گلی میں تو درجن بھر بچے کھیل رہے ہیں۔''

پڑوسی نے واصف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں اس کی بات کررہا ہوں۔''

''اوہ...... اچھا!'' گل زمان نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''اس شیطان نے تو پوری بلڈنگ کا ناک میں دم کررکھا ہے۔ خیر...... میں اس کی ماں کو جاکر بتاتا ہوں اور رات میں، میں صدر صاحب سے بھی اس کی شکایت کروں گا۔''

پڑوسی مطمئن ہوکر واپس چلا گیا۔ گل زمان نے اوپر جاکر واصف کی ماں عمرانہ کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور نہایت ہی ادب سے کہا۔

''باجی! واصف گلی میں ماچس بم چلارہا ہے۔ ایک پڑوسی نے آکر شکایت کی ہے۔ آپ اپنے بیٹے کو ایسا کرنے سے منع کریں۔ اگر میں واصف سے کچھ کہوں گا تو آپ کو برا لگے گا۔''

''برا تو مجھے اب بھی لگ رہا ہے۔'' عمرانہ نے غصیلے لہجے میں کہا اور جارحانہ انداز میں پوچھا۔ ''کیا اس وقت گلی میں صرف میرا بچہ ہی کھیل رہا ہے؟''

''نہیں باجی!'' گل زمان نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وہاں اور بھی بہت سارے بچے کھیل رہے ہیں۔ میں آپ کے بچے کی بات اس لیے کررہا ہوں......''

''کیا تم نے ان تمام بچوں کے گھر جاکر اس قسم کی شکایت کی ہے؟'' گل زمان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی عمرانہ تڑخ کر بولی۔ ''یا صرف میرا بیٹا ہی تمہاری آنکھوں میں خار بن کر چبھتا ہے؟''

''ایسی بات نہیں ہے باجی!'' گل زمان ایک لمحے کے لیے گڑبڑا کر رہ گیا پھر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اصل میں جس محلے دار نے مجھ سے واصف کی شکایت کی ہے، اس کی والدہ دل کی مریضہ ہے اور آپ کا بیٹا گلی میں ماچس بم چلارہا ہے۔ اس خطرناک پٹاخے کا دھماکا کسی بھی مریض کے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔''

''مریض دل کا ہو یا دماغ کا، شور شرابا اسے اچھا نہیں لگتا۔'' عمرانہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''واصف کے علاوہ جو بچے گلی میں کھیل رہے ہیں، انہوں نے اپنے ہونٹوں پر ٹیپ تو نہیں چپکا رکھے نا...... انہوں نے یقیناً وہاں اودھم مچا رکھا ہوگا۔ کیا اس دل کی مریضہ بڑھیا کو ان بچوں کا شور و شغب ذرا سا بھی پریشان نہیں کررہا؟'' لمحاتی توقف کرکے عمرانہ نے ایک گہری سانس خارج کی پھر طنز سے بھرپور ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

''بچے شب برات کے موقع پر پٹاخے نہیں پھاڑیں گے تو پھر کب پھاڑیں گے؟ تمہاری دشمنی صرف میرے بیٹے کے ساتھ ہے اسی لیے منہ اٹھا کر اس کی شکایت کرنے چلے آئے ہو۔''

عمرانہ کے اس غیر انسانی رویے کے بعد مزید کسی بات کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی تھی لہٰذا گل زمان بوجھل دل کے ساتھ واپس آگیا۔ جب وہ بلڈنگ کے ریسیپشن پر پہنچا تو اس نے واصف کو گیٹ سے اندر داخل ہوکر لفٹ کی جانب بڑھتے دیکھا۔ ماچس بم اس کے ہاتھ میں تھے۔ اس نے واصف سے کوئی بات نہیں کی اور باہر گلی میں جھانکا۔ اب وہاں کوئی بھی بچہ شور نہیں مچا رہا تھا۔

پوچھنے پر کسی نے گل زمان کو بتایا۔ ''ابھی یہاں سے دو پولیس والے موٹر سائیکل پر گزرے تھے۔ انہوں نے رک کر بچوں کو تنبیہ کی ہے کہ جو بھی پٹاخے اور ماچس بم چلائے گا، وہ اسے پکڑ کر تھانے میں بند کردیں گے۔ یہ سنتے ہی واصف تو فوراً بلڈنگ کے اندر گھس گیا ہے اور باقی بچے بھی اب شرافت سے کھیل رہے ہیں۔ مطلب، انہوں نے پہلے کی طرح آسمان سر پر نہیں اٹھا رکھا۔''

''چلیں، کسی کے بھی کہنے ہی سے سہی، یہ طوفانِ بدتمیزی تو رکا۔'' گل زمان نے اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''بچے تو بچے، ان کے ماں باپ بھی کسی کی نہیں سنتے۔ میں ابھی واصف کی ماں سے اس کے بیٹے کی شکایت کرنے گیا تھا۔ وہ الٹا مجھ پر برس پڑی۔ کہہ رہی ہے بچے شب برات کے موقع پر ماچس بم نہیں چلائیں گے تو پھر کب چلائیں گے۔'' بات کے اختتام پر اس کا لہجہ حد درجہ تلخ ہوگیا۔

گل زمان سے بات کرنے والا شخص بھی اسی گلی میں واقع ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ کا چوکیدار تھا۔ ''تم بہت سیدھے اور بھولے ہو گل بادشاہ!'' اس نے گل زمان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''واصف جیسے بچوں کو

بگاڑنے میں ان کے والدین ہی کا ہاتھ ہوتا ہے۔ وہ لوگ اپنے بچے کے خلاف کچھ سننے کو تیار نہیں ہوتے لہٰذا تمہیں سیدھا کمیٹی کے صدر کو صورتِ حال سے آگاہ کرنا چاہیے۔ اپنے گلے میں گھنٹی کیوں باندھتے ہو؟''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو مختار علی!'' گل زمان نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہماری بلڈنگ کمیٹی کے صدر داؤد بھائی اس وقت اپنے گھر میں نہیں ہیں۔ میں رات میں گھر جانے سے پہلے انہیں سب کچھ بتادوں گا۔''

مختار علی ''ڈائمنڈ ہائٹس'' نامی ایک رہائشی عمارت کا چوکیدار تھا۔ وہ گل زمان کو خدا حافظ کہہ کر وہاں سے چلا گیا اور گل زمان سوچنے لگا، اس معاملے کو کس انداز میں داؤد بھائی کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔

رات میں کمیٹی کے صدر ''داؤد بھائی'' واپس لوٹے تو گل زمان کی چھٹی کا وقت ہو چکا تھا۔ اس نے رات والے چوکیدار ظاہر شاہ کو چارج دیا اور داؤد بھائی کے اپارٹمنٹ کی جانب قدم بڑھادیے۔ داؤد صاحب ایک سمجھ دار، بردبار اور تجربہ کار انسان تھے۔ صدر کے صرافہ بازار میں ان کی جیولری کی دکان تھی۔ وہ اس بلڈنگ کے گراؤنڈ فلور پر اپارٹمنٹ نمبر ''جی ون'' میں رہائش پذیر تھے۔ طوبیٰ ہومز کے تمام لوگ داؤد بھائی کی بہت عزت کرتے تھے اور ان کے کیے ہوئے فیصلے کو قدر و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ گل زمان کے گھنٹی بجانے پر داؤد بھائی دروازے پر آئے اور سوالیہ نظر سے گل زمان کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''گل بادشاہ! تم ابھی تک گھر نہیں گئے؟''

''میں گھر ہی جارہا ہوں صاحب!'' گل زمان نے لجاجت بھرے انداز میں کہا۔ ''لیکن آپ کو ایک سو دو والے بچے کے بارے میں کچھ بتاتا ہوں۔''

''تم اس شیطان بچے واصف کی بات کررہے ہو؟'' داؤد بھائی نے چونکتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''آج دن میں جب میں گھر سے نکل رہا تھا تو واحد بھائی نے بھی اس کی شکایت کی تھی۔ تمہیں معلوم ہے اس فتنہ پرور بچے نے ان لوگوں کے کپڑے جلادیے ہیں۔''

''یہ کب کی بات ہے صاحب؟'' گل زمان نے الجھن زدہ انداز میں صدر کمیٹی کی طرف دیکھا۔ ''واحد بھائی نے مجھ سے تو ذکر نہیں کیا۔''

''یہ پچھلی رات کا واقعہ ہے۔'' داؤد بھائی نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''واحد بھائی نے تم سے ذکر کیا اور نہ ہی ظاہر شاہ کو کچھ بتایا ہے۔ انہوں نے سیدھی مجھ سے شکایت کی ہے۔ شاید اس لیے کہ میں ان کا پڑوسی بھی ہوں۔ میں ''جی ون'' میں ہوں اور واحد بھائی ''جی ٹو'' میں۔ گزشتہ رات......'' وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اس فسادی بچے نے ایک ماچس بم اوپر اپنے گھر کی گیلری سے واحد بھائی کی گیلری میں پھینکا۔ واحد بھائی کی گیلری میں واشنگ مشین کے ساتھ ہی میلے کپڑوں والی باسکٹ بھی رکھی ہوئی تھی۔ وہ ماچس بم سیدھا جاکر اس باسکٹ میں گرا پھر جیسے ہی وہ پھٹا، کپڑوں نے آگ پکڑلی۔ یہ کارنامہ انجام دیا ہے اس نالائق نے۔ خیر، تم بتاؤ......؟''

گل زمان نے گلی میں پھاڑے جانے والے ماچس بم اور عمرانہ سے ہونے والی اپنی گفتگو کے بارے میں داؤد بھائی کو تفصیلاً بتادیا۔ جب وہ خاموش ہوا تو داؤد بھائی نے گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔

''تم نے واصف کی والدہ سے سخت لہجے میں بات تو نہیں کی؟''

''نہیں صاحب!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تو عمرانہ باجی سے صرف اتنا کہا تھا کہ وہ واصف کو ماچس بم چلانے سے منع کریں۔ ان خوفناک دھماکوں سے ایک دل کی مریضہ خاتون کو تکلیف پہنچ رہی ہے۔ عمرانہ باجی نے میری بات سننے کے بجائے الٹا مجھ ہی کو کھری کھری سنادیں۔ میں چپ چاپ واپس چلا آیا۔''

''تم نے بالکل ٹھیک کیا گل بادشاہ!'' داؤد بھائی نے تعریفی نظر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اور ظاہر شاہ کو اس بلڈنگ میں رہنے والے لوگوں کی حفاظت اور خدمت کے لیے یہاں ملازم رکھا گیا ہے لہٰذا سب کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آنا ہے۔ باقی جہاں تک ''طوبیٰ ہومز'' کے اندرونی مسائل کا معاملہ ہے تو انہیں حل کرنے کے لیے میں ہوں نا۔ تم لوگوں نے بس مجھے بتانا ہے۔ اس کے بعد میں جانوں اور میرا کام۔ سمجھ گئے نا گل بادشاہ؟''

''جی صاحب! میں سمجھ گیا۔'' گل زمان نے اثبات میں جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، اب تم اپنے گھر جاؤ اور ظاہر شاہ کو میرے پاس بھیج دو۔'' داؤد بھائی نے معتدل انداز میں کہا۔ ''کل چھٹی کا دن ہے۔ میں دوپہر کے بعد تمام رہائشیوں کی ایک میٹنگ رکھتا ہوں جس میں ان تمام معاملات پر تفصیلی گفتگو... ہوجائے گی۔''

گل زمان، داؤد بھائی کو سلام کرکے وہاں سے چلا گیا۔

آئندہ روز سہ پہر میں طوبیٰ ہومز کے بیسمنٹ میں تمام اپارٹمنٹس کے مکین جمع ہو گئے۔ اس بلڈنگ کی میٹنگز عموماً وہیں پر منعقد کی جاتی تھیں۔ پارکنگ کا ایک حصہ خالی تھا جہاں پر کرسیاں لگا کر سب کے بیٹھنے کا انتظام کر دیا جاتا تھا۔ ایک سو دو نمبر اپارٹمنٹ کی نمائندگی کرنے اشفاق محمود کی بیوی عمرانہ وہاں آئی تھی۔

''کیا اشفاق بھائی آج کل کراچی میں موجود نہیں ہیں؟'' داؤد بھائی نے عمرانہ کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''وہ صادق آباد گئے ہوئے ہیں۔'' عمرانہ نے روکھے لہجے میں جواب دیا۔ ''اگر وہ یہاں ہوتے تو پھر مجھے اس میٹنگ میں آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیا اشفاق کے نہ ہونے اور میرے ہونے سے کوئی فرق پڑتا ہے؟''

عمرانہ کے آخری سوالیہ جملے نے شرکائے مجلس کو ایک لمحے کے لیے گڑبڑا دیا کیونکہ عمرانہ نے یہ سوال کرنے کے بعد باری باری سب کی طرف دیکھا بھی تھا۔ اس محفل میں شامل افراد میں عمرانہ واحد عورت تھی۔ باقی تمام گھروں سے مرد ہی آئے تھے۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے عمرانہ بہن!'' داؤد بھائی نے شائستہ لہجے میں کہا۔ ''آپ ہوں یا اشفاق بھائی، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ واصف آپ دونوں ہی کا بیٹا ہے......!''

''تو کیا آج کی میٹنگ میرے بیٹے کی وجہ سے بٹھائی گئی ہے؟'' عمرانہ نے حاضرینِ مجلس کی طرف دیکھتے ہوئے تیز لہجے میں استفسار کیا۔ ''لگتا ہے آپ لوگوں کو ہمارے بچے سے کچھ زیادہ ہی شکایات ہونے لگی ہیں۔''

''اس میں برا منانے کی ضرورت نہیں عمرانہ بہن! تپش وہیں محسوس ہوتی ہے جہاں آگ جل رہی ہو۔'' داؤد بھائی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''چھوٹے موٹے معاملات تو چلتے ہی رہتے ہیں لیکن اب صورتِ حال خاصی گمبھیر ہوتی جا رہی ہے۔ میں جانتا ہوں آپ نے واصف کو ایک مہنگے پرائیویٹ انگلش میڈیم اسکول میں پڑھنے کے لیے ڈال رکھا ہے لیکن تعلیم کے علاوہ ایک ضروری چیز اور بھی ہوتی ہے......!''

''جیسا کہ......؟'' عمرانہ قطع کلامی کرتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

''جیسا کہ تربیت۔'' داؤد بھائی نے رسان بھرے انداز میں کہا۔ ''اور تربیت کا تعلق بچوں کے اسکول کے ''میڈیم'' سے نہیں ہوتا۔ اسکول انگلش میڈیم ہو، اردو میڈیم ہو اور یا پھر دینی مدرسہ...... بچوں کی اصل تربیت ان کے گھر سے ہوتی ہے۔ یہ فریضہ ہر حال میں بچے کے والدین کو ہی ادا کرنا ہوتا ہے۔''

''تو آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ ہم نے واصف کی تربیت نہیں کی؟'' عمرانہ نے تیکھے لہجے میں سوال کیا۔

''بات میرے کہنے کی نہیں ہے عمرانہ بہن!'' داؤد بھائی نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''اس بلڈنگ میں رہنے والے ہر شخص کو آپ کے بیٹے سے کوئی نہ کوئی شکایت ضرور ہے۔ میں واصف کا دشمن نہیں ہوں۔ وہ بہت اچھا بچہ ہوگا مگر اس کی حرکتیں غیر اخلاقی اور خطرناک ہیں اسی لیے آج یہ میٹنگ رکھی گئی ہے تاکہ آپ سے درخواست کر سکیں کہ آپ اپنے بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کریں۔ اب اس طرح نہیں چل سکے گا۔''

''آپ لوگوں نے مجھے مجرموں والے کٹہرے میں کھڑا کر ہی دیا ہے تو بتائیں، کس کس کو میرے بیٹے سے کیا کیا شکایت ہے؟'' عمرانہ نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''ویسے ایک بات میری سمجھ میں آ گئی ہے کہ اس میٹنگ کے پیچھے چوکیدار گل کا ہاتھ ہے۔ وہی کل واصف کی شکایت لے کر میرے دروازے پر آیا تھا۔''

''آپ کا اندازہ درست نہیں ہے عمرانہ بہن!'' جی ٹو میں رہنے والے واحد بھائی نے معتدل انداز میں کہا۔ ''یہ شکایت گل زمان نے نہیں، میں نے داؤد بھائی تک پہنچائی ہے جس کے بعد ہی یہ میٹنگ بلانے کا فیصلہ کیا گیا ہے کیونکہ اب پانی سر سے اوپر ہوتا جا رہا ہے۔''

''تو پھر پہلے آپ ہی بتائیں۔'' عمرانہ نے کینہ توز نظر سے واحد بھائی کو دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ''میرے بیٹے نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟''

واحد بھائی نے واصف کے پھینکے ہوئے ماچس بم اور باسکٹ میں رکھے ہوئے کپڑوں کے جلنے کا واقعہ بالتفصیل بیان کرنے کے بعد خفگی بھرے لہجے میں کہا۔

''شکر کریں کہ وہ آگ اسی باسکٹ کے کپڑوں تک محدود رہی۔ اگر یہ ... معاملہ آگے بڑھ جاتا تو طوبیٰ ہومز کی پوری عمارت جلنے اور راکھ کا ڈھیر بن سکتی تھی اور اس راکھ میں یقیناً ہم سب کے سوختہ اجسام کا حصہ بھی شامل ہوتا۔''

''تو آپ کا دعویٰ ہے کہ وہ ماچس بم میرے بیٹے نے آپ کے کپڑوں والی ٹوکری میں پھینکا تھا؟'' عمرانہ نے کینہ پرور لہجے میں پوچھا۔ ''اور یہ بھی بتائیں کہ اس بلڈنگ میں شب برات صرف میرے بیٹے کے لیے ہی آئی ہے۔ کیا کوئی

اور بچہ پٹاخے نہیں چھوڑ رہا اور آتش بازی نہیں چھوڑ رہا؟''

''ہمیں دوسرے بچوں سے کچھ لینا دینا نہیں عمرانہ صاحبہ!'' واحد بھائی نے بیزاری سے کہا۔ ''ہاں، البتہ طوبیٰ ہومز میں آپ ہی کے بیٹے نے لوگوں کا جینا عذاب کر رکھا ہے۔ ہماری گیلری کے اوپر آپ کے اپارٹمنٹ کی گیلری پڑتی ہے۔ وہ ماچس بم آپ ہی کی گیلری سے ہماری گیلری میں پھینکا گیا تھا۔''

''بہت خوب!'' وہ استہزائیہ انداز میں بولی پھر کینہ در لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیا آپ نے واصف کو ماچس بم پھینکتے ہوئے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا یا خوامخواہ میرے بچے پر الزام لگا رہے ہیں؟''

''سچی بات تو یہ ہے کہ جب میں نے بم کا دھماکا سنا تو فوراً میں اپنی گیلری میں پہنچا کیونکہ وہ دلدوز آواز اسی طرف سے آئی تھی۔'' واحد بھائی نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔ ''اور میں نے باسکٹ میں رکھے کپڑوں کو جلتے دیکھا اور میں نے پانی والا پائپ لگا کر اس آگ کو بجھا دیا۔''

''اگر آپ کی گیلری کے اوپر ہماری گیلری پڑتی ہے تو ہماری گیلری کے اوپر ''دو سو دو'' والوں کی گیلری بھی پڑتی ہے واحد صاحب!'' عمرانہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''آپ کے کپڑے جلانے والا ماچس بم ''دو سو دو'' والوں کی گیلری میں سے بھی تو پھینکا جا سکتا ہے۔''

''یہ ممکن نہیں ہے عمرانہ بہن!'' داؤد بھائی نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔ ''آپ کو اس بلڈنگ میں آئے ایک سال ہونے کو آ رہا ہے لیکن افسوس کہ آپ یہاں پہلے سے رہنے والوں کے بارے میں بہت کم معلومات رکھتی ہیں۔ اپارٹمنٹ نمبر دو سو دو میں آصف علی اپنی بیوی عائشہ کے ساتھ رہتے ہیں اور ابھی تک ان کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ وہاں سے ماچس بم پھینکے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ ماچس بم آپ کے بیٹے ہی نے پھینکا تھا۔ آپ اگر اس حقیقت کو تسلیم کر لیں گی تو اس سے آپ کی شان میں کوئی کمی واقع نہیں ہو جائے گی۔ ہم پہلے ہی کی طرح آپ کی عزت کریں گے۔ اس بلڈنگ میں بسنے والا ہر شخص ہم سب کے لیے بے حد واجب الاحترام ہے۔''

عمرانہ، داؤد بھائی کی وضاحت کو سنی ان سنی کرتے ہوئے واحد بھائی کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''آپ تو صاحب اولاد ہیں۔'' اس نے کینہ کش لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیا آپ کے بچے شب برات نہیں مناتے؟ کیا اس تہوار کے دنوں میں آپ ان کے ہاتھوں کو مضبوط رسیوں سے جکڑ دیتے ہیں تا کہ وہ پھلجھڑی، آتش بازی اور پٹاخے...... کسی بھی شے کا استعمال نہ کر سکیں۔ کپڑوں والی ٹوکری میں بم پھینکنے والی وہ ''حرکت'' آپ کے بچوں میں سے بھی کسی کی ہو سکتی ہے...... ہیں نا؟''

''بالکل نہیں۔'' واحد بھائی کے لہجے میں برہمی شامل ہوگئی۔ عمرانہ کی کٹ حجتی اور کج بحثی نے ان کی طبیعت مکدر کر دی تھی۔ ''میرے بچے اپنی ماں کے ساتھ گزشتہ ایک ہفتے سے حیدر آباد نانی کے گھر گئے ہوئے ہیں اور...... اور ہم نے اپنی اولاد کو اتنی تمیز ضرور سکھا رکھی ہے کہ وہ اس قسم کی تخریبی حرکتیں کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔''

طوبیٰ ہومز کے بیسمنٹ کا ماحول کچھ ایسا ہو گیا تھا جیسے وہاں ایک قسم کی عدالتی کارروائی چل رہی ہو۔ بہرکیف، ہر طرف سے منہ کی کھانے کے بعد عمرانہ لاجواب سی ہو کر وہاں موجود افراد کے منہ دیکھنے لگی۔

دو سو چار والے نواز بلوچ نے اپنے دل کا غبار نکالتے ہوئے کہا۔ ''میں جب بھی آفس سے واپس آ کر پارکنگ میں گاڑی کھڑی کرنے کے بعد لفٹ کی طرف آتا ہوں تو لفٹ فرسٹ فلور پر رکی ہوئی ملتی ہے۔ تنگ آنے کے بعد جب میں نے پوچھ تاچھ کی تو پتا چلا کہ اپنے فلور پر لفٹ کو اٹکا کر رکھنا واصف کا پسندیدہ کھیل ہے۔'' پھر وہ صدر کمیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ''داؤد بھائی! کیا اس بلڈنگ کی لفٹ بچوں کا کوئی کھلونا ہے...... کیا ہم لوگ اتنی بھاری مینٹیننس اس لیے دیتے ہیں کہ لفٹ کے بجائے زینے چڑھ کر اپنے گھر جایا کریں؟''

''میں نے ایک خوبصورت پالتو پرشین کیٹ پورے تیس ہزار روپے میں خریدی تھی۔'' ایک سو تین کے رہائشی منظور علی نے تپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ایک سو دو والوں کے بچے نے اپنی پلاسٹک کے چھروں والی پستول سے فائر کر کے میری معصوم قیمتی بلی کی ایک آنکھ پھوڑ ڈالی۔ جب میں نے اس شیطان کے باپ سے شکایت کی تو اس نے خشک لہجے میں کہا۔ ''یہ بلڈنگ انسانوں کے رہنے کی جگہ ہے۔ اپنے گھر میں جانور پال کر آپ اسے چڑیا گھر بنانے کی کوشش کریں گے تو ایسے حادثات کو نہیں روکا جا سکتا۔'' جواب میں، میں نے بھی کہہ دیا۔ ''یہ بلڈنگ کوئی شوٹنگ کلب بھی نہیں ہے جو اپنے بچوں کے ہاتھوں میں بندوقیں تھما کر انہیں چاند ماری کی کھلی چھٹی دے دی جائے۔ میری بلی کی جگہ کسی انسان کی آنکھ بھی اس پلاسٹک کے چھرے کا نشانہ بن سکتی تھی۔'' واصف کے باپ نے گھور کر مجھے دیکھا

اور طوفانی انداز میں دروازہ بند کر دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اشفاق نے دروازہ بند نہ کیا ہو بلکہ میرے منہ پر ایک زوردار طمانچہ رسید کر دیا ہو۔ پالتو گھریلو جانوروں سے نہیں، ایسے بدمزاج اور بدکلام انسانوں سے ایک دن یہ بلڈنگ ضرور چڑیا گھر بن جائے گی۔''

''واصف کی کرکٹ نے ہمارا سکون برباد کر کے رکھ دیا ہے۔'' ایک سو چار والے رہائشی غلام حسین نے خشم آلود لہجے میں کہا۔'' آپ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں ہر فلور پر چار اپارٹمنٹس ہیں اور گھروں میں آمد و رفت کے لیے دروازوں کے سامنے محض دو بالشت کی راہداری اور اسی مختصر سے کوریڈور میں اسکول سے آتے ہی ان کے بچے کی بلے بازی شروع ہو جاتی ہے۔'' لمحے بھر کو رک کر اس نے عمرانہ کی جانب اشارہ کیا پھر اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''آپ خود ہی بتائیں، کیا اس راہداری کو کرکٹ کا میدان بنانا جائز ہے؟ اس شیطان کی ہر ہٹ سیدھی آ کر میرے دروازے پر لگتی ہے۔ پچھلے ایک سال میں، میں چار بار اپنے دروازے کا لاک ریپیئر کروا چکا ہوں اور ایک مرتبہ دروازہ بھی تبدیل کروایا ہے۔ اب سوچ رہا ہوں اپنی رہائش ہی تبدیل کر لوں کیونکہ اس بچے اور اس کے ڈھیٹ والدین پر تو کسی بات کا اثر ہوتا نہیں ہے۔ اگر ان کے بیٹے کی شکایت کریں تو یہ لڑنے مرنے اور مارنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔''

طوبیٰ ہومز کے رہائشیوں نے اپنے مسائل کا کھل کر اظہار کر دیا تھا۔ ہر کسی کو بارہ سالہ واصف سے شکایت تھی۔ ان کی متفقہ رائے کے مطابق اس بچے کے اندر شیطان کی روح حلول کر چکی تھی جو اس سے الٹی سیدھی تخریبی حرکتیں کرواتی تھی لیکن یہی بچہ اپنے والدین اور ماموں کی آنکھ کا تارا تھا۔ دنیا میں ان کے مطابق اور کوئی بچہ اس کے پائے کا تمیز دار اور امن پسند تھا ہی نہیں۔

عمرانہ کو شک نہیں بلکہ یقین تھا کہ اس قضیے کے پیچھے گل زمان کا ہاتھ تھا جس کے نتیجے میں یہ میٹنگ رکھی گئی تھی جس میں اسے حد درجہ خفت اور شرمندگی اٹھانا پڑی تھی۔ اس نے گل زمان کو اپنی اس ذلت کا ذمے دار سمجھ لیا تھا۔ طوبیٰ ہومز کے بیسمنٹ میں ہونے والی اس میٹنگ کے احوال کو تفصیل سے بیان کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ وہ عوامل آپ کے ذہن میں اچھی طرح جگہ بنا لیں جن کی بنا پر عمرانہ گل زمان سے شدید نفرت کرنے لگی تھی۔ چنانچہ جب اس کے گھر میں چوری کی واردات ہوئی تو اس نے سیدھا سیدھا گل زمان کو اس کا ذمے دار ٹھہراتے ہوئے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا۔

''یا تو یہ چوری چوکیدار گل زمان نے کی ہے اور یا پھر اس نے اپنی نگرانی میں چوری کروائی ہے۔ اگر وہ خود چور نہیں تو چور کو جانتا ضرور ہے۔''

مالِ مسروقہ کی تفصیل عمرانہ اور اشفاق کے بیان کے مطابق کچھ اس طرح تھی...... پچاس ہزار مالیت کے طلائی زیورات، تیس ہزار روپے نقدی اور پچاس ہزار روپے سے زیادہ قیمت کا واصف کا پی سی (پرسنل کمپیوٹر) جو ماموں شاکر علی نے سالگرہ پر واصف کو گفٹ کیا تھا۔

ایک پرسنل کمپیوٹر سیٹ (کی بورڈ، مانیٹر، ماؤس اور سی پی یو) کی قیمت پر زیادہ حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ آج سے کم و بیش پینتیس سال پہلے کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں ایک مناسب سا پی سی اتنا ہی مہنگا ہوا کرتا تھا۔ آج کل تو لیپ ٹاپ، ٹیبلٹ اور آئی پیڈ کا دور ہے۔ بیچارے ''پی سی'' کو کوئی پوچھتا نہیں۔ اسی کو انقلابِ وقت اور نیرنگیٔ دوراں کہا

حضرت جنید اور منصور حلاج

مجذوب حسین بن منصور حلاج جو انا الحق کے نعرے کے جرم میں قتل ہوئے، ایک بار حضرت جنید بغدادیؒ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا کہ آپؒ کی صحبت میں رہنا چاہتا ہوں۔ حضرت جنیدؒ نے جواب دیا۔ ''میں دیوانوں کو اپنی صحبت میں نہیں رکھ سکتا۔''

ابنِ منصور حلاج نے کہا۔'' یا مرشد! ہوش اور مدہوشی دو صفتیں ہیں۔ جب تک ساری صفات انسان سے ختم نہ ہوں وہ خالقِ حقیقی سے دور اور پوشیدہ ہے۔''

حضرت جنید نے جواب دیا۔'' تم غلطی پر ہو۔ ہوش خدا کے معاملے میں سلامتیٔ عقل پر دلالت ہے اور مدہوشی تمنا کے حد سے گزر جانے کی علامت۔ یہ دونوں صفتیں ایسی ہیں کہ انسان جدوجہد کے بل پر پورا نہیں اتر سکتا اور مجھے تمہارے افکار میں زیادہ تر حماقت اور دیوانگی نظر آتی ہے۔''

جب ابنِ منصور آمادہ بہ اصلاح نہ ہوئے اور انہیں پھانسی ہوئی تو حضرت جنیدؒ کے ایک ہم عصر نے کہا۔

''یہ اس لیے ہوا کہ اس نے کسی کا راز دوسروں پر افشا کر دیا تھا۔''

(مرسلہ: مہتاب احمد، حیدر آباد)

جاتا ہے۔

☆☆☆

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے اس مقدمے کا چالان عدالت میں پیش کردیا۔ پولیس کی چارج شیٹ کے مطابق طوبیٰ ہومز کا دن والا چوکیدار ملزم گل زمان اس عمارت میں رہنے والے تمام لوگوں کے معمولات سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اپارٹمنٹ نمبر ایک سو دو میں رہنے والا اشفاق محمود اکثر و بیشتر اپنے کاروبار کے سلسلے میں کراچی سے باہر جاتا ہے اور اس کی واپسی میں ہفتہ، دس دن لگ جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں ملزم کو یہ بھی پتا تھا کہ اپنے اکلوتے بیٹے واصف کو اسکول بھیجنے کے بعد اشفاق محمود کی بیوی عمرانہ ڈیڑھ، دو گھنٹے کی نیند لیتی ہے۔ اسی جانکاری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ملزم نے چوری کی واردات کے لیے آٹھ نومبر کے دن کا انتخاب کیا اور صاحبۂ خانہ کی غفلت بھری نیند کے دوران میں اس کے گھر کا صفایا کردیا۔ اس واردات کے لیے اس نے برقعے کا استعمال کیا تھا تا کہ کسی کو اس پر شک نہ ہو اور یہی سمجھا جائے کہ کوئی برقع پوش عورت بلڈنگ میں گھسی اور اپنا کام کر کے چپ چاپ وہاں سے چلی گئی۔ ملزم کی یہ چال ایک حد تک کامیاب بھی رہی لیکن وہی بات کہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ صرف دو روز بعد ہی اسے گرفتار کرلیا گیا...... وغیرہ ہم!

میں نے آپ کو پولیس کے تیار کردہ چالان کا خلاصہ ''سنایا'' ہے ورنہ اس رپورٹ میں اور بھی بہت ساری لایعنی اور غیر متعلقہ باتیں بھری ہوئی تھیں۔

عدالتی کارروائی شروع ہونے سے پہلے ہی میں نے اپنا وکالت نامہ اور ملزم کی درخواستِ ضمانت دائر کردی تھی۔ علاوہ ازیں میں نے ایک معتبر سماجی شخصیت کا ضمانتی کی حیثیت سے بندوبست بھی کر رکھا تھا۔ یہ ایک شخصی ضمانت تھی جس کا ذکر درخواستِ ضمانت میں موجود تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے مؤکل کی ضمانت کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔

''جنابِ عالی! میرا مؤکل اس معاشرے کا ایک امن پسند اور شریف النفس انسان ہے۔ وہ گزشتہ پانچ سال سے طوبیٰ ہومز میں چوکیدار کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس دوران میں بلڈنگ کے کسی بھی مکین کو اس سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ وہاں کے سب رہائشی ملزم پر پورا بھروسا کرتے ہیں۔ میں ثابت کردوں گا کہ ملزم کو ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اس مقدمے میں پھنسایا گیا ہے۔ سرِدست معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ ملزم کو شخصی ضمانت پر رہا کیا جائے تا کہ یہ اپنی معمول کی زندگی جاری رکھ سکے۔''

''یور آنر! ملزم کی ضمانت کو منظور کرنا انصاف کے اصولوں کے منافی ہوگا۔'' وکیل استغاثہ نے ضمانت کو رکوانے کی کوشش کرتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ ''میرے فاضل دوست نے ابھی اس عدالت کو بتایا ہے کہ ملزم کی پانچ سالہ ملازمت کے دوران میں کبھی کسی ایک مکین کو بھی اس سے شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ یہ بڑی عجیب سی بات ہے ورنہ دنیا میں ایسا ایک بھی انسان موجود نہیں جس سے کسی کو کوئی شکایت نہ ہو۔ کیا وکیلِ صفائی اپنے مؤکل کے اس اعلیٰ انسانی مرتبے کے ثبوت کے طور پر کوئی ٹھوس دلیل پیش کرسکتے ہیں؟''

''جنابِ عالی! اس وقت عدالت میں جو کیس لگا ہوا ہے، اس کو لے کر ہم پوری دنیا کے انسانوں کی نہیں، صرف طوبیٰ ہومز کے مکینوں کی بات کرسکتے ہیں اور میں نے ابھی ذکر بھی انہی لوگوں کا کیا تھا۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا پھر ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔ ''یس! میں نے اپنے مؤکل کی سیرت، کردار، رویے اور فطرت کے بارے میں جو کچھ بھی کہا ہے، میں اسے ایک زندہ اور تازہ مثال سے ثابت کرسکتا ہوں، اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو۔''

بات کے اختتام پر میں سوالیہ نظر سے جج کی جانب دیکھا۔ جج نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''پرمیشن گرانٹڈ!''

''یور آنر!'' میں نے پراعتماد انداز میں کہنا شروع کیا۔ ''پولیس کے تیار کردہ چالان کے مطابق طوبیٰ ہومز کے اپارٹمنٹ نمبر ایک سو دو میں چوری کی واردات والا یہ واقعہ مؤرخہ آٹھ نومبر کی صبح پیش آیا تھا لیکن تھانے میں اس کی رپورٹ دو روز بعد یعنی دس نومبر کی صبح درج کرائی گئی اور اسی روز لگ بھگ گیارہ بجے پولیس نے میرے مؤکل کو گرفتار کرلیا تھا۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ پولیس کو اطلاع دو روز تاخیر سے کیوں دی گئی؟''

''اس کا ایک خاص سبب ہے۔'' وکیل استغاثہ نے قطع کلامی کرتے ہوئے جارحانہ انداز میں کہا۔ ''اپارٹمنٹ ایک سو دو میں رہنے والا اشفاق محمود ایک کاروباری دورے پر کراچی سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس کی واپسی نو نومبر کی رات میں ہوئی لہٰذا اس نے اگلے روز یعنی دس نومبر کی صبح متعلقہ تھانے جا کر اس واقعے کی رپورٹ درج کروادی تھی۔''

''اگر آپ کی ''مداخلتِ بے جا'' مکمل ہوگئی ہو تو میں کچھ عرض کروں؟'' میں نے تیز سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ

کی طرف دیکھا۔ ”کوئی چھوٹا ہو یا بڑا/ادنیٰ ہو یا اعلیٰ...... جب وہ بات کر رہا ہو تو اسے بلاوجہ روکنا اور ٹوکنا اخلاقیات کے منافی تصور کیا جاتا ہے۔“

وکیل سرکار خجل سا ہو کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بھاری بھرکم لہجے میں کہا۔

”ڈیفنس! پلیز کنٹینیو!“

”جنابِ عالی! میں نے جن دو دن (آٹھ نومبر کی صبح سے دس نومبر کی صبح تک) کا ذکر کیا ہے، اس دوران میں طوبیٰ ہومز کی یونین کے صدر داؤد بھائی نے اپارٹمنٹ نمبر ایک سو دو کی مکین اور اشفاق محمود کی بیوی عمرانہ کے ایک فوری اور خاصے بے رحمانہ مطالبے کے ذیل میں بلڈنگ کے مکینوں کے بیچ پولنگ کرائی تھی۔ مسز اشفاق کا مطالبہ تھا کہ میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم گل زمان کو فوری طور پر فارغ کر دیا جائے۔ اس ووٹنگ پروسس میں کُل بارہ مکینوں میں سے گیارہ کا ووٹ ملزم کے حق میں تھا۔ وہ ملزم کی دیانت، شرافت، ایمانداری، ذمے داری اور اعلیٰ اخلاق کے معترف تھے جبکہ صرف ایک رہائشی یعنی اپارٹمنٹ نمبر ایک سو دو میں رہنے والی مسز عمرانہ نے ملزم کے خلاف ووٹ دیا۔ یہ تو وہ پس منظر ہے جو میرے مؤکل کو طوبیٰ ہومز کے مکینوں کی نگاہ میں صاحبِ کردار اور قابلِ بھروسا ثابت کرتا ہے۔ باقی جہاں تک مسز عمرانہ کی مخالفت اور مخاصمت کا معاملہ ہے تو اس کو سمجھنے کے لیے گزشتہ ایک سال کے چھوٹے بڑے درجنوں واقعات کا اجمالی نہیں، تفصیلی جائزہ لینا ہوگا کہ کب کب مسز عمرانہ کے حد درجہ بدتمیز بیٹے واصف کی وجہ سے ملزم اور عمرانہ کے درمیان تلخ کلامی ہوئی۔ ملزم نے واصف کے شر سے بلڈنگ کے دیگر بچوں اور بڑوں کو محفوظ رکھنے کے لیے اگر کبھی سختی سے کام لیا تو عمرانہ کو وہ بالکل اچھا نہیں لگا تھا کیونکہ اس کے تئیں واصف اس کرۂ ارض کا سب سے زیادہ امن پسند، صلح جو اور تمیز دار بچہ ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ زیرِ سماعت کیس کے اس پہلو کو ثابت کرنے کی نوبت آئے گی لیکن اگر بفرضِ محال ایسی ضرورت پیش آئی تو میں اپنے بیان کی تصدیق کے لیے کم از کم درجن بھر افراد کو معزز عدالت میں حاضر کر سکتا ہوں۔“

”جنابِ عالی! یہ ایک دو ہزار کی چوری کا معاملہ نہیں ہے بلکہ کم از کم ایک لاکھ تیس ہزار کا نقصان ہوا ہے جس میں تیس ہزار روپے تو نقد رقم ہے۔“ وکیل استغاثہ نے ملزم کی ضمانت کے خلاف زور لگاتے ہوئے کہا۔ ”طوبیٰ ہومز کی چوکیداری کرتے ہوئے ملزم کو دو ہزار روپے بطور تنخواہ ملتے تھے۔ اس حساب سے اپارٹمنٹ ایک سو دو والوں کا نقصان ملزم کے پینسٹھ ماہ یعنی لگ بھگ ساڑھے پانچ سال کی تنخواہ کے برابر ہے اور یہ کوئی معمولی رقم نہیں ہے چنانچہ معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ ملزم کی درخواستِ ضمانت کو رد کرتے ہوئے اس کیس کو آگے بڑھایا جائے۔“

”ڈیفنس مدعی اشفاق محمود کے اپارٹمنٹ میں ہونے والی چوری کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھتا کیونکہ یہ اس کا مسئلہ ہے ہی نہیں۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”چوری ہوئی ہے یا نہیں ہوئی، ڈیفنس کا فوکس اس بات پر ہے کہ ملزم گل زمان کسی بھی زاویے سے اس جرم کا جزوی یا کلی ذمے دار نہیں ہے۔ وہ صد فیصد بے گناہ ہے۔ کسی خاص مقصد کے تحت اسے اس کیس میں الجھایا گیا ہے۔ باقی جہاں تک ایک لاکھ تیس ہزار روپے کے نقصان کا معاملہ ہے تو یقیناً یہ نقصان ہوا ہوگا مگر ڈیفنس ایسا سمجھتا ہے اور وقت آنے پر اسے ثابت بھی کر سکتا ہے کہ اگر چوری کی یہ واردات واقعتاً وقوع پذیر ہوئی ہے تو اس میں چور کے جرم سے زیادہ صاحبۂ خانہ مسز عمرانہ کی غفلت اور بے احتیاطی کا عمل دخل ہے۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟“ وکیل استغاثہ نے تڑپ کر پوچھا۔

”یہ ایک ایسی بات ہوئی جو آپ کی سمجھ میں بالکل نہیں آئی میرے فاضل دوست!“ میں نے وکیل استغاثہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”اور آپ کو سمجھانے کے لیے ضروری ہے کہ مسز عمرانہ لازمی یہاں موجود ہوں۔“

وہ الجھن زدہ لہجے میں مستفسر ہوا۔ ”اس کا کیا مطلب ہوا؟“

”مطلب بہت سادہ، واضح مگر خاصا سنگین ہے مگر اسے بیان کرنے کے لیے مجھے ماضی بعید سے ایک عظیم مثال کو یہاں پیش کرنا پڑے گا جس سے آپ کی تشفی ہو جائے گی۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اگر آپ کی اجازت ہو تو عرض کروں؟“

”ٹھیک ہے۔“ وہ بیزاری سے بولا۔ ”آپ کہیں جو بھی کہنا چاہتے ہیں۔“

”ایک شخص پریشانی کے عالم میں حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ ”اے امیر المومنین! مجھ سے ایک بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ آپ مجھے اس کا کفارہ بتائیں۔“ خلیفۂ وقت نے اس شخص سے سرزد ہونے والے گناہ کی بابت دریافت کیا تو اس نے زار و قطار روتے ہوئے امیر المومنین کو بتایا کہ وہ زنا کا ارتکاب کر بیٹھا ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ نے خشمگیں نظر سے اسے گھورا اور ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے فرمایا۔ ''تمہاری شرمندگی، ندامت اور کیفیتِ زار کو دیکھ کر مجھے گمان گزرا تھا کہ کہیں تم نے کسی کی غیبت تو نہیں کر ڈالی؟'' لمحاتی توقف کر کے میں نے گہری نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھا اور معتدل انداز میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میرے فاضل دوست! اسی لیے پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کرنے یعنی اس کی غیبت کرنے کو اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ سو، مسز عمرانہ کی غیر موجودگی میں انہیں برا بھلا کہنا اخلاقی اور شرعی اعتبار سے انتہائی گھٹیا اور قابلِ مذمت فعل ہوگا۔ ہم اس بارے میں اس وقت بات کریں گے جب موصوفہ وٹنس باکس میں جلوہ افروز ہوں گی۔ آپ کا اس حوالے سے کیا خیال ہے؟''

میں نے اپنے مخصوص انداز میں وکیل مخالف کی ''طبیعت سے'' ایسی ''مزاج پرسی'' کر دی تھی کہ وہ کوئی اونچا یا نیچا خیال ظاہر کرنے کی حالت میں نہیں رہا تھا۔ اس نوعیت کی خفیہ کارروائی کو دیسی زبان میں ''جوتوں سے پیٹنا'' کہا جاتا ہے۔ مطلب بدن پر چوٹ کا نشان ندارد اور اندر سے ہر سسٹم کا سوا ستیاناس۔

وکیل استغاثہ اپنے پوشیدہ و نادیدہ گھائل اندرون کی اذیت سے بوکھلا کر بے تکے انداز میں ملزم کی ضمانت کو رکوانے کے لیے الٹے سیدھے دلائل دینے میں مصروف ہو گیا۔ جج چند منٹ تک اسے سنتا رہا پھر دوٹوک لہجے میں کہا۔

''پراسیکیوشن نے ایسا کوئی بھی ٹھوس ثبوت مہیا نہیں کیا جس کی بنا پر ملزم کی ضمانت کی درخواست کو رد کیا جا سکے لہٰذا یہ عدالت ملزم گل زمان کو ضمانت پر رہا کرتی ہے۔ اس پابندی کے ساتھ کہ جب تک یہ کیس عدالت میں ہے، ملزم اس شہر سے باہر نہیں جائے گا۔ کسی ایمرجنسی کی صورت میں کراچی سے باہر جانے سے پہلے متعلقہ تھانے کو آگاہ کر کے اس کی اجازت لینا ہوگی۔'' پھر اس نے چوبی ہتھوڑا اٹھایا اور ان الفاظ کے ساتھ مذکورہ ہتھوڑے کو استعمال کر ڈالا۔

''دی کورٹ از ایڈ جارنڈ فار دی ڈے۔''

اس روز عدالت میں گل زمان کا حمایتی اور اس کا ضمانتی دونوں موجود تھے۔ حمایتی صنوبر حسین ہی نے دراصل گل زمان کے لیے ارشاد الحق نامی ایک ضمانتی کا بندوبست کیا تھا۔ ارشاد الحق ایک معروف کار ڈیلر تھا۔ اس کا شوروم یونیورسٹی روڈ پر اسلامیہ کالج کے نزدیک واقع تھا۔ اس کی شخصیت تگڑی اور وکیل استغاثہ کے دلائل مقابلتاً بودے ثابت ہوئے تھے لہٰذا گل زمان کی ضمانت کے راستے کی تمام تر رکاوٹیں خود بخود ہٹ گئی تھیں۔

ہم کورٹ روم سے نکل کر کوریڈور میں آئے تو صنوبر حسین نے مجھ سے کہا۔ ''میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ آپ کے پائے کا اور کوئی وکیل کم از کم سٹی کورٹ میں تو نہیں ہے۔ آپ نے پہلے ہی قدم پر ایک بڑی کامیابی حاصل کر لی ہے۔ میں گل زمان کو ایک آزاد انسان کی حیثیت سے اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔''

صنوبر حسین نے اس سے پہلے بھی میرے آفس میں کچھ اس انداز میں میری تعریف کی تھی جیسے وہ مجھے جانتا ہو لیکن میں نے اس کی اس بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ اب مجھے اس حوالے سے غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ عین ممکن ہے ماضی میں وہ کسی ایسے کیس کا کوئی کردار رہا ہو جس کیس کو میں نے ہینڈل کیا تھا۔ بہرکیف اس کی بات کے جواب میں، میں نے کہا۔

''یہ تو شروعات ہیں صنوبر صاحب! آگے کے معاملات کے لیے مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت پیش آئے گی۔ آپ اس کے لیے تیار ہیں نا؟''

''ایک دم تیار وکیل صاحب!'' وہ پُرعزم لہجے میں بولا۔ ''آپ نے کہا گل زمان کے لیے کسی معتبر ضمانتی کا انتظام کرنا ہے، میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کر دی۔ آئندہ بھی آپ جو کہیں گے، میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ بتائیں کیا کرنا ہے؟''

''فی الحال آپ یہ کریں کہ ایک آدھ روز میں طوبیٰ ہومز کے یونین انچارج داؤد بھائی کو لے کر میرے آفس آئیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''گل زمان سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں داؤد بھائی میرے مؤکل کے لیے اپنے دل میں بھلائی اور ہمدردی کے جذبات رکھتا ہے۔ چوری کی یہ واردات چونکہ اسی رہائشی عمارت میں ہوئی ہے لہٰذا داؤد بھائی سے میری ملاقات گل زمان کے لیے کئی حوالوں سے سودمند ثابت ہوگی۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟''

''جی بالکل!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں کل ہی داؤد بھائی سے آپ کی ملاقات کا انصرام کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ اور کچھ؟''

''سردست اتنا کافی ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''باقی ضرورت پڑنے پر بتاؤں گا۔''

اس نے تہِ دل سے میرا شکریہ ادا کیا اور مجھے سلام کر کے گل زمان کے ہمراہ گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ یہ

بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس موقع پر گل زمان کس قدر خوش و مطمئن تھا۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر اس کیس کی باقاعدہ سماعت شروع ہوئی۔ جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم گل زمان نے میری ہدایات کی روشنی میں صحتِ جرم سے صاف انکار کر دیا۔ اس کے بعد ملزم کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا گیا۔

یہ ایک سادہ اور نپا تلا بیان تھا جو اس سے پہلے وہ پولیس کو بھی دے چکا تھا۔ جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد وکیل استغاثہ جرح کے لیے اکیوزڈ باکس (ملزم والے کٹہرے) کے نزدیک چلا گیا اور اس کے چہرے پر نگاہ جما کر تیز لہجے میں سوال کیا۔

''کیا یہ درست ہے کہ تم پچھلے پانچ سال سے طوبیٰ ہومز میں چوکیداری کر رہے ہو...... میرا مطلب ہے چوکیداری کر رہے تھے؟''

''جی، یہی حقیقت ہے۔'' ملزم نے رسانیت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''تمہاری تنخواہ کتنی ہے؟''

''دو ہزار روپے۔''

''سو کھے دو ہزار روپے یا کچھ آمدنی اوپر سے بھی ہو جاتی ہے؟'' وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

ملزم اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں لگ بھگ ہزار روپے اوپر سے بھی کما لیتا ہوں۔''

''اس اضافی آمدنی کا ذریعہ کیا ہے؟''

''اس بلڈنگ میں رہنے والے اکثر لوگ مجھ سے اپنی گاڑیاں صاف کراتے ہیں۔'' ملزم نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ''وہ اس کام کے لیے مجھے پیسے دیتے ہیں۔ آپ اس رقم کو میری اوپر کی کمائی یا اضافی آمدنی کہہ سکتے ہیں۔''

''یعنی اس پارٹ ٹائم کام کا تمہاری اصل جاب سے کوئی تعلق نہیں ہے؟'' وکیل استغاثہ نے شاطرانہ انداز میں سوال کیا۔ ''چوکیداری کی وہ جاب جس کی تمہیں مبلغ دو ہزار روپے تنخواہ دی جاتی تھی؟''

''جی، یہی حقیقت ہے۔'' ملزم نے مختصر جواب دیا۔

''تمہاری ڈیوٹی کب سے کب تک ہوتی ہے؟''

''صبح آٹھ بجے سے رات آٹھ بجے تک۔''

''طوبیٰ ہومز کے مکینوں کی گاڑیاں تم صبح آٹھ بجے سے پہلے صاف کرتے ہو یا پھر رات آٹھ بجے کے بعد؟''

''یہ کام میں عموماً دن میں دس اور گیارہ بجے کے درمیان کرتا ہوں۔'' ملزم نے بتایا۔ ''یہ ان لوگوں کی گاڑیاں ہیں جو گیارہ بجے کے بعد اپنے آفس یا کاروبار کے لیے نکلتے ہیں۔ وہ صبح اپنے بچوں کو ان کے اسکول پہنچا کر گاڑیاں پارکنگ میں لگا دیتے ہیں اور میں گیارہ بجے سے پہلے ان کی گاڑیاں چمکا دیتا ہوں۔''

''کیا اپارٹمنٹ نمبر ایک سو دو والوں کی گاڑی بھی تم ہی چمکاتے ہو؟'' وکیل استغاثہ نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''نہیں۔'' ملزم نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔ ''ایک سال پہلے جب وہ لوگ اس بلڈنگ میں آئے تھے تو انہوں نے اپنی گاڑی کی صفائی کا کام مجھے دیا تھا لیکن پھر میں نے خود ہی انہیں منع کر دیا تھا۔''

''اس کی کوئی خاص وجہ؟'' وکیل استغاثہ نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔ ''جب تم دوسرے لوگوں کی گاڑیاں صاف کرتے ہو تو پھر اس کیس کے مدعی اشفاق محمود کی گاڑی سے انکار کیوں؟''

''اس انکار کی کئی وجوہات ہیں لیکن ان میں سے دو زیادہ اہم ہیں۔'' ملزم نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''اور ان دونوں وجوہات کا تعلق اشفاق صاحب کی بیوی عمرانہ باجی سے ہے۔''

''عدالت ان دونوں وجوہ کے بارے میں جاننا چاہتی ہے۔'' وکیل استغاثہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''نمبر ایک، اشفاق صاحب زیادہ تر شہر سے باہر رہتے ہیں اور ان کی غیر موجودگی میں گاڑی عمرانہ باجی چلاتی ہیں، اور سچی بات تو یہ ہے کہ انہیں ڈرائیونگ ٹھیک طرح سے نہیں آتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی کھیت میں ٹریکٹر چلا رہی ہوں۔'' ملزم نے میرے پڑھائے ہوئے سبق کی روشنی میں بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ''جب وہ گاڑی کو لاکر پارکنگ میں کھڑی کرتی ہیں تو اس کا حشر نشر ہو چکا ہوتا ہے اور وہ چاہتی ہیں کہ میں خشک اور گیلے کپڑے کی مدد سے ان کی گاڑی کو بھی اتنا ہی چمکا دوں جیسا کہ میں باقی لوگوں کی گاڑیوں کو صاف کرتا ہوں اور یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ ان کی گاڑی کو تو روزانہ ''کارواش'' میں جاکر باقاعدہ سروس کرانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ نمبر دو......'' وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''عمرانہ باجی مزاج کی بھی بہت تیز ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر وہ غصے میں آجاتی ہیں اور سامنے والے کی بے عزتی کر کے رکھ دیتی ہیں۔ میں اس بلڈنگ میں ملازم ہوں۔

پلٹ کر جواب دوں گا تو سب یہی کہیں گے کہ میں نے بدتمیزی کی ہے اسی لیے میں نے ان کی گاڑی صاف کرنے سے انکار کر دیا تھا۔''

''تم نے مسز عمرانہ کی گاڑی صاف کرنے سے تو انکار کر دیا لیکن تمہارے دل میں ان کے لیے غصہ بھرتا چلا گیا۔'' وکیل استغاثہ نے ملزم اور مدعی کی بیوی عمرانہ کے مابین چپقلش کو اپنے انداز میں اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے تیز آواز میں کہا۔ ''تم کھل کر اپنی ناپسندیدگی اور غصے کا اظہار نہیں کر سکتے تھے اس لیے تم نے سب سے پہلے مسز عمرانہ کے اکلوتے بیٹے واصف کو اپنی دشمنی کا نشانہ بنایا اور اسے پوری بلڈنگ میں دنیا کا سب سے زیادہ شیطان اور بدتمیز بچہ مشہور کر دیا۔ جب اس سے بھی تمہارے انتقام کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی تو تم نے موقع تاک کر ان کے گھر کا ہی صفایا کر ڈالا...... ہیں نا؟''

''بالکل نہیں۔ آپ غلط کہہ رہے ہیں وکیل صاحب!'' ملزم نے کمال جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''واصف کس ٹائپ کا بچہ ہے، یہ پوری بلڈنگ اچھی طرح جانتی ہے۔ آپ طوبیٰ ہومز کے مکینوں کو یہاں بلا کر میری بات کی تصدیق یا تردید کر سکتے ہیں۔ باقی یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ چوری والے اس معاملے سے میرا کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔''

''ضرورت پڑنے پر طوبیٰ ہومز کے دیگر مکینوں کو بھی یہاں بلایا جائے گا۔ فی الحال تم میرے سوالوں کے جواب دو۔'' وکیل استغاثہ نے معنی خیز لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''تم یہ بات اچھی طرح جانتے تھے نا کہ مسز عمرانہ صبح نو بجے سے گیارہ بجے تک سونے کی عادی ہیں۔ یہ ایک طرح سے ان کے معمول میں شامل ہے۔''

''ہاں، میں جانتا ہوں۔'' ملزم نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''مسز عمرانہ کی اس عادت کے بارے میں میرے علاوہ بھی کئی اور لوگ جانتے ہیں جن میں ان کا شوہر اشفاق محمود، بھائی شاکر علی، گھر میں کام کرنے والی ماسی سلمیٰ اور رات والا چوکیدار ظاہر شاہ شامل ہیں۔''

وکیل استغاثہ نے ملزم کی سنی ان سنی کرتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تمہارے وکیل صاحب نے عدالت کو بتایا ہے کہ تم ایک ایماندار اور صاحب کردار انسان ہو لیکن تمہارا عمل تو اس کے برعکس ہے۔ تمہیں اس بلڈنگ کی چوکیداری کے لیے رکھا گیا ہے اور تم اسی وقت میں ''پارٹ ٹائم'' جاب کر کے مال بنا رہے ہو۔ یہ کہاں کی ایمانداری اور انسانیت ہے؟''

میں نے ملزم سے دو تین تفصیلی ملاقاتیں کر کے اسے اچھی طرح سکھا دیا تھا کہ عدالت میں سرکاری وکیل کے ساتھ کیسے پیش آنا ہے۔ وہ میری ہدایات کے عین مطابق بڑے اعتماد سے بات کر رہا تھا۔

''یہ ٹھیک ہے کہ میں طوبیٰ ہومز کا چوکیدار ہوں لیکن میرے فرائض میں صرف بلڈنگ کے گیٹ پر کھڑے رہنا ہی شامل نہیں ہے وکیل صاحب!'' ملزم نے اپنی پوزیشن کلیئر کرتے ہوئے کہا۔ ''وقت پر موٹریں چلا کر زیرزمین ٹینک میں پانی بھرنا پھر بلڈنگ کی چھت والے ٹینک میں پانی چڑھانا، لائٹ چلے جانے پر جنریٹر آن کرنا، مکینوں کی گاڑیوں کے لیے بیسمنٹ والا گیٹ کھولنا اور بند کرنا، بلڈنگ میں آنے جانے والے لوگوں پر نظر رکھنا اور اس کے علاوہ بھی ہزاروں کام۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''بارہ گھنٹے کے اس جھمیلے میں میرے پاس وہی ایک گھنٹا قدرے کم مصروف ہوتا ہے جب میں گاڑیوں کی صفائی وغیرہ کا کام کرتا ہوں اور ہماری کمیٹی کے صدر صاحب یعنی داؤد بھائی نے مجھے اس کی اجازت دے رکھی ہے۔ بلڈنگ کے دیگر مکینوں کو بھی میرے اس اضافی کام پر کوئی اعتراض نہیں ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ میں اپنی ڈیوٹی میں کسی قسم کی بددیانتی نہیں کر رہا۔''

''تمہاری اسی ایماندارانہ پارٹ ٹائم جاب کے دوران میں اپارٹمنٹ نمبر ایک سو دو میں چوری کی واردات ہو جاتی ہے۔'' وکیل استغاثہ نے ملزم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اور تمہارا یہ کہنا ہے کہ تمہیں اس چوری کے بارے میں کچھ پتا ہی نہیں ہے۔ تم لوگوں کی کاریں چمکانے میں لگے رہے اور کوئی فرسٹ فلور کے ایک اپارٹمنٹ میں جھاڑو پھیر کر چلا گیا۔ یہ ہے تمہاری فرض شناسی؟'' وہ ڈرامائی انداز میں تھما پھر چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''بتاؤ، یہ تمہارا خود کا کارنامہ ہے یا تم نے اس واردات میں کسی اور کی مدد کی ہے۔ تمہارے شامل ہوئے بنا یہ کام ہو نہیں سکتا تھا۔ تم چاہو تو سچ بول کر اپنی سزا میں کمی کرا سکتے ہو...... بتا دو، تم نے مالِ مسروقہ کو کہاں ٹھکانے لگایا ہے؟''

''آپ مجھے چور کہیں یا کسی چور کا ساتھی، اس سے حقیقت بدل نہیں سکتی وکیل صاحب!'' ملزم نے بیزاری بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ مجھ سے دس بار بھی یہ سوالات

کریں گے تو میرا جواب ایک ہی ہوگا کہ میں نے چوری کی ہے اور نہ ہی کسی چور کا مددگار ہوں۔ آپ خوامخواہ مجھ پر شک کر رہے ہیں۔''

وکیل استغاثہ نے مختلف زاویوں سے میرے مؤکل پر متعدد حملے کیے تھے لیکن وہ گل زمان کو توڑنے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا چنانچہ اس نے اپنی جرح کو موقوف کرنے کا اعلان کر دیا۔

''مجھے ملزم سے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!''

استغاثہ کی جانب سے نصف درجن گواہوں کی فہرست دائر کی گئی تھی لیکن قبل اس کے کہ گواہوں کی پیشیوں کا سلسلہ شروع ہوتا "میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یور آنر! میں اس کیس کے انکوائری آفیسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''

زیر سماعت کیس کا تفتیشی افسر اس وقت کورٹ روم میں موجود تھا۔ میری فرمائش نما درخواست کے جواب میں جج کے حکم پر آئی او وٹنس باکس میں آکر کھڑا ہوگیا۔ وہ رینک کے اعتبار سے سب انسپکٹر تھا۔ اس کے متناسب بدن پر پولیس کی یونیفارم خوب پھب رہی تھی۔

''آئی او صاحب! میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔'' میں نے انکوائری آفیسر کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''دو، تین آسان سوال اور بس۔''

سب انسپکٹر صاحب نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

''آپ کی رپورٹ کے مطابق آٹھ نومبر کی صبح لگ بھگ دس بجے طوبیٰ ہومز کے اپارٹمنٹ نمبر ایک سو دو میں چوری ہوئی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن آپ نے دو روز بعد یعنی دس نومبر کے دن کے گیارہ بجے ملزم کو گرفتار کیا تھا۔ اس تاخیر کا کوئی خاص سبب؟''

''تاخیر کے ذمے دار ہم نہیں بلکہ اس کیس کا مدعی اشفاق محمود ہے وکیل صاحب!'' آئی او نے اکھڑے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''پولیس کے محکمے میں بھی انسان ہی کام کرتے ہیں۔ انہیں الہام نہیں ہوتا کہ کس جگہ کون سی واردات ہو رہی ہے۔ جب تک کوئی شخص ہمارے پاس آکر اپنی شکایت درج نہیں کراتا، ہم کارروائی نہیں کرتے۔ اس معاملے میں بھی یہی ہوا تھا۔ ہمارے روزنامچے کے مطابق اشفاق محمود نے دس نومبر کی صبح دس بجے تھانے آکر اس واقعے کی رپورٹ درج کرائی تھی اور ہم نے ایک گھنٹے کے بعد ملزم کو گرفتار کرلیا۔ بتائیں، ہم سے کون سی کوتاہی اور غفلت سرزد ہوئی ہے؟''

''میرے سوال کرنے کا مقصد آپ کی کسی سستی یا غلطی کو اجاگر کرنا نہیں تھا سب انسپکٹر صاحب!'' میں نے متحمل انداز میں کہا۔ ''میں اپنی معلومات کی خاطر اس تاخیر کی وجہ جاننا چاہتا تھا کیونکہ وکیل استغاثہ کے مطابق یہ کوئی معمولی چوری نہیں ہے۔ میرے خیال میں اس پر تو کوئی فوری ایکشن ہونا چاہیے تھا۔ خیر.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''آپ جائے وقوعہ پر پہنچے اور آپ نے ملزم کو گرفتار کرلیا۔ کیا آپ نے جائے واردات کا جائزہ بھی لیا تھا۔ میرا مطلب ہے آپ نے اپارٹمنٹ نمبر ایک سو دو کا وزٹ کیا تھا؟''

''موقع واردات کا تفصیلی جائزہ تو کارروائی کا لازمی جزو ہوتا ہے وکیل صاحب!'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''بالکل! میں نے مذکورہ اپارٹمنٹ کے اندر جا کر ہر چیز کا اچھی طرح معائنہ کیا تھا اور اس گھر میں رہنے والے افراد سے گفتگو بھی کی تھی۔''

''پھر اس معائنے اور بات چیت کا کیا نتیجہ نکلا؟'' میں نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

''صاحب خانہ کے مطابق ملزم نے دو روز قبل ان کے اپارٹمنٹ میں چوری کی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔

''یہ تو مدعی اور اس کی بیوی کا دعویٰ ہے۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''میں تو آپ کی تفتیش کے نتائج سے بھی آگاہ ہونا چاہ رہا تھا۔ کیا اس اپارٹمنٹ کے اندر کسی بھی جگہ آپ کو ملزم کی انگلیوں کے نشانات ملے تھے؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں جواب دیا۔

''آپ کیا سمجھتے ہیں، اس واردات کے دوران میں ملزم نے اپنے ہاتھوں پر دستانے پہن رکھے تھے یا اپارٹمنٹ سے نکلتے وقت اس نے اپنی انگلیوں کے تمام نشانات کو صاف کر دیا تھا؟''

''میرے خیال میں دو روز گزر جانے کے بعد ملزم کے فنگر پرنٹس وہاں موجود نہیں رہے تھے۔'' اس نے گڑبڑائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''گھر میں روزانہ صفائی جو ہوتی ہے۔''

''آپ کے اس زریں خیال پر میرا دل چاہ رہا ہے کہ ایک زوردار قہقہہ لگاؤں مگر عدالت کا احترام اس کی اجازت نہیں دیتا۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''چلیں مان لیا کہ مدعی کے اپارٹمنٹ میں روزانہ ایسی زبردست صفائی ہوتی ہے کہ تمام دیواروں اور دروازوں کو گھس گھس کر صاف

کیا جاتا ہے اس لیے ان دو روز میں ملزم کے فنگر پرنٹس کا نام ونشان نابود ہو گیا۔ آپ معزز عدالت کو صرف اتنا بتا دیں کہ ملزم اپارٹمنٹ کے اندر داخل کیسے ہوا تھا...... گھنٹی بجا کر...... دستک دے کر...... یا پھر دروازہ توڑ کر؟"

"مدعی کی بیوی مسز عمرانہ نے ہمیں بتایا ہے کہ وہ سونے سے پہلے دروازہ بند کرنا بھول گئی تھی۔"

"ملزم کو یہ کیسے خبر ہوئی کہ وقوعہ کے روز مسز عمرانہ نے سوتے وقت اپنے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا ہے؟" میں نے جارحانہ انداز میں پوچھا۔ "لہٰذا وہ اس موقع کو غنیمت جان کر چوری کی نیت سے اپارٹمنٹ میں گھسا اور قیمتی سامان کے علاوہ نقدی بھی لے اڑا۔ ایک بات دھیان میں رہے کہ چوری کی واردات کا عین وہی وقت ہے جب معمول کے مطابق ملزم بلڈنگ کے بیسمنٹ میں گاڑیاں صاف کر رہا تھا۔"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ "بہت سارے معاملات میں ہمیں گھر والوں یعنی متاثرین کے بیانات پر یقین کرنا پڑتا ہے۔"

"چاہے اس یقین کی بنا پر کوئی معصوم اور بے گناہ شخص عدالت سے ایک لمبی سزا پا کر جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے پہنچ جائے؟" میں نے کڑوے لہجے میں استفسار کیا۔ "یہ تفتیش کا کون سا طریقہ ہے انسپکٹر صاحب؟"

آئی او کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ میں نے اسے کافی مشکل میں پایا۔ قبل اس کے کہ وہ سنبھالا لے کر کسی لولی لنگڑی وضاحت کی کوشش کرتا، میں نے آخری سوال داغ دیا۔

"کیا آپ نے مالِ مسروقہ برآمد کر لیا؟"

"ابھی تک نہیں۔" وہ اپنے چہرے پر نمودار ہونے والے پسینے کو صاف کرتے ہوئے بے جان لہجے میں بولا۔ "کوشش جاری ہے۔ بہت جلد ہمیں کامیابی مل جائے گی۔"

"آپ اس سعی لاحاصل میں لگے رہیں۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "بے سمت بھاگنے والے کبھی اپنی منزل پر نہیں پہنچ پاتے۔" پھر میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے ان الفاظ کے ساتھ اپنی جرح موقوف کر دی۔

"جنابِ عالی! میرا مؤکل اور اس کیس کا ملزم گل زمان ایک بے قصور انسان ہے۔ اسے کسی گہری سازش کے تحت اس چوری کی واردات میں اندر فٹ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آئی او سے ہونے والی گفتگو کے نتیجے میں استغاثہ کی کئی ایک خامیاں سامنے آ چکی ہیں۔ باقی کی کسر میں گواہوں کے بیانات کے موقع پر پوری کر دوں گا۔ دیٹس آل یور آنر!"

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔

آئندہ پیشی سے پہلے صنوبر حسین نے طوبیٰ ہومز کی کمیٹی کے صدر داؤد بھائی سے میری تفصیلی ملاقات کرا دی۔ داؤد بھائی ٹھنڈے مزاج کا ایک دانا و بینا انسان تھا۔ اس سے مل کر مجھے دلی خوشی ہوئی۔ بعض لوگ پہلی ہی ملاقات میں اپنے اپنے سے لگتے ہیں۔ داؤد بھائی کا شمار بھی انہی افراد میں ہوتا تھا۔ اس کیس کے حوالے سے داؤد بھائی نے مجھے خاصی مفید معلومات دیں جن کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب موقع پر کیا جائے گا۔ اس ملاقات کے اختتام پر میں نے داؤد بھائی سے کہا۔

"ضرورت پڑنے پر میں گواہی کے لیے آپ کو عدالت میں حاضر ہونے کی زحمت دوں گا۔ آپ اس کے لیے ذہنی طور پر تیار رہیے گا۔"

"حق اور سچ کی سربلندی کے لیے آپ مجھے کبھی بھی پیچھے نہیں پائیں گے بیگ صاحب!" وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولا۔ "ہم کئی نسلوں سے جیولری کے بزنس میں ہیں۔ میں کھرے اور کھوٹے کی پہچان اچھے سے کر سکتا ہوں جناب!"

میں ستائشی نظر سے اسے دیکھتا چلا گیا۔

☆☆☆

اگلی پیشی پر استغاثہ کی جانب سے اس کیس کے مدعی اشفاق محمود کو سب سے پہلے وٹنس باکس میں کھڑا کیا گیا۔ اشفاق کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ وہ سانولی رنگت اور بھاری بدن کا مالک ایک خشک مزاج شخص تھا۔ اس نے اپنا بیانِ حلفی ریکارڈ کرا دیا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے اس کے نزدیک چلا گیا۔

"اشفاق صاحب!" وکیل استغاثہ نے معتدل انداز میں سوال کیا۔ "کیا آپ وقوعہ کے وقت شہر میں موجود نہیں تھے؟"

"جی ہاں، میں اپنے کاروباری دورے پر نکلا ہوا تھا۔" گواہ نے جواب دیا۔

"آپ کا یہ دورہ کہاں کا تھا؟"

"سکھر، گھوٹکی اور میر پور خاص۔"

"آپ کراچی سے کب روانہ ہوئے تھے؟" وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

گواہ نے بتایا۔ ”پانچ نومبر کی صبح۔“
”اور آپ کی واپسی کب ہوئی؟“
”نو نومبر کی رات، لگ بھگ گیارہ بجے۔“
”اور اگلی صبح یعنی دس نومبر کو آپ نے تھانے جا کر اس واقعے کی رپورٹ درج کرادی؟“ وکیل استغاثہ نے سوالیہ نظر سے اپنے گواہ کی طرف دیکھا۔

”اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔“ وہ خفگی آمیز لہجے میں بولا۔ ”میرے گھر میں چوری ہوئے دو دن گزر گئے اور بلڈنگ کی کمیٹی کی جانب سے کوئی ایکشن نہیں ہوا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ فوری طور پر چوکیدار گل زمان کو پولیس کے حوالے کردیا جاتا مگر یہاں تو کچھ اور ہی چل رہا تھا۔ ملزم کو بچانے کے لیے پولنگ کا اہتمام کردیا گیا تھا۔ جب میری بیوی نے مجھے ان حالات کے بارے میں بتایا تو میں سر پکڑ کر رو گیا۔ پھر مجبوراً میں تھانے پہنچا اور اس واقعے کی رپورٹ درج کرادی۔ پولیس کا میں شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا ہے۔“

”تو آپ کو یقین ہے کہ آپ کے گھر میں ہونے والی چوری کا ذمے دار دن والا چوکیدار گل زمان ہی ہے؟“ وکیل استغاثہ نے اپنی مرضی کے الفاظ گواہ کے منہ میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”یا تو یہ خود چور ہے یا پھر چور کا مددگار ہے؟“

”بالکل، یہی حقیقت ہے۔“ گواہ نے پُر وثوق انداز میں کہا۔ ”اسی لیے تو یہ اس وقت ایک مجرم کی حیثیت سے سر جھکائے کٹہرے میں کھڑا ہے۔“

”دیٹس آل یور آنر!“ وکیل استغاثہ نے فاتحانہ انداز میں کہا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔ ”یور وٹنس پلیز!“

اپنی باری پر میں وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا اور گواہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سپاٹ آواز میں کہا۔ ”اشفاق صاحب! آپ اپنی سوچ کی تصحیح کرلیں پلیز!“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ وہ بھڑک کے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا۔

”مطلب یہ کہ......“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”ابھی تک اس عدالت میں میرے موکل پر لگایا گیا الزام ثابت نہیں ہوسکا لہٰذا اسے مجرم کی حیثیت دینا سراسر غلط ہے۔ وہ اس وقت ایک ملزم کی حیثیت سے سر جھکائے کٹہرے میں کھڑا ہے۔ امید ہے میری بات آپ کی سمجھ میں آگئی ہوگی کیونکہ آپ ایک کاروباری اور سمجھ دار انسان ہیں۔“

”مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ وہ ناگواری سے مجھے گھورتے ہوئے بولا پھر گل زمان کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا۔ ”میں صرف یہ جانتا ہوں کہ اس بندے نے میرے گھر میں چوری کرکے یا چوری کرواکے مجھے بھاری نقصان پہنچایا ہے لہٰذا میرا نقصان پورا کرنے کے ساتھ ہی اس مکار کو کڑی سے کڑی سزا بھی ملنا چاہیے۔“

”میں آپ کی ذہنی کیفیت اور مجروح احساسات کو سمجھ سکتا ہوں اشفاق صاحب!“ میں نے اپنی جرح میں مصنوعی ہمدردی کا بگھار لگاتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”لیکن بے حد افسوس کے ساتھ کہوں گا عدالت انسان کے جذبات کو نہیں، واقعاتی شواہد اور حقائق کی روشنی میں فیصلہ کرتی ہے۔ آپ کا وہی خیال اور وہی رائے صائب مانی جائے گی جس کو ثابت کرنے کے لیے آپ کے پاس ٹھوس دلیل یا ثبوت موجود ہو۔ بے بنیاد باتوں کی یہاں کوئی اوقات اور اہمیت نہیں ہے۔“

”آخر آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟“ وہ معاندانہ لہجے میں مستفسر ہوا۔ ”آپ کی باتیں میرے سر کے اوپر سے گزر گئی ہیں۔“

”میں اپنی باتوں کے کان کھینچ کر انہیں آپ کے سر کے اوپر سے صرف لینڈ کرنے کو کہتا ہوں بلکہ میری کوشش ہوگی کہ آپ کے دماغ کا ریسیور انہیں بآسانی اپنے اندر مقیم بھی کرلے۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”لیکن اس کے لیے آپ کو پوری توجہ سے مجھے سننا ہوگا۔ بولیں منظور ہے یا نہیں؟“

وہ بیزاری سے بولا۔ ”پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“

”آبجیکشن یور آنر!“ وکیل استغاثہ نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ”ڈیفنس اپنی اوٹ پٹانگ باتوں سے استغاثہ کے معزز گواہ کو پریشان کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ ڈیفنس کا یہ انداز کسی بھی طور مہذب اور معقول نہیں ہے۔“

”آبجیکشن سسٹینڈ!“ جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر میری جانب دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔ ”وکیل صاحب! آپ گواہ سے سادہ، آسان اور برملا انداز میں سوال کریں۔“

”آل رائٹ یور آنر!“ میں نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے مؤدب انداز میں کہا پھر استغاثہ کے گواہ کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''اشفاق صاحب!'' میں نے اپنی جرح میں تیزی لاتے ہوئے استفسار کیا۔ ''تھوڑی دیر پہلے آپ نے وکیل سرکار کے سوال کے جواب میں اور اب مجھے بڑے وثوق کے ساتھ بتایا ہے کہ ملزم گل زمان نے آپ کے گھر میں لگ بھگ ایک لاکھ تیس ہزار روپے مالیت کی چوری کی ہے۔ کیا اپنے اس دعوے پر قائم ہیں؟''

''جی بالکل!'' وہ سینہ ٹھوک کر بولا۔ ''یہی سچائی ہے۔''

''کیا آپ اس سچائی کے ذیل میں معزز عدالت کے سامنے کوئی ٹھوس ثبوت پیش کر سکتے ہیں۔ آپ نے یا کسی اور نے ملزم گل زمان کو آپ کے اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے اور چوری کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟''

''میں تو اس موقع پر کراچی میں موجود ہی نہیں تھا لہٰذا دیکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' اس نے کندھے جھٹکتے ہوئے جواب دیا۔ ''میرے خیال میں اور بھی کسی نے نہیں دیکھا مگر اس سے حقیقت بدل نہیں جاتی...... چوری تو ہوئی ہے نا۔''

''بے شک آپ کا بھاری نقصان ہوا ہوگا۔'' میں نے واشگاف الفاظ میں کہا۔ ''ڈیفنس کو اس بات سے کوئی سروکار نہیں ہے کہ چوری کس نے کی ہے یا کس نے کروائی ہے۔ وکیل صفائی کی حیثیت سے میں تو صرف یہ ثابت کرنے میں لگا ہوا ہوں کہ میرا مؤکل اس معاملے میں کسی بھی لحاظ سے ملوث نہیں ہے۔'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اشفاق محمود کی طرف دیکھتے ہوئے دو ٹوک انداز میں استفسار کیا۔

''تو آپ مانتے ہیں کہ آپ نے ملزم کو چوری کرتے دیکھا ہے اور نہ ہی ایسی کوئی منصوبہ بندی کرتے سنا ہے۔ یہ تمام تر معلومات آپ کی زوجہ محترمہ کی فراہم کردہ ہیں؟''

''جی...... جی ہاں!'' اس نے مختصر جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ اپنی بیوی سے ڈرتے ہیں؟''

''یہ کس قسم کا سوال ہے؟'' وہ کھا جانے والی نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''انتہائی واہیات اور بے ہودہ۔''

''آپ تو خوامخواہ دل پر لے گئے اشفاق صاحب!'' میں نے اس کے احساسات کی ''مرہم پٹی'' کرتے ہوئے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''حالانکہ یہ دماغ پر لینے والی بات تھی۔ اگر آپ اپنے گرد و پیش پر نگاہ ڈالیں تو اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ ہر معقول، شریف اور صلح پسند شوہر اپنی نصف بہتر سے ڈرتا ہے۔''

وہ معاندانہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنی جرح تمام کردی۔ اشفاق محمود کے بعد استغاثہ کے گواہ جاوید کو پیش کیا گیا۔

جاوید کو لوگ عام طور پر ''صاحب'' کہہ کر پکارتے تھے اور وہ اسی گلی کی ایک رہائشی عمارت ''اسٹار اسکوائر'' میں بطور خاکروب کام کرتا تھا۔ وہ میانہ قد، سانولی رنگت اور گھنگرالے بالوں والا ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ جاوید عرف صاحب نے اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کرایا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے اس کے پاس پہنچ گیا۔

''صاحب! آٹھ نومبر کی صبح کو اپنے ذہن میں تازہ کرو۔'' وکیل استغاثہ نے معتدل انداز میں کہا۔ ''یہ عدالت جاننا چاہتی ہے کہ اس روز تم نے طوبیٰ ہومز کے گیٹ کے سامنے کیا دیکھا تھا؟''

''میں اپنے کام پر آرہا تھا......!'' گواہ نے جواب دیا۔ ''گلی میں داخل ہونے پر پہلے طوبیٰ ہومز والی بلڈنگ آتی ہے پھر چند عمارتوں کے بعد اسٹار اسکوائر ہے جہاں پر میں جھاڑو پونچھے کا کام کرتا ہوں۔ جب میں طوبیٰ ہومز کے سامنے سے گزر رہا تھا تو میں نے وہاں کھڑے رکشا میں سے ایک عجیب وغریب عورت کو نکلتے دیکھا۔''

''عجیب وغریب عورت؟'' وکیل استغاثہ نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔ ''عورت تو عورت ہی ہوتی ہے۔ ''عجیب وغریب'' سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''اس عورت کا قد مردوں کی طرح کافی اونچا تھا۔'' جاوید وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس نے برقع پہن رکھا تھا جو اس کی پنڈلیوں تک آتا تھا۔ عورتیں عموماً جو برقع پہنتی ہیں اس کا گھیر اور لمبائی اتنی ہوتی ہے کہ ان کے پاؤں اور جوتے وغیرہ بھی چھپ جاتے ہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ اس عورت نے کسی نوعمر لڑکی کے سائز کا برقع پہن رکھا ہو۔ اس کے ہاتھ بھی عورتوں جیسے نازک اور پتلے نہیں تھے بلکہ ان پر مجھے مردوں کی طرح کے بال بھی نظر آئے تھے اور وہ مردوں ہی کے مانند سینہ تان کر چل رہی تھی۔''

''کہاں چل رہی تھی؟'' وکیل استغاثہ نے سوال کیا۔ ''ابھی تو تم نے بتایا ہے کہ وہ طوبیٰ ہومز کے سامنے کھڑے ایک رکشا سے نکلی تھی۔''

''جی، بالکل۔ میں نے آپ سے غلط نہیں کہا سر جی!'' گواہ نے مضبوط لہجے میں بولا۔ ''وہ عورت رکشا میں سے نکل کر تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے طوبیٰ ہومز کے اندر چلی گئی تھی۔''

''کیا تم اس کا چہرہ دیکھ پائے تھے؟''

''نہیں جناب!''

''اس کا مطلب ہے ضروری نہیں کہ وہ کوئی عورت ہی ہو۔'' وکیل استغاثہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''وہ کوئی دراز قامت برقع پوش مرد بھی تو ہوسکتا ہے؟''

''سر! آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی۔'' جاوید مسیح نے ترنت جواب دیا۔ ''اس وقت مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔''

''مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے اپنی جرح موقوف کرتے ہوئے کہا پھر میری جانب دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

''یور وٹنس مائی ڈیئر کونسلر!''

''جاوید مسیح!'' میں نے استغاثہ کے گواہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے معتدل انداز میں سوال کیا۔ ''تم نے ابھی معزز عدالت کو بتایا ہے کہ وہ عجیب وغریب عورت رکشا میں سے نکل کر طوبیٰ ہومز کے اندر چلی گئی تھی۔ اس رہائشی عمارت میں داخل ہونے کے دو راستے ہیں۔ نمبر ایک، چھوٹا گیٹ۔ بلڈنگ میں رہنے والے لوگ آمدورفت کے لیے عموماً اسی چھوٹے گیٹ کا استعمال کرتے ہیں۔ نمبر دو، بیسمنٹ والا بڑا گیٹ جہاں سے گاڑیاں پارکنگ میں آتی اور جاتی ہیں۔ وہ برقع پوش مشکوک عورت کس گیٹ سے طوبیٰ ہومز کے اندر داخل ہوئی تھی؟''

''چھوٹے گیٹ سے۔'' گواہ نے جواب دیا۔

''تم نے اس، بقول تمہارے .... عجیب وغریب عورت کے انڈر سائز برقع کا ذکر متعدد بار کیا ہے۔'' میں نے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ''کیا تم اس عدالت کو متذکرہ عورت کے برقع کا رنگ بتا سکتے ہو؟''

''جی بالکل۔'' وہ پُروثوق انداز میں بولا۔ ''اس عورت نے سلیٹی رنگ کا برقع پہن رکھا تھا۔''

میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''دیٹس آل یور آنر!''

اگلی گواہی مدعی محمد اشفاق محمود کے اکلوتے سالے اور انتہائی شیطان بچے واصف کے ماموں جان شاکر علی کی تھی۔ شاکر کا بیانِ حلفی ریکارڈ ہوچکا تو وکیل استغاثہ نے وٹنس باکس کے نزدیک جاکر اپنا کام شروع کردیا۔

''شاکر صاحب! آٹھ نومبر کی صبح آپ نے طوبیٰ ہومز کے سامنے کیا منظر دیکھا تھا؟'' وکیل استغاثہ نے سوال کیا۔

''میں گزشتہ روز یعنی سات نومبر کو ایک ضروری فائل باجی کے گھر بھول گیا تھا۔'' گواہ نے جواب دیا۔ ''وہ ایک ایسے پلاٹ کی فائل تھی جس کا سودا آٹھ نومبر دن میں ہونے والا تھا۔ میں وہی فائل لینے طوبیٰ ہومز آیا تھا۔ جب میں اپنی کار کو پارکنگ والے گیٹ کے قریب لایا تو میں نے ایک خاتون کو چھوٹے گیٹ سے نکل کر ایک رکشا پر سوار ہوتے دیکھا تھا۔ مذکورہ رکشا پہلے سے چھوٹے گیٹ کے سامنے کھڑا اسی عورت کا انتظار کررہا تھا۔ وہ عورت خاصی عجلت میں دکھائی دیتی تھی اور رکشا والا اس سے بھی کہیں زیادہ جلدی میں تھا۔ وہ عورت جیسے ہی رکشا میں بیٹھی، ڈرائیور نے فوراً رکشا آگے بڑھا دیا تھا۔''

''آپ جس عورت کا ذکر کررہے ہیں، کیا اس نے برقع پہن رکھا تھا؟'' وکیل استغاثہ نے سوال کیا۔

''جی ہاں۔'' گواہ نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''لیکن وہ برقع اس عورت کے ڈیل ڈول سے موافقت نہیں رکھتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی جسیم اور قدآور عورت کو کسی اسکول گرل کے ناپ کا برقع پہنا دیا گیا ہو۔''

''وہ وہی برقع پوش عورت ہوگی جسے جاوید مسیح نے طوبیٰ ہومز میں داخل ہوتے دیکھا تھا؟'' وکیل استغاثہ نے بہ آوازِ بلند خودکلامی کرنے والے انداز میں کہا پھر وہ اپنے گواہ کی جانب دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''آپ نے بیسمنٹ میں اپنی کار پارک کی...... اس کے بعد؟''

''اس کے بعد میں لفٹ کے ذریعے فرسٹ فلور پر پہنچا۔'' گواہ نے بتایا۔ ''جب میں باجی عمرانہ کے اپارٹمنٹ نمبر ایک سو دو کے سامنے پہنچا تو میں نے گھر کے داخلی دروازے کو کھلا پایا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت کے ساتھ تشویش بھی ہوئی کہ وہ دروازہ کھلا ہوا کیوں ہے۔ یہ بات میرے علم میں تھی کہ باجی، واصف کو اسکول بھیجنے کے بعد ڈیڑھ، دو گھنٹے کی نیند لیتی ہیں لیکن اس دوران میں وہ دروازے کو اندر سے لاک رکھتی تھیں۔ خیر، میں اپارٹمنٹ کے اندر پہنچا تو وہاں کی حالت بگڑی ہوئی تھی۔ واصف کا کمپیوٹر مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا اور مختلف درازیں اور کپڑوں والی الماری کے پٹ کھلے ہوئے تھے۔ میں نے باجی کو جگایا اور تبھی یہ انکشاف ہوا کہ صرف واصف کا کمپیوٹر ہی نہیں بلکہ باجی کے طلائی زیورات اور نقد رقم بھی غائب تھی۔''

''اس کا سیدھا سیدھا مطلب تو یہ ہوا کہ کسی شخص کے پاس اپارٹمنٹ نمبر ایک سو دو کی ڈپلی کیٹ چابی تھی۔'' وکیل استغاثہ نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''اور وہ بندہ یہ بات بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ صبح نو بجے سے دن گیارہ بجے کے دوران میں مسز عمرانہ سونے کی عادی ہیں۔ چنانچہ اس نے

موقع غنیمت کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈپلی کیٹ چابی سے اپارٹمنٹ نمبر ایک سو دو کا دروازہ کھولا اور اس کے ہاتھ جو بھی لگا اسے سمیٹ کر چلتا بنا۔"

"آپ نے بالکل ٹھیک کہا وکیل صاحب!" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اور مجھے تو اسی برقع پوش عورت پر شک ہے اور میرے مشاہداتی تجربے کے مطابق وہ یقیناً کوئی مرد تھا جس نے برقع پہن کر یہ واردات کی ہے تاکہ کسی کا اس کی طرف دھیان نہ جائے۔"

"آخری سوال۔" وکیل استغاثہ نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے سپاٹ آواز میں اپنے گواہ سے استفسار کیا۔ "جب آپ اپنی کوئی فائل لینے طوبیٰ ہومز پہنچے اور آپ نے بلڈنگ کے بیسمنٹ میں گاڑی پارک کی تو کیا اس وقت ملزم پارکنگ میں موجود تھا؟"

"نہیں وکیل صاحب!" شاکر علی نے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ "گل زمان پارکنگ ایریا میں مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔"

"مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!" وکیل استغاثہ نے تیز آواز میں کہا پھر فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"یور وٹنس پلیز!"

میں جارحانہ موڈ میں وٹنس اسٹینڈ کے پاس پہنچا پھر استغاثہ کے گواہ کو آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے پہلا سوال کیا۔

"شاکر علی! آپ کا دھندا کیسا چل رہا ہے؟"

"کون سا دھندا؟" اس نے چونکتے ہوئے لہجے میں جواباً پوچھا۔

"کیا آپ پراپرٹی کی خرید و فروخت کے علاوہ اور بھی کوئی بزنس کرتے ہیں؟" میں نے طنزیہ لہجے میں دریافت کیا۔

"اوہ اچھا۔ نہیں، میں صرف ریئل اسٹیٹ ہی کا کام کرتا ہوں۔" وہ سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اینڈ مائی دھندا از مندا۔"

"اور آپ کی نگاہ کیسی ہے؟" میں نے اپنا کام جاری رکھا۔

"جناب! میں ایک شریف انسان ہوں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "آپ خوانخواہ مجھ پر شک کر رہے ہیں۔"

"میں آپ کے کردار کی بابت نہیں، بینائی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔" میں نے اسے تیز نظر سے گھورا پھر اسی کے انداز میں انگریزی میں اضافہ کر دیا۔ "آئی مین، یور آئی سائٹ؟"

"میں سمجھ گیا۔" وہ عجیب سے انداز میں بولا۔ "آپ نے میری بصارت کے بارے میں اس لیے سوال کیا ہے تاکہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ میں نے دوسرے وکیل صاحب کو درست جواب دیا ہے یا غلط، یعنی جب وقوعہ کے روز میں نے بیسمنٹ میں گاڑی پارک کی تو گل زمان مجھے وہاں دکھائی نہیں دیا تھا...... ہیں نا؟"

"مسٹر شاکر! یہ کورٹ روم ہے، آپ کا ڈرائنگ روم نہیں اس لیے ڈونٹ بی اوور اسمارٹ۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سخت لہجے میں اسے تنبیہ کی۔ "جتنا پوچھا جائے بس اتنا ہی منہ کھولیں۔ میں نے آپ کی آئی سائٹ کے بارے میں سوال کیا تھا۔"

"جی، ٹھیک ہے۔" وہ قدرے شرمندگی سے بولا مگر اس ندامت کے اندر بھی مکاری چھپی ہوئی تھی۔ "میری نظر ایک دم پرفیکٹ ہے جناب! سکس بائی سکس۔ وکیل صاحب! میں بہ آسانی سوئی میں دھاگا ڈال لیتا ہوں۔"

"اور آپ کلر بلائنڈ بھی نہیں ہیں۔" میں نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔

"بالکل نہیں وکیل صاحب!" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

"شاکر علی!" میں نے اپنی جرح کی تندی کو بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ "وقوعہ کے روز جب آپ کوئی فائل لینے طوبیٰ ہومز کی طرف آئے تو آپ نے ایک برقع پوش عورت کو بڑی عجلت میں ایک رکشا پر سوار ہو کر وہاں سے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ایسا آپ نے تھوڑی دیر پہلے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا؟"

"جی ہاں...... یہی حقیقت ہے۔"

"اور آپ کو شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ اس برقع کے اندر کوئی مرد چھپا ہوا تھا؟"

"جی ایسا ہی ہے۔" وہ پُروثوق انداز میں بولا۔

"پھر ماننا پڑے گا کہ آپ کی نگاہ "سکس بائی سکس" ہے اور اسے عقابی نظر بھی کہا جا سکتا ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "آپ نے لمحے بھر کے لیے اس عورت نما مرد یا مرد نما عورت کو دیکھا اور اس کے بارے میں کافی حد تک جان گئے۔"

وہ کوئی اثباتی یا انکاری جواب دینے کے بجائے توصیف طلب انداز میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ لوہا گرم ہو چکا تھا لہٰذا میں نے ایک کاری ضرب لگانے کا فیصلہ کر لیا اور استغاثہ کے گواہ کے چہرے پر نگاہ جما کر سپاٹ آواز میں

دریافت کیا۔

"شاکر علی! وقوعہ کے روز جب آپ نے اس مشکوک عورت کو طوبیٰ ہومز کے اندر سے نکل کر کسی رکشا پر سوار ہوتے دیکھا تو اس نے کون سے رنگ کا برقع پہن رکھا تھا؟"

اس کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہوئے۔ لحاتی تذبذب کے بعد اس نے جواب دیا۔ "اس عورت نے سیاہ برقع پہن رکھا تھا۔"

"لیکن اسٹار اسکوائر کے مہتر جاوید مسیح کا تو دعویٰ ہے کہ اس عورت نے سلیٹی رنگ کا برقع پہن رکھا تھا۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

وہ گڑبڑا کر رہ گیا اور جذباتی لہجے میں بولا۔ "نہیں...... ہاں...... شاید وہ عورت سلیٹی برقع ہی میں ملبوس تھی۔"

"آپ کی سکس بائی سکس نگاہ کا کیا ہوا شاکر صاحب؟" میں نے زہریلے لہجے میں استفسار کیا۔ "سیاہ اور سلیٹی رنگ میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے اور آپ 'ہاں، نہ اور شاید' میں جواب دے کر جان چھڑانے کی کوشش کر رہے ہیں؟"

اس نے امداد طلب نظر سے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا۔ قبل اس کے وکیل سرکار نعرۂ مستانہ بلند کرتا، عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا۔ جج نے عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

"دی کورٹ از ایڈ جارنڈ!"

اگلی پیشی ایک ماہ بعد کی تھی۔

اب تک کی میری کارکردگی سے میرا موکل گل زمان، اس کا خیر خواہ صنوبر حسین اور ضامنتی ارشاد الحق پوری طرح مطمئن تھے۔ اس دوران میں طوبیٰ ہومز کا یونین انچارج داؤد بھائی بھی مسلسل میرے رابطے میں تھا۔ میں نے داؤد بھائی کے ذمے جو کام لگائے تھے ان میں سے بیشتر اس نے کر دیے تھے۔ بس ایک بڑا اخواری والا کام باقی تھا۔ آئندہ پیشی سے دو روز قبل داؤد بھائی نے مجھے فون کیا۔ اس وقت میں آفس سے گھر آ چکا تھا۔

"بیگ صاحب!" رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "میں نے آپ کو اس وقت ڈسٹرب کیا مگر بات ہی کچھ ایسی ہے کہ میں صبح کا انتظار نہیں کر سکا۔"

"داؤد بھائی! معذرت کی ضرورت نہیں۔" میں نے معتدل لہجے میں کہا۔ "آپ کہیں، سب خیریت تو ہے نا؟"

"جی ہاں، اللہ کا شکر ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔ "آپ کو ایک خوشخبری سنانا تھی۔ میں نے آپ کا دیا ہوا وہ مردان والا کام خوش اسلوبی سے انجام دے دیا ہے۔"

"ویری گڈ!" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "کیا اپ ڈیٹس ہیں؟"

"رحیم شاہ نے اس امر کی تصدیق کر دی ہے کہ اس کی طبیعت کبھی بھی خراب نہیں تھی۔" داؤد بھائی نے جوشیلے لہجے میں بتایا۔ "آپ کا شک صد فیصد درست نکلا ہے۔ وہ بندہ ادھر کراچی ہی میں وقت گزار کر واپس آ گیا تھا۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ پرسوں والی پیشی نتیجہ خیز ثابت ہونے والی ہے۔" میں نے کہا۔

"جی بالکل۔" وہ ٹھوس انداز میں بولا۔ "میں نے وہ

تمام معلومات اور ثبوت بھی اکٹھا کر لیے ہیں جو اس کے کراچی میں موجود رہنے کی تصدیق کرتے ہیں، مطلب ان دنوں جب وہ آفیشلی چھٹی پر تھا۔ آپ میرا اشارہ سمجھ رہے ہیں نا؟''

''ہاں، میں سمجھ گیا داؤد صاحب!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن صرف معلومات اور ثبوتوں سے گزارہ نہیں چلے گا۔''

''تو بتائیں، میرے لیے اور کیا حکم ہے بیگ صاحب؟'' وہ گہری سنجیدگی سے مستفسر ہوا۔

''بس آخری کام......!'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''پرسوں والی پیشی پر آپ کو بھی عدالت میں موجود رہنا ہوگا کیونکہ آپ اس معاملے میں ایک سند کی حیثیت کے حامل ہیں اس لیے آپ کو بوقتِ ضرورت کام آنا ہوگا۔''

''ڈن بیگ صاحب!'' اس نے توانا آواز میں کہا۔

میں ایک اطمینان بھری سانس خارج کر کے رہ گیا۔

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں مسز عمرانہ اپنی گواہی کے لیے موجود تھیں۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرادیا۔ اس کے بیان کا غالب حصہ میرے موکل اور اس کیس کے ملزم گل زمان کے خلاف زہر افشانی پر مشتمل تھا۔ اس کے نزدیک ملزم اس دنیا کا سب سے بُرا انسان تھا۔

عمرانہ کے خیالات کو وکیل استغاثہ نے ہر ممکنہ حد تک بڑھاوا دینے کے لیے اچھے بُرے درجنوں سوالات کیے۔ میں ''آبجیکشن یور آنر'' کا کارڈ استعمال کیے بغیر وکیل مخالف کی آنیاں اور جانیاں ملاحظہ کرتا رہا کیونکہ میرا ہوم ورک مکمل تھا۔ جب آدھے گھنٹے کی جرح کے بعد وکیل استغاثہ نے اپنی سب سے اہم گواہ عمرانہ کو فارغ کیا تو جج کی اجازت سے میں وٹنس اسٹینڈ کے پاس چلا گیا اور ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

''عمرانہ صاحبہ! مجھے آپ کے نقصان کا دلی افسوس ہے لیکن آپ سے سوال وجواب میرے پیشے اور زیر سماعت کیس کا تقاضا ہے لہٰذا امید ہے آپ اس ٹرائل کو برداشت کرلیں گی۔''

''وکیل صاحب! آپ کے منہ سے ہمدردی اور افسوس کے الفاظ بالکل بودے اور بے معنی لگتے ہیں۔'' وہ میرے چہرے پر نگاہ جما کر طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''کیونکہ آپ اس وقت میرے دشمن کے ساتھ کھڑے ہیں اور اسے بے گناہ ثابت کرنے کے لیے تگ ودو کر رہے ہیں۔ میں آپ کی کھوکھلی باتوں سے متاثر ہونے والی نہیں ہوں۔''

''میڈم! ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ میں اس وقت قانون کے ساتھ کھڑا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ میرے موکل نے آپ کے اپارٹمنٹ میں نقب نہیں لگائی اس لیے اسے عدالت سے بے گناہ ثابت کر کے انصاف دلانا میری پیشہ ورانہ ذمے داری ہے۔'' میں نے واشگاف الفاظ میں کہا۔ ''آپ کو میری نیت پر شک کرنے کے بجائے مجھ سے تعاون کرنا چاہیے تاکہ یہ عدالت کسی فیصلے تک رسائی حاصل کر سکے۔''

''آپ مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہیں؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے گھورتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

''آپ نے ابھی وکیل استغاثہ کے درجنوں ٹیڑھے میڑھے سوالات کے طول طویل جواب دیے ہیں لیکن میں آپ کو ایسے کسی کشٹ میں نہیں ڈالوں گا۔'' میں نے اپنے شکار کو فرائی کرنے سے پہلے ''میرینیشن پروسس'' سے گزارتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں آپ سے صرف دو یا زیادہ سے زیادہ تین سوال کروں گا لیکن آپ کو وعدہ کرنا ہوگا کہ آپ میرے سوالات کے سیدھے اور کھرے جواب دیں گی۔''

''آبجیکشن یور آنر!'' وکیل استغاثہ عدالت میں اپنی موجودگی کا ثبوت دیتے ہوئے تیز آواز میں بولا۔ ''استغاثہ کی معزز گواہ اپنا بیان ریکارڈ کرانے سے پہلے مقدس آسمانی کتاب پر ہاتھ رکھ کر سچ بولنے کا حلف اٹھا چکی ہیں۔ اس کے بعد راست گوئی کے کسی وعدے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ڈیفنس، استغاثہ کی گواہ کو فروعی باتوں میں الجھا کر عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہا ہے۔''

''آبجیکشن سسٹینڈ!'' جج نے وکیل استغاثہ کے اعتراض کو درست جانتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ کوئی وعدہ لیے بغیر اپنی جرح جاری رکھیں۔''

''سوال نمبر ایک......!'' میں نے مسز عمرانہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''چوری والا واقعہ آٹھ نومبر کی صبح لگ بھگ دس بجے پیش آیا اور دس نومبر کی صبح تک یعنی پورے دو دن آپ بلڈنگ کی کمیٹی کے صدر داؤد بھائی سے مسلسل یہ مطالبہ کرتی رہیں کہ گل زمان کو فوراً نوکری سے نکال کر اس کی جگہ کوئی دوسرا چوکیدار رکھا جائے۔ آپ نے ایک بار بھی واصف کے کمپیوٹر، اپنے طلائی زیورات اور نقدی کی بازیابی اور واپسی کا ذکر نہیں کیا۔ مالِ مسروقہ کی بازیابی، ملزم کو نوکری سے فارغ کرنے سے کہیں

زیادہ اہم تھی۔ کیا آپ یہ سمجھتی تھیں کہ ملزم کی چھٹی کر دینے سے آپ کا نقصان معجزاتی طور پر خود بخود پورا ہو جائے گا؟'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اپنے سوال کو دراز کرتے ہوئے کہا۔

''استغاثہ نے چوری کی رپورٹ تاخیر سے درج کرانے کے حوالے سے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ چونکہ آپ کا شوہر کراچی میں موجود نہیں تھا اور بلڈنگ کمیٹی نے آپ کے بجائے ملزم کا ساتھ دیا اسی لیے اس واردات کی رپورٹ دو دن تاخیر سے درج کرائی گئی تھی جبکہ آپ کا بھائی شاکر علی مسلسل یہاں موجود تھا اور وہ روزانہ آپ کے گھر آتا جاتا بھی تھا۔ وہ آپ کے شوہر سے کہیں زیادہ زمانہ ساز اور ہوشیار شخص ہے۔ اس نے تھانے جا کر اس واقعے کی رپورٹ درج کیوں نہیں کرائی؟''

''ہماری سمجھ میں جو آیا، وہ ہم نے کیا۔'' وہ جاہلانہ انداز میں بولی۔ ''اب تو وقت گزر چکا۔ ماضی کو بدلا تو نہیں جاسکتا نا۔''

''ماضی کو یقیناً بدلا نہیں جاسکتا مگر حال کے کسی بھی معاملے کو سلجھانے کے لیے ماضی کو کھنگالنا لازم ٹھہرتا ہے لیکن آپ اور آپ کے بھائی صاحب تو اس طرح مطمئن بیٹھے تھے جیسے چوری ہونے والا سامان اور نقدی وغیرہ آپ کی کسی معلوم جگہ پر رکھے ہیں۔ آپ جب چاہیں انہیں حاصل کر سکتے ہیں۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''آپ دونوں اپنی ساری توانائی اس مطالبے پر صرف کر رہے تھے کہ کسی بھی طرح ملزم کو ملازمت سے برخاست کر دیا جائے۔ خیر، جیسا کہ آپ نے کہا ''ہماری سمجھ میں جو آیا وہ ہم نے کیا'' تو میری بھی جو سمجھ میں آرہا ہے میں وہی کرنے جارہا ہوں یعنی سوال نمبر دو......!'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اپنی جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''نومبر کا پورا مہینا طوبیٰ ہومز کی کمیٹی اور دیگر رہائشیوں پر خاصا کڑا گزرا ہے۔ خصوصاً آٹھ نومبر سے اٹھارہ نومبر تک کے دن۔ آٹھ نومبر کی صبح آپ کے اپارٹمنٹ میں چوری کی واردات ہوئی اور نو نومبر کو رات والا چوکیدار ظاہر شاہ ہنگامی حالات کے پیشِ نظر اپنے گاؤں مردان چلا گیا تھا۔ اس کے والد کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہوگئی تھی۔ اس موقع پر بلڈنگ کی کمیٹی نے ظاہر شاہ کی مالی امداد کے طور پر ایک ہزار روپے، باقی رہائشیوں سے دو، دو سو روپے اور آپ نے پورے پانچ ہزار روپے اسے دیے تھے۔ آپ کی کنجوسی کے بارے میں ہر چھوٹا بڑا بخوبی جانتا ہے پھر اس فیاضی کا کوئی خاص سبب؟ ایک طرف تو آپ اپنی گاڑی صاف کرانے کے معاملے میں گل زمان کی محنت میں ڈنڈی مارتی دکھائی دیتی ہیں اور دوسری جانب ظاہر شاہ کے ساتھ شاہانہ برتاؤ۔ کیا یہ کھلا تضاد نہیں ہے؟''

''کیا کسی غریب اور پریشان حال شخص کے ساتھ بھلائی کرنے سے پہلے مجھے آپ سے یا کسی عدالت سے تحریری اجازت لینا ہوگی؟'' اس نے خاصے بدتمیز لہجے میں استفسار کیا۔

''ہرگز نہیں۔'' میں نے اس کے نامناسب رویے کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے معتدل لہجے میں کہا۔ ''آپ اپنی مرضی سے جو بھی چاہیں، کسی کو بھی دے سکتی ہیں۔ ایک نیک اور بھلائی کے کام کے لیے کسی بھی اتھارٹی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہوگی لیکن میں اپنی معلومات اور عدالتی ریکارڈ کی درستی کے لیے آپ سے یہ جاننا چاہوں گا کہ کیا آپ کو یقین ہے ظاہر شاہ کے باپ کی طبیعت واقعتاً اتنی خراب تھی کہ اسے ایمرجنسی میں مردان جانا پڑ گیا اور آپ نے اس مصیبت کی گھڑی میں دریا دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے پانچ ہزار روپے دے دیے یعنی اس کی ڈھائی ماہ کی تنخواہ کے برابر رقم؟''

''ہاں، یہ بات صد فیصد درست ہے کہ ظاہر شاہ کا باپ رحیم شاہ شدید بیمار تھا۔'' عمرانہ نے اثبات میں جواب دیا۔ ''ظاہر شاہ نے مردان پہنچ کر اپنے باپ سے فون پر میری بات بھی کرائی تھی۔''

''کیا میں آپ کے اس جواب کو لاک کر دوں مسز عمرانہ؟'' میں نے استغاثہ کی گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں پوچھا۔

''بالکل......ضرور!'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ''جو سچ ہے، وہ سچ ہے۔ حق اور سچ کو لاک کرنا بہت ضروری ہے۔''

''یور آنر!'' میں نے روئے سخن جج کی سمت موڑتے ہوئے دبنگ لہجے میں کہا۔ ''استغاثہ کی گواہ عمرانہ جس سچ کا ذکر کر رہی ہیں، وہ زیرِ سماعت کیس کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ رات والا چوکیدار ظاہر شاہ نو نومبر سے اٹھارہ نومبر تک کراچی ہی کے علاقے سلطان آباد میں اپنے چاچا کریم شاہ کے گھر میں موجود تھا۔ کریم شاہ کی چپلوں کی دکان ہے۔ مزے کی بات یہ کہ ظاہر شاہ کا باپ رحیم شاہ بفضلِ خدا صحت مند اور خوش و خرم زندگی گزار رہا ہے۔''

''آپ یہ بات اتنے دعوے سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟'' وکیل استغاثہ نے معاندانہ نظر سے مجھے گھورتے

ہوئے پوچھا۔ ''کیا آپ اس سلسلے میں کوئی ٹھوس ثبوت عدالت میں پیش کر سکتے ہیں؟''

''میرے فاضل دوست!'' میں نے وکیل استغاثہ کی طبیعت صاف کرتے ہوئے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''کورٹ روم میں بغیر دلیل اور ٹھوس ثبوت کے بات کرنے والے کو وکیل نہیں، گھسیارا کہا جاتا ہے۔'' پھر میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی بات مکمل کر دی۔

''جناب عالی! مجھے جیسے ہی پتا چلا کہ وقوعہ کے اگلے روز رات والا چوکیدار اپنے گاؤں چلا گیا ہے تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ پتا نہیں کیوں اس کے باپ کی بیماری والی بات مجھے ہضم نہیں ہوئی تھی۔ آپ اسے میری چھٹی حس کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ بہرکیف، میں نے اپنے اطمینان کے لیے طوبیٰ ہومز کی کمیٹی کے صدر داؤد بھائی کے تعاون سے کراچی تا مردان ضروری معلومات اکٹھی کرائیں تو اس کا نتیجہ جو برآمد ہوا اسی کی روشنی میں، میں ٹھوس ثبوتوں کے ساتھ یہ بات دعوے سے کہتا ہوں کہ ظاہر شاہ کا والد سرے سے بیمار تھا ہی نہیں اور وہ مردان بالکل نہیں گیا۔ اس نے یہ دن اپنے چاچا کے گھر سلطان آباد میں گزارے اور اٹھارہ نومبر کو دوبارہ ڈیوٹی پر آ گیا۔ اس موقع پر میں چند اہم پوائنٹس عدالت کے سامنے اجاگر کرنا چاہوں گا۔ اگر ان پوائنٹس کے جوابات سنجیدگی سے تلاش کیے جائیں تو زیر ساعت کیس اپنے منطقی انجام کو پہنچ جائے گا اور یہ ''تلاش'' کوئی راکٹ سائنس بھی نہیں ہے جناب عالی! داؤد بھائی اس وقت عدالت میں موجود ہیں اور قانون کی مدد کے لیے ثبوتوں کے ساتھ ہر لحہ تیار بھی۔'' میں سانس ہموار کرنے کی غرض سے متوقف ہوا پھر بہ آواز بلند اپنے دلائل کو آگے بڑھا دیا۔

''اگر رحیم شاہ مردان میں بیمار نہیں تھا تو پھر ظاہر شاہ نے اس کی طبیعت کی خرابی کا بہانہ کیوں بنایا؟ طوبیٰ ہومز کی رہائشی مسز عمرانہ نے ظاہر شاہ کی نہ صرف غیر معمولی مدد کی بلکہ معزز عدالت کے روبرو اس امر کی تصدیق بھی کی ہے کہ اس نے مردان میں موجود ظاہر شاہ کے بیمار باپ سے فون پر بات بھی کی ہے۔ ان تمام تر جھوٹوں کے عقب میں ایک گہری سازش چھپی ہوئی ہے۔ سب سے مزے کی بات یہ کہ جسامت اور قد کاٹھ کے اعتبار سے ظاہر شاہ اس برقع پوش عورت پر پورا اترتا ہے جسے جاوید مسیح نے طوبیٰ ہومز میں داخل ہوتے اور شاکر علی نے بلڈنگ سے نکلتے دیکھا تھا۔ معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ پہلی فرصت میں ظاہر شاہ اور مسز عمرانہ کو گرفتار کر کے شاملِ تفتیش کیا جائے تا کہ اس کیس میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ نظر آئے۔ اسی مرحلے سے گزرنے کے بعد انصاف کے تقاضے پورے ہو سکیں گے۔ دیٹس آل یور آنر!''

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر وٹنس باکس میں کھڑی عمرانہ پھٹ پڑی۔ ''اس منحوس شخص سے مجھے شدید نفرت ہے۔'' وہ انگلی سے ملزم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے غضب ناک لہجے میں بولی۔ ''اس کی شکل دیکھ کر میرا خون کھول اٹھتا ہے۔ جب ظاہر شاہ نے بھی میرے سامنے اس کی برائی کی تو میرے ذہن میں ملزم سے انتقام لینے کا ایک منصوبہ ترتیب پا گیا۔ میں نے ظاہر شاہ کا استعمال کر کے اس بدبخت کو چوری کے معاملے میں پھنسانے کی کوشش کی۔ اس اسکیم میں شاکر علی نے بھی ہمارا ساتھ دیا لیکن...... عین وقت پر اس بیگ کے بچے نے سارا کھیل بگاڑ کر رکھ دیا۔''

اپنی بات کے اختتام پر وہ وٹنس باکس کی چوبی ریلنگ کو تھام کر خونخوار نظر سے مجھے تکنے لگی۔ میرا کام نکل آیا تھا لہٰذا میں نے اس کی بدکلامی کا برا ماننے کے بجائے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''مسز عمرانہ! میرا نام مرزا امجد بیگ ہے اور ظاہر ہے میرے والد صاحب کے نام کے آخر میں بھی ''بیگ'' کا لفظ موجود ہے۔ سو، اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ میں بیگ صاحب کا ہی بچہ ہوں۔ باقی ابھی آپ نے معزز عدالت کے سامنے جو جذباتی بیان دیا ہے، وہ درحقیقت آپ کا ''اقبالِ جرم'' ہے......!'' ذرا دیر کو رک کر میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر ان اختتامی الفاظ کے ساتھ اپنی جرح موقوف کر دی۔

''مسز عمرانہ! میں تہ دل سے آپ کا ممنونِ احسان ہوں کہ آپ کے اقبالی بیان نے میرا کام سہل کر دیا ورنہ اس کیس کو نمٹانے کے لیے پتا نہیں اور کتنی پیشیاں بھگتنا پڑتیں۔ تھینک یو، ویری مچ میڈم!''

میں نے بڑے طریقے سلیقے سے ''عمرانہ اینڈ کو'' کو اپنی جرح کے شکنجے میں کس کر ملزم گل زمان کی باعزت رہائی کا ساماں کر دیا تھا۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ان مجرموں نے مالِ مسروقہ کو کہاں چھپا کر رکھا ہوا تھا البتہ آپ کی دلچسپی اور تفریح طبع کے لیے یہ ذکر ضروری ہے کہ میں نے ہتک عزت کا دعویٰ دائر کر کے اپنے موکل کو عمرانہ کے شوہر اشفاق محمود سے ایک تگڑی رقم دلوا دی تھی۔

(تحریر: حُسام بٹ)

مہلک کھیل

صائمہ دانش

موسم میں حبس ہو یا دل میں غبار بھرا ہو... جب تک یہ نکل نہ جائے، نہ موسم خوشگوار ہوتا ہے، نہ دل ہلکا... وہ جو ایک دوسرے کے مزاج آشنا تھے... زندگی کی کئی بہاریں ایک ساتھ دیکھ چکے تھے۔ جانے کیسے ان کے درمیان کوئی خزاں کی صورت آن بسا تھا... اب ایسے میں اسے دل کا غبار نکالنے کے لیے جو کھیل ملا، اس نے کھیلا اور جانتی تھی کہ اس مہلک کھیل میں اسے جیت اور ہار ایک ساتھ ملنے والی تھیں۔

ٹوٹے ہوئے دل کو بہلانے والی ایک حسینہ کی

خطرناک چال

میں قریباً پندرہ منٹ سے ہوٹل کے بار میں ایک اسٹول سنبھالے بیٹھی تھی۔ میرا فون میرے ہاتھ میں اور میرا پرس میرے ساتھ والے خالی اسٹول پر تھا۔ ہوٹل میں کنونشن کے ہجوم کی گفت وشنید کی آوازیں تھیں، شور تھا مگر اس کے باوجود اس کی ہلکی آواز میری سماعتوں تک بڑی وضاحت سے پہنچی تھی۔

''معاف کیجیے گا، کیا یہ سیٹ خالی ہے؟''

میں نے انسٹاگرام فیڈ بند کرتے ہوئے اپنا فون کاؤنٹر پر اپنی ڈرنک کے پاس رکھا اور سر سے پیر تک اس کا جائزہ لیا۔

یہ شخص اس کنونشن کا حصہ نہیں لگ رہا تھا کیونکہ وہ کافی تروتازہ نظر آرہا تھا جیسے وہ فرصت میں وقت نکال کر یہاں

آیا ہو۔ پالش ونگ ٹپس شوز، گرے سلیکس، بلیک اسپورٹ جیکٹ، کوئی ٹائی نہیں۔ اس نے اپنی قمیص کے اوپری دو بٹنوں کو کھول رکھا تھا۔ شاید وہ سوبر اور اسٹائلش دونوں نظر آنا چاہتا تھا لیکن یہ بات ہرگز غلط نہ ہوگی کہ وہ شرٹ اس پر سوٹ کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت نمایاں تھی۔ وہ کلین شیو تھا اور اس کے کولون کی مہک مسحور کر دینے کے لیے کافی تھی۔

''ہاں ضرور۔'' میں نے اپنا پرس اٹھا کر بار کاؤنٹر کے نیچے ہک سے لٹکا دیا۔

وہ ہنسا۔ ''ایک سیکنڈ کے لیے مجھے یوں لگا کہ میں آپ کو ڈسٹرب کر رہا ہوں۔''

میں مسکرائی۔ ''نہیں، ایسا نہیں ہے۔''

''شین......!'' اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''گڈ۔'' میں نے اس کا ہاتھ تھاما۔

''آپ کیا پینا پسند کریں گے سر؟'' بارٹینڈر شین کو دیکھ کر اس طرف آیا۔

''مارٹینی۔'' شین نے کہا۔ ''میرے کمرے میں بھجوا دو۔'' اس نے کمرے کا نمبر دیا پھر میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''کیا میں تمہیں ایک ڈرنک آفر کر سکتا ہوں؟''

''میں ایک اور ڈرنک لوں گی لیکن میں کسی اجنبی کی آفر قبول نہیں کرتی۔'' میں پہلے ہی ایک بیس نکال چکی تھی جسے میں نے بار کاؤنٹر پر رکھ دیا۔

شین اور بارٹینڈر نے نظروں کا تبادلہ کیا۔ ہمدردی اور ہچکچاہٹ کا اظہار کرتی نظریں۔ میں نے نظر انداز کرنا ہی مناسب سمجھا۔

''مارٹینی۔'' میں نے بارٹینڈر کے جانے کے بعد کہا۔ ''مجھے حیرت ہے کچھ پاگل مرد ساٹھ کی دہائی میں بھی جیمز بانڈ بننے کی کوشش کرتے ہیں؟''

''یقین کرو میں ان مردوں میں سے نہیں۔'' شین نے کہا۔ اس کے انداز میں شرارت اب کھل کر سامنے آنے لگی تھی۔ یہ دیکھنے میں کوئی حرج نہیں تھا کہ وہ کتنی آسانی سے کسی کو پھنسا سکتا ہے۔

''ایک لیڈی کلر؟'' میں بڑبڑائی۔

اس نے کندھے اچکائے۔ ''میں وہی ہوں جو میں ہوں۔''

''کیا ہم سب نہیں ہیں؟'' میں نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ یہاں کنونشن کے ساتھ ہیں؟'' اس نے میری بات جیسے سنی ہی نہیں۔

''ہاں۔'' میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ حالانکہ جو لباس میں نے پہن رکھا تھا وہ اس کنونشن کے لحاظ سے بالکل موزوں نہیں تھا۔ ریپ بلیزر کے ساتھ پنسل اسکرٹ۔

''لیکن مجھے یاد نہیں کہ میں نے آپ کو کسی میٹنگ میں کبھی دیکھا ہو۔''

شین نے سر ہلایا۔ ''میں یہاں ایک بزنس ٹرپ پر ہوں۔'' اس نے ہجوم کی طرف دیکھا۔ ''مجھے کام کے سلسلے میں سفر کرنا کبھی برا نہیں لگا۔ میں اس میں کچھ وقت اپنے لیے نکال ہی لیتا ہوں۔ تم بتاؤ، تم انجوائے کر رہی ہو؟''

اب میری باری تھی کندھے اچکانے کی۔ ''ہاں، کر رہی ہوں۔ ہر ایک کو تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے۔ مناظر کی تبدیلی، ایک ہی چار دیواری، ایک تسلسل، وہی معمولات، وہی سب کچھ۔'' میں نے اپنا تقریباً خالی گلاس اٹھایا، اس پر نظر ڈالی اور اپنی بات مکمل کرنے سے پہلے آخری گھونٹ لیا۔ ''مجھے اپنے شوہر سے بھی بریک کی ضرورت تھی۔''

اس کی پیشانی سکڑ سی گئی۔ ''تمہارا شوہر؟''

اسی اثنا میں بارٹینڈر ہمارے لیے اور ڈرنک لے آیا۔

شین نے تقریباً فوراً ہی اپنی مارٹینی کو اپنے ہونٹوں سے لگا لیا پھر کاک ٹیل نیپکن سے ایک اٹھا کر اپنے ہونٹ پونچھنے لگا۔

اچانک ہی پسینے کا آنا، میں تصور کر سکتی تھی۔

''تمہیں کیوں، آپ کو حیرانی ہوئی؟'' میں جانتی تھی کہ اس کے پاس جواب نہیں تھا۔

میں نے اپنے خالی گلاس کو دور دھکیل دیا۔ ''اس میں حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں یہاں تم سے بات کر رہی ہوں، ایک ڈرنک شیئر کر رہی ہوں اور وہ شاید خود بھی کسی لڑکی کے ساتھ مصروف ہو۔ کسی خوبصورت اور کمسن سی لڑکی کے ساتھ۔ مجھے یقین ہے، ایسا ہی ہوگا۔ ان دنوں وہ کافی بدل گیا ہے لیکن خیر، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میرے پاس اس کا بھی انتظام ہے۔''

الجھن، تجسس، بے چینی...... میرے شوہر کے تاثرات میں اس وقت ہر ایک کی تھوڑی سی جھلک نظر آ رہی تھی کیونکہ وہ وہی ہے۔ یہ آدمی میرا شوہر ہے۔ اس کا اصل نام شین ہے۔

اور یہ وہ کھیل ہے جو ہم کبھی کبھی کھیلتے ہیں۔ ہماری اپنی روٹین اور مناظر کی تبدیلی، ہمارے تمام تر معمولات

سے ایک بریک۔

اتوار کی صبح وہ ٹی شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس اور میں ایک بڑی سی شرٹ میں...... کچن کاؤنٹر پر سلاد کاٹ رہی ہوں۔ ہم میں سے کوئی ایک میل چھانٹ رہا ہے یا پھر ہفتے کی گروسری لا رہا ہے۔ ہم میں سے کوئی ایک اسٹریٹ کے کونے سے سوشی لا رہا ہے...... یا پیزا۔

ہوسکتا ہے کہ یہ کھیل محض ایک اور معمول ہو۔ مجھے اس کا احساس ہے۔ ایک اور کام جو ہم کرتے ہیں۔ یہ نیٹ فلیکس پر کسی فلم کا انتخاب کرنے سے مختلف نہیں جب ہم رات گئے صوفے پر اکٹھے بیٹھتے ہیں۔

میں نے اب شین کی طرف دیکھا۔ اس کی پیشانی پر سلوٹوں کا جال بن گیا تھا۔ یہ شاید اس کے مارٹینی کا اثر تھا جسے وہ عام طور پر پیتا نہیں تھا لیکن اس وقت وہ جس کیریکٹر میں تھا، اسے نبھانے کے لیے وہ کچھ بھی کرسکتا تھا۔ جیسے میرے مشروب کے پاس موجود سگریٹ نہ صرف غیر استعمال شدہ بلکہ ٹوٹا ہوا بھی تھا۔ کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ میں سگریٹ نہیں پیتی۔

ہماری کبھی کبھار کی پلان کی گئی ان میٹنگز میں ورائٹی کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ہم کچھ بھی بن جاتے۔ ہاں، مگر ہوتے اجنبی ہی جو پہلی بار مل رہے ہوں۔

کبھی شین کوئی پروفیسر بنتا، بکھرے بالوں والا، غائب دماغ، محبت جتانے کے طریقوں میں عجیب۔

ایک رات وہ ٹینس پلیئر بنا جو کلب میں امیر خواتین کے درمیان راجا اندر بنا ہوتا اور پھر ایک رات راک بینڈ ڈرمر کیونکہ ہر کوئی ڈرمر سے محبت کرتا ہے، میرے خیال میں۔

جہاں تک میرے کرداروں کا تعلق ہے۔

ایک طرح دار لائبریرین، بڑے شیشے کی عینک لگائے، بالوں کا اونچا جوڑا باندھے، کافی شاپ میں چیخوف کو پڑھتے ہوئے۔ ایک بار موسم بہار کے بریک پر آئی کالج کی لڑکی بنی۔ آزاد اور بے پروا۔ میں نے اس کے لیے پلیڈ اسکرٹ پہنا تھا۔ مجھے اعتراف کرتے ہوئے افسوس ہے کہ کئی بار مجھے لباس کرائے پر لینے کی ضرورت بھی پڑی تھی۔

میرے پاس وگوں کی بھی کافی ورائٹی ہے۔ شین کو میرے سرخ گھنگھرالے بالوں والی وگ پسند ہے لیکن آج رات میرے بال جیٹ بلیک تھے اور اس کے نیچے میں نے اپنے لمبے سنہری بالوں کو اس قدر مضبوطی سے باندھا تھا کہ میری کھوپڑی میں درد ہو رہا تھا۔

لیکن آج رات میں اس کھیل کو ایک مختلف سمت میں

عقل کی بات

ایک دانش ور،
پاگل خانے میں تقریر کررہا تھا۔ تقریر
بہت طویل ہوگئی تو ایک پاگل نے اٹھ کر کہا۔
"یہ خرافات بند کیجیے بس اب بہت ہوچکا۔" مقرر نے
حیرت اور مایوسی سے منتظم کی طرف دیکھا تو اس نے کہا: "آپ جاری رکھیے
اس کی پرواہ نہ کیجیے۔ یہ سال میں ایک آدھ بار ہی عقل کی بات کرتا ہے۔"
مقرر کی تقریر بہت طویل ہوگئی۔ سامعین نے اکتاہٹ کا
اظہار کیا۔ مقرر سمجھ گیا اور بولا:
"میں یہ باتیں آپ کی آئندہ نسلوں کی بھلائی کے لیے کررہا ہوں۔"
ایک شخص نے اٹھ کر کہا: "آپ تقریر جاری رکھیے ہماری
آئندہ نسلیں جلد ہی ختم پہنچنے ہی والی ہوں گی۔"

مرسلہ
نثار احمد راجہ۔ گوجر خان

جان پہچان!

خاتون جوتا خریدنا چاہ رہی تھیں، مگر انہیں کوئی پسند نہیں آرہا تھا۔ ایک گھنٹے میں انہوں نے دکان پر موجود ہر جوتے کو اپنے بھدے پیروں میں ڈال کر دیکھ لیا۔ بالآخر ایک جوتا انہیں بھا گیا جب پیسے دینے کے لیے پرس کھولا تو حیران ہوکر بولیں۔ "اوہ میں پیسے لانا تو بھول ہی گئی۔ اگر آپ اعتبار کریں تو جوتا لے جاؤں، پیسے کل آکر دے جاؤں گی۔"

"کوئی بات نہیں خاتون! آپ شوق سے لے جائیں۔" سیلز مین نے جواب دیا۔ اور جوتا ڈبے میں ڈال کر انہیں تھما دیا وہ خوش خوش چلی گئیں۔ دکان کے مالک نے بعد میں سیلز مین سے کہا۔ "تم انہیں پہچانتے ہو؟"

"نہیں۔"

"پھر تم نے جوتے کیوں دے دیئے؟ کیا پتہ وہ نہ آئے۔"

"آپ بے فکر رہیں۔ میں نے دونوں جوتے دائیں پیر کے دیئے ہیں۔"

جاوید احسن کاظمی۔ امریکہ

لے جانے والی ہوں اور اس ٹوئسٹ کے بارے میں شین بھی نہیں جانتا۔

☆☆☆

لاؤنج کے اس پار ایک تاجر قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔ میں نے اسے دیکھنے کے لیے گردن موڑی۔ اس کا چہرہ سرخ تھا۔ اس کے ساتھ موجود لوگ اپنے شراب کے گلاس اٹھا رہے تھے۔ سر ہلاتے ہوئے ہنسی میں اس کا ساتھ دے رہے تھے پھر میں نے ایک نظر شین پر ڈالی۔

وہ میرے ساتھ والے اسٹول پر بیٹھا اپنا توازن درست کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک شکاری سیلز مین کے روپ میں پُراعتماد اور پُرکشش۔

یہ آج رات کا پلان تھا۔ گہرے لباس والا آدمی ہوٹل کے بار میں ایک کاروباری عورت سے ملتا، بات چیت ہوتی، ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ، ایک دوسرے کو مائل کرنے کی کوشش اور پھر یہ ملاقات ہوٹل کے ایک کمرے پر ختم ہوجاتی۔ وہ کمرا جو شین نے پہلے ہی بک کررکھا تھا۔

''تو تمہارا شوہر بھی ایسے ہی کسی بار میں بیٹھا کسی دوسری عورت سے بات کر رہا ہوگا جیسے میں تم سے کر رہا ہوں اور تمہیں اس بات سے کوئی پریشانی نہیں؟'' شین پوچھنے لگا۔

''نہیں۔'' میں اپنی ٹانگیں دھیرے دھیرے ہلا رہی تھی۔ ''اسے اس طرح سے دیکھو، وہ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے اور میں بھی وہی کر رہی ہوں۔''

''تو کیا یہ اوپن میرج ہے؟'' اس کے انداز میں اب بے یقینی تھی۔ ''تم لوگ اس شادی میں ہوکر بھی جس کے ساتھ چاہو افیئر چلا سکتے ہو؟''

''کیوں...... تمہیں یہ عجیب لگتا ہے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ میں نے کبھی اس بارے میں سوچا نہیں۔'' شین نے کندھے جھٹکے، نظریں چرائیں۔ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ میں جانتی تھی مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ میں اس کی براؤزر ہسٹری دیکھتی رہتی ہوں۔

''باہمی اتفاق سے کیا جانے والا معاہدہ۔ یہ آج کل عام ہے اور اس کے بہت سے فوائد بھی ہیں، اگر مجھ سے پوچھو تو۔'' میں نے کہا۔ ''اس کے بارے میں کچھ دن پہلے نیویارک ٹائمز میں ایک مضمون بھی چھپا تھا۔ شاید تم نے دیکھا ہو۔''

اس نے ایک بار پھر کندھے اچکائے۔ ''ہاں، نان کمیٹیل کے عنوان سے۔''

میں دل ہی دل میں ہنسی۔ ''واہ، کیا عنوان ہے۔''

''بہت سے جوڑے اپنی روزمرہ زندگی سے اکتا کر رول پلے کرتے ہیں۔'' میں کہنے لگی۔ ''انہیں لگتا ہے اس سے ان کا مرجھاتا ہوا رشتہ کھل سکتا ہے اور ہوسکتا ہے کہ میرج اوپن ان کے ازدواجی تعلقات کو تازہ رکھنے کا اگلا قدم ہو۔ یعنی جب آپ سوچیں کہ آپ کا شوہر اس وقت کسی اور عورت کے ساتھ ہوگا یا بیوی، تو سب سے پہلا جذبہ دل میں کون سا بیدار ہوتا ہے؟ حسد...... رقابت اور آپ کو یاد دلاتا ہے کہ آپ کے رشتے میں اب بھی کہیں کوئی چنگاری باقی ہے۔'' میں اپنے گلاس کے کنارے پر انگلی پھیرتے ہوئے نیویارک ٹائمز کے اس مضمون کی کچھ سطریں یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''شادی کے کچھ عرصے بعد آپ اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں آپ ایک دوسرے پر بھروسا کرتے ہیں اور یہ اعتماد اور بھروسا دوطرفہ ہوتا ہے۔ کون کہاں ہے، کس کے ساتھ ہے یا کتنوں کے ساتھ ہے؟'' یہ کہتے ہوئے میں نے آنکھ ماری کیونکہ بات جب ''کتنوں'' تک پہنچتی ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے بے راہ روی۔

''تو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' میں نے بات جاری رکھی۔ ''اہم یہ ہے کہ آپ گھر کس کے پاس آتے ہیں۔ آپ کا دل کس کے پاس ہے۔ میرا شوہر اور میں اس بات کو سمجھتے ہیں اور ہماری اسی انڈر اسٹینڈنگ نے ہمیں ایک دوسرے سے جوڑ رکھا ہے۔''

وہ اضطراری انداز میں اپنے گلاس کے کنارے پر لپٹے لیموں کی قاش رگڑ رہا تھا۔ میں اس کی کیفیت محسوس کرسکتی تھی۔ میں اسے جانتی تھی۔ اس کی سوچ سے زیادہ جانتی تھی۔

''تو اگر ہمارے بیچ آج رات کچھ ہوتا ہے تو کیا وہ تمہارے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھے گا؟'' اس نے سوال کیا۔

''تم کیا چاہتے ہو کیا معنی رکھے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اسی وقت میرے فون کی نوٹیفکیشن ٹون بجی۔ میں نے ایک نظر دیکھا اور چہرے پر معذرت خواہانہ مسکراہٹ سجائی۔ ''سوری...... انسٹاگرام۔''

میں نے ایپ کھولی۔ چند کمنٹس پر کوئیک ریپلائی کرتے ہوئے فون واپس کاؤنٹر بار پر رکھ دیا۔

''ہاں تو تم نے پوچھا میرے لیے کیا معنی رکھے گا؟'' میں نے اس کے سوال کو دہرایا۔ ''یہ میری فلاسفی ہے کہ کبھی چیزیں جیسے ہو رہی ہوں، ہونے دینی چاہئیں۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ کہاں جاکر رکیں گی۔ نتیجہ کیا ہوگا۔ نئے تجربات ہمیشہ زندگی میں نئی تبدیلی لے کر آتے ہیں۔ کیا

خیال ہے؟''

اس سے پہلے کہ وہ کچھ جواب دیتا، بارٹینڈر ایک بار پھر قریب آیا۔ ''کیا میں آپ کے لیے کچھ لاسکتا ہوں؟''

اس سوال پر شین کنفیوز ہوا کیونکہ اس کی مارٹینی کا گلاس آدھا بھرا ہوا تھا اور میرا پورا۔

مگر اگلے ہی پل ہمیں احساس ہوا کہ بارٹینڈر کے مخاطب ہم نہیں تھے۔

''امم...... یس پلیز......!'' ایک سریلی نسوانی آواز ہماری پشت پر ابھری۔ ''اسٹرابیری ڈاکیری ٹھیک رہے گی؟'' اس ہچکچاتی آواز میں آرڈر کم اور سوال زیادہ تھا اور میں بنا اس کی طرف دیکھے ہی اس کے انداز، اس کی جھجک، اس کی جوان لوچ دار آواز سے سمجھ گئی کہ وہ کون ہے۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ کوئی فتنہ تھی۔ میں بس اتنا کہوں گی تروتازہ، جوان اور بے حد حسین۔ اس کی گلابی مائل شفاف جلد پر کہیں کوئی داغ، کوئی لکیر نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں ہیزل گرین اور بال سرخ گھنگرالے تھے۔ اس کا فگر پرفیکٹ تھا اور اس کے گالوں میں ڈمپل تھے۔

ایک مرد کو اور کیا چاہیے۔

''ویلکم!'' میں نے اس کی سمت ایک نرم مسکراہٹ اچھالی۔

''معذرت۔'' اس نے کہا۔ ''میرا مقصد آپ کو ڈسٹرب کرنا نہیں تھا۔'' اب اس کی آواز میں شرمندگی تھی مگر انداز اب بھی سوالیہ۔ یہ آج کل کے جوانوں کو ہوا کیا ہے۔ ہر بات کو سوالیہ انداز میں بیان کرنا۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں نے ہاتھ ہلایا۔ ''شین اور میں ایک دوسرے کو جان رہے تھے۔ اس نے مجھے ایک ڈرنک خریدنے کی پیشکش کی لیکن میں اپنا خیال رکھ سکتی ہوں۔''

''اوہ......!'' اس نے سر ہلایا۔

میں نے اس کے ہاتھ کی پشت کو چھوا۔ ''فکر مت کرو۔ وہ تمہارے لیے بھی ادائیگی کر دے گا۔''

''شین!'' میرے شوہر نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ایسا کرتے ہوئے بار اسٹول پر اس کا توازن تھوڑا بگڑ گیا۔ ''اور یہ ہے......'' وہ میری طرف گھوما۔ ''تم نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟''

''لیکن......'' یہ میرا اصل نام نہیں۔ میں اس کی آنکھوں میں ہلکی سی حیرت دیکھ سکتی تھی، جب ہماری ہتھیلیاں آپس میں ملیں۔ ''مجھے للی کہہ سکتی ہو اور تم؟''

''ایڈن۔'' اس نے کہا۔

''گارڈن آف ایڈن!'' میں نے ابرو اچکائے۔

کراہیت کا باعث

دکان پر ایک خاتون ایک پونڈ مکھن لیے ہوئے آئیں اور دکاندار سے بولیں۔ ''مجھے افسوس ہے، یہ مکھن مجھ سے کیچڑ میں گر گیا تھا۔ اگرچہ میں نے اسے خوب اچھی طرح دھو لیا ہے پھر بھی کراہیت سی محسوس ہو رہی ہے۔ مہربانی کر کے اس کے بدلے میں مجھے دوسرا مکھن دے دو۔ مکھن تم کسی اور کے ہاتھ بیچ دینا۔ تمہارا بھی نقصان نہیں ہوگا اور جو شخص اسے خریدے گا، اسے بھی کوئی پتا نہیں چلے گا کیونکہ جس چیز کے بارے میں علم نہ ہو، وہ کراہیت کا باعث نہیں ہوتی۔''

دکاندار نے سر جھکا کر کہا۔ ''آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔''

مکھن لے کر وہ دکان کے اندرونی حصے میں گیا۔ اندر پہنچ کر اس نے مکھن کا کاغذ اتارا اور نیا کاغذ لپیٹ دیا پھر وہ اسی مکھن کو لے کر باہر نکلا اور خاتون کے حوالے کر دیا۔

خاتون شکریہ ادا کرتی ہوئی چلی گئیں تو دکاندار نے مسکرا کر دکان میں رکھی ہوئی چیزوں کو مخاطب کر کے کہا۔ ''جس چیز کے بارے میں علم نہ ہو، وہ کراہیت کا باعث نہیں ہوتی۔''

(مرسلہ: نازش علی، مری)

اس کے چہرے پر شرمیلی مسکراہٹ آئی۔

مجھے یقین ہے کچھ مرد تو اس کی اسی ادا پر مر مٹتے ہوں گے۔

''میری ماں نے مجھے بتایا کہ اس کا مطلب ہے ''خوشی'' کیونکہ جب میں پیدا ہوئی تو میں نے انہیں خوشی دی۔'' اس نے بتایا۔ ''پھر مجھے پتا چلا کہ انہوں نے یہ نام ایک پرانے سوپ اوپرا سے متاثر ہو کر رکھا تھا اور اس کی اسٹوری زیادہ اچھی نہیں تھی۔''

''مجھے یقین ہے کہ وہ ایک اچھی اسٹوری ہوگی۔'' میں نے کہا۔ حالانکہ وہ خود سوپ اوپرا سے اوپر کی چیز تھی۔ شاید سبھی جوان چہرے ایسے ہی نظر آتے ہوں۔ جس منظر میں داخل ہوں، اسے روشن کر دیتے ہوں۔

شین مجھے دیکھ رہا تھا۔ کنفیوز تھا کہ میں کیا سوچ رہی ہوں، میں کیا کر رہی ہوں اور میں اس لڑکی کے بارے میں کتنا جانتی ہوں؟

اس کے اندر اس وقت شاید سوالات کی بھرمار تھی۔

اور یہی الجھن میں ایڈن کی آنکھوں میں بھی دیکھ سکتی تھی۔ وہ یقیناً سوچ رہی ہوگی کہ جب شین کو یہاں اس سے ملنا تھا تو وہ اس دوسری عورت کے لیے ڈرنک کیوں خرید رہا ہے؟ اس ادھیڑ عمر عورت کے لیے۔

میرا شوہر شین عام طور پر اپنے دفتر میں کسی بھی نئے ایمپلائی کے بارے میں شکایت ہی کرتا نظر آتا ہے۔ ان کی ناتجربہ کاری، کم اعتمادی اور غیر سنجیدگی کا رونا روتے ہوئے۔ وہ ایک ٹیک فرم میں کام کرتا ہے۔ سسٹم مینجمنٹ اور مینٹیننس، سیکیورٹی سلوشنز، جنرل آئی ٹی اسپورٹ۔ ایڈن بھی ایک نئی ایمپلائی تھی لیکن شین نے مجھ سے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔

اور کیا مضحکہ خیز بات ہے کہ وہ اپنے ای میلز اور میسیجز کو اپنی بیوی سے پوشیدہ بھی نہ رکھ سکا۔ جب میں نے شین کا فون چیک کیا، اس کے معمولات پر نظر رکھی اور مجھ پر منکشف ہوا کہ ان کی دوستی باتوں سے لے کر محض ہفتوں میں بستر تک پہنچ گئی تھی۔

ان کی آنکھوں، ان کے چہرے پر سوال ہی سوال تھے اور اس کا جواب دینا آسان تھا۔

جس طرح سے میں اور میرے شوہر اس کھیل کے کرداروں کا انتخاب کرتے ہیں، وہ ہماری اپنی فینٹیسیز ہوتی ہیں اور ہم کبھی پورا اسکرپٹ نہیں لکھتے۔ آگے کیا ہوگا، ہم کیا کریں گے؟ یہ ایک سرپرائز ہوتا ہے اور یہی حصہ جو ہمارے کنٹرول سے باہر ہوتا ہے، ہمیں سنسنی سے بھر دیتا ہے۔ جیسے آخری قدم کو قسمت پر چھوڑ دینا۔

آج رات کی بزنس وومن والی فینٹسی میرے شوہر کی تھی۔ کاغذ کا ایک رقعہ جو وہ میرے لیے ڈریسنگ ٹیبل پر چھوڑ گیا تھا۔ ''میریٹ بار 7 بجے جمعے کی شام۔ کاروباری لباس، دکھاوا کریں کہ ہم اجنبی ہیں۔ اوپر ایک کمرا انتظار کر رہا ہوگا۔''

کاغذ کے اس رقعے کو ایڈن تک پہنچانا کافی آسان تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ شین کی ہینڈ رائٹنگ پہچان لے گی۔

واحد جوا۔ کیا وہ تجسس کے لیے جائے گی یا براہِ راست پیغام پر عمل کرے گی؟ اور واضح طور پر تجسس جیت گیا تھا۔

ایڈن، شین کی طرف دیکھتے ہوئے شاید اس رقعے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ میں حیران تھی کہ وہ کب تک اجنبی ہونے کا دکھاوا کریں گے۔ کیا اوپر بک کیے ہوئے کمرے میں اکیلے ہونے تک؟

جبکہ شین مجھے دیکھ رہا تھا، مجھے جانچ رہا تھا کہ میں کیا جانتی ہوں، کیا منصوبہ بنا رہی ہوں؟ جو کچھ بھی ہوا، اس کی کڑیاں ملا رہا تھا۔

ہمارے اردگرد شور بڑھ گیا تھا۔ اسی اثنا میں بار ٹینڈر ایڈن کا اسٹرابیری ڈائکیری کا گلاس لیے آگیا اور ساتھ میں کچھ اور کاک ٹیل نیپکن۔

میں نے سوچا تھا کہ کوئی بھی حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے میں ایک بار ایڈن سے ذاتی طور پر ملوں گی، اسے جانوں گی اور اسی لیے میں نے یہ جوا کھیلا۔

''چلو، اسے ایک پارٹی بنائیں۔'' میں نے کہا اور پھر میں ان گلاسوں کے ساتھ کھیلنے لگی۔ کاک ٹیل نیپکن کو ہاتھ میں لے کر اپنے شوہر کے لبالب بھرے مارٹینی کے گلاس کو کنارے پر کھینچا اور نیپکن والے ہاتھ سے ہی ایڈن کے گلاس کو سرکا کر سینٹر میں رکھ دیا۔ کچھ ڈائکیری میری انگلی پر چھلکی بھی جسے میں نے چاٹنے کے بجائے رومال سے پونچھا۔

''شین! تمہیں اس ینگ لیڈی کو اپنی سیٹ دینی چاہیے کیونکہ آج کافی بھیڑ ہے۔'' میں نے اطراف میں نظریں دوڑاتے ہوئے کہا تو شین فوراً ہی مستعدی سے اپنی سیٹ سے اٹھا اور ایڈن کو اسے لینے کے لیے اشارہ کیا۔

''شین اور میں بات کر رہے تھے۔'' میں اس کی طرف جھکی۔ ''ان فیصلوں کے بارے میں جو آپ کرتے ہیں۔ کیسے جینا ہے اور دوسروں کو کیسے جینے دینا ہے۔''

''اوکے۔'' اس نے غیر یقینی کیفیت میں سر ہلایا اور اپنی ڈرنک کا چھوٹا سا گھونٹ بھرا۔

''فرض کرو تمہارے پاس دو ممکنہ راستے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''پہلا محفوظ، آرام دہ لیکن بورنگ ہے۔''

''اور دوسرا؟'' ایڈن اپنے اسٹول سے تھوڑا شین کی سمت جھکی۔ شین غیر محسوس انداز میں پیچھے ہٹا۔ شاید ایڈن بھول رہی تھی کہ وہ دونوں اجنبی ہونے کی ایکٹنگ کر رہے ہیں۔

لیکن ایک بات تو واضح تھی کہ وہ اس کے ساتھ رہنے کے لیے بہت پُرجوش تھی۔ شام کے آگے بڑھنے کے لیے بے چین۔ شاید اسے مجھ پر غصہ بھی آرہا تھا کہ شین نے اس شرابی عورت سے بات کی ہی کیوں جو بار بار پٹڑی سے اتر رہی ہے۔

لیکن میں نشے میں نہیں تھی، بالکل نہیں۔

''اور دوسرا راستہ محبت کا راستہ...... نئی محبت کا۔''

میری اس بات پر شین کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ اپنے گلاس کو یوں گھور رہا تھا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔

بے چارہ شین...... اسے یقیناً جھٹکا لگا تھا۔ مجھے دل

ہی دل میں اس کی حالت پر ہنسی آئی۔

”جب کوئی نیا نیا محبت میں گرفتار ہوتا ہے تو اس کی زندگی ایک دم معمول سے ہٹ جاتی ہے۔ بوریت کی جگہ جوش لے لیتا ہے۔ ایک ایڈونچر، ایک سنسنی۔“ میں نے اپنے شوہر کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔

”اور ایڈونچرز تو ہوتے ہی خطرناک ہیں۔“ میں ہنسی۔ ”تو تم بتاؤ...... محفوظ راستہ اختیار کرنا بہتر ہے یا یہ ایڈونچر کہ جو ہو رہا ہے، ہونے دو۔ دیکھتے ہیں چیزیں کہاں جاتی ہیں؟“

ایڈن اپنے ان سرخ بالوں کے لچھوں کو انگلی پر لپیٹتی سوچ میں پڑ گئی۔

کاؤنٹر پر رکھا میرا فون ایک بار پھر بجا۔ ”معاف کرنا۔“ میں نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔ کچھ اور انسٹا نوٹیفکیشنز جواب دینے کے لیے کچھ اور تبصرے۔

میں ایڈن کی نظریں خود پر محسوس کر رہی تھی۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ مجھے پہچان سکتی ہے۔ اگرچہ وہ کافی قریب بیٹھی تھی مگر میری اس سیاہ وگ نے اور معمول سے زیادہ ڈرامائی انداز میں کیے گئے میک اپ نے مجھے کافی بدل دیا تھا۔

لیکن ایڈن نے وہ تصویر تو دیکھی ہوگی جو شین اپنی میز کے کونے پر رکھتا تھا۔ اس تصویر میں ہم کسی پکنک پر تھے اور کافی خوش نظر آرہے تھے۔ میں تصور کر سکتی تھی اس نے مجھے سوشل میڈیا پر ڈھونڈا بھی ہوگا۔ میرا فیس بک اکاؤنٹ، میرا انسٹاگرام، میری تصاویر کو گھورتے ہوئے۔ شین اور میری ویک اینڈز پر لی گئی بچکانہ سی سیلفیز، شادی کی وہ تصویر جو میں ہر سالگرہ پر دوبارہ پوسٹ کرتی ہوں۔ اس عورت کی زندگی کو دیکھتے ہوئے جو اس کے محبوب کی بیوی ہے۔

مگر آج رات لگ رہا تھا اس نے مجھے نہیں پہچانا، تو کہہ سکتے ہیں میں ایک اچھی فنکارہ ہوں یا ہو سکتا ہے میں غلط ہوں۔ اس نے کبھی مجھے اسٹاک کیا ہی نہ ہو۔ اس نے شین کی آفس ٹیبل پر وہ تصویر دیکھی ہی نہ ہو۔

میں نے اپنا فون بند کیا۔ ہمارے آس پاس شور بڑھنے لگا تھا۔ رات جوان ہو رہی تھی۔

”تو میں کیا کہوں؟“ ایڈن اچانک بہت سنجیدہ نظر آنے لگی۔ کلاس کی اس لڑکی کی طرح جسے ہر حال میں اے پلس چاہیے ہو۔

”شین نے کچھ دیر پہلے ایک تبصرہ کیا تھا کہ لوگ جو ہوتے ہیں وہی رہتے ہیں۔ چاہے کچھ بھی ہو۔ ایسی ہی بات تھی نا شین؟“ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

وفا پرستی

جاناں بیگم بیرم خاں کی لڑکی عبدالرحیم خانخاناں کی بہن اور شہنشاہ اکبر کے لڑکے دانیال کی بیگم تھی۔ شہزادہ دانیال کے انتقال کے بعد شہزادہ سلیم نے تخت و تاج سنبھال کر اسے نکاح کا پیغام بھیجا تو اس نے اپنے تمام دانت نکلوا کر اور بال کٹوا کر سابقہ شہزادہ سلیم اور موجودہ شہنشاہ جہانگیر کی خدمت میں بھیج دیے۔ جہانگیر جاناں بیگم کی وفا پرستی دیکھ کر دنگ رہ گیا اور پھر اس سے نکاح کی خواہش نہیں کی۔

حکمت

نوبی قوم کے ایک سیاہ فام غلام تھے اور حق تعالیٰ شانہٗ نے ان کو حکمت و دانش سے نوازا تھا۔ بنی اسرائیل کے ایک امیر نے انہیں ساڑھے تین مثقال کے عوض خریدا تھا۔ امیر کے دروازے کے قریب ایک نہر جاری تھی اور وہ چوسر کھیلنے کا عادی تھا۔

ایک دن اس شرط پر چوسر کھیلی گئی کہ جو ہار جائے گا اُسے نہر کا سارا پانی پینا پڑے گا، ورنہ اس کا فدیہ ادا کرنا ہوگا۔ حضرت لقمان کا آقا ہار گیا اور اس کا دوست جیت گیا۔ اب دوست نے مطالبہ کیا کہ یا تو سارا پانی پیو یا فدیہ ادا کرو اور جو کچھ تمہاری ملکیت ہے، وہ سب فدیہ ہوگا۔ حضرت لقمانؑ کے آقا نے کہا۔ ”مجھے آج کے دن کی مہلت دو۔“ دوست نے منظور کر لیا۔

حضرت لقمان اس وقت جنگل سے لکڑیاں کاٹنے گئے ہوئے تھے۔ واپس آئے تو آقا کو آزردہ اور غمگین دیکھا۔ انہوں نے اس کے پاس بیٹھ کر کہا۔ ”کیا بات ہے میں تم کو افسردہ دیکھ رہا ہوں۔“ آقا نے تین بار اعراض کیا چوتھی مرتبہ حضرت لقمان نے کہا۔ ”مجھے اصل بات بتاؤ۔ ہو سکتا ہے میں تمہاری مشکل حل کر دوں۔“

آقا نے پورا قصہ سنا دیا۔

حضرت لقمان نے کہا۔ ”فکر نہ کیجیے میرے پاس اس کا علاج موجود ہے، جب تمہارا دوست آکر پانی پینے کا سوال کرے تو اس سے پوچھنا کہ دونوں کناروں کے درمیان کا پانی پیوں یا نہر کی لمبائی کا۔ وہ کہے گا دونوں کناروں کے درمیان کا یا کہے گا۔ نہر کی لمبائی کا۔ تم اس سے کہنا کہ میں پینے پر آمادہ ہوں تم لمبائی یا چوڑائی سے پانی کو بہنے سے روک لو۔ اور یہ اس کی طاقت سے باہر ہے چنانچہ آپ اس عہد سے نکل جائیں گے۔“

اگلے روز دوست آیا اور آقا سے کہا۔ ”میری شرط پوری کرو۔“ آقا نے کہا ”چوڑائی کا پانی پیوں یا لمبائی کا؟“ اس نے کہا۔ ”چوڑائی کا۔“ آقا نے کہا۔ ”لمبائی کے پانی کو روک لو۔“ اس نے کہا۔ ”یہ تو ناممکن ہے۔“

اس طرح عدم ایفائی ذمے داری دوست پر آپڑی اور لقمانؑ کا آقا غالب آگیا۔ مکحول کہتے ہیں کہ آقا اتنا خوش ہوا کہ اس نے اسی روز حضرت لقمان کو آزاد کر دیا۔

یوں لگا جیسے وہ اس پر غور کر رہا ہو۔ ''لیکن......'' وہ کہتے ہوئے ہچکچایا۔ ''کبھی کبھی لوگ بدل بھی جاتے ہیں۔''

ایڈن نے کندھے اچکائے۔ ''ہم وہی ہیں جو ہم ہیں۔'' اس نے کہا اور میرے دل پر جیسے کسی نے کسی ہتھوڑے سے ضرب لگائی۔

اس نے وہی الفاظ دہرائے جو شین نے کہے تھے۔

''نہیں...... میں کارپوریٹ ہیڈ ہنٹر ہوں۔ یہ میرا کام ہے۔ میں جھکتی نہیں۔ جو چاہتی ہوں اس کے پیچھے چلتی ہوں۔ عام طور پر اسے حاصل بھی کر لیتی ہوں۔ کسی بھی امکان کے لیے چوکس رہتی ہوں لیکن گھر میں...... گھر میں، میں ایک شیرنی نہیں بلکہ بلی بن جاتی ہوں۔ اچھی دوست، اچھی بیوی۔''

کنٹرول رکھنے کے باوجود اس لمحے میری آواز ذرا سی ٹوٹی تھی۔ باقی سب کچھ غلط تھا۔ میں کمیونٹی کالج میں گرافک ڈیزائنر ہوں لیکن ایڈن کا شین کے الفاظ دہرانا مجھے اندر تک ہلا گیا تھا۔

''تم شادی شدہ ہو؟'' ایڈن نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔

میں نے ہاتھ ہلایا۔ ''زندگی کی بہت سی پرتیں ہیں اور لوگوں کی بھی۔ آپ جو بھی ہیں، آپ تبدیل ہو سکتے ہیں۔ نئی چیزیں آزما سکتے ہیں، نئی جہتیں دریافت کر سکتے ہیں۔ وہ سب بھی جن کے بارے میں آپ کو پتا بھی نہیں تھا کہ آپ کے پاس ہے۔''

میں نے شین کے چہرے پر وہ تاثرات دیکھے جنہیں میں پہچانتی تھی۔ یہ پہلی بار نہیں تھا کہ وہ کچھ چاہتا تھا اور اسے چاہنے سے پریشان تھا۔

مجھے وہ وقت یاد آیا جب وہ موٹر سائیکل خریدنے کے جنون میں مبتلا تھا۔ اس کے ایک دوست کے پاس نئی ہارلے تھی تو اس کے پاس کیوں نہیں۔ وہ اسے پانے کے لیے بالکل ضدی بچہ بن گیا تھا...... اور ایک اور بار...... اس کی نظر ایک مہنگی روئنگ مشین پر پڑی۔ یہ اس کے فٹ رہنے، صحت مند رہنے کے لیے بہت ضروری تھی، چاہے اس سے ہمارا بجٹ ہی کیوں نہ خراب ہو۔ اس وقت بھی شین کا وہی تاثر تھا جو میں اب اس کے چہرے پر دیکھ سکتی تھی۔ تڑپ اور امید و یاس کی کیفیت میں مجھے دیکھتے ہوئے کہ میں ہاں کہوں گی یا نہ...... لیکن اس روئنگ مشین کے لیے میں نے ہاں کہی تھی۔ یہ کہتے ہوئے کہ ''ٹھیک ہے، سکس پیک بناؤ اور لڑکیوں کا دل جیتو۔''

اور مجھے اب پتا چل رہا تھا کہ وہ لڑکی کون تھی۔

☆☆☆

ہمارے اردگرد روشنیاں اب بھی ٹمٹما رہی تھیں۔ کھنکتے قہقہوں کا شور تھا۔ ایسے ماحول میں خواب ابھرتے ہیں۔ شاید کچھ حقیقی معاملات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ کہانیاں اپنی شروعات تلاش کرتی ہیں، نئے باب کھلتے ہیں۔

مگر یہاں ایک باب بند ہو رہا تھا، خواب ٹوٹ رہے تھے اور دل بھی۔

''پتا ہے کیا...... تم دونوں کی جوڑی کافی اچھی رہے گی۔'' میں نے یہ بات ایڈن کی طرف دیکھ کر کہی۔

ایڈن کے چہرے پر شرمیلی مسکراہٹ نے اس کے ڈمپل کو اور گہرا کر دیا اور شین کے چہرے پر کھسیاہٹ کی سرخی چھائی۔

نیوریلیشن شپ انرجی...... ٹائمز کے مضمون نے اسے یہی کہا تھا۔

''تو تم کیا کہتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔ ''محفوظ راستہ یا پُرخطر ایڈونچر؟''

ایڈن نے شین کی طرف دیکھا اور پھر کہا۔ ''ایڈونچر۔''

سر ہلا کر کہتے ہوئے اس کا لہجہ مضبوط تھا۔

''میں بھی ایڈونچر کا انتخاب کروں گا۔'' شین نے کہا۔ اس کا انداز ایڈن سے بھی زیادہ بے لچک تھا۔ ''اور تم؟''

بارٹینڈر پھر آیا اور میرے تقریباً خالی گلاس کو دیکھا۔

''کیا آپ ایک ڈرنک اور لینا چاہیں گی؟''

میں نے سر ہلایا اور پھر شین کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس کی ادائیگی میرا دوست کرے گا۔''

شین نے سر ہلایا۔ بارٹینڈر نے میرا خالی گلاس لینے کی کوشش کی لیکن میں نے ہاتھ پیچھے ہٹا لیا، کم از کم ابھی کے لیے مجھے گلاس اپنے قریب رکھنا تھا۔

''اور اب مجھے ایکسکیوز کریں۔ مجھے ذرا پاؤڈر روم تک جانا ہے۔'' میں اسٹول سے اتری، ہک سے اپنا پرس کھینچا۔ ''امید ہے کہ تم دونوں کو تھوڑی دیر کے لیے ایک دوسرے کو کمپنی دینے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''ہم ٹھیک ہیں۔'' ایڈن نے مسکراتے ہوئے میرے ہاتھ کی پشت کو چھوا جیسے میں نے اس کے ہاتھ کو چھوا تھا۔ کیا وہ مذاق اڑا رہی تھی یا پھر مجھ سے چھٹکارا پا کر خوش تھی؟

میں اس احساس سے حیران بھی تھی اور افسردہ بھی کہ نہ تو وہ میرے جانے سے خوش نظر آ رہی تھی نہ ہی اس کی

آنکھوں میں کوئی تمسخر اڑاتا تاثر تھا بلکہ میں اس کی آنکھوں میں اپنے لیے پریشانی، فکرمندی دیکھ سکتی تھی اور شاید ترس بھی۔ وہ مخلص لگی۔ فطرتاً مہربان طبیعت کی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ایک مثالی بیوی ہوتی۔

پھر میری نظریں شین پر گئیں۔ اس کی پیشانی پر اب پسینے کی چمک تھی۔ کیا یہ پریشانی کی علامت تھی یا پھر آگے کیا ہوگا...... اس بات کی گھبراہٹ؟ یا اس کے علاوہ کچھ اور؟

''میں زیادہ ٹائم نہیں لوں گی۔'' میں نے ایک میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ اپنا گلاس اٹھایا اور بار سے نکل آئی۔ میں نے آنکھ کے کونے سے دیکھا، بارٹینڈر ایک دوسری ڈرنک لے کر آ گیا تھا۔

میں لاؤنج کے پرشور ماحول سے ہوتی لابی کی طرف آئی جہاں ریسٹ روم تھے۔

میں جانتی تھی جیسے ہی میں ان کی نظروں سے اوجھل ہوں گی، وہ بات کریں گے۔ سوالات پوچھیں گے، جوابات ڈھونڈیں گے اس سے پہلے کہ میں واپس آ جاؤں۔

لیکن میں بار میں واپس نہیں جاؤں گی۔

فیصلے پہلے ہی ہو چکے تھے۔ میں ٹہلتے ہوئے ہوٹل سے باہر نکلی۔ گلاس اب بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ باہر نکلتے ہی تازہ ہوا کا جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا۔

میرا فون میرے ہاتھ میں تھا۔ میں دوبارہ اسکرول کرنے لگی۔ میری اس تصویر پر کافی ہمدردانہ تبصرے آ رہے تھے جو میں نے شین کے آنے سے پہلے بار سے پوسٹ کی تھی۔ نائٹ پاجامے میں ملبوس، ہاتھ میں گلاس لیے، اپنے گھر کے لیونگ روم میں اپنے شوہر کا انتظار کرتے ہوئے۔ پس منظر میں ٹی وی اسکرین نظر آ رہی تھی۔

یہ تصویر میں نے بار پہنچنے سے پہلے لی تھی اور پوسٹ تب کی جب میں بار میں بیٹھی تھی۔ ٹائم اسٹیمپ آن، لوکیشن سروس آف۔

اور اپنی کار میں نے گیراج میں نہیں، سڑک پر پارک کی تھی اس لیے وہاں کوئی ریکارڈ نہیں تھا۔ میں نے ہوٹل کے راستے میں ایک نالی دیکھی تھی۔ اب باہر نکلتے ہوئے میں نے اپنا گلاس اس میں پھینکا۔ شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی۔

کار کے اندر میں نے کچھ اور انسٹا کمنٹس کا جواب دیا۔ ایک اور تصویر پوسٹ کی جس میں، میں اپنے لیے دوسرا گلاس بنا رہی تھی۔ یہ بھی پہلے کی لی گئی تصویر تھی۔ پوسٹس بہت زیادہ اتفاقی لگیں گی مجھے یقین ہے کیونکہ پہلے بھی ایسا بہت بار ہو چکا ہے جب شین کو آفس سے دیر ہوئی اور میں نے اس کے انتظار میں انسٹا پر تصاویر پوسٹ کیں۔

میں نے گاڑی کو گیئر میں ڈالا اور وہاں سے نکل آئی۔

اس نیکوٹین کا اثر ہونے سے پہلے میں گھر پہنچ جاؤں گی جو میں نے ان کے گلاسوں میں شامل کیا تھا، جب میں نے ان کو دوبارہ ترتیب دیا۔ گلاسوں سے چھیڑچھاڑ کا وہ عمل بے سبب نہیں تھا اور رہی بات میرے فنگر پرنٹس کی تو اس کے لیے میں کاک ٹیل نیپکن کی شکرگزار تھی۔

شین اپنی ڈرنک میں آئی اس کڑواہٹ کا سبب یقیناً اس لیمو کو سمجھے گا اور ایڈن کی ڈرنک کی ساری تلخی اسٹرابیری کی مٹھاس میں گم ہو جائے گی۔

جلد ہی شین کے چہرے پر آیا پسینا اور اس کی گھبراہٹ بڑھے گی۔ دھڑکنیں زیروزبر ہوں گی، سانس بند ہونے لگے گی اور یہی کچھ ایڈن کے ساتھ بھی ہوگا۔

کچھ دیر میں وہ دونوں ہانپ رہے ہوں گے۔ ان کا نظام قابو سے باہر ہو جائے گا۔ میں تصور کر سکتی ہوں کہ وہ سہارے کے لیے ایک دوسرے کی جانب جھکیں گے۔ انہیں اپنا انجام قریب نظر آ رہا ہوگا۔

میں نے واقعتاً اپنے اندر ایسے جوہر دریافت کیے تھے جن کے بارے میں، میں نہیں جانتی تھی جس پر میں نے کبھی غور نہیں کیا تھا۔

اور تمہارا شکریہ لیلین! وہ عورت بننے کے لیے جس کی مجھے ضرورت تھی۔

بارٹینڈر جس عورت کے بارے میں بتائے گا، وہ سیاہ بالوں اور تیز میک اپ والی کوئی عورت ہوگی اور میں ویسی بالکل نہیں۔

جب تک پولیس گھر پہنچے گی، لیلین غائب ہو چکی ہوگی۔ ریپ بلیزر اور پنسل اسکرٹ کوڑے میں ہوگا۔ نیکوٹین کی خالی شیشی ٹوٹ چکی ہوگی۔

اور جب وہ مجھ سے پوچھیں گے تو میں کہوں گی۔

''میرا شوہر......؟ نہیں، وہ گھر پر نہیں ہے۔ اسے آج دیر ہو گئی ہے۔ رکو، کیا......؟ وہ کہاں ہے اور کس کے ساتھ......؟''

یہ سن کر کہ آپ کے شوہر کو زہر دیا گیا ہے، آپ کا کیا ردعمل ہے؟ وہ ہوٹل کے بار میں دوسری عورت کے ساتھ تھا اور اس نے اوپر ایک کمرا بھی بک کیا تھا۔

صدمہ، غم، اداسی اور بے بسی۔

یہ جذبات حقیقی ہوں گے۔ چاہے دوسری وجوہات کی بنا پر۔

⌘⌘⌘

محفلِ شعروسخن

❄ ذکیہ احمد...... چکوال

کمال حسن کو پہنچی نہ جستجو کی نظر
تمام عمر یونہی وقفِ اضطراب رہی

❄ ناہید یوسف...... اسلام آباد

خزاں کی رت میں لمحۂ جمال کیسے آگیا
یہ آج پھر سنگار کا خیال کیسے آگیا
ہنسی کو اپنی سن کے ایک بار میں بھی چونک اٹھی
یہ مجھ میں دکھ چھپانے کا کمال کیسے آگیا

❄ ناصر خان...... کوئٹہ

اغراض کے بندوں سے نہ اخلاص طلب کر
صحرا میں گھنے پیڑ کے سائے نہیں ملتے

❄ حرا خان...... مری

چاہت پہ کبھی بس نہیں چلتا ہے کسی کا
لگ جاتی ہے یہ آگ لگائی نہیں جاتی

❄ میمونہ علی...... کوٹری

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

❄ شرمین خان...... پشاور

محبت بھی کیا چیز ہے دیکھنا
ادھر بات کی ، چشم تر ہوگئی

❄ رمشا ذیشان...... کراچی

پھر بھی نہ میرا قافلہ لٹنے سے بچ سکا
میں نے خبر تو رکھی تھی اک اک گھات کی

❄ سکینہ...... حیدر آباد

کتنی چپ چاپ سُلگتی ہوئی ویرانی ہے
یہ مرے شہر کی گلیاں ہیں کہ آنکھیں میری

❄ پرویز علی...... ملتان

سمجھ جاتا ہوں لیکن دیر سے ، میں داؤ پیچ اس کے
وہ بازی جیت جاتا ہے میرے چالاک ہونے تک

❄ ندیم شاہ...... اوکاڑہ

اس زمانے کے عجب دستور ہوکر رہ گئے
کل جو تھے مختار اب مجبور ہوکر رہ گئے

❄ ایم یونس...... مردان

انتہا کوئی نہیں ہے ابتدا ہونے کے بعد
عشق کیا ہے جان لو گے مبتلا ہونے کے بعد

❄ آذین رضوان...... کراچی

بہت سے ناموں کو اپنے سینے میں چھپائے
جلی ہوئی بستی میں ایک شجر بھی ہے
سوکھ گیا خود اپنے دل کی نرمی سے
پیڑ کو کیا معلوم تھا بیل امر بھی ہے

❄ عبدالعزیز...... گوجرانوالہ

ڈھونڈنے کو جب گیا میں اس کی آنکھوں میں وفا
اس کی آنکھوں کا سمندر اور گہرا ہوگیا

❄ روبینہ ملک...... بہاولپور

ہمیں بھی دیکھ جو اس درد سے کچھ ہوش میں آئے
ارے دیوانہ ہوجانا محبت میں تو آسان ہے

❄ ثمینہ احمد...... میانوالی

اک بار تجھے عقل نے چاہا تھا بھلانا
سو بار جنوں نے تیری تصویر دکھا دی

❄ راحیل سورانی...... کراچی

خاموش تھے لب ، صورتِ اقرار عجب تھی
کیا کہتے صفائی میں کہ سرکار عجب تھی
پھر جمنے لگے ، دیکھ ، مرے پاؤں زمیں پر
غربت میں ترے شہر کی دیوار عجب تھی

❄ عابد محمود...... رحیم یار خان

ہچکیاں سی آتی ہیں یاد آرہے ہو تم
سانس کے اکھڑنے میں دیر کتنی لگتی ہے

❄ نائلہ وجاہت...... ڈی جی خان

نہ جانے کیا ہے کسی کی اداس آنکھوں میں
وہ منہ چھپا کے بھی جائے تو بے وفا نہ لگے

❄ لیاقت شہزاد...... شیخوپورہ

پلکوں پہ رک گیا ہے سمندر خمار کا
کتنا عجب نشہ ہے ترے انتظار کا

❄ فوزیہ رحمان...... ساہیوال

میں جہاں کہیں بھی بھٹک گیا، وہیں گرتے گرتے سنبھل گیا
مجھے ٹھوکروں سے پتا چلا میرا ہاتھ ہے کسی ہاتھ میں

❄ شوکت علی...... کمالیہ

چھوڑ کر جا تو رہا ہوں تجھے بوجھل دل سے
دور ہوگا نہ کبھی ذہن سے تیرا سایہ

❄ نواز آفریدی...... مظفر آباد

اک سوچ میں گم ہوں تیری دیوار سے لگ کر
منزل پہ پہنچ کر بھی ٹھکانے نہ لگا میں

❄ صدف ایاز...... کراچی

دل صاف ہو تو زہر اگلتی نہیں زبان
روشن چراغ سے کبھی اٹھتا نہیں دھواں

❄ شیر خان لاشاری...... بھکر

جنگل ہو یا اب صحرا ہو تنہائی سے کیا ڈرنا
ہم تو دل ہی رکھ آئے ہیں ستم گروں کی گھاتوں میں

❄ نصرت یاسمین...... نواب شاہ

پہلو میں میرے دل کو نہ اے درد کر تلاش
مدت ہوئی غریب وطن سے نکل گیا

❄ متین چودھری...... سیالکوٹ

کیسی محبت کیسی چاہت ، ہم پہ سب کچھ روشن تھا
یونہی ذرا سا جی چاہا تھا آؤ دل برباد کریں

❄ خرم نقوی...... سرگودھا

نہیں جاتی کہاں تک فکرِ انسانی نہیں جاتی
مگر اپنی حقیقت آپ پہچانی نہیں جاتی

❄ عدنان ملک...... ملتان

بندھے ہوئے ہاتھ کا بھی اس کو ملال کب ہے
شریکِ پرواز کر رہا ہے اسیر ایسا
میں دونوں ہاتھوں کو چھوڑ کر چل رہی ہوں پھر سے
سرِ ارادہ کھڑا ہے اک دستگیر ایسا

❄ خالد خان...... خوشاب

تمنا تھی کہ جلتے ہم وفا کی آگ میں لیکن
جنہیں خود شمع ٹھکرائے وہ پروانے کدھر جائیں

❄ مریم احمد...... گوجر خان

موجیں تڑپ رہی ہیں اسی غم میں آج بھی
کس کو ڈبو دیا ہے کنارو جواب دو!

❄ طاہر علی...... وہاڑی

یہ اپنا ظرف وہاں بھی مسرتیں بانٹیں
وہ شہر جس میں محبت کا کچھ رواج نہ تھا

❄ عظیم احمد...... جھنگ سٹی

میں خواب میں چلتا ہوا آیا ہوں ترے پاس
اے دوست مجھے نیند سے بیدار نہ کرنا

❄ طارق علوی...... سکھر

ہم ہیں سوکھے ہوئے تالاب پہ بیٹھے ہوئے ہنس
جو تعلق کو نبھاتے ہوئے مرجاتے ہیں

❄ ضیا آرائیں...... ملتان

معلوم ہیں مجھ کو تیرے احوال کہ میں بھی
مدت ہوئی گزرا تھا اسی راہ گزر سے

❄ احسان ہاشمی...... کراچی

رسوائیوں کا آپ کو آیا ہے اب خیال
ہم نے اپنے دوست بھی دشمن بنا لیے

❄ الطاف انجم...... میرپور خاص

کیسے کہوں کہ میں نے کہاں کا سفر کیا
آکاش بے چراغ ، زمین بے لباس تھی

❄ امجد علی...... گلگت

نکلی تھی میں صدائے جرس کی تلاش میں
دھوکے سے اس سکوت کے صحرا میں آگئی

❄ نورین ایوب...... بہاولنگر

بسا ہوا ہے خیالوں میں کوئی پیکرِ ناز
بلا رہی ہے ابھی تک وہ دل نشیں آواز

❁ وقاص علی...... روہڑی

مانا نگاہِ ناز بھی قاتل سے کم نہیں
ہو جس پہ ظلم ، عدل کی زنجیر کھینچ دے

❁ پروین خان...... مانسہرہ

آنکھوں میں بسا لیتے ہیں روٹھے ہوئے منظر
جاتے ہوئے لوگوں کو پکارا نہیں کرتے

❁ ناظر علی...... میانوالی

یاد کے بے نشاں جزیروں سے
کوئی آواز سی آرہی ہے ابھی

❁ ثنا صادق...... کراچی

یہ قربتیں میری آنکھوں میں کیسی اتری ہیں
کہ خواب بھی میرے رخصت ہیں رتجگا بھی گیا

❁ طوبیٰ احمد...... بی

دل محوِ انتظار ہے آنکھیں ہیں فرشِ راہ
آ کبھی تو جانے والوں کے شہر میں

❁ اظہر رشید...... ملتان

ہم کو شاہوں کی عدالت سے توقع تو نہیں
آپ کہتے ہیں تو زنجیر ہلا دیتے ہیں

❁ عاشی...... راولپنڈی

یہ تیرا جمالِ کامل یہ شباب کا زمانہ
دلِ دشمناں سلامت ، دلِ دوستاں نشانہ

❁ امتیاز احمد...... منڈی بہاؤالدین

سبز لبادہ پہنے میں تو سوچ رہی ہوں پہروں سے
فصلِ بہاراں بھی آپہنچی جانے تم کب آؤ گے

❁ محمد امین...... کراچی

بڑا دلچسپ منظر ہے سکوتِ ناز کا ان کے
نگاہیں گفتگو کرتی ہیں لب خاموش رہتے ہیں

❁ شاہین تبسم...... سرگودھا

یا تو آج ہمیں اپنا لے یا تو آج ہمارا بن
دیکھ کہ وقت گزرتا جائے کون ابد تک جیتا ہے

❁ شکور احمد...... چیچہ وطنی

ایسا گم ہوں تیری یادوں کے بیابانوں میں
دل نہ دھڑکے تو سنائی نہیں دیتا کچھ بھی

❁ نازیہ مختار...... گوجرانوالہ

ہے کدے سے جو بچ نکلتا ہے
تری آنکھوں میں ڈوب جاتا ہے

❁ سکندر خان...... فیصل آباد

تلخیِ غمِ دوراں کی مٹا کیوں نہیں دیتے
مخمور نگاہوں کو اٹھا کیوں نہیں دیتے

❁ محمود خان...... ٹنڈوالٰہیار

کھوئی کھوئی سی یہ کچھ اور حسیں لگتی ہیں
آج کس بات پہ حیراں ہیں تمہاری آنکھیں

❁ وردہ جنید...... کراچی

دیکھا نہ تھا تجھے تو تیری آرزو نہ تھی
دیکھا تجھے تو تیرے طلب گار ہوگئے

❁ جاوید بشیر...... ڈی جی خان

کوئی تصویر نہ ابھری تیری تصویر کے بعد
ذہن خالی ہی رہا کاسئہ سائل کی طرح

❁ اسما شاہ...... کوٹ لکھپت

آئینے کی آنکھ ہی کچھ کم نہ تھی میرے لیے
جانے اب کیا کیا دکھائے گا تمہارا دیکھنا

❁ عدنان صدیقی...... کراچی

زلفوں کی گھٹا ، رنگ ، حیا ، تابِ جوانی
ہر چند تیرے رخ پر نقابوں کی طرح ہے

❁ عثمان شاہ...... بفہ ہزارہ

حیا کی شوخیوں سے اٹھتے اٹھتے جھک گئیں نظریں
مری قسمت میں ان کے تیر بھی آئے کماں ہوکر

❁ زرین نصیر...... نواب شاہ

رکا رکا سا تبسم ، جھکی جھکی سی نظر
تمہیں سلیقۂ بیگانگی کہاں ہے ابھی

❁ احمد رضا جعفری...... کوئٹہ

زلف کا بادل ، بدن کی روشنی ، آنکھوں کی شام
اس زمیں پر آسماں پھیلا ہے میرے سامنے

❁ خالد خان...... سوات

اے تلاشِ یار مجھ کو فکرِ دشت و در نہیں
شمعِ دل اک چاہیے بس روشنی کرتی رہے

انتقام انسان کو کہاں سے کہاں پہنچادیتا ہے... اگر کسی کے ساتھ کوئی ظلم اور زیادتی ہوجائے تو دل کی آگ سب کچھ جلا کر راکھ کردیتی ہے... اور ایسے میں انسان خود ظلم کا مرتکب ہوجاتا ہے... یہی حال اس کا بھی تھا جو اپنوں کے ہاتھوں دار پر لٹک چکا تھا مگر انجانے میں کچھ ایسا کرشمہ ہوا کہ ظالم کی بازی پلٹ گئی... بس قدرت کی یہی بات اسے گھمنڈ میں مبتلا کرگئی... اور اسی تکبر میں وہ اپنی چال چلن سب بھول گیا۔

موت سے لڑ جانے والے ایک بے وقوف انسان کی کارروائیاں

پوشیدہ راز

آصفہ ضیا احمد

جو کچھ ''نیلا آکاش'' میں ہوا، وہ انتہائی بھیانک اور المناک تھا۔ نیلا آکاش کے وسیع و عریض ہال میں سفید چادروں سے ڈھکی ہوئی دو لاشیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک بائیس سالہ خوبرو نوجوان کی لاش تھی جس کا نام جے پال تھا اور دوسری لاش ایک بال ودھوا (کمسن بیوہ) کی تھی جو بلا کی حسین و جمیل تھی۔ وہ صرف نام کی من موہنی نہیں تھی بلکہ حقیقتاً اس کا طلسمی روپ ہر ایک کے من کو موہ لیتا تھا۔ شاید اسی لیے اس کا نام اس کے گھر والوں نے من موہنی رکھا تھا۔

اس وقت نیلا آکاش کے چپے چپے پر پولیس بکھری ہوئی تھی۔ ان کمروں کو سیل کر دیا گیا تھا جہاں سے لاشیں ملی تھیں۔ پولیس کے سخت گھیراؤ اور نگرانی کی وجہ سے لوگ دور دور سے نظارہ کر رہے تھے۔ میڈیا والوں کے لیے بھی فی الحال داخلہ ممنوع تھا۔ نیلا آکاش کے اطراف میں بھی خوف و ہراس کی فضا قائم تھی۔ یہ سنسنی خیز خبر سن کر لوگوں کو یوں محسوس ہوا جیسے ایٹم بم گرا ہو۔

پولیس رسمی کارروائی اور ابتدائی تفتیش سے فارغ ہوئی اور لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے اٹھالیا گیا۔ لاشیں اٹھتے ہی ایسا کہرام مچا کہ ایک قیامت برپا ہوگئی۔ گھر کی کرتا دھرتا اور بزرگ مہیلا (خاتون) نیلا دیوی نے ایک دلدوز چیخ ماری اور غش کھا کر گر پڑی۔ نیلا دیوی کا چھوٹا بیٹا مہی پال، ماں کو سنبھالنے کے لیے آگے بڑھا لیکن شدت غم سے چکرا کر زمین پر بیٹھ گیا۔ گھر میں آہ و فغاں کا طوفان برپا تھا۔

ویسے تو وہاں موجود ہر شخص سسک رہا تھا مگر نیلا دیوی جو جے پال کی دادی لگتی تھی، اس کی چیخیں آسمان کا کلیجا چیر رہی تھیں۔ وہ بین کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”ہائے بھگوان! یہ کون سے پاپوں کی سزا ہمیں دی ہے۔ اب اس ونش اس کل کا کوئی نام لیوا، کوئی وارث نہیں رہا۔ ہائے ربا! یہ کیسا کلجگ ہے کہ میں بڑھیا بیٹھی ہوں اور میرے جوان بچوں کی ارتھیاں میرے سامنے اٹھائی جا رہی ہیں۔ ارے جانے کے دن تو میرے تھے۔ بھگوان! تو مجھے بھول گیا۔“

نیلا دیوی کی آہ و زاری سن کر سب کی آنکھوں کے سوتے ابل پڑے۔ خاص طور پر جے پال کی ماں روپالی ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ جس بیٹے کے سر پر وہ سہرا سجانے کا سوچ رہی تھی، وہ پرلوک سدھار چکا تھا۔ روپالی غش کھا کر اس طرح بیہوش ہوئی کہ ہاتھ پیر ہی ٹھنڈے پڑ گئے۔ فوراً ہی ڈاکٹر طلب کیا گیا۔ ڈاکٹر نے فوری ٹریٹمنٹ کے بعد ایک پرسکون کمرے میں روپالی کو شفٹ کروایا جہاں روپالی کا خاص ملازم رمن اسے اٹینڈ کر رہا تھا۔ رمن کے علاوہ وہاں صرف روپالی کا شوہر مہی پال جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ کسی کو وہاں آنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ پولیس کے چند سپاہی نیلا آکاش پر تعینات تھے جو اندر اور باہر اپنی عقابی نظروں سے جائزہ لے رہے تھے لیکن ابھی تک ان کے ہاتھ کچھ نہیں آیا تھا۔

تفتیشی افسر انوراگ پاٹل بھی اپنی ڈیوٹی مکمل کر کے جا چکا تھا۔ اس وقت نیلا آکاش پر ایک سوگوار سناٹے اور ویرانی کا راج تھا۔

☆☆☆

آج سے برسوں پہلے نیلا اور آکاش ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔ دونوں نے گریجویشن کرنے کے بعد اپنے ماتا پتا تک یہ بات پہنچادی کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور بہت جلد شادی کر کے اپنا گھر سنسار بسانا چاہتے ہیں۔ دونوں پریوار نے ان کی پسند کو سویکار کیا کیونکہ ذات برادری میں کوئی زیادہ فرق نہیں تھا۔ معاشی طور پر آکاش ذرا کمزور تھا لیکن نیلا کے باپ کی عمیق نظروں نے یہ بھانپ لیا کہ لڑکا سلجھی ہوئی طبیعت کا ہے اور ساتھ ہی محنتی اور کماؤ ہے۔ ایک تولیے بنانے والی فیکٹری میں بطور پرچیز منیجر کام کر رہا تھا۔ گھر کرائے کا تھا لیکن پھر بھی ٹھیک ٹھاک گزارہ ہو جاتا تھا کیونکہ گھر میں صرف دو ہی افراد تھے۔ ایک خود آکاش، دوسری اس کی ماں بملا۔

بملا بڑی گھر گرہستی والی اور سگھڑ عورت تھی۔ آکاش کے باپ کے مرنے کے بعد سلائی اور کڑھائی کر کے اس نے آکاش کو پڑھایا لکھایا۔ جب آکاش برسر روزگار ہو گیا تو اس کی خواہش تھی کہ اس کا اپنا نجی مکان ہو جائے لیکن آکاش کو یہ ڈر تھا کہ نیلا کے ماں باپ اس کی شادی کہیں اور نہ کر دیں اس لیے اس نے ماں کو اس طرح شیشے میں اتارا کہ وہ مکان اور فلیٹ بھول کر فوراً نیلا کے گھر جا پہنچی۔

نیلا کے خاندان نے فوراً رشتہ قبول کر کے چٹ منگنی، پٹ بیاہ پر عمل کیا اور اس طرح نیلا پیا کے گھر چلی آئی لیکن ابھی اس کی شادی کو مکمل دو ماہ بھی نہیں گزرے تھے کہ وہ فیکٹری جہاں آکاش کام کرتا تھا، خسارے میں چلی گئی۔ تمام ایمپلائز کو جواب دے دیا گیا۔ آکاش پاتال میں اتر گیا۔ ایسے میں نیلا نے میکے سے ملنے والا گہنا، زیور سب اپنے پتی دیو کے سامنے رکھ کر کہا۔ ”آکاش! ہم اگنی پوتر کے سات پھیرے لیتے ہوئے یہی شپتھ (قسم) اٹھاتے ہیں تا کہ ور اور ودھو (دولہا دلہن) میں کوئی انتر (فرق) نہیں۔ دونوں کے دھرم کرم ایک، شریر (جسم) ایک، جیون مرن ایک۔ ٹھیک کہہ رہی ہوں نا میں۔“ اس نے تصدیق طلب نظروں سے اپنی ساس اور پتی کی طرف دیکھا۔ اس کی اس بات پر دونوں ماں بیٹے چونک گئے۔ دونوں کچھ بھی نہیں سمجھ پائے۔

آکاش نے حیران کن نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”نیلا! یہ بات تو ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارے سات پھیرے ہمیں یہی سکھاتے ہیں کہ ہم جیون کے اچھے

بُرے پل مل کر کاٹیں گے اور انتم چتا (مرنے کی آخری رسم) تک ایک دوسرے کا ساتھ نبھائیں گے۔ کیا مجھ سے یا میری ماں سے کوئی بھول، کوئی غلطی ہوگئی جو تم یہ سب کہہ رہی ہو اور یہ گہنا تم نے کس لیے نکالا ہے؟"

آکاش کی ماں نے بھی بیٹے کی ہاں میں ہاں ملائی اور بولی۔ "ہاں بہو! میں آکاش کی رائے سے سہمت (متفق) ہوں۔ تمہارے میکے کا گہنا ہے۔ اس کی رکھشا (حفاظت) کرنا ہمارا کرتویہ (فرض) ہے۔"

"اوہ ماں جی! آپ اور آکاش بھی بات کو پورب سے پچھم لے کر چلے گئے۔ میں آپ دونوں سے یہ کہہ رہی ہوں کہ میرے دکھ سکھ اب اس گھر سے جڑے ہوئے ہیں اس لیے میرا یہ گہنا جو میرے ماتا پتا نے دیا ہے، اس کو بیچ کر آکاش اپنا کوئی کاروبار یا دھندا شروع کرکے اپنی روزی روٹی کمائیں تو اس میں کوئی برائی تو نہیں۔ نوکری چاکری کا تو ویسے ہی کال پڑا ہے۔ کچھ دن کاروبار سے ملنے والا پرافٹ ہم اپنے واپر (استعمال) میں نہیں لیں گے۔ میں اور ماں جی کام کرکے گھر چلائیں گے۔ جب ہمارا کاروبار سیٹ ہوجائے گا، تب ہم اگلے پڑاؤ پر قدم رکھیں گے۔"

نیلا کی بات سولہ آنے سچ تھی۔ دونوں ماں بیٹے کے دل میں سماگئی۔ دونوں ستائشی نظروں سے نیلا کو دیکھنے لگے۔ تھوڑی سی ردوکد کے بعد بالآخر آکاش نے تمام زیورات کو سمیٹ کر ایک پوٹلی بنائی اور اپنے پاس رکھ لی۔ دوسرے ہی دن اس نے اپنے ایک سنار دوست کو فون کرکے اپنے گھر بلایا جس نے وعدہ کیا کہ وہ یہ تمام زیور اچھے داموں فروخت کروادے گا اور چند دن میں ہی اس نے اپنا وعدہ پورا کیا۔

اب آکاش کے پاس ایک خطیر رقم تھی۔ اس نے کافی سوچ بچار کے بعد موٹر اسٹینڈ پر آدھا پلاٹ خریدا جس کی وجہ سے جمع شدہ رقم کا بڑا حصہ اس کے پاس سے نکل گیا۔ اس پلاٹ پر اس نے ایک کھوکھا نما بھوجنالیہ (طعام خانہ) کی نیو (بنیاد) رکھی جو کہ شاکاہاری جہاں خالص سبزیوں کی ڈشز بنتی ہیں، تھا۔ ٹوٹے پھوٹے فرنیچر کو کم داموں میں خریدا اور اس کی مرمت کرواکر اس نے بزنس کی دنیا میں پہلا قدم رکھا۔ ہوٹل کا نام دونوں پتی پتنی نے آکاش کی ماں کے نام پر "بملا بھوجنالیہ" رکھا۔ آکاش کی بوڑھی ماں اپنے اس آدرسمان (ادب احترام) پر پھولے نہیں سمائی اور بیٹے، بہو کو اتنی دعائیں دیں کہ دونوں ماں کے چرنوں میں جھک گئے۔

بملا اپنی ہر پرارتھنا میں یہی کہتی۔ "ہے پربھو! میرے بیٹے بہو کا کاروبار خوب پھولے پھلے رکھیو۔ انہیں جلدی سے سنتان (اولاد) کا منہ دکھائیو۔" اور بملا کے دل سے نکلی ہوئی تمام دعائیں ایسی رنگ لائیں کہ ان کا کچا پکا یہ چھوٹا سا ہوٹل بہت جلد ترقی کرگیا۔ آتے جاتے ڈرائیور اور پسنجر وہاں اترتے، اپنے من پسند کھانے کا آرڈر دیتے، شکم سیر ہوکر کھاتے اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہوجاتے۔

اس کا بھوجنالیہ اچھی طرح چل نکلا تھا۔ اب وہ دو وقت پیٹ بھر کر کھاتے اور پیر پسار کر سوتے لیکن نیلا کا سپنا کچھ اور تھا۔ اس نے ایک دن آکاش اور بملا کو یہ شبھ سماچار سنایا کہ اس کا پیر بھاری ہے۔ دونوں ماں بیٹے یہ سن کر خوشی سے اچھل پڑے اور جب ان کی بگیا میں یش پال کا پرویش (آمد) ہوا تو سارا گھر اس کی قلقاریوں سے گونج اٹھا۔ نیلا نے پہلی بار آکاش کے سامنے اپنی مانگ رکھی کہ وہ اپنی سنتان کو اچ شکشا دلانا چاہتی ہے اور اس کے لیے دھن سمپتی چاہیے۔ اس لیے اپنے کاروبار کو بڑھانے کی کوشش کرے۔ آکاش کی سوئم منوکامنا (خود کی خواہش) یہی تھی کہ اس کی شکستہ ہوٹل کی عمارت پختہ ہوجائے اور بزنس میں بھی انتی اور بڑھوتری ہو۔ نیلا نے جونہی اسے ترغیب دی، وہ میدان میں کود پڑا۔

ان دنوں بھارت میں چھوٹے بیوپاریوں کے لیے حکومت نے ایک ایسی یوجنا (منصوبہ) بنائی تھی جس میں سرکاری بینک کم شرح سود پر قرض دے رہا تھا۔ آکاش نے اسی سے فائدہ اٹھایا اور گورنمنٹ سے قرض لے کر اپنے ہوٹل کو نیا رنگ روپ دے ڈالا۔ پیسا تو ٹھیک ٹھاک لگا لیکن اس کے ساتھ گاہکوں کی تعداد بھی بڑھی لیکن کئی گاہک اس کی دکان سے کیول (صرف) اس لیے واپس جاتے کہ اس کے یہاں تمام بھوجن شاکاہاری ہوتا اور آج کل لوگوں میں مانساہاری کھانے پسند کیے جارہے تھے۔ اس کی ماں کٹر ہندو تھی اور وہ گوشت، انڈے اور مچھلی کی بوباس سخت ناپسند کرتی تھی۔ اس نے ماں کو ہوا بھی نہیں لگنے دی اور اپنے ڈھابے پر مانساہاری بھوجن کے لیے ایک نیا رسوئیا (باورچی) رکھ لیا۔

اب تو اس پر ہُن برسنے لگا۔ لوبھ اور لالچ کی کوئی سیما نہیں ہوتی۔ دونوں پتی، پتنی نے رائے مشورے کے بعد ایک چھوٹا سا ٹھیا دارو شراب کا بھی رکھ لیا جس میں کچی شراب، تاڑی اور ٹھرا شامل تھا۔

اب تو آکاش کی انکم میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہورہی تھی۔ اس کی ماں بملا بھی دنیا چھوڑ چکی تھی۔ نیلا

کی گود میں دوسرا بیٹا مہی پال آچکا تھا۔ آکاش کا پریوار ایک سنتشٹ (مطمئن) اور خوشحال جیون بتا رہا تھا۔ نیلا نے بہت چاہا کہ دونوں بیٹے پڑھ لکھ کر افسر بنیں لیکن دونوں کی رُچی (رجحان) پڑھائی لکھائی کی اور بالکل بھی نہ تھی۔ واجبی سی شکشا پراپت کرنے کے پشچات (تعلیم حاصل کرنے کے بعد) دونوں باپ کے ڈھابے پر بیٹھنے لگے۔ باپ کی نگاہ بچا کر گلے پر ایسی ہاتھ کی صفائی دکھاتے کہ آکاش کی آتما کو بھی پتا نہ چلتا۔ ویسے بھی جب دونوں بیٹوں نے کاروبار میں حصہ لینا شروع کیا تھا آکاش پوری طور سے نشچنت ہوگیا تھا۔ پہلے پہل تو وہ صرف دارو بیچنے کا کام کرتا تھا، اب تو خود بھی پینے لگا تھا۔ نیلا نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن آکاش نے اس کی ایک نہ سنی۔ کثرتِ شراب نوشی کی وجہ سے اس کا جگر اور پھیپھڑے بری طرح پربھاوت ہوئے اور پھر جلد ہی وہ بھی پرلوک سدھارا۔

نیلا نے پتی کا اتنا سوگ منایا کہ خود ہی بیمار پڑ گئی۔ آج اسے پہلی بار احساس ہوا کہ دھن دولت کا لوبھ کتنا بھینکر (خوفناک) ہوتا ہے۔ اپنے دونوں بیٹوں کو اس نے سیدھے راستے پر لانے کے لیے ان گنت جتن کیے لیکن یش پال اور مہی پال نے آنکھیں کھولتے ہی نوٹوں کی بہار دیکھی تھی اور سکوں کی جھنکار سنی تھی اس لیے وہ چاہتے تھے کہ دولت کی یہ ورشا (بارش) ہمیشہ جاری وساری رہے۔ ماں کو طرح طرح کے بہلاوے تسلیاں دے کر اس کو سمجھاتے بجھاتے رہتے۔ اب تو سارے شہر میں بھلا بھوجنالیہ کی کئی برانچز تھیں بلکہ دونوں بھائیوں کا ایک مشترکہ فائیو اسٹار ہوٹل بھی تعمیر ہو چکا تھا جس کا اودگھاٹن (افتتاح) انہوں نے ایک بہت بڑے نیتا سے کروایا تھا۔ یہ اندر کی بات ہے کہ اس کے عوض نیتا جی کے سامنے انہیں نوٹوں کا ڈھیر ارپت کرنا پڑا اور ان کے کارندوں نے ساری رات انگلش وائن کے مزے لوٹے۔

دونوں بھائیوں کے آنگن میں لچھمی (دولت کی دیوی) جھوم جھوم کر ناچ رہی تھی۔ ماں کو خوش کرنے کے لیے دونوں دل و جان سے اس کی سیوا میں لگے رہتے بلکہ دونوں بھائیوں نے باہمی مشاورت سے شہر کی بہترین لوکیشن میں ایک وسیع وعریض بنگلا بنوایا جس کا نام انہوں نے ماں باپ کے نام پر ''نیلا آکاش'' (نیلا آسمان) رکھا۔ جدید طرز کی یہ عمارت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اندرونی تزئین و آرائش کا کام بھی شہر کی مشہور اور مہنگی ڈیکوریشن کمپنی سے کروایا گیا تھا۔ نیلا نے آتے ہی ''گھر بھراونی'' کا سمارو (فنکشن) سلیبریٹ کیا۔ آج تک وہ متوسط طبقے میں رہنے بسنے والے لوگوں کے ساتھ رہتی آئی تھی۔ اتنے بڑے گھر میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ اکیلا پن اور سناٹا محسوس کر رہی تھی۔ شوہر کی کمی اسے شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ اپنی اور اپنے بیٹوں کی تنہائی دور کرنے کا سب سے سادھارن اپائے (آسان طریقہ) اسے یہ نظر آیا کہ دونوں بیٹوں کا جلد سے جلد بیاہ کر دیا جائے۔

☆☆☆

اپنے خاندانی پنڈت اجودھن اپادھیائے کے ذریعے ایک اچھی، سندر اور سوشیل کنیا (خوبصورت اور سلیقہ مند لڑکی) اس کے ہاتھ لگ گئی۔ یش پال بھی تصویر دیکھتے ہی لوٹ پوٹ ہوگیا۔ یوں انورادھا ''نیلا آکاش'' میں بہو بن کر آگئی اور پھر جلد ہی وہ ایک بچے کی ماں بھی بن گئی۔ اب نیلا کو اپنے دوسرے بیٹے مہی پال کی شادی کی فکر تھی۔ اس نے پھر پنڈت جی سے رابطہ کرنا چاہا لیکن مہی پال نے سختی سے ماں کو منع کر دیا کہ اس معاملے کو وہ خود حل کرے گا۔ اپنی من چاہی لڑکی جہاں بھی نظر آجائے گی، وہ شادی میں دیر نہیں کرے گا اور اس نے جو کہا تھا وہی کیا۔

نیلا ''نام کرن'' کی ایک محفل میں گئی ہوئی تھی۔ جب اسے واپسی میں دیر ہوئی تو مہی پال وہاں ماں کے لیے گاڑی لے کر پہنچ گیا۔ وہ گھرانا اس کے لیے قطعاً انجان اور اجنبی تھا اس لیے وہ گاڑی سے اتر کر گیٹ پر کھڑے واچ مین سے بات کرنے لگا۔ معاً گھر سے نکلنے والے ایک شخص کو دیکھ کر وہ اچھل پڑا۔ وہ اس کا دوست راکیش تھا جو کسی زمانے میں اس کا کلاس فیلو رہ چکا تھا۔ راکیش نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ لپک کر اس کے پاس آیا اور والہانہ انداز میں اس سے آکر لپٹ گیا۔ دونوں نہایت گرمجوشی سے ایک دوسرے سے ملے۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد جب مہی پال نے بتایا کہ وہ یہاں اپنی ماں کو لینے آیا ہے تو راکیش نے گھر کے برآمدے میں سے آواز لگائی۔

''روپالی...... او روپالی!'' اس کی آواز پر فوراً ایک لڑکی باہر آئی۔ راکیش نے مہی پال سے اس کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ''مہی پال! یہ میرے ماما کی چھوٹی بیٹی ہے۔ اس کی بڑی بہن کی بچی کا آج ''نام کرن'' (تجویز کردہ نام رکھنے کی تقریب) ہے۔ تمہاری ماتا جی کو یہ یقیناً جانتی ہوں گی۔ یہ انہیں بلا لائیں گی۔''

مہی پال نے لڑکی کی جانب نظریں اٹھائیں تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ اوپر والے کی صناعی کی داد دیے بغیر نہیں رہ

سکا۔ کیا کچھ نہیں تھا اس سندری کے پاس۔ ہوش اسے اس وقت آیا جب روپالی نے اپنی مترنم آواز میں کہا۔

”آپ کو چند منٹ ویٹ کرنا ہوگا۔ بس سمارو سماپت ہونے میں کچھ چھن باقی ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ پھر دوبارہ اسی دروازے سے غائب ہوگئی۔

مہی پال تصویر بنا دروازے کی طرف دیکھتا رہا۔ راکیش بھی کسی کے پکارنے پر دوسری جانب چلا گیا۔ جب نیلا دیوی باہر آئیں تب مہی پال ماں کو گاڑی میں بٹھا کر گھر چلا آیا۔ بظاہر تو وہ گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا لیکن بار بار روپالی کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتا اور اس کا ہاتھ بہک جاتا اور ماں گھبرا کر دہائی دیتی اور کہتی۔ ”ہائے میرے پتر! تیری طبیعت تو ٹھیک ہے نا، یہ آج تجھے کیا ہوگیا ہے؟“

مہی پال نے بہ مشکل اپنے جذبات پر قابو پایا۔ گاڑی سے اتر کر نیلا فوراً اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ مہی پال آتشِ عشق زیادہ دنوں تک مخفی نہ رکھ سکا۔ موقع محل دیکھ کر ایک دن وہ ماں کے کمرے میں گھس گیا۔ نیلا، نیرج کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ مہی پال نے لمبی چوڑی تمہید باندھنے کے بجائے فوراً اپنا مقصد بیان کردیا۔ نیلا خود بھی یہی چاہتی تھی کہ دوسری بہو بھی جلد ہی گھر میں آجائے اس لیے خوشی سے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ روپالی کا گھرانا اسے خود بھی بہت پسند تھا۔

☆☆☆

روپالی کا بنگلا برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ اس وقت لان میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ مہمانوں میں شہر بھر کے بزنس مین، سیاست دان، سرکاری افسران اور شوبز کے لوگ شامل تھے۔ روپالی کا باپ گارمنٹس کا بہت بڑا بیوپاری تھا۔ غیر ممالک میں بھی اس کا بڑا نام تھا۔ اپنے دیس کے ہنرمندوں سے کام کروا کر باہر مال امپورٹ کرتا۔ بالائی خود کھاتا اور نچوڑا ہوا پانی کاریگروں کو دیتا۔ دروازے پر کچھی ڈول رہی تھی۔ مہی پال کا رشتہ پا کر سارے خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی لیکن بذات خود روپالی اداس اور افسردہ تھی۔ پہلے پہل تو وہ انکار کرتی رہی لیکن جب ماں باپ نے آنکھیں دکھائیں تو دل پر جبر کر کے مہی پال کے نام کا منگل سوتر پہن ہی لیا۔

”نیلا آکاش“ میں قدم رکھتے ہی اسے احساس ہوگیا کہ اس کے ماں باپ نے اس کے لیے جو فیصلہ کیا ہے، وہ غلط نہیں ہے۔ نیلا آکاش کی تزئین و آرائش، روپے پیسے کی ریل پیل، چھوٹے موٹے کاموں کے لیے بھی نوکروں کی فوج اور ناز نخرے اٹھانے کے لیے مہی پال جیسا شوہر موجود تھا جس نے اسے سونے میں پیلا اور چاندی میں سفید کردیا تھا۔ اسے کسی بات کی کمی نہیں تھی لیکن پھر بھی یوں لگتا جیسے وہ ہنسنے مسکرانے کی صرف ایکٹنگ کر رہی ہو۔ اس کی جیٹھانی انورادھا اس کی ٹوہ میں رہتی لیکن ہمیشہ ناکام رہتی۔

سال ڈیڑھ سال گزرنے کے بعد روپالی بھی ایک گورے چٹے بچے کی ماں بن چکی تھی۔ بچے کی ”نام کرن“ کی تقریب بھی بہت دھوم دھام سے منائی گئی اور اس کا نام جے پال رکھا گیا۔ ننھیال اور ددھیال، دونوں جگہ بچہ آنکھوں کا تارا بنا ہوا تھا۔ اب نیلا ایک نہیں بلکہ دو پوتوں کے ساتھ کھیلتی اور اس طرح اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔

نیرج اور جے ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے، کھیلتے کودتے۔ دونوں نے ایک ہی اسکول سے میٹرک کیا اور پھر باہر جا کر بزنس مینجمنٹ کا کورس مکمل کر کے اپنے دیس لوٹے تو دونوں ایسے گبرو جوان بن گئے تھے کہ دونوں کو دیکھ کر نظر لگ رہی تھی۔ دادی دونوں کی آرتی اتار کر ہر بار ہزاروں روپیہ دان کرچکی تھی۔ ان کی مائیں بھی گردن اکڑا کر بیٹوں کو یوں دیکھتیں جیسے رام اور لکشمن نے دوبارہ جنم لیا ہو۔ جے کے تو ابھی کچھ سیمسٹرز باقی تھے اس لیے اسے پھر جانا پڑا لیکن نیرج کی پڑھائی مکمل ہوچکی تھی اور اب وہ کاروبار میں باپ اور چچا کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ دادی اور ماں نے اس کے لیے لڑکی کی تلاش بھی شروع کردی تھی۔ کئی پنڈتوں کی ”نیلا آکاش“ میں آوک جاوک شروع تھی۔ دادی اور ماں ان گنت لڑکیوں کی تصاویر اس کی ٹیبل پر بکھرا دیتیں کہ ان کا راج دلارا کسی کو تو من مندر کے سنگھاسن پر بٹھائے گا لیکن دوسرے دن جا کر دیکھتیں تو پتا چلتا کہ ساری فوٹوز کچرے کی باسکٹ کی نذر ہوگئی ہیں۔ دونوں ایک سرد آہ بھرتیں اور دوبارہ مزید زور و شور سے اپنی تلاش شروع کردیتیں۔ یہ سلسلہ شاید یوں ہی چلتا رہتا اگر ان کے گھر اچانک من موہنی نہیں آجاتی۔

☆☆☆

من موہنی اپنی ماں راجیشوری کے ساتھ اپنی خالہ روپالی سے ملنے آئی تھی۔ روپالی، من موہنی سے یوں ملی جیسے ماں اپنی بچھڑی بیٹی سے ملتی ہے۔ وہ بھانجی کے انگ انگ کو چوم رہی تھی اور اپنے پیار کی پیاس بجھا رہی تھی۔ ساتھ ہی بہن سے شکوے شکایت بھی جاری تھے۔

”دیدی! تم بڑی کٹھور ہو۔ آج کتنے دن بعد میں

اپنی گڑیا سے مل رہی ہوں۔ جب چھوٹی تھی تب تو میرے پاس چھوڑ دیتی تھیں لیکن اب تو تم ایک منٹ کے لیے بھی اسے اپنے آپ سے جدا نہیں کرتی ہو۔“

راجیشوری نے اس کی شکایتوں کو سنی ان سنی کرتے ہوئے نہایت دھیرج سے کہا۔ ”روپالی! زمانہ بڑا خراب ہے۔ یہ یونیورسٹی بھی جاتی ہے تو میں اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر جاتی ہوں اور واپسی پر بھی اسے لینے کے لیے جاتی ہوں کہ پھر کوئی نیا گل نہ کھل جائے۔“

راجیشوری کی بات سن کر روپالی کے تیور بدل گئے۔ اس نے انتہائی ناگواری کے ساتھ بہن کو دیکھا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگی۔ من موہنی حیران کن نظروں سے ماں اور خالہ کو دیکھے جا رہی تھی۔ بولی کچھ نہیں لیکن اس کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ”نیا گل نہ کھل جائے“ یہ جملہ اس کے پلے نہیں پڑ رہا تھا۔

ڈنر کے بعد جب راجیشوری نے روپالی اور اس کی ساس سے واپسی کی اجازت مانگی تو روپالی اڑ گئی اور پورے بھرم سے بولی۔ ”دیدی! کیا میری بھانجی پر میرا ادھیکار نہیں ہے۔ کیا یہ چند دن بھی میرے گھر میں مہمان نہیں رہ سکتی؟“

راجیشوری نے دل پر پتھر رکھ کر بیٹی کو اجازت تو دے دی لیکن جاتے جاتے بھی مڑ مڑ کر بیٹی کو تکتی رہی۔ بیٹی کی چند دن کی جدائی بھی اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی جبکہ روپالی کے لیے یہ چار دن ہولی، دیوالی سے کم نہیں تھے۔ اسے تو جیسے بن مانگے موتی مل گئے تھے۔ دوسری صبح بڑی خوشگوار اور مہکتی ہوئی تھی۔ روپالی، رسوئیا کے سر پر سوار اسے ناشتے کے لیے ہدایات دے رہی تھی ورنہ عام دنوں میں تو وہ رسوئی کے قریب سے بھی نہیں گزرتی تھی۔ میز پر ناشتا پروسنے کے بعد اس نے شہد بھرے لہجے میں بھانجی کو آواز لگائی۔

”موہنی، میری چندا! اب آ بھی جاؤ۔ ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“

نیرج ناشتے کے لیے اپنے کمرے سے نکل رہا تھا۔ ایک نیا نام سن کر وہ چونکا اور استفسارانہ نظروں سے روپالی کو دیکھنے لگا۔ روپالی اسے ابھی کوئی جواب نہیں دے پائی تھی کہ من موہنی کمرے کا پردہ ہٹا کر آتی نظر آئی۔ نیرج مبہوت، آنکھیں پھاڑے من موہنی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس اجنبی حسینہ کو دیکھ کر اس کے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ ایک انجانی سی خوشی موج در موج دل میں دھڑکنے لگی۔ اس نے اسی لمحے فیصلہ کر لیا کہ اب دادی اور ماں کو مزید ادھر اُدھر تاک جھانک نہیں کرنی پڑے گی۔

من موہنی نے بھی اضطراری طور پر نظر اٹھائی اور فوراً ٹھٹک کر نظر جھکالی۔ معاً ذہن میں روشنی کا جھماکا ہوا کہ یقیناً یہ مہاشے (محترم) آنٹی روپالی کے جیٹھ کے پتر نیرج پال ہیں۔ اس نے آج تک نام ہی نام سنا تھا۔ آج پہلی بار تصادم ہوا تو اس نے سرسری سی ایک نگاہ ڈالی اور سبک رفتار سے چلتی ہوئی میز کی طرف بڑھ گئی جبکہ نیرج محبت پاش نگاہوں سے دیکھے جا رہا تھا۔ بہ مشکل اپنے آپ پر قابو پایا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا آیا اور من موہنی کے بالمقابل بیٹھ کر میز پر نظر دوڑائی تو سمجھ میں آگیا کہ اس مہمان سندری کے اعزاز میں سارا تام جھام ہے۔

من موہنی اپنی جگہ کسمسائی اور انتہائی نزاکت سے ایک بریڈ، مکھن اور جیلی لے کر چمچے کانٹے سے کھیلنے لگی جبکہ نیرج اپنی ناک سے سوندھی سوندھی خوشبوؤں سے لطف اندوز ہوا اور پھر من چاہی چیزوں سے اپنی پلیٹ کو بھرتے ہوئے بولا۔

”اس ساری ٹیبل کی سج دھج کیول آپ کے لیے ہے اور آپ ہی چڑیوں کی طرح کھائیں گی تو ہم تو لجا سے مر جائیں گے۔ آپ ٹھیک ٹھاک ہاتھ ماریں گی تو ہم بھی تھوڑی بہت پیٹ پوجا کر لیں گے۔“ اس کی بات پر گھر کے سب لوگ ہنس پڑے مگر روپالی کا قہقہہ سب سے بھاری تھا۔ وہ نیرج اور من موہنی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں نہار رہی تھی۔

نیرج نے مسکراتے ہوئے روپالی کی طرف رخ کیا اور شوخ لہجے میں بولا۔ ”ویسے چاچی! آپ نے ان دیوی جی کا پریچے (تعارف) تو کروایا ہی نہیں۔ ان سے آپ کا کیا ریلیشن ہے؟“

روپالی کی مسکراہٹ خاصی خوشگوار اور معنی خیز تھی۔ نیرج کا سوال نغمہ بن کر اس کے کانوں تک پہنچا تھا۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ من موہنی کا رعب جمال نیرج کے دل کو گھائل کر چکا ہے۔ من موہنی بھی پوری دلچسپی اور چمک دار آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جب نیرج کی نالج میں یہ بات آئی کہ وہ روپالی کی سگی بھانجی ہے تو دل باغ باغ ہو گیا۔ من موہنی سے مل کر وہ بے پناہ مسرور تھا۔ دفتر سے لیش پال اور مہی پال کے فون پر فون آ رہے تھے اور وہ نظر انداز کیے جا رہا تھا۔ ان دونوں کو یوں ہنستا بولتا دیکھ کر کسی نے تو اتنا اثر نہیں لیا لیکن انو رادھا کے ناک کے نتھنے

پھڑکنے لگے تھے۔ اس نے سخت لہجے میں بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"تم نے شاید اپنا موبائل بند کر رکھا ہے۔ تمہارے ڈیڈ اور چاچا کی کالز میرے نمبر پر آ رہی ہیں۔"

نیرج، من موہنی سے محوِ گفتگو تھا۔ اسے یہ دخل اندازی اچھی نہیں لگی۔ اس نے جھنجلا کر تلخ لہجے میں جواب دیا۔ "آپ ان دونوں کو بتا دیں کہ میں آج دفتر نہیں آؤں گا۔ میں اور من موہنی آج باہر جا رہے ہیں۔ لنچ اور ڈنر بھی باہر ہی کریں گے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے موہنی کا ہاتھ پکڑا اور اسے کرسی سے اٹھا دیا۔ من موہنی بھی انتہائی ناز و ادا کے ساتھ اٹھ کر اس کے ساتھ ہو لی۔

روپالی نے جاتی ہوئی من موہنی کو روکا اور بڑی لگاوٹ سے بولی۔ "میری چندا! کیا یوں ہی چلی جاؤ گی۔ تھوڑا بہت میک اپ کر کے ڈریس ہی تبدیل کر لیتیں۔"

نیرج کی رنگین مزاجی عروج پر تھی۔ وہ بن پیے بہک رہا تھا۔ وہ شرارتی لہجے میں بولا۔ "چاچی! اگر یہ مزید تیار شیار ہو کر میرے ساتھ نکلی تو یقین کریں شہر میں قتلِ عام شروع ہو جائے گا۔"

اپنی اس تعریف پر من موہنی کے خون کی گردش تیز ہو گئی۔ روپالی کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے بڑا معرکہ سر کر لیا ہو۔ من موہنی اور نیرج کو ایک ساتھ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں امیدوں کے ان گنت چراغ جل اٹھے تھے۔

☆☆☆

انورادھا کے سارے وجود میں آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ اس وقت ذہنی کشمکش میں مبتلا تھی۔ بھویں تنی ہوئی تھیں، پیشانی پر آڑی ترچھی لکیروں کی وجہ سے چہرے پر پھٹکار برس رہی تھی۔ جب وحشتوں کی تلچھٹ سر پر چڑھ گئی تو تنتناتی ہوئی ساس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ نیلا نے نظریں گھما کر بہو کو دیکھا اور اس کے چہرے کے تاثرات بھانپ کر بولی۔

"اے بڑی بہو! یہ اچانک تجھے کیا ہو گیا ہے؟ تیری صورت پر تو بارہ بج رہے ہیں۔"

انورادھا کے اندر کا آتش فشاں پھٹ پڑا۔ وہ شکست خوردہ شیرنی کی طرح غرائی۔ "ماں جی! صبح ناشتے کی میز پر جو نوٹنکی ہو رہی تھی اس سے آپ نے کیا نتیجہ نکالا؟"

نیلا پلکیں جھپکا کر رہ گئی۔ کچھ توقف کے بعد بولی۔

"میں سمجھی نہیں، تم کیا کہہ رہی ہو؟" اس نے بہو کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے اپنا سوال داغ دیا۔ اس کے اس تجاہلِ عارفانہ پر تو انورادھا کو پتنگے لگ گئے۔ وہ ترخ کر بولی۔

"ماں جی! آپ واستو میں اتنی بھولی ہیں یا ڈرامے بازی کر رہی ہیں؟"

اس کے اس گستاخانہ رویے پر ساس بھی چراغ پا ہو گئی اور ترش لہجے میں بولی۔ "بہو! جو کہنا ہے کھل کر کہہ دے۔ یہ لپا چھپی والی باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔"

اس بار انورادھا سنبھل گئی اور پینترا بدل کر بولی۔

"ماں جی! یہ جو روپالی کی بھانجی آئی ہے، اس کے لچھن (عادات و اطوار) مجھے ایک آنکھ نہیں بھا رہے ہیں۔ نہ لاج نہ شرم۔ نیرج کے ساتھ یوں مٹکتی گئی ہے جیسے جنم جنمانتر کے ساتھی ہیں۔ یہ سب روپالی کی چال ہے۔ مجھ سے میرا بیٹا چھینا جا رہا ہے۔ میں سب سمجھ رہی ہوں۔ میں کبھی بھی اس کلموہی کو بہو نہیں بناؤں گی۔"

نیلا معاملہ فہم عورت تھی۔ اس نے بحث سے گریز کرتے ہوئے کہا۔ "بڑی بہو! عقل اور بدھی (سمجھ) سے کام لینا سیکھ۔ لڑکا جوان اور پڑھا لکھا ہے۔ اگر اس کی پسند کو تو نے ٹھکرا دیا اور وہ کورٹ میرج کر کے اسے تیرے سر پر لے آئے گا پھر تو تجھے من موہنی کو سویکار کرنا ہی پڑے گا نا۔"

نیلا کے چند جملوں میں بہت بڑی سچائی پوشیدہ تھی۔ اب انورادھا کے چہرے پر شدید مایوسی تھی۔ قدرے ہچکچاہٹ کے بعد اس نے ساس کی بات مان لی۔ تلخ لہجے میں اس نے ایک ہنکاری بھری اور وہاں سے اٹھ گئی۔ نیلا اسے جاتا دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر ایک پراسرار مسکراہٹ تھی۔ اسے اچھی طرح علم تھا کہ انورادھا روزِ اول سے ہی روپالی کی دشمن بنی ہوئی ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارن یہ تھا کہ ہر دیکھنے والا جب دونوں کو ساتھ دیکھتا تو بے اختیار ہو کر یہ کہتا۔ "نیلا دیوی! آپ کی چھوٹی بہو تو کسی جادونگری کی جل پری لگتی ہے۔" ایسے وقت انورادھا جل بھن کر کوئلہ ہو جاتی۔ روپالی اور اس کی بھانجی دونوں سے وہ سوتیا ڈاہ (سوکن والی جلن) محسوس کر رہی تھی مگر کرتی بھی کیا۔ اس کا اپنا سکہ ہی کھوٹا تھا اس لیے ساس نے بھی فوراً ہی اس کے احتجاج کی دھجیاں اڑا دیں۔

☆☆☆

روپالی اپنے کمرے میں بیٹھی رمن سے محوِ گفتگو تھی۔ انداز کانا پھوسی والا تھا۔ رمن کچھ بول نہیں رہا تھا بلکہ تکی

بت بنا روپالی کی باتیں سن رہا تھا۔ روپالی کی آنکھوں میں رمن کے لیے بے پناہ تشکر اور خلوص تھا۔ وہ آہستہ آہستہ رمن سے کہہ رہی تھی۔ ''رمن! تجھے میں نے کبھی اپنا نوکر یا غلام نہیں سمجھا۔''

''تو پھر کیا سمجھا؟'' رمن نے معنی خیز لہجے میں سوال کیا۔

''اپنا دوست، اپنا سنگی ساتھی سمجھا۔ ہر کام کے لیے تجھ سے مشورہ کیا۔ اس بار بھی تیرے مشورے پر عمل کیا اور جیت کا جھنڈا میرے ہاتھ میں لہرایا۔''

رمن نے خوشی اور استعجاب سے مغلوب ہو کر زور سے کہا۔ ''سچ کہہ رہی ہو۔ جو میرا پلان تھا وہ کارگر ہوا۔''

روپالی نے باچھیں پھاڑ کر کہا۔ ''بالکل بالکل۔ سو فیصد سپھلتا ملی ہے اس پلان کو۔''

رمن نے مزید خوش ہو کر کہا۔ ''بس یہ سمجھ لے چھوٹی مالکن کہ اب من موہنی سدا تیرے ساتھ اور تیرے سامنے رہے گی۔''

روپالی نے اس کے پاس سے اٹھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ ''بس رمن! اب تو جلدی سے نکل لے۔ میں جب بلاؤں تب ہی آیا کر اور تو صرف سننے کا کام کیا کر کیونکہ جب تو بولتا ہے تو ''نیلا آکاش'' کی دیواریں، دروازے اور کھڑکیوں کے ساتھ ساتھ یہاں رہنے والوں کے بھی کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔''

رمن اس کے تبصرے پر تھوڑا سا جھینپ گیا اور پھر بولا۔ ''بس چھوٹی مالکن! تجھے خوش دیکھ کر میں اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتا۔'' یہ کہتے ہوئے رمن وہاں سے نکل گیا۔ وہ پہلے ہی وہاں سے نکل گیا تھا لیکن روپالی اب بھی اپنے پر تعیش بیڈ روم میں لیٹی رمن کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔ سوچتے سوچتے وہ بچپن کے اس سنہری دور میں داخل ہو گئی جہاں تتلیاں تھیں، پھول تھے، سرسبز درختوں پر پرندوں کی چہکار تھی اور اردگرد بہت سے بچے تھے۔ گھر کے خدمت گاروں کے غریب، نردھن اور کنگال بچے جو اسے اور راجیشوری کو رانی مہارانی سمجھ کر ان دونوں کی جے جے کار کرتے۔ پھر خوابوں اور آرزوؤں کا دور آیا یعنی جوانی اور اس جوانی میں اپنی دیوانگی یاد آئی۔ پھولوں اور فواروں کے درمیان کسی سے چھپ چھپ کر ملنا یاد آیا اور پھر اچانک برسات میں بھیگی ہوئی چڑیا کے مانند اس نے ایک جھرجھری لی اور اٹھ کر بیٹھ گئی کیونکہ تصور میں بابل کی قہر برساتی نظریں اور آگ کے مانند لپلپاتی زبانیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اب وہ بہت بے چینی سے من موہنی کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں لیکن نیرج اور من موہنی پورا دن بتا کر ڈنر کر کے گھر لوٹے۔ چونکہ دونوں تھکے ہوئے تھے اس لیے آتے ہی اپنے اپنے بیڈ رومز میں چلے گئے۔

☆☆☆

نیرج کو اپنی شادی کے سلسلے میں کسی ورودھ یا سنکٹ (مخالفت اور مشکلات) کا سامنا نہیں کرنا پڑا کیونکہ گھر کی سربراہ یعنی اس کی دادی نیلا دیوی اس کے پکش (حمایت) میں تھی۔ شادی کے جشن کا سماں دیکھنے والوں نے دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ نیلا دیوی نے ''نیلا آکاش'' کے دوار پر بذاتِ خود بیٹھ کر اپنے ہاتھوں سے جو دان پن (خیرات بانٹنا) کیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ من موہنی کے میکے والوں نے بھی دان دہیز دینے میں کوئی کمی نہیں کی۔ ادھر ''نیلا آکاش'' کی روشنیاں اور چراغاں دیکھ کر لگ رہا تھا کہ سچ مچ آسمان اپنے ستاروں سمیت دھرتی پر چلا آیا ہے۔ دونوں ورودھو کا ہنی مون ٹرپ بھی بہت کامیاب رہا۔

ہنی مون سے واپسی پر ان کے اپنے فرینڈ سرکل میں دعوتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ اپنے سگے سمبندھیوں اور رشتے ناتے والوں کو تو نیرج نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ ابھی فی الحال ہم کہیں نہیں جا پائیں گے لیکن اپنے ایک قریبی دوست کے بہت زیادہ اصرار پر دونوں پتی پتنی سج بن کر ہوٹل راجد ھانی پہنچے۔ وہاں کھانے کے ساتھ پینے پلانے کا بھی انتظام تھا۔ نیرج نے کچھ زیادہ ہی چڑھا لی۔ من موہنی اسے منع کرتی رہی۔ دوست احباب کے غول میں وہ بری طرح بہک رہا تھا۔ من موہنی کو سب سے زیادہ اس بات کا ڈر تھا کہ نیرج اب گاڑی کس طرح چلائے گا کیونکہ ان کا ڈرائیور دو دن قبل چھٹی لے کر اپنے گاؤں چلا گیا تھا۔ آتے سمے تو نیرج بالکل ٹھیک تھا لیکن اب وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ من موہنی نے اسے پسنجر سیٹ پر بٹھاتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ ''آج گاڑی میں چلاؤں گی۔ آپ یہاں ریسٹ کریں۔''

نیرج نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے ضدی لہجے میں کہا۔ ''میری مردانگی یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ میرے ہوتے ہوئے تم گاڑی ڈرائیو کرو۔ تم کیا سمجھ رہی ہو، مجھ پر نشہ چھایا ہوا ہے۔ نہیں میری جان! میں اتنا بلوان ہوں کہ ابھی کئی بوتلوں کا مزہ لوٹ سکتا ہوں۔''

من موہنی منع کرتی رہی لیکن نیرج اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوا۔ من موہنی طیش کے عالم میں جا کر عقبی سیٹ پر براجمان ہو گئی۔ نیرج نے گاڑی اسٹارٹ کی اور گاڑی

ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

گاڑی کی اسپیڈ دیکھ کر من موہنی چلائی۔ ''نیرج! بھگوان کے لیے سنبھل جاؤ۔ دیکھو کہیں کوئی ایکسیڈنٹ نہ ہو جائے۔''

اور نیرج اس کا بھیے اور خوف دیکھ کر زور زور سے ہنسنے لگا اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اس کی من موجی رنگ لائی۔ گاڑی ایک درخت سے ایسی ٹکرائی کہ نیرج آن اسپاٹ ہی موت کی گود میں جا سویا اور من موہنی خوش قسمتی سے بچ تو گئی لیکن چوٹیں اور خراشیں اتنی تھیں کہ اسے فوراً ایمبولینس سے نزدیکی اسپتال میں ایڈمٹ کرنا پڑا۔

''نیلا آکاش'' نے آج موت کا سیاہ لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ ساری خوشیاں بجھ گئیں۔ ہر دل رو رہا تھا۔ سب حزن و ملال کے پیکر بنے ہوئے تھے۔ ایسے میں جے پال نے سارے گھر کو سہارا دیا۔ پورے کٹم (خاندان) کے لیے اس نے رات دن ایک کر دیے۔ بوڑھی دادی جب اس کے کندھے پر سر رکھ کر روتی تو وہ اپنی راتوں کی نیندیں قربان کر کے اسے دلاسے تسلی دیتا۔ اپنے بوڑھے تاؤ جی اور تائی جی کے رستے زخموں پر مرہم لگا کر ان کی سیوا میں لگا رہتا۔ اپنی ماں روپالی کا سر گود میں رکھ کر سہلاتا اور پھر اسے تھپک تھپک کر سلانے کی کوشش کرتا۔ اپنے ننھیال جاتا تو نانا نانی اور خالہ خالو کا غم اس سے نہیں دیکھا جاتا۔ سب کے غموں کو بانٹتے بانٹتے وہ خود ادھ مرا ہو گیا تھا۔ آیا تھا وہ شادی میں شرکت کے لیے لیکن ماں اور دادی کے اصرار پر کچھ دن کے لیے رک گیا تھا اور پھر شادی کے بعد یہ اندوہناک حادثہ پیش آ گیا لیکن ایسے کٹھن وقت میں اس نے اپنے ہوش و حواس پر قابو رکھا جبکہ گھر کے دوسرے لوگ بری طرح بکھر گئے تھے۔

سب سے زیادہ اسے من موہنی کی چنتا تھی۔ من موہنی پر بار سنگھار اب حرام ہو گیا تھا۔ سفید لبادے میں لپٹی وہ مینٹل اسپتال میں داخل کر دی گئی تھی۔ جب اس کی حالت بہتر ہوئی تو وہ نیلا آکاش میں آئی ضرور لیکن اس کی ماں راجیشوری فوراً آ کر اسے اپنے ساتھ لے گئی کیونکہ وہ سب کے تیور دیکھ رہی تھی۔ وہ من موہنی جو چند دن پہلے سب کی آنکھوں کا تارا تھی، اب اس کے لیے ان ہی آنکھوں میں نفرت اور بیزاری تھی۔ انسان بھی موسم کی طرح بدل جاتے ہیں۔ لوگ اپنی کنواری لڑکیوں کو اس ابھاگن کے پاس بیٹھنے بھی نہیں دیتے تھے۔

من موہنی چونکہ اب جسمانی اور ذہنی طور پر نارمل ہو چکی تھی اس لیے وہ ہر بات کو بہ خوبی محسوس کر رہی تھی۔ خاص طور پر انورادھا نے تو اس پر نظر ڈالنا بھی گوارا نہیں کیا۔ نیلا دیوی نے بھی کینچلی بدل لی تھی۔ وہ بھی یہ سوچ رہی تھی کہ کاش وہ انورادھا کی بات مان لیتی تو نیرج ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتا۔

من موہنی کا اس ماحول میں بری طرح دل گھبرا رہا تھا۔ اسے ''نیلا آکاش'' میں سانس لینا بھی بھاری ہو رہا تھا۔ جونہی راجیشوری اسے لینے آئی، وہ فوراً تیار ہو گئی۔ روپالی نے بھی اسے نہیں روکا۔ وہ تیل بھی دیکھ رہی تھی اور اس کی دھار پر بھی نظر تھی۔ دل کا دھڑکا نئے خطرے کی گھنٹی بجا رہا تھا۔ سوچ سوچ کر اس کے ہاتھ پیر سنسنا رہے تھے۔ راجیشوری اور من موہنی کو رخصت کر کے وہ اپنے کمرے میں آئی۔ وہ کئی مخملی تکیوں کے سہارے آدھی لیٹی اور آدھی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ اپنے بیٹے جے پال کے متعلق سوچ رہی تھی۔ سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔

اچانک اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے سرہانے کوئی طوفان برپا ہوا ہو۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ جے پال طیش کے عالم میں کھڑا خونخوار آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ روپالی کا اندیشہ غلط نہیں تھا۔ جے کے ہونٹوں پر صرف ایک سوال تھا۔ وہ کٹیلے لہجے میں ماں سے پوچھ رہا تھا۔ ''مما! من موہنی کہاں ہے؟''

روپالی نے گول مول سا جواب دیا۔ ''جہاں سے آئی تھی، وہاں چلی گئی۔''

''کیا مطلب...... کیا پھر مینٹل اسپتال میں داخل کرا دیا؟''

''نہیں۔'' روپالی نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''وہاں اب بھگوان نہ لے جائے اسے۔ دراصل دیدی آئی تھی۔ وہ سب کی اجازت سے لے کر گئی ہے مگر تم اسے من موہنی کیوں کہتے ہو؟ وہ تم سے بڑی ہے۔ اس کا سمان (احترام) کیا کرو۔''

جے کی جھنجلاہٹ اپنے عروج پر تھی۔ من موہنی کو گھر میں نہ پا کر اس کے چہرے کی رنگت سرخ ہو گئی تھی۔ سارے جسم میں کھنچاؤ اور اکڑن پیدا ہو گئی تھی۔ اوپر سے روپالی کے سوال پر وہ اور بھڑک اٹھا۔ نہایت سرد مہری سے بولا۔ ''پہلے کسی زمانے میں، میں اسے دیدی کہا کرتا تھا پھر نیرج بھیا سے شادی کے بعد آپ نے ہی کہا تھا کہ اب تم اسے بھابی کہا کرو مگر یہ رشتہ ہم دونوں کو راس نہ آیا اس لیے میں نے سوچا کہ کوئی تیسرا راستہ اور رشتہ قائم کیا جائے اور وہ

رشتہ ہے پریم کا۔ مما! موہنی نے آج کل جو روپ دھارن کیا ہے، وہ مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ اجڑی بجڑی ویران آنکھیں، ملگجے سفید کپڑے، سونی مانگ۔ میں اس کی مانگ میں سیندور بھروں گا۔"

"جے! رک جاؤ...... اس سے آگے کچھ نہ کہنا۔" روپالی چیخی۔ اس کے لہجے میں شعلے بھڑک رہے تھے، ہونٹ کپکپا رہے تھے لیکن جے نے ماں کی حالت کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

"موہنی اب میرا جیون، میری آتما ہے۔ آج ہی میں دادی، تاؤجی اور پاپا سے بات کرتا ہوں۔"

"نہیں، نہیں جے! تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔" روپالی کی آنکھیں ساون بھادوں کا منظر پیش کررہی تھیں۔ وہ لجاجت آمیز لہجے میں بیٹے سے کہہ رہی تھی۔

"جے! مجھے کسی امتحان میں نہ ڈال۔ میرے بچے! ہماری برادری میں ودھوا کی شادی گھور پاپ ہے۔ بھگوان ہمیں نرک میں جھونکے گا۔ موہنی کو آئندہ دیدی کہہ کر بلانا۔ کبھی اسے میلی نظر سے نہیں دیکھنا۔"

جے نے ماں کی بات مکمل نہیں ہونے دی اور پیر پٹختا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ شام تک سارے گھر میں یہ بات گردش کررہی تھی کہ آنے والا وقت نئی کروٹ لینے والا ہے۔ گھر کے ملازمین بھی آپس میں سرگوشیاں کررہے تھے کہ دیکھیں "نیلا آکاش" کا یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

جے جو من مانی کرنا چاہ رہا تھا، گھر کے سارے افراد اس کے خلاف تھے لیکن انورادھا موافقت میں تھی بلکہ حمایتی بن کر جے کے ساتھ کھڑی تھی کہ اگر موہنی کی شادی نیرج سے ہوسکتی ہے تو جے سے بھی ہوسکتی ہے۔ رہی یہ بات کہ ودھوا کی شادی نہیں ہوسکتی تو یہ سب پرانی باتیں ہیں۔ اب تو گورنمنٹ کی طرف سے بھی پابندی لگ گئی ہے کہ کسی ودھوا کو آپ شادی سے نہیں روک سکتے پھر کیا آپتی ہے۔ جس طرح گورنمنٹ نے "ستی" کی رسم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے، اسی طرح اس رسم کو بھی ختم ہونا چاہیے تو پھر ہم اپنے گھر سے ہی شروعات کیوں نہ کریں۔

انورادھا اس وقت جے کی سب سے بڑی ہمدرد بنی ہوئی تھی۔ اس کی منوکامنا (دلی خواہش) یہی تھی کہ بجائے کسی کنواری کنیا کے، ودھوا استری سے جے کی شادی ہو۔

جے غصے میں پھنکارتا ہوا سوئم (خود) اپنی خالہ کے گھر پہنچ گیا۔ خالہ اور خالو کے سامنے بھی اس نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ راجیشوری کا پتی تو خاموش رہا لیکن راجیشوری نے مغلوب الغضب ہوکر بھانجے کو ایک زوردار طمانچہ مارا اور غصے سے کپکپاتے ہوئے کہا۔ "جے! مجھے بھی جینے دے اور اپنی ماں کو بھی جینے دے۔ ہمارے یہاں ودھوا کی شادی نہیں ہوتی۔ جو ہمارے ریتی رواج ہیں، ہمیں اس پر چلنا چاہیے۔"

جے اس وقت تو چلا آیا لیکن اب اس نے اپنا جال من موہنی کی جانب پھینکا۔ من موہنی جوان تھی، خوبصورت تھی، بغیر مرد کے زندگی گزارنے کا تصور ہی اس کے لیے سوہانِ روح تھا۔ دونوں کا ٹیلی فونک رابطہ تو پہلے ہی تھا لیکن اب مزید گہرا ہوگیا تھا۔ دونوں باہر گھومنے پھرنے بھی لگے تھے۔

"نیلا آکاش" اور راجیشوری کے گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ اسی اثنا میں رکھشا بندھن کا تہوار آگیا۔ ساری ہندو جاتی ہی اس تہوار کو بڑے جوش وجذبے سے مناتی ہے۔ راجیشوری، موہنی کو لے کر اس لیے آئی کہ وہ جے کو راکھی باندھے۔ جے کو سنہری موقع ہاتھ آیا۔ اس نے موہنی کا ہاتھ پکڑا اور راکھی کو پھینک کر ٹھوس اور مضبوط لہجے میں بولا۔

"دادی! یہ کوئی میری بہن نہیں ہے۔ آپ شادی کی آگیہ نہیں دیں گی تو ہم دونوں خود ہی کسی مندر میں جاکر اپنا لگن منڈپ سجالیں گے۔"

کمرے میں سب ہی جمع تھے۔ سب کو سانپ سونگھ گیا۔ بملا دیوی نے قہر آلود نظروں سے پوتے کو گھور کر دیکھا اور منہ پھیرلیا۔ راجیشوری اور روپالی نے بھی اپنے اپنے سر جھکالیے۔

جے منتظر تھا کہ دادی اسے کوئی جواب دیں گی لیکن انہوں نے بجائے پوتے سے مخاطب ہونے کے اپنے بڑے بیٹے کو کرارے لہجے میں حکم دیا۔ "یش پال! ذرا تو ہی سمجھا اس مورکھ کو۔ یہ ودھوا بھاوج سے بیاہ رچانا چاہتا ہے۔"

ماں کی بات سن کر یش پال کی آنکھیں سوچ میں ڈوب گئیں۔ اس نے سب پر طائرانہ نظر ڈالی اور پھر اپنی نشست سے اٹھ کر ماں کے قریب آبیٹھا اور مدھم آواز میں بولا۔ "ماں! جے کو کچھ کہنے سننے کے بجائے میں آپ تمام لوگوں سے یہ کہوں گا کہ جے کو اس شادی کی اجازت دے دی جائے۔ یہ اس کا ادھیکار ہے۔"

جے خوشی سے اچھل پڑا۔ من موہنی کا چہرہ بھی خوشی سے تمتما گیا جبکہ وہاں موجود سب لوگوں کے چہرے فق تھے۔ ہاں البتہ انورادھا کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک تھی۔

راجیشوری کا شوہر بھی اس شادی کے حق میں تھا اس لیے بات قریب قریب پکی تھی۔

مہی پال نے فوراً مٹھائی کا آرڈر دے کر بیٹے کی شادی کا چرچا کر دیا۔ اس رات راجیشوری اور من موہنی وہیں ٹھہر گئے کیونکہ دوسرے دن گھر میں پوجا تھی۔ پوجا میں طرح طرح کی مٹھائیاں تھیں۔ سب کھا بھی رہے تھے اور بانٹ بھی رہے تھے۔

آج روپالی نے اپنے میکے والوں کو بھی بلایا تھا۔ رمن کو بھی اس نے دل بھر کر مٹھائیاں کھانے کے لیے دیں۔ رمن نے اس مٹھائی پر بھی بڑا ہاتھ مارا جو جے کی منگنی کی خوشی میں تھال میں سجی رکھی تھی۔ وہ میٹھا کھانے کا بہت شوقین تھا اس لیے اس نے اپنی جیبیں بھی مٹھائی سے بھر لی تھیں۔ "نیلا آکاش" میں خوشیاں پھر سے لوٹ آئی تھیں لیکن راکھی کی رات گزرنے کے بعد دوسری صبح وہاں غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ سب کچھ اجڑ گیا۔ جے اور من موہنی اپنے اپنے کمروں میں مردہ پائے گئے تھے اور پولیس تفتیش جاری و ساری تھی۔ گھر کی فضا سوگوار اور المناک تھی۔ باری باری جو درگھٹنائیں اس گھر میں ہو رہی تھیں، اس نے سب کچھ ہلا کر زیر و زبر کر دیا تھا۔ پولیس کے لیے یہ کیس اس لیے چیلنج بن گیا تھا کہ لاکھ پوچھ گچھ کے بعد بھی کوئی سرا ہاتھ نہیں لگ رہا تھا۔

☆☆☆

انویسٹی گیشن آفیسر انوراگ پاٹیل اپنے آفس میں بیٹھا کچھ پرانی فائلوں کو کھنگال رہا تھا۔ وہ جاگتے ذہن کے ساتھ اپنے کام میں مصروف تھا۔ اچانک ایک نیلے رنگ کی فائل تلاش کر کے اسے دیکھنا شروع کیا جس پر لکھا تھا "مرڈر کیس ان ہوٹل ساگرمتی"۔ اس نے فوراً فائل کو کھول کر اسے پورے غور و خوض کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔ معاً اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ یوں لگتا تھا جیسے غیر متوقع طور پر اسے نشانِ منزل مل گیا ہو۔ اس نے فوراً اپنے اسسٹنٹ کمار ہنس راج کو کال کی۔ ہنس راج جونہی کمرے میں داخل ہوا، وہ فوری سمجھ گیا کہ انوراگ کو کوئی اہم سراغ ہاتھ لگ گیا ہے۔ کامیابی کی خوشی سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ ہنس راج نے نہ صرف محسوس کیا بلکہ اپنی زبان سے کہہ بھی دیا۔ "لگتا ہے سر! نیلا آکاش تک آپ کا ہاتھ پہنچ گیا ہے۔"

انوراگ نے توقف سے سپاٹ اور سرد لہجے میں کہا۔ "ہنس راج! یہ سمجھو گھور اندھکار میں دیے کی ایک لو ٹمٹمائی ہے۔ اس کے سہارے ہم آگے بڑھ رہے ہیں۔ میرا خیال اور دو چار غلط بھی ہو سکتا ہے اس لیے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ بہرحال ہمیں ابھی اسی وقت ہوٹل ساگرمتی چلنا ہوگا۔"

ہنس راج نے سیلیوٹ مارتے ہوئے کہا۔ "اوکے سر!"

دونوں سرکاری گاڑی میں اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور ڈرائیور برق رفتاری سے گاڑی کو دوڑا رہا تھا۔ ان دونوں کو گاڑی سے اترتے دیکھ کر ہوٹل کا سارا عملہ الرٹ ہو گیا۔ منیجر دوڑا دوڑا آیا اور دونوں کا سواگت کرتے ہوئے بولا۔ "سسواگتم سر (خوش آمدید جناب)۔ آپ کے درشن ہمارا سوبھاگیہ ہے۔"

انوراگ نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے ڈائریکٹ اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی اور مستحکم لہجے میں پوچھا۔ "آپ کے ہوٹل میں کچھ عرصہ پہلے روم نمبر 14 میں کینیڈا سے آئے ہوئے ایک شخص کی ہتیا کی گئی تھی، یاد ہے آپ کو؟"

منیجر نے اثباتی انداز میں کئی بار سر کو ہلایا اور بولا۔ "بہت اچھی طرح یاد ہے سر! بلکہ اس مرڈر کے بعد ہمارا بزنس ہیرو سے زیرو بن گیا۔"

انوراگ نے فوراً دوسرا سوال داغ دیا۔ "جب ہم پوچھ گچھ کر رہے تھے تو تمہارا ایک ملازم تھا، اویناش...... اس نے ہماری کافی مدد کی تھی۔ کیا وہ آج ڈیوٹی پر ہے؟"

منیجر نے اس بار بھی اثبات میں سر ہلایا اور فوراً ہی اویناش کو کال دی۔ ڈرا، سہا، خوفزدہ اویناش پسینے میں تربتر، ہانپتا کانپتا جب انوراگ کے سامنے آیا تو انوراگ اور ہنس راج دونوں ہنس پڑے۔

انوراگ نے انتہائی ملائمت سے اس کی پشت تھپتھپائی اور بولا۔ "اویناش! گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ہم پولیس والے ضرور ہیں لیکن ہمارے پاس بھی دردمند دل ہے۔ ہم قانون کے رکھوالے ہیں۔ لوگ بھلے ہی ہمیں کسی بھی نظر سے دیکھیں۔" پھر جلد ہی انوراگ نے اپنے مطلب کا وشئے (موضوع) چھیڑ دیا۔ اس نے نہایت گمبھیرتا سے سوال کیا۔ "جب کینیڈا کے رہواسی (رہنے والا) مسٹر موہن داس کا مرڈر ہوا تھا تو اس وقت تم نے بتایا تھا کہ اس سے ملنے اکثر ایک شخص آیا کرتا تھا۔ اس کا نام یاد ہے؟"

اویناش گہری سوچ میں ڈوب گیا اور بولا۔ "سوری سر! اس نے کبھی نام نہیں بتایا۔ نہ ہمیں، نہ منیجر صاحب کو۔"

"ہوں...... م...... م۔" انوراگ نے ایک طویل ہنکاری بھری اور پھر استفسار کیا۔ "کوئی خاص بات یاد ہے اس کے حوالے سے؟"

اوبناش نے جوش بھرے لہجے میں کہا۔ ”جی سر! ایک دن موہن داس اور وہ آدمی زینے سے اتر رہے تھے اور ہم ان کے پیچھے چل رہے تھے تو موہن داس نے کہا تھا۔ ”سیدھی طرح میری امانت مجھے نہیں لوٹائے گی تو میں نیلا آکاش تک پہنچ جاؤں گا۔“ یہ واکیہ (جملہ) مجھے آج تک یاد ہے۔“

انوراگ نے اپنے جوش اور جذبے کو دباتے ہوئے دبنگ لہجے میں کہا۔ ”تمہاری یہ بات مجھے بھی اچھی طرح یاد تھی اسی لیے میں یہاں دوڑا چلا آیا۔“ پھر لمحاتی توقف کے بعد انوراگ نے کہا۔ ”اوبناش! اب آخری سوال، سوچ سمجھ کر جواب دینا۔“

اوبناش کی سراسیمگی ختم ہو چکی تھی۔ وہ مکمل طور پر ریلیکس ہو چکا تھا۔ انوراگ نے سوال کیا۔ ”اس کا حلیہ بتا سکتے ہو جو موہن داس سے ملنے آتا تھا؟“

اوبناش نے پُریقین لہجے میں جواب دیا۔ ”جی...... جی سر! مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وہ قد کا ٹھگنا تھا، جسم کا اکہرا۔ عمر یہی کوئی چالیس پینتالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ چہرے پر چیچک کے داغ اور بال کھچڑی تھے۔ لگتا تھا کسی نچلی کاسٹ کا آدمی ہے لیکن تک سک سے اپنے آپ کو درست رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔“ یہ سب کچھ بتانے کے بعد اوبناش خاموش ہو گیا اور پھر چند لمحوں کا توقف کیا اور بولا۔ ”بس سر! اس سے زیادہ ہمیں کچھ نہیں پتا۔“

انوراگ نے پُرتشکر لہجے میں کہا۔ ”اوبناش! تھینکس۔ ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ اب یہ دونوں کیس ایک ساتھ ہی سولو ہو جائیں گے کیونکہ مجرم ایک ہی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے انوراگ نے ہنس راج کو وہاں سے نکلنے کا اشارہ کیا اور دونوں اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گئے۔

راستے میں انوراگ نے ہنس راج سے استفسار کیا اور بولا۔ ”ہنس راج! اوبناش نے جو حلیہ بتایا ہے، وہ یاد ہے؟“

”جی سر!“ ہنس راج نے جواب دیا۔

انوراگ نے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔ ”فوراً اس حلیے پر ایک پنسل اسکیچ بنواؤ۔ ہری اپ، دیر نہیں ہونی چاہیے۔“

ہنس راج نے پُرتجسس لہجے میں استفسار کیا۔ ”سر! کیا دونوں کیسز میں کوئی کنکشن ہے؟“

انوراگ نے تیقن آمیز لہجے میں جواب دیا۔ ”یقیناً ہوٹل ساگرمتی اور نیلا آکاش میں ہونے والی ہتیا کے بیچ ضرور کوئی ایسی کڑی ہے جو ہم کو دوشی (مجرم) تک پہنچا سکتی ہے۔ بس یہ سمجھو اب ہم درست دِشا (سمت) میں جا رہے ہیں۔“ اس کے لہجے میں امید کا عنصر نمایاں تھا۔

اوبناش کے بیان کردہ حلیے پر جب اسکیچ تیار کیا گیا اور انوراگ کی ٹیبل پر لایا گیا تو وہ مزید سوچ بچار میں پڑ گیا کیونکہ وہ چہرہ نہ صرف اس کے لیے بلکہ ہنس راج کے لیے بھی قطعی اجنبی تھا۔ انوراگ کی آنکھوں میں نراشا (مایوسی) اتر آئی۔ اس نے بجھے دل سے ہنس راج کو مخاطب کیا اور بولا۔

”ہنس راج! کہیں ہمارے تیر الٹے تو نہیں چل رہے کیونکہ نیلا آکاش میں اس وقت جتنے لوگ موجود تھے، اس میں یہ چہرہ مجھے کہیں بھی نظر نہیں آیا۔“

ہنس راج نے ایک بار پھر اسکیچ کو غور سے دیکھا اور بولا۔ ”سر! ملازم پیشہ شخص لگتا ہے۔ ایک بار پھر ہمیں سارے ملازمین کو چیک کرنا پڑے گا لیکن ایک پرابلم یہ ہے کہ ہتیارا ہوشیار اور چوکنا نہ ہو جائے۔ میرا ایک مشورہ یہ ہے کہ اس روز ہمارے ساتھ جو نفری گئی تھی، ان سے فرداً فرداً پوچھا جائے۔ ہو سکتا ہے کسی کی میموری میں اس کی تصویر چھپی ہوئی ہو۔“

”ٹھیک ہے، ایسا ہی کرلو۔ ہو سکتا ہے کوئی کلیو مل جائے۔“

یکے بعد دیگرے دیکھا تو سب نے لیکن شناسائی کی لہر سریندر نامی ایک سپاہی کی آنکھوں میں لہرائی اور اس نے جوشیلے لہجے میں کہا۔ ”سر! یہ تو رمن ہے۔“

انوراگ اور ہنس راج نے یک زبان ہو کر سوال کیا۔ ”کون رمن...... کیا تم اسے جانتے ہو؟“

سریندر نے پوری گرم جوشی کے ساتھ جواب دیا۔ ”ارے سر یہ کوئی میرا سگا سمبندھی یا سنگی ساتھی نہیں ہے۔ ہتیا والے دن نیلا آکاش میں یہ بھی موجود تھا۔ مجھے پیاس محسوس ہوئی تو اس نے مجھے پانی پلایا تھا تو اس کے ہاتھ تھرتھرا رہے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا تھا کہ ”بابا! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے، تم کہاں رہتے ہو اور تمہارا نام کیا ہے؟“ تو اس نے کہا تھا۔ ”میرا نام رمن ہے اور میں بڑی مالکن اور چھوٹی مالکن کے میکے میں کام کرتا ہوں۔“ یعنی وہ سیٹھ گردھاری لال جن کا گارمنٹس کا بہت بڑا کاروبار ہے، ان کا نوکر تھا۔ اپنی طبیعت کے متعلق اس نے یہ کہا تھا کہ ”آج جو یہ دو قتل ہوئے ہیں، یہ دونوں بچے اس کی گودوں کے کھلائے ہوئے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگا۔ اس کی حالت دیکھ کر میرا بھی دل بھر آیا کہ کتنا وفادار نوکر ہے جو مالکوں کے بچوں کے لیے رو رہا ہے۔ اسی لیے یہ مجھے

یاد بھی رہ گیا۔"

☆☆☆

دروازے پر دھڑ دھڑاہٹ کی آواز سن کر رمن نے ایک کریہہ آواز نکالی اور سر جھٹک کر شراب کا بڑا سا گھونٹ اپنے حلق میں اتارا۔ وہ کافی دیر سے اپنے اس شغل میں منہمک تھا۔ جب دوبارہ دروازہ دھڑ دھڑایا گیا تو وہ جھومتا جھامتا اٹھا۔ سامنے ہی پولیس والوں کو دیکھ کر اس کا سارا نشہ ہرن ہوگیا، رگوں میں خون کی جگہ ہیجان دوڑنے لگا، آنکھوں میں وحشت امڈ آئی۔ اس کے پیر لڑکھڑائے، سنبھلنے کی کوشش کی لیکن قدموں میں سہار نہیں تھی۔ شدید خطرے کا احساس اسے ہو چکا تھا۔ بغیر کسی پس و پیش کے اس نے خود ہی اپنے دونوں ہاتھ پیش کر دیے۔ ہتھکڑی پہنا کر پولیس کے ایک سپاہی نے اسے زوردار دھکا لگایا اور رمن اوندھے منہ سرکاری گاڑی میں جا گرا۔ آنکھیں کھول کر اس نے کراہتی ہوئی آواز میں کہا۔

"بھگوان کے لیے مجھ پر دیا کرو۔" اس نے ترحم آمیز نظروں سے پولیس والوں کی طرف دیکھا۔

ایک سپاہی نے اپنے سخت بوٹ سے اسے ایک ٹھوکر ماری اور کھردرے لہجے میں بولا۔ "ادئے چپ ہو جا ورنہ زبان کھینچ کر ہاتھ میں دے دوں گا۔"

رمن نے اس کے بعد ان سے کوئی بنتی، کوئی التجا نہیں کی۔ گرنے کی وجہ سے نکسیر پھوٹ گئی تھی اور اس میں بری طرح ٹیس اٹھ رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی جان نکل رہی ہو۔ اب اس کی ناک پر بینڈ ایج چپکی ہوئی تھی۔ ایک آنکھ سوجی ہوئی تھی اور اس کے نیچے نیل تھا۔

اسی حالت میں انویسٹی گیشن روم میں انوراگ اور ہنس راج کے روبرو اس کی پیشی ہوئی تب بھی اس کے ہونٹ سلے ہوئے تھے۔ پولیس کے سخت رویّے اور جارحانہ پوچھ گچھ کا اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا تھا۔

اچانک انوراگ نے غصے اور جوش کے ساتھ اس کا پنجہ اپنے ہاتھ میں لے کر اس طرح مروڑا کہ وہ شدتِ کرب سے چیخنے لگا۔ شدید زور آزمائی کی وجہ سے وہ بے ساختہ چیخ پڑا اور چلا کر بولا۔ "بتاتا ہوں، بتاتا ہوں۔ بھگوان کے لیے اب مجھے نہ مارنا۔"

ہنس راج گھونسا بنا کر اس کی ٹھوڑی پر مارنے ہی والا تھا لیکن انوراگ کے اشارے پر اس نے فوراً اپنا ہاتھ روک لیا۔ رمن کی خاموشی کا خول ٹوٹ گیا تھا۔ اس کے ہونٹ پھڑ پھڑائے اور اس نے بولنا شروع کیا۔ دل کا سارا جوار بھاٹا شبدوں میں ڈھلنے لگا۔

"میں اور میرے پروج (آباؤاجداد) سیٹھ گردھاری لال کے پریوار سے ہمیشہ سے جڑے رہے۔ میرے ماں باپ بھی گردھاری لال کے یہاں چاکری کرتے تھے۔ گردھاری لال کا بڑا کاروبار تھا اس لیے نوکر چاکر بھی تھوک کے حساب سے تھے۔ موہن کا باپ کیدار ناتھ بھی مالی کے طور پر کوٹھی میں کام کرتا تھا۔ موہن، میں، راجیشوری اور روپالی، ہم چاروں ساتھ میں کھیلتے، ہنستے بولتے اور اپنا وقت بتاتے۔ پتا ہی نہیں چلا کب بچپن، لڑکپن خاموشی سے پھسل گیا اور جوانی آگئی۔ سنگ مرمر سے تراشی ہوئی وہ حسین گڑیا روپالی اب اور بھی سندر ہوگئی تھی۔ مجھے اپنی حقیقت پتا تھی کہ میں اس گھر کا منگتا ہوں اور وہ راج سنگھاسن پر بیٹھی ہوئی راج کماری ہے لیکن دل مانتا ہی نہیں تھا۔ میں جاگتے میں بھی اس کے سپنے دیکھتا رہتا۔ اب مجھے اپنے آپ پر قابو نہیں رہا تھا۔ میں اپنی یکطرفہ پریم کہانی اپنے متر موہن کو سنا کر اسے اپنا رازدار بنانا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے موہن نے مجھ پر یہ انکشاف کیا کہ وہ اور روپالی ایک دوسرے کے پریم میں اس قدر ڈوب چکے ہیں کہ ان دونوں میں کوئی بھید بھاؤ، کوئی انتر نہیں رہا۔ یہ سب جان کر مجھ پر بجلی گر پڑی۔ دکھاوے کے لیے تو میں ان دونوں کا ہمدرد اور ہمراز بن گیا لیکن من ہی من میں ان کا سب سے بڑا شترو تھا۔ ان دونوں کی لو اسٹوری سے مجھے جو دھچکا لگا تھا اس نے میرے جیون کو بے رنگ اور بے مزہ کر دیا تھا۔ روپالی جب اسکول یا کالج جانے کے لیے نکلتی تو میں موہن کے کان میں پھسپھساتا کہ موہن! تیرے حصے کا سارا کام میں کر دوں گا۔ جا اپنی پریمیکا سے ملاقات کرلے۔ تیرے دل کو قرار آجائے گا۔ موہن کا ہردے گدگدا اٹھتا۔ وہ بھینچ کر مجھے گلے لگا لیتا کہ رمن! تیرا یہ اپکار میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ روپالی بھی میری آبھاری (احسان مند) ہوتی۔

"ایک دفعہ میں نے چور سے کہا چوری کر اور شاہ سے کہا ہوشیار رہ۔ سیٹھ اور سیٹھانی کو وہاں پہنچا دیا جہاں دونوں کا لگن منڈپ سجا ہوا تھا۔ دونوں رنگے ہاتھ پکڑے گئے۔ موہن اور اس کے کٹم قبیلے کو تو اسی وقت سرونٹ کوارٹر خالی کرنے کی چتاؤنی دے دی گئی۔ اب موہن، روپالی کی زندگی سے نکل گیا تھا۔ میرے سارے شریر میں خوشی دوڑ گئی۔ وہ رات میرے لیے بڑی کٹھن تھی جب روپالی کے ماں باپ کو اس بات کی سوچنا (خبر) ملی کہ روپالی گربھوتی (حاملہ) ہے۔ سیٹھانی نے مار مار کر روپالی کا بھرتا بنا دیا۔

اس کی چیخیں پاتال سے نکل کر آکاش کے کناروں کو چھو رہی تھیں۔ میرا دل اس رات بہت رویا لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ روپالی پر زور دیا جارہا تھا کہ وہ ابارشن کروالے لیکن روپالی اس کے لیے تیار نہیں تھی کیونکہ اس نے موہن سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کے بچے کو نو مہینے پیٹ میں رکھ کر اسے جنم دے گی چاہے اس کے لیے اسے نرک (دوزخ) سے کیوں نہ گزرنا پڑے۔ بالآخر تھک ہار کر سیٹھانی نے دماغ لڑا کر ایک تیر سے دو شکار کیے۔

''جب یہ گھٹنا گھٹی گئی (جب یہ واقعہ رونما ہوا) اس سے دو سال پہلے راجیشوری کی شادی ہوچکی تھی لیکن ابھی تک اس کے یہاں کوئی اولاد نہیں تھی اور اس کا پتا دوسرے بیاہ کے لیے پر تول رہا تھا۔ سیٹھانی نے علاج کے بہانے راجیشوری اور اس کے پتی کو ساتھ لیا اور روپالی کے لیے یہ بہانہ کیا کہ اس نے ابھی تک دلی شہر نہیں دیکھا ہے۔ یہ بھی گھوم پھر لے گی اور ان سب کی سیوا اور خدمت کے لیے مجھے چنا گیا۔ جس طرح میں روپالی اور موہن کا ہمراز تھا، اسی طرح سیٹھانی اور راجیشوری بھی آنکھیں بند کر کے مجھ پر بھروسا کرتی تھیں۔ دہلی کے ایک حکیم صاحب کے پاس راجیشوری اور اس کے پتی اوتار سنگھ کو لے جاکر علاج کا ڈراما کیا اور پھر کچھ دنوں بعد اوتار سنگھ سے کہا کہ تمہارا کاروبار نوکروں کے بھروسے ہے، وہ کہیں تمہیں کوئی دھکا نہ پہنچائیں۔ تم جاکر اپنا بزنس سنبھالو۔ حکیم صاحب پورے وشواس سے کہہ رہے ہیں کہ یہ علاج ضرور سپھل ہوگا اور اوتار سنگھ اور راجیشوری کے آنگن میں بہت جلد ہنستا بولتا کھلونا آجائے گا۔ اوتار سنگھ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ مطمئن ہوکر اپنے گھر واپس لوٹ گیا۔ سیٹھانی نے اسپتال میں ڈلیوری کے سمے روپالی کی جگہ راجیشوری کا نام لکھوایا۔ اس طرح روپالی کی بیٹی سنسار میں آتے ہی راجیشوری کی گود میں چلی آئی۔

''روپالی بہت چیخی چلائی لیکن سیٹھانی نے اس کی ایک نہیں چلنے دی۔ روپالی نے اپنی بچی کا نام من موہنی رکھا کیونکہ موہن نے اس سے وچن لیا تھا کہ لڑکا ہو یا لڑکی، نام اس کے اپنے نام پر ہی رکھا جائے گا۔ سیٹھانی اور راجیشوری نے بھی اس سے اپنا منہ سی لیا کیونکہ روپالی کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اسے اب مزید کوئی مانسک یا شاریرک (ذہنی یا جسمانی) شاک دیا جائے۔ جب سب خوشی خوشی اپنے شہر لوٹے تو اوتار سنگھ اور اس کے پریوار نے ان کا ایسا بھرپور سواگت کیا کہ سارا شہر چکت رہ گیا۔ اوتار سنگھ تو بچی کو دیکھ کر پاگل ہوگیا۔ بچی تھی بھی بہت سندر اور گلاب کے پھول کی طرح نرم و نازک۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ موہن بھی بہت گورا چٹا اور ہینڈسم تھا اسی لیے روپالی کا دل اس پر آیا تھا۔ اس کے مقابلے میں، میں بہت بدصورت تھا بلکہ میرے چیچک زدہ چہرے کو دیکھ کر اکثر دونوں مجھے نقشی کٹورا کہتے تھے۔ میں نے ہر چھوٹی بڑی بات اپنے دل پر لکھ لی تھی اور گن گن کر بدلے لے رہا تھا جبکہ وہ سارا پریوار یہ سمجھتا تھا کہ میں ان کا بھلا چاہنے والا ہوں۔ ادھر میں خاموشی کے ساتھ موہن سے بھی رابطے میں تھا۔ موہن مجھ سے پل پل کی خبر لیتا۔ وہ ابھی تک روپالی کو نہیں بھول پایا تھا اور من موہنی کو دیکھنے کے لیے تو وہ رات دن تڑپ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنی بیٹی کے لیے دھن دولت کا پہاڑ کھڑا کردے اور اپنی یہ ابھیلاشا اس نے اس طرح پوری کی کہ وہ باہر چلا گیا اور وہاں وہ ایک اسمگلنگ کرنے والے گروہ میں شامل ہوگیا۔ وہ دن رات نوٹ چھاپتا رہا۔ مجھے وہ سب کچھ بتاتا تھا۔

''ادھر ان ہی دنوں سیٹھ مہی پال کا رشتہ روپالی کے لیے آیا تو سیٹھ گردھاری لال اور سیٹھانی اُما دیوی کی خوشی کا ٹھکانا نہیں رہا حالانکہ اس وقت بھی روپالی جل بن مچھلی کی طرح تڑپتی رہی لیکن کسی نے اس کی آہ و بکا نہیں سنی اور یوں وہ بیاہ کر ''نیلا آکاش'' کی بہو بن گئی لیکن وہاں رہ کر بھی وہ اپنی بیٹی کے لیے تڑپتی تھی۔ سیٹھانی اور راجیشوری نہیں چاہتے تھے کہ من موہنی اس کے قریب رہے۔ چور کا دل بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ دونوں کو خطرہ تھا کہ یہ بھینکر رہس (خوفناک راز) کھل نہ جائے لیکن خون کا اثر تھا کہ بچی راجیشوری سے زیادہ روپالی سے مانوس تھی۔ روپالی بہانے بہانے سے کبھی ماں کے گھر، کبھی راجیشوری کے گھر بچی کو دیکھنے پہنچ جاتی لیکن جب اس نے جے کو جنم دیا تب سیٹھانی اور راجیشوری کے دلوں کو سکون ملا کہ اب یہ اپنے بیٹے کے پالن پوشن میں لگ جائے گی اور ہوا بھی یہی لیکن جب من موہنی نے جوانی میں قدم رکھا تو اس کی ممتا پھر پھڑپھڑانے لگی اور اس نے مجھ سے مشورہ مانگا کہ ''رمن! تم سے ہمارے پریوار کا کوئی راز چھپا نہیں ہے۔ کوئی ایسی دھانسو قسم کی ترکیب یا اُپائے بتاؤ کہ میری بیٹی ہمیشہ میرے سامنے رہ سکے۔'' میں نے اسے یہ ترکیب بتائی کہ وہ من موہنی کی ملاقات اپنے جیٹھ کے بیٹے نیرج سے کروادے پھر دیکھ تیرا سارا سسرال ہاتھوں ہاتھ تیری بیٹی کو پھولوں کی ڈولی میں بٹھا کر لے جائے گا اور میری بتائی ہوئی یہ ترکیب ایسی کارگر ہوئی کہ ہینگ لگی نہ پھٹکری، رنگ بھی چوکھا آگیا۔

''اسی دوران موہن روپے پیسے اور دولت سے لدا پھندا ودیش سے چلا آیا اور ہوٹل راج دھانی میں آکر ٹھہرا اور فون کر کے مجھے بلایا۔ اس کی خواہش تھی کہ روپالی اس سے آکر ملے لیکن روپالی کے کانوں تک میں نے یہ خبر ہی نہیں پہنچائی پھر اس نے اپنی بیٹی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ میرے دل میں چھل کپٹ اور لالسا نے بسیرا کر لیا تھا۔ میں نے جھوٹ کا سہارا لیا اور اسے بتایا کہ روپالی کہہ رہی ہے کہ اب وہ اور اس کی بیٹی ''نیلا آکاش'' کی بہوئیں ہیں اس لیے اس سے ملاقات نہیں کر سکتیں۔ اس روز موہن بہت رویا، بہت تڑپا۔ جو وہ کما کر لایا تھا، اس میں سے کافی کچھ مجھے دے کر کہا کہ یہ ایک قسط ہے جو میں تمہیں دے رہا ہوں۔ مزید اور دوں گا۔ بس مجھے میری بیٹی سے ملوا دو۔ میں اسے کچھ دینا چاہتا ہوں۔ میں نے سب کچھ ہتھیا کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

''میرا انتقام ابھی ادھورا تھا۔ موہن کے بعد روپالی میرا شکار ہوتی اور پھر اس کی بیٹی اور بیٹی کو میں سموچا (مکمل) نگلنا چاہتا تھا لیکن کوئی موقع ہاتھ نہیں آرہا تھا۔ اب میرے پاس موہن کے لائے ہوئے پیسے کی گرمی تھی۔ میں نے ہوٹل ساگر متی میں موہن کی ہتیا کر کے اس کی ساری جمع پونجی اپنے قبضے میں کر لی تھی۔ اسی پیسے سے میں نے ہوٹل نٹ راج تک رسائی حاصل کی اور بار میں جا کر نیرج کی من پسند شراب میں ایسا کیمیکل ملایا کہ وہ نیرج کے دماغ پر چڑھ گئی۔ جس روز نیرج کی ارتھی اٹھی، مجھے یوں لگا میرا مشن پورا ہو گیا لیکن اس جگہ ایک ایسا موڑ آیا کہ میں اچنبھت رہ گیا۔ جب میں نے سنا کہ جے، روپالی کا بیٹا موہنی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ میں دل ہی دل میں خوب ہنسا کہ او پروا لے تیری بھی خوب لیلا ہے۔ دونوں ایک ہی عورت کے پیٹ سے جنمے تھے، باپ بھلے ہی الگ الگ تھے لیکن ماں تو ایک تھی۔ گردھاری سیٹھ کی پتنی اور ان کی دونوں بیٹیوں راجیشوری اور روپالی کے چہرے دیکھنے کے قابل تھے۔ اپنے طور پر ان لوگوں نے سر توڑ کوشش کی کہ دونوں مان جائیں۔ چونکہ دونوں کو اصلیت کا کچھ پتا ہی نہیں تھا اس لیے وہ پریمی اور پریمیکا بنے ہوئے تھے۔

''تینوں ماں بیٹیوں نے رکھشا بندھن کے تہوار پر من موہنی کو خوب مکھن لگایا کہ وہ۔ جے کا خیال دل سے نکال دے۔ اسے ایک سے ایک ور مل سکتا ہے۔ وہ جے کے گلے میں ور مالا ڈالے گی تو یہ مہا پاپ ہوگا۔ ہاں اس کے ہاتھ پر راکھی باندھ کر جب تو اسے اپنا بھائی سویکار کرلے گی تو آکاش کے سارے دیوی دیوتا پرسن ہو کر تجھے آشیرواد دیں گے۔ من موہنی ٹکر ٹکر کبھی نانی کو، کبھی ماں کو اور کبھی خالہ کو دیکھنے لگتی۔ وہ کوئی نرنئے نہیں لے پا رہی تھی۔ جیسے ہی وہ لوگ ''نیلا آکاش'' میں داخل ہوئے، جے نے اس کی صورت دیکھتے ہی بھانپ لیا کہ وہ انڈر پریشر ہے۔ جے نے ہمت کر کے اس کا ہاتھ پکڑا اور دادی سے اس سے دو ٹوک بات کی۔ جے کے تاؤ جی سیٹھ یش پال نے جے کا بھرپور ساتھ دیا۔ جے اور من موہنی پھر سے جی اٹھے مگر ان تینوں ماں بیٹیوں کو سانپ سونگھ گیا کیونکہ جو گھر کا بڑا تھا اس نے ہی فیصلہ سنا دیا تھا۔ تینوں ماں بیٹیوں کی میٹنگ ہوئی۔ گردھاری لال کی پتنی اور راجیشوری نے بہت سوچ بچار کے بعد اس سمسیا (مسئلے) کا یہ حل نکالا کہ جے اور من موہنی کو اس سنسار سے بدا (وداع) کرنا بہت ضروری ہے۔ اگر ان دونوں کی ارتھی نہیں اٹھی تو ہم اس گھور پاپ کا بوجھ نہیں برداشت کر سکیں گے۔ ان دونوں کی مرتیو ہی ہمیں جیون پردان کر سکتی ہے۔ روپالی انگاروں پر لوٹنے لگی۔ وہ ماں اور بہن کے پیروں میں گر گر کر اپنے دونوں بچوں کی زندگی کی بھیک مانگنے لگی لیکن سیٹھانی اور راجیشوری نے مجھے اشارہ دے دیا کہ دونوں کا کام تمام کر دیا جائے اور پھر میں مٹھائی پرساد کی تھالی میں رکھ کر لے گیا۔ مٹھائی میں ایک سریع الاثر زہر میں پہلے ہی ملا چکا تھا۔ ''نیلا آکاش'' میں اس سمے سناٹا تھا۔ جب میں ان دونوں کے کمروں میں گیا۔ جے جیسے گبرو نوجوان اور من موہنی جیسی سندرتا کی مورت کو زہر دیتے ہوئے مجھے تھوڑا سا دکھ تو ہوا پھر میں نے سوچا کہ یہ اس پستک کا آخری چیپٹر ہے۔ میرا اپمان کرنے والے، مجھے دکھ پہنچانے والوں کا اب کوئی نام لیوا نہیں رہے گا۔''

یہ کہہ کر وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ ایک وحشت انگیز اور جنونی ہنسی۔ انویسٹی گیٹر انوراگ پاٹیل آنکھیں پھاڑے حیران کن نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ باقی لوگ بھی بت بنے رمن کو دیکھ رہے تھے اور رمن کی ہنسی اب خوفناک قہقہوں میں تبدیل ہو گئی تھی۔

اسی وقت انوراگ کے موبائل پر رنگ ٹون ہوئی۔ تھانے کے ایک سپاہی نے یہ سنسنی خیز خبر دی کہ مسز روپالی مہی پال نے خودکشی کر لی ہے۔ انوراگ نے ایک طویل سرد آہ کھینچی اور اٹھ کھڑا ہوا جبکہ رمن کے قہقہے اب آنسوؤں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ وہ منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

⌘⌘⌘

جنگباز

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط 24

مقدر کا عروج ہو یا نصیب کا زوال... جانے کن خاموش لمحوں میں زندگی میں شامل ہو جاتے ہیں... لیکن کچھ لوگ تقدیر سے زیادہ تدبیر پر بھروسا کرتے ہیں... وہ جو حالات کی زنجیر میں قید بوسیدہ در و دیوار تک محدود تھا تمام تر معصومیت کے ساتھ شب و روز کی ہنگامہ خیزیوں میں مصروف تھا کہ اچانک حرص و طمع اور لالچ کے مارے... چہروں پر شرفا کا نقاب ڈالے عیرت و مکر کے تمام حربے آزمانے اس کے راستے میں چلے آئے... وہ جو رنگین شاموں... سنگین ہنگاموں اور تحیر انگیز چالوں سے ناآشنا تھا... ایسا بازی گر بن گیا کہ تمام پردہ داروں کی ڈوریاں الجھ کر رہ گئیں... اس کے ذہن میں قید ناآسودہ خواہشوں کا بھنور اسے کسی کل چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ تقدیر کے سہارے چلنے والا... کچھ اس انداز سے تدبیروں سے اپنی کایا پلٹتا چلا گیا کہ چال بازوں کی تمام چالیں لڑکھڑا گئیں۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم

زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

روشنیوں کا شہر کراچی...... اس نے جانے کتنے لوگوں کو اپنے دامن میں ماں کی طرح سمیٹ رکھا ہے، ان گنت داستانوں کی امین اس مہربان گود کے کسی کونے میں سہراب خان یعنی میں بھی رہتا ہوں جو ایک غریب محلے میں محبت کرنے والی ماں اور ایک سخت گیر طبیعت کے حامل باپ کا ایسا ناخلف بیٹا بھی تھا جو ہر وقت باپ کی بے جا مار پیٹ کا نشانہ بنتا رہتا۔ میری ایک بہن بھی تھی راحیلہ، مگر نہیں، بعد میں مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ میری بہن نہیں تھی، خالہ زاد تھی۔ بچپن میں اس کے ماں باپ ایک ناگہانی حادثے میں مر چکے تھے اور ماں نے اسے میرے ساتھ ہی پال پوس کر جوان کیا تھا۔ یہ راز صرف میری ماں اور راحیلہ کو پتا تھا۔ میں تو راحیلہ کو بچپن سے ہی سگی بہن سمجھا کرتا تھا مگر وہ بچپن سے ہی مجھے ایک بھائی کی نہیں بلکہ کسی اور ہی ''نگاہ'' سے دیکھا کرتی۔ ماں میری شادی اس سے کروانا چاہتی تھی لیکن یہ حقیقت آشکار ہونے کے باوجود بھی میرے اس جذبے میں کوئی فرق نہ آیا۔ میں اب بھی اسے ایک ''بہن'' کے ہی روپ میں دیکھتا تھا۔ راحیلہ نے میرے اس برتاؤ پر برا منایا مگر میں اسے بری طرح جھڑک دیتا۔ میرا باپ، ماں کو مارا پیٹا کرتا تھا۔ ایک دن ماں کو اس نے گہرا زخم دیا تو میں برداشت نہ کر پایا اور باپ کے سامنے سینہ تانے کھڑا ہو گیا۔ باپ کا یہ دیکھ کر بلڈ پریشر بڑھ گیا اور اس کی دماغ کی رگ پھٹ گئی۔ وہ جہان سے کوچ کر گیا تو گھر میں سکون ہوا۔ پتا چلا کہ اصل نحوست غربت کی نہیں بلکہ ایک غصہ ور شخص کی روز روز کی دانتا کل کل کی تھی۔ غربت اور باپ کی سخت گیر طبیعت نے مجھے ایک حد تک جرائم کی طرف لڑھکا ضرور دیا تھا مگر چونکہ شاید میری رگوں میں ''نسلی'' خون دوڑ رہا تھا اسی لیے میں جلد ہی سنبھل گیا مگر اس ''سنبھلنے'' کی مجھے بڑی قیمت چکانا پڑی۔ میں اور میرا باپ ایک فیکٹری میں معمولی ورکر تھے۔ گلی کے محلے میں ہی تین ہم عمر لڑکے میرے یار کہلائے۔ ایک کا نام سلیم، دوسرے کا راجو اور تیسرا ماجد تھا۔ ماجد کی جوان بہن فوزیہ میری پہلی اور آخری محبت ٹھہری۔ ہم چاروں جرائم پیشہ گروہ کے آلہ کار بن گئے۔ اقبال نامی ادھیڑ عمر شخص ہمارا ''باس'' کہلایا۔ اس کا نائب سجاد بیگ تھا۔ اسی گروہ نے ہم چار یاروں (سلیم، راجو، ماجد اور مجھے) ایک روز آنکھوں پر پٹی باندھ کر کسی نامعلوم مقام پر پہنچا دیا جہاں ہمیں لڑائی بھڑائی کی خصوصی ٹریننگ دی گئی۔ میں جسامت کے لحاظ سے چھریرا، لمبا اور مضبوط کاٹھی کا تھا۔ سلیم مناسب قدو قامت کا جبکہ راجو اور ماجد قدرے گھٹی ہوئی جسامت کے مالک تھے۔ گروہ نے ہمارے ناموں کے ساتھ عجیب و غریب قسم کے ''لاحقے'' نتھی کر ڈالے۔ میں سہراب لمبو کہلایا۔ سلیم کے ساتھ ''چھالیا'' نتھی ہو گیا۔ راجو ''بوری'' ہو گیا جبکہ ماجد ''ماجا''۔ گروہ دیگر جرائم کے ساتھ بھتا خوری بھی کرتا تھا۔ ہمارے فیکٹری مالک سیٹھ سکندر سے بھتا لینے کے لیے ''باس'' اقبال نے ہمیں استعمال کیا۔ میری غیرت جاگی۔ میں نے سلیم وغیرہ کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ میرے ہی دشمن ہو گئے، تاہم میں نے سیٹھ سکندر کے ساتھ نمک حلال کیا اور اسے سب باتیں بتا دیں کہ بھتا نہ دینے کی صورت میں اس کی فیکٹری کو بم سے اڑا دینے کی دھمکی دی گئی ہے۔ میں نے بروقت بم کی اطلاع دے کر جہاں سیکڑوں غریب ورکروں کی جان بچالی، وہیں سیٹھ سکندر کو بھی بھاری مالی اور جانی نقصان سے بچالیا۔ گروہ سمیت میرے تینوں یار میری جان کے دشمن ہو گئے۔ سیٹھ سکندر کی جواں سال خوب صورت بیٹی سدرہ میری ''نمک حلالی'' سے متاثر ہوئی۔ سیٹھ سکندر تو تھا ہی میرا معترف۔ عقدہ کھلا کہ سدرہ کا ماموں یعنی سیٹھ سکندر کا سالا، سجاد بیگ ہی جرائم پیشہ گروہ کے باس اقبال کا نائب ہے۔ بعد میں اس راز سے بھی پردہ ہٹا کہ وہ سدرہ کی ماں کا سوتیلا بھائی تھا۔ وہ بھائیوں والی محبت جتا کر سوتیلی بہن کا سب کچھ ہتھیانا چاہتا تھا اور اپنے گروہ کو بھی مالی فائدہ پہنچانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے اس کی پلاننگ آشکار کر دی۔ وقت تیزی سے بدلا۔ ماں مر گئی۔ ماجد عرف ماجے کے قتل کا الزام مجھ پر لگا۔ فوزیہ مجھ سے متنفر نہ ہوئی تھی کیونکہ بعد میں راحیلہ نے اسے حقیقت بتا ڈالی تھی۔ میں لاک اپ ہوا۔ اسی دوران کوئی ''چھوٹا خان'' نامی اجنبی میری مدد کو آیا۔ اندازہ ہوا کہ یہ گروہ کا کوئی مخالف تھا۔ اس کی مدد سے میں نے کسی طرح قانون سے رہائی پائی۔ باس اقبال، سلیم چھالیا اور راجو بوری میرے خون کی بُو سونگھتے پھر رہے تھے۔ میں راحیلہ اور فوزیہ کو لے کر کراچی سے سیالکوٹ ہجرت کرنے لگا۔ وہاں سدرہ کا کوئی مکان خالی پڑا تھا۔ ادھر سدرہ کو اپنے نام نہاد ماموں سجاد بیگ سے بھی جان کا خطرہ تھا۔ سیٹھ سکندر کے دو وفادار محمود قریشی اور مشتاق بھی تھے۔ ٹرین کراچی سے پنجاب کے لیے روانہ ہوئی اور صادق آباد میں فوزیہ اور راحیلہ سے بچھڑ کر میں بااثر ''چودھری جی برادران'' کے نرغے میں چلا گیا۔ وہاں بھولے سے میری عجیب حال میں ملاقات ہوئی۔ اس کی منگ سے چودھری شالا جی نے زبردستی شادی کر لی تھی۔ اس کا نام نادو تھا۔ ہم تینوں فرار اختیار کر گئے۔ راستے میں پولیس اور چودھری جی برادران کے حواریوں سے مقابلے میں بھولا مارا گیا۔ نادو میری ذمے داری بن گئی۔ وہ ایک عجیب لڑکی تھی۔ اسے درحقیقت کسی اور سے محبت تھی۔ اس کا نام بختیار تھا۔ بختیار راجن پور میں رہتا تھا۔ فوزیہ اور راحیلہ کو بھی میں نے کسی طرح تلاش کر لیا۔ سیالکوٹ میں ایک ماں بیٹی سے میری شناسائی ہوئی۔ وہ محلے دار تھیں۔ لڑکی نگہت اور ماں شگفتہ خاتون۔ نگہت کسی وسیم نامی لڑکے سے محبت کرتی تھی۔ دونوں فائٹنگ کلب کے ممبر بھی تھے۔ عقدہ کھلا کہ شگفتہ، باس اقبال کی منکوحہ تھی اور نگہت بیٹی مگر شوہر کی مجرمانہ زندگی سے تنگ آ کر شگفتہ اپنی بیٹی نگہت کے ساتھ کراچی سے سیالکوٹ اپنے ماں باپ والے گھر میں آن بسی تھی۔ اس کی الگ کہانی تھی۔ فائٹنگ کلب کا ایک ماسٹر عرف استاد جوجی میرا دوست بن گیا۔ نگہت اب بھی باپ (اقبال) سے ملاقات کرتی تھی۔ سیالکوٹ میں اقبال چوک پر اس کے باپ یعنی باس کا بنگلا تھا۔ وہاں دو چوکیدار اور ملازم ارشد وغیرہ تھے۔ ایک خفیہ گروہ ''کالی لہر'' سے میرا ٹاکرا ہو گیا۔ یہ جادو ٹونے کرنے والا گروہ

تھا۔ عدیل جو کہ جگنو نامی شخص کا بھائی تھا ان کے ہاتھوں مارا گیا۔ جگنو ایک بڑی سیاسی شخصیت کا آلۂ کار تھا۔ وہ میرا دشمن اور بعد میں دوست بن گیا۔ کالی لہر کے رانگا بابا اور میڈم بچھی سے میری دشمنی عروج پر تھی اور ان کے میرے خلاف جادو ٹونے بھی۔ میرا دشمن باس اقبال بھی ان کی جادوئی ہانڈیوں کی زد میں آ کر اسپتال پہنچ گیا۔ اس کی بیٹی نگہت میری دشمن بن گئی جبکہ اس کی ماں شگفتہ خاتون مجھے بھائی سمجھتی تھی۔ اب میری بیک وقت جنگ بازی...... باس اقبال کے نائب سجاد بیگ، چودھری جی برادران اور کالی لہر والوں کے ساتھ جاری تھی۔ میں راحیلہ کا پیچھا کرتے ہوئے رانگا بابا کے ٹھکانے پر پہنچ گیا اور اسے اٹھا کر فارم ہاؤس لے آیا۔ رانگا نے منتر پڑھنا شروع کر دیے اور اچانک وہاں ہانڈیوں کی بارش ہونے لگی۔ مجھے سر پر کچھ مار کر بے ہوش کر دیا گیا اور جب ہوش آیا تو وہ لوگ باور کرانے لگے کہ میں مر چکا ہوں اور میری روح ان کے قبضے میں ہے۔ عجیب عجیب شعبدہ بازیاں دکھائی گئیں، پھر مجھے حالت بے ہوشی میں قبر میں دفنا دیا گیا۔ انہوں نے کچھ کھلا کر میرے جسم کو مفلوج کر دیا تھا۔ وہاں بجو نے حملہ کیا اور جب ہی غیبی مدد ہوئی اور ایک ماں بیٹی نے مجھے قبر سے نکالا۔ میری حالت دگرگوں تھی۔ پھر میری محسن میرا علاج کرنے لگی۔ ان ماں بیٹی کو گاؤں والوں نے دربدر کر دیا تھا۔ وہاں کے چودھری کا بیٹا صمد یار چنبیلی کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ وہ وہاں آ کر ہم لوگوں کو ہراساں کرنے لگا۔ اماں میرے علاج کی غرض سے خاص بوٹی لینے سرحد پار نکل گئی۔ اماں خاص بوٹی لے آئی تھی اور اس نے دوا کا سفوف اور تیل تیار کر لیا تھا۔ دوا نے مجھ پر جادوئی اثر دکھایا اور میرے اندر طاقت کا خزانہ بھر گیا۔ جنگل میں عورت کی چیخ پر میں وہاں پہنچا تو دیکھا ایک تیندوا عورت کو دبوچے ہوئے تھا۔ میں نے درندے کو ٹھکانے لگا دیا۔ زخمی عورت صمد یار کی ماں شمیلہ خانم تھی۔ صمد یار کے گماشتوں نے اماں کی مڑھی کو آگ لگا دی۔ میں انہیں تھانے لے گیا تاہم انہوں نے مجھے ہی لاک اپ کر دیا۔ میں تھانے سے بھاگ نکلا۔ مجھے شمیلہ خانم نے ایک ڈاکٹر کے کلینک پر ٹھہرا دیا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ وہ ہمیں یہاں سے نکال کر شہر پہنچا دے گا تاہم میں مطمئن نہ تھا۔ میں نے ڈاکٹر کے پاس ایک پراسرار آدمی کو دیکھا۔ جب تھوڑا تحقیق کی تو پتا چلا ڈاکٹر ہمیں پھنسانا چاہتا ہے۔ میں نے ڈاکٹر کو گرفت میں لیا مگر وہ نکل گیا اور ہمیں مجبور کیا کہ جیسا وہ کہے، ہم کریں۔ تاہم دھینگا مشتی میں ڈاکٹر جان سے چلا گیا اور میں اماں اور چنبیلی کے ساتھ وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ میں استاد جوجی کے ٹھکانے پر آ گیا۔ وہاں سے ہم کالی لہر والوں کے ایک ٹھکانے پر پہنچے تو وہاں نزاکت اور رراڑاں کی لاشیں ملیں۔ میں نے انتقام لینے کی ٹھان لی۔ وہاں سے میں ایک قصائی صورت بدمعاش کو اپنے ٹھکانے پر لے آیا۔ اس پر تشدد کر کے ہم معلومات لے رہے تھے کہ وہاں ہانڈیوں کی بارش ہو گئی۔ ہم نے دشمنوں کو مار بھگایا اور قبضے میں موجود بدمعاش سے کالی حویلی کا پتا معلوم کر لیا۔ ہم کالی حویلی پہنچ گئے۔ وہاں میرا رانگا سے ٹاکرا ہوا۔ رانگا نے استاد جوجی کو شدید زخمی کر دیا۔ میں نے رانگا کی ایک ٹانگ کاٹ ڈالی تاہم رانگا بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں دشمن کے ایک اور ٹھکانے پر پہنچا تاہم انہوں نے مجھے قابو کر لیا۔ میں زخمی بھی ہو گیا۔ اچانک وہاں سلیم نے حملہ کر دیا۔ مجھے وہاں سے نکال لیا گیا۔ سلیم اور چودھری برادران نے مجھ سے مفاہمت کر لی تاہم اس کے پیچھے ان کا کوئی خاص مقصد تھا۔ راحیلہ بھی انہی لوگوں کے پاس تھی۔ سلیم اور میں نے راجا تیمور کو چھاپے کی کوشش کی تاہم ہمیں ناکامی ہوئی۔ وہاں سے واپسی پر ایک جگہ ایمبولینس اور پولیس نظر آئی۔ وہ کسی لاش کو اٹھا رہے تھے۔ جگنو کو مار دیا گیا تھا۔ میں نے انتقام کی ٹھان لی۔ میں نے تیمور کو چھاپنے کا ارادہ کیا اور اس کی فیکٹری پہنچ گیا۔ وہ لوگ کوئی "شے" لے کر کہیں جا رہے تھے۔ میں نے ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ ایک مقام پر میری گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو گیا۔ میں نے پیدل ہی ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ اچانک دوڑتے ہوئے میں گڑھے میں گرا۔ سر پر چوٹ لگنے سے بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو دیکھا راجا تیمور اور ڈرائیور ہلاک ہو چکے تھے اور کینوس سے ڈھکی شے غائب تھی۔ راجا تیمور کا ایک ساتھی زندہ میرے ہتھے چڑھ گیا۔ معلومات پر پتا چلا کہ کسی گروہ نے انہیں ہلاک کیا تھا اور بومبورگا نامی قدیم مجسمہ لے اڑے تھے۔ میں نے میڈم بچھی تک پہنچنے کے لیے ان کا پیچھا کیا اور ان کے ساتھیوں کی کشتی میں سوار ہو گیا۔ بومبورگا کا مجسمہ بھی انہی کے پاس تھا۔ کشتی ایک جگہ رکی تو بھیڑیوں نے حملہ کر دیا۔ ایک بھیڑیے نے خوفناک غراہٹ کے ساتھ مجھ پر جست لگا دی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

جنگلی بھیڑیے نے جیسے ہی مجھ پر جست لگائی، میں تب تک سنبھالا لے چکا تھا۔ میں نے خود کو اس کی شکاری گرفت میں جانے دینے کے بجائے یک دم ایک مخصوص "ٹرک" سے بیک وقت حملے اور دفاع کے طور پر اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھائے۔ اس کے خونخوار جبڑوں سے جھانکتے ہوئے نکیلے دانتوں کی جھلک مجھے اپنے چہرے سے فقط چند انچ کے فاصلے پر ہی دکھائی دی جہاں سے حیوانی بھبکے میرے چہرے سے ٹکرانے لگے لیکن میرے دونوں ہاتھوں کے شکنجے تب تک اس کی بھرے بالوں والی گردن پر کسے جا چکے تھے۔

یہی وہ موقع تھا جسے ضائع کرنے کا مطلب شمو جیسی بھیانک موت سے دوچار ہونا تھا۔ لہٰذا میں اسے مزید موقع دیے بغیر اس کی گردن پوری قوت سے دباتا چلا گیا۔ یہ بھاگی بوٹی کا ہی کمال تھا کہ میں چشم زدن میں ہی اس جنگلی اور جسیم بھیڑیے کا گلا دبا کر اسے ہلاک کر چکا تھا۔ میں نے نفرت انگیز انداز میں اس کی لاش ...... دنبالے سے باہر

نہر میں اچھال دی اور پھر اپنے حواس درست کیے۔
کیبن کی طرف معاملہ قدرے ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ سمورا نے کشتی آگے بڑھا دی تھی۔ گرد واس اور شینا دونوں مل کر بھیڑیوں کی لاشوں کو ایک ایک کر کے نہر میں پھینکتے رہے۔ شمو کی لاش کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ سفر ایک سنسنی خیز ڈرامے کے اختتام کے بعد دوبارہ شروع ہو چکا تھا۔
کشتی میں اب صرف تین (مجھے ملا کر چار) افراد باقی بچے تھے۔ یعنی گرد واس، شینا اور سمورا...... میں ابھی ان کی نظروں سے اوجھل تھا۔

میں ایک لکڑی کے چبوترے سے سر ابھار کر ان دونوں کی نقل و حرکت دیکھنے لگا۔ گرد واس اور شینا نے اپنے رہائشی کیبن کی طرف رخ کرنے کے بجائے وھیل روم کی طرف قدم بڑھائے۔ وہ شاید وہاں سمورا کو کوئی ہدایت دینے گئے تھے۔ اس کے ذرا دیر بعد دونوں دوبارہ نمودار ہوئے۔ گرد واس، شینا سے کہہ رہا تھا۔
''ڈارلنگ! تم اندر چلو، میں ذرا نیچے بوائلر روم کا چکر لگا کر آتا ہوں۔''
شینا کیبن کی جانب اور گرد واس چوبی دیوار والے ایک مختصر گلیارے میں اتر گیا۔ میں نے ایک گہری ہنکاری بھری اور ذہن میں کافی دیر سے پنپنے والے خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہی لاسلکی آلہ نکال لیا۔
میں نے پہلے اس کا غور سے جائزہ لیا۔ اس پر ایک ہی فریکوئنسی پہلے سے سیٹ تھی۔ اسی پر میں نے اسے چارج اپ کر کے آن کیا اور دھڑکتے دل سے رابطہ ملانے میں مصروف ہو گیا۔
چند ہی لمحوں بعد ائر پیس میں مچھروں کا شور سا ابھرا، اس کے بعد خاموشی چھا گئی لیکن اس خاموشی میں ہلکی ''ٹون'' کی مسلسل آواز آنے لگی۔
''ہیلو، شیان اسپیکنگ...... آر یو کاپی می؟'' میں نے ایک فرضی نام لے کر کہا۔
دوسری جانب سے ایک مترنم سی مگر جوش اور تفکر میں ملی جلی نسوانی آواز ابھری۔
''یس، کاپیڈ یو...... تم شیان؟ رامو کدھر ہے؟ اوور۔''
''آپ شاید لیڈی لارا ہیں؟ میں راموکا ہی ایک ساتھی ہوں۔ ایک ایمرجنسی ہو گئی ہے ہمارے ساتھ...... اوور۔'' میں نے رامو کے منہ سے پہلے سے سنی گفتگو کے مطابق کہا۔
''یہ کافی نہیں۔ پہلے اپنی شناخت کرواؤ ورنہ اس ڈیوائس کو ہمیشہ کے لیے ڈراپ اینڈ ڈیڈ کر دیا جائے گا...... اوور۔''
دوسری جانب سے لیڈی لارا کی غراتی ہوئی آواز ابھری۔
میں بے اختیار گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ بہت چالاک تھی اور حد درجہ محتاط بھی۔ بلاشبہ وہ کسی معمولی گینگ سے تعلق نہیں رکھتی ہوگی۔
میں نے بھی دانستہ اس بار سنجیدگی اور بظاہر روکھے لہجے میں ایسا انداز اختیار کرتے ہوئے جوابی گفتگو کی جیسے میں اس کا کوئی ماتحت نہیں بلکہ برابر کی حیثیت کا کارندہ ہوں۔
''لیڈی لارا! تمہاری مرضی تم جو چاہے کرو۔ اگر تم ایمرجنسی کے متعلق کچھ نہیں سننا چاہتی ہو تو پھر میں خود بھی اس ڈیوائس سے چھٹکارا پانے کی فکر میں ہوں کیونکہ تم سے وفاداری کی صورت میں میرے ساتھی میرے دشمن بن سکتے ہیں...... اوور۔''
میرے اس رویّے کا لارا پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ وہ فوراً معذرتی لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولی۔
''مسٹر شیان! برا مت مناؤ۔ حالات کی غیر یقینی کے باعث مجھے ایسا رویہ اختیار کرنا پڑا۔ میں کاپی کر رہی ہوں۔ تفصیل بتاتے چلو...... اوور۔''
''اٹس او کے۔'' میں نے کہا۔ ''مسٹر راموکا میں پرانا اور ایک معاون ساتھی ہوں۔ ممکن ہے اس نے میرا تم لوگوں سے ذکر کرنا ضروری نہ سمجھا ہو۔ وہ اب مر چکا ہے اور......'' اس کے بعد میں نے اسے ساری صورت حال کے بارے میں صراحت سے آگاہ کر دیا اور آگے بولا۔
''اب میں راموکی جگہ تمہارے کام آ سکتا ہوں یا نہیں، یہ فیصلہ تمہیں یا باس البرٹ رمنڈو کو جلد کرنا ہوگا تاکہ میں اپنی کوئی راہ اپناؤں۔ میں زیادہ دیر دشمنوں کے درمیان نہیں رہ سکتا کیونکہ موجودہ حالات میں کسی بھی وقت میرا بھی بھانڈا پھوٹ سکتا ہے...... اوور۔''
''مسٹر شیان! میں باس کی نائب ہوں۔'' دوسری جانب سے لارا کی آواز ابھری۔ اب اس میں سختی اور تحکم نہ تھا۔ وہ آگے بولی۔ ''تمہاری باتوں کی تصدیق ہو چکی۔ تم واقعی رامو کے ساتھی ہو۔ ورنہ تمہیں یہ سب حالات اتنی تفصیل کے ساتھ معلوم نہ ہوتے۔'' اس کی بات پر میرے اندر چٹکلا چھوٹا۔ میں بے اختیار اپنی اس کامیاب چال پر مسکرا اٹھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔
''ساتھ ہی ہمیں تمہارے ساتھی رامو اور اپنے دونوں ساتھی بوتھم اور جولی کی ہلاکت پر افسوس بھی ہے۔ بہر حال اب تمہیں وہی کرنا ہے جو رامو کے ذمے تھا یعنی بومبورگا کے مجسمے کا حصول۔ کیا تم مجھے تھوڑی تفصیل اس

بارے میں بتا سکتے ہو کہ اس وقت تم لوگ کس مقام سے گزر رہے ہو؟ اوور۔''

''ہم پیلی گھاٹ کی جانب رواں دواں ہیں اور اس وقت دریائے بیاسی میں سفر کر رہے ہیں۔'' میں نے جواب میں کہا۔ ''لیکن تم لوگ کہاں موجود ہو؟ اوور۔'' میں نے چالاکی سے کام لیا۔

بظاہر میرا ان سے کوئی سروکار نہ تھا مگر چونکہ یہ لوگ بھی اسی مجسمے کے حصول کے لیے خفیہ طور پر کوشاں تھے اور یہ لوگ میرا راستہ بھی کسی وقت کھوٹا کر سکتے تھے، نیز میرے دشمنوں کے دشمن کا گروپ تھا یہ۔ میں ان دونوں کو ٹکرا کر اپنے وسیع تر مفادات کا حصول آسان بنا سکتا تھا۔

''یس مسٹر شیان! تصدیق ہو چکی۔ ہماری وسیع حیطہ عمل والی ڈیوائس پر تمہاری موصول ہونے والی فریکوئنسی کے مطابق تم اس وقت .... دریا بیاسی میں تبت اور نیپال کی جانب دریائے برہم پترہ کے معاون میں سفر کر رہے ہو اور جس مقام پر یہ بیاسی دریا تسانگ پو کے علاقے میں داخل ہوتا ہے وہیں ہمارا ایک خفیہ بیس کیمپ ہے......اوور۔''

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ بومبورگا کے مجسمے کے سلسلے میں میرے ذہن میں پلاننگ پہلے سے ہی محفوظ تھی لیکن وہ میں صحرائی عقاب والوں کے ہتھے ہرگز نہیں چڑھنے دینا چاہتا تھا۔ ان سے رابطہ کرنے کا میرا مقصد محض اسی قدر تھا کہ ان کی موجودگی کا علم رہے تاکہ ان کی طرف سے اچانک حملہ یا ہلا بولنے کا خطرہ نہ رہے۔

''مجھے افسوس ہے لارا! میری جغرافیائی معلومات انتہائی ناقص ہے۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ میں رامو کا ایک مددگار اور قابلِ اعتبار ساتھی تھا۔ مجسمے والے مشن کے سلسلے میں اس نے مجھے اپنے ساتھ ملا رکھا تھا......اوور۔''

''کوئی بات نہیں۔ ہم تمہیں خود ہی ٹریس کر رہے ہیں...... اوور۔'' دوسری جانب سے لارا کی مترنم آواز ابھری۔ اس کی سریلی آواز میں مجھے ایک نشیلا پن سا محسوس ہو رہا تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ کسی کرمنل گینگ کی نائب تھی۔ میں مقصد کی بات پر آتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''لیڈی لارا! کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ کتنا وقت لگے گا اور میرے لیے آگے کیا حکم ہے کیونکہ رامو تو رہا نہیں لہٰذا مجھے راہنمائی کی ضرورت پڑ سکتی ہے......اوور۔''

''گڈ! تم کام کے آدمی ہو۔'' اس نے ملائمت آمیزی سے میری توصیف کر ڈالی پھر وہ بولی۔ ''تبت کی سرحد تسانگ پو سے بھی تم تقریباً چالیس میل دور ہو۔ اگرچہ سرحدی علاقہ بیس ایکس مائل (میل) کے بعد شروع ہو جائے گا۔ یہاں تمہیں نیپال اور چینی بارڈر فورسز کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ ممکن ہے ان لوگوں نے اس کی کوئی تدبیر کر رکھی ہو۔ ہم نے بھی ایک جغرافک ڈاکیومنٹری گروپ کا روپ اختیار کر رکھا ہے لیکن کوئی مسئلہ ہو جائے تو ہمیں فوراً مطلع کر دینا......اوور۔''

میں نے کہا۔ ''ان کی منزل پیلی گھاٹ ہے۔ یہ کہاں واقع ہے؟ اوور۔''

''رامو ہمیں ان کی منزل کے بارے میں بتا چکا ہے جو آسام کی اسی آبی راہ گزر سے ہو کر بنگلا دیش اور وہاں سے رانگا ماٹی دریا تک ہے۔ پیلی گھاٹ آخری کھاڑی نما بندرگاہ ہے...... اوور۔'' لارا نے مجھے بتایا اور میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

''اگر ایسا ہے تو پھر تبت میں داخلے کی وجہ؟ اوور۔''

''وہ تو انہیں ہی معلوم ہو گی۔ ممکن ہے اس میں کسی رازداری یا آسانی کا عمل دخل رہا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہاں کسی اور گمنام آبی گزرگاہ سے تسانگ پو کو چھو کر گزر جائیں......اوور۔''

''کلیئر......اوور۔''

''او کے۔ اوور اینڈ آل'' کہتے ہوئے لارا نے رابطہ منقطع کر دیا۔

اب اس طرح میں صحرائی عقاب والوں کی موجودگی اور ان کی پلاننگ سے آگاہ ہو چکا تھا۔ اگر میں ان سے بے خبر رہتا تو یہ میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتے تھے اور ان کے ہاتھوں میرا بھی حشر راجا تیمور جیسا ہو سکتا تھا۔

لیکن سوال یہ تھا کہ میرے لیے اس وقت صحرائی عقاب والے اہم نہیں تھے کیونکہ ان کا مقصد صرف مجسمے کا حصول تھا۔ وہ ان پر حملہ آور ہوتے تو میرا منزلِ مقصود تک سفر جاری رکھنا مشکل ہو جاتا۔

گرد واس کی نفری قوت بہت کم تھی۔ کشتی میں یہ صرف تین لوگ بچے تھے۔ اگرچہ انہیں صحرائی عقاب والوں کے عزائم کا علم تھا مگر یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ اب بھی کس مقام پر ان کی گھات لگائے بیٹھے تھے۔ یہ صرف میں جانتا تھا۔

پیلی گھاٹ تک کا سفر مجھے خاصا طویل محسوس ہو رہا تھا۔ صحرائی عقاب والوں کے ہاتھوں راجا تیمور وغیرہ کا حشر دیکھ کر مجھے اندازہ تو ہو چکا تھا کہ وہ بھی کم خطرناک لوگ نہ تھے تاہم گرد واس اور شینا نے بھی بعد میں ان کا مقابلہ کیا تھا

اور بوتھم اور جولی کو ہلاک کر کے اپنے منہ کا چھینا ہوا نوالہ ان سے واپس لے لیا تھا۔ گویا اب آگے کسی بھی مقام پر ایک زبردست معرکہ ان کے درمیان متوقع تھا۔

اس سے پہلے میں مجسمے کو تھیا لینا چاہتا تھا۔ اس طرح کہ نہ وہ ان کے پاس رہے اور نہ ہی صحرائی عقاب والوں کے قبضے میں جائے کیونکہ کالی لہر والوں کے لیے یہ مجسمہ کتنی اہمیت کا حامل تھا، مجھے اس کا اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا۔

اب میں نے کیا کرنا تھا، اس کا لائحہ عمل میں پہلے ہی بنا چکا تھا۔ ڈیوائس چھپا کر میں وہیں کونے میں لیٹ گیا۔

☆☆☆

دھوپ کی چبھن سے میری آنکھ کھلی۔ صبح ہو چکی تھی بلکہ پوری طرح دن نکلا ہوا تھا۔ بوٹ مجھے رکی ہوئی محسوس ہوئی کیونکہ اس کا انجن بند تھا البتہ پانی کی جلترنگ سنائی دے رہی تھی۔

میں نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ رات سوتے میں خیریت گزری اور کسی کی نظر مجھ پر نہیں پڑی۔

میں محتاط انداز میں آہستہ آہستہ اٹھا۔ بہت سہانا موسم اور دلفریب منظر میری نظروں کے سامنے تھا۔ بوٹ دریا کے کنارے لنگر انداز تھی۔ اس طرف جنگلی گھاس کا ڈھلوانی میدان اور درختوں کا جنگل سا تھا۔ درخت اور اس کی شاخیں کئی فٹ دریا کی جانب جھکی پانی کی سطح کو بوسہ دے رہی تھیں۔ دوسرے کنارے پر مجھے گھاس اور درختوں پر تھوڑی بہت برف کی جھلک نظر آئی۔ سردی پڑنے لگی تھی۔ اوپر نیلے کھلے آسمان پر بادل کے سفید ٹکڑے تیرتے نظر آئے۔ میں نے اپنی جیکٹ کے کالر اونچے کیے اور بٹن بند کر دیے۔ مجھے بھوک اور پیاس ستانے لگی۔ ہلکی سردی تھی۔

دفعتاً ہلکا سا شور میرے کانوں سے ٹکرایا۔ دیکھا، شینا اور گرد واس دریا کے پانی میں نہاتے اور چہلیں کرنے میں مصروف تھے۔ کنارے پر سمورا نے آگ جلا رکھی تھی۔ وہ کچھ کھانے پینے کی چیز بنانے میں مصروف تھا۔ اس نے تین چار موٹے تازے جنگلی خرگوش شکار کیے تھے۔

انہیں مصروف پا کر میں دبے پاؤں کیبن کی طرف بڑھا۔ وہیں مجھے تھوڑا بہت کھانے پینے کو مل سکتا تھا۔ قریب پہنچا تو کیبن کا داخلی دروازہ تھوڑا بھڑا ہوا تھا۔ میں اسے آہستہ سے دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔

کیبن قدرے کشادہ اور آرام دہ تھا۔ وسط میں گرم بستر تھا۔ دائیں جانب ایک میز اور دو کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک الماری بھی۔ دریا کی جانب کھلنے والی کھڑکی گول اور خشکی کی جانب چوکور کھڑکی تھی۔

ایک شیلف بھی نظر آئی۔ اس کے اندر زیادہ تر وائن باٹلز رکھی تھیں تاہم مجھے لیکوئڈ فوڈ کے کچھ سیل ڈبے بھی نظر آئے۔ پانی بھی رکھا تھا۔ میں نے سب سے پہلے پانی پیا اس کے بعد کیبنٹ سے فوڈ کے دو ڈبے نکالے۔ نائف کٹر مجھے میز کی دراز سے مل گیا۔ اندر جوس اور فروٹ کے قتلے تھے۔

میں نے جلدی جلدی دونوں ڈبوں پر ہاتھ صاف کیا۔ میرا نہیں خیال تھا کہ ان دو ڈبوں کے غیاب پر کوئی چونکتا۔ تاہم خالی کیبن میں نے وہاں نہیں پھینکے اور جیکٹ کی جیب میں ڈال لیے کہ بعد میں موقع دیکھ کر پانی میں پھینک دوں گا۔

اس کے بعد میں نے تھوڑا باہر جھانکا۔ وہ سب مصروف تھے۔ میں نے کیبن کی جلدی جلدی تلاشی لی لیکن بومبورگا کا مجسمہ مجھے وہاں نہیں ملا۔ یہ ممکن تھا اسے کہیں اور چھپا رکھا ہو۔

اچانک ایک آواز پر میں چونکا۔ بدک کر کھڑکی کی طرف گیا اور سن ہو کر رہ گیا۔ شینا اور گرد واس پانی میں بھیگے ہوئے کیبن کی طرف آرہے تھے۔ میرے پاس مہلت نہیں رہی تھی کہ میں کیبن سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا۔

لہٰذا جلدی سے اِدھر اُدھر دیکھا اور الماری کے پیچھے چلا گیا۔ اس کے لیے مجھے الماری تھوڑی سی آگے کی طرف دھکیلنی پڑی تھی تاکہ اس کے عقب میں اپنے لیے جگہ بنا سکوں لیکن وہ میری دراز قامتی سے کم تھی۔ اسی لیے مجھے تھوڑا جھک کر اس کے عقب میں ٹکنا پڑا تھا۔

وہ باتیں کرتے اندر داخل ہوئے۔ گرد واس کرسی پر بیٹھ گیا اور اس نے شینا کو وائن تیار کرنے کا کہا۔

دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ اسی اثناء میں سمورا نے انہیں آواز دی۔ شاید کھانا تیار ہو چکا تھا۔ وہ دونوں نکل گئے۔ میں نے بھی اطمینان کی سانس لی اور موقع تاک کر کیبن سے باہر آ گیا۔ دنبالے پر آ کر میں کچھ سوچنے لگا۔ یہ لوگ کنارے پر اب کھانے پینے میں مشغول ہو چکے تھے۔ میں نے تیزی سے بوٹ کا معائنہ شروع کر دیا۔

مجسمہ مجھے کہیں نظر نہیں آیا حتیٰ کہ وہیل روم کے قریب ایک کونے میں بنے اسٹور روم کو بھی دیکھ لیا۔ وہاں مجھے ایک قرولی پڑی نظر آئی۔ کچھ سوچ کر میں نے وہ اٹھالی اور اپنے جوتے میں اڑس لی۔ تب ہی اچانک مجھے بوائلر روم کا خیال آیا۔ پہلے تو سوچا ادھر بھلا کوئلوں اور لکڑی کے ٹکڑوں کے سوا کیا مل سکتا تھا لیکن دل نے کھد بڑا کہ تلاشی کی یہ حسرت بھی پوری کر لینی چاہیے۔

میں بوائلر روم میں آ گیا۔ یہاں کا ماحول خاصا گرم تھا۔ گرمی میں تو یہ جہنم کا ہی نظارہ پیش کرتا ہوگا۔ میں ادھر اُدھر تاکنے لگا کہ اچانک دیکھا میرے بائیں جانب ایک راہداری سی تھی۔ میں اس طرف چلا گیا۔ وہ مختصر تھی۔ راہداری کے اختتام پر سپاٹ دیوار تھی اور وہیں مجھے ایک انتہائی مکروہ اور منحوس سی شے رکھی دکھائی دے گئی۔ اس پر سیاہ رنگ کا موٹا کپڑا تھا، وہ میں نے ہٹا دیا۔

بمشکل چار فٹ کا وہ مجسمہ بومبورگا کا ہی ہوسکتا تھا۔ بالکل سیاہ اور بیٹھنے کی حالت میں تھا۔ اس کا سر مخروطی اور شکل انتہائی بدصورت تھی۔ تنگ پیشانی پر فقط ایک ہی آنکھ تھی جو کھلی ہوئی مجھے گھورتی لگی۔ موٹی سی ناک کے نتھنے کھلے ہوئے اور اٹھے ہوئے تھے۔ بازو غائب تھے، ٹانگیں سکڑی ہوئیں۔ کمر کی جانب بڑا سا کُب نکلا ہوا تھا اور بھی بدوضع قسم کے عجیب نقش ونگار بنے ہوئے تھے۔ رنگت ساری سیاہ تھی۔

اسے شروپا قبیلے کا دیوتا سمجھا جاتا تھا اور میری معلومات کے مطابق وہ مصر کے میوزیم اور پھر پیرس سے چرایا گیا تھا اور اب میرے سامنے تھا۔ بلاشبہ نوادرات میں اس کی اہمیت مستند ہوسکتی تھی۔

میں تھوڑی دیر تک اس کا جائزہ لیتا رہا اور پُرسوچ انداز میں ہونٹ بھینچے اس کے سامنے کھڑا رہا۔ یہ تسلی ہونے کے بعد کہ بومبورگا کا مجسمہ ادھر موجود تھا، میں بوائلر روم سے نکل آیا۔

پہلے میرے ذہن میں آیا کہ اپنے طے شدہ منصوبے کے ایک مرحلے کو بخوبی انجام تک پہنچا دوں۔ یعنی خاموشی سے یہ مجسمہ کسی طرح اٹھا کر جنگل میں کہیں خفیہ جگہ پر چھپا دوں لیکن ابھی مجھے یہ سب اپنے منصوبے سے بعید ترین نظر آیا۔ راستے میں کسی وقت بھی اگر مجسمے کی ڈھنڈیا پڑ جاتی تو ان کا پہلی گھاٹ کی جانب سفر موخر ہوسکتا تھا جو کم از کم میں ہرگز نہیں چاہتا تھا۔

میں نے کنارے پر دیکھا۔ گردواس اور شینا کھا پی کر وہیں کنارے پر موجود ہری ہری گھاس پر لیٹ گئے تھے جبکہ سمورا بوٹ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ بوٹ میں آ کر اس نے سیدھا بوائلر روم کا رخ کیا۔ وہاں تھوڑی دیر تک وہ موجود رہا اس کے بعد اوپر آیا اور وہیل روم کا رخ کیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ''پھٹ...... پھٹ'' کی مخصوص آواز ابھری اور ساتھ ہی بوٹ کی چمنی سے دھواں نکلنا شروع ہوگیا۔ لنگر ابھی نہیں اٹھایا گیا تھا۔ گویا یہ لوگ روانگی کے لیے تیار تھے۔ انجن اسٹارٹ کر کے سمورا دوبارہ وہیل روم سے نمودار ہوا اور ریلنگ کے قریب جا کر اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر کے ہلانے لگا۔

دریا کے کنارے گھاس پر بیٹھے شینا اور گردواس اٹھ کھڑے ہوئے۔ باقی سامان سمورا اٹھا لایا تھا۔ انہوں نے بھی اپنا مختصر بوریا بستر اٹھایا اور کنارے کنارے چلتے وہ بوٹ میں آ گئے۔ ابھی انہوں نے اپنے کیبن کا رخ نہیں کیا تھا البتہ ان دونوں کے بوٹ میں سوار ہوتے ہی سمورا نے دوبارہ روم کا رخ کیا پھر اس کے ذرا دیر بعد ہی پھٹ پھٹ تیز ہوگئی، ساتھ ہی بوٹ نے بھی حرکت شروع کر دی۔

دریا کا پاٹ کہیں بہت کھلا اور کہیں تنگ ہوجاتا۔ دورویہ کناروں پر جنگل، جھاڑیاں اور درختوں کی بہتات تھی۔ فقط دوسرے کنارے جنگل پار... برف پوش چوٹیوں کی جھلک نظر آتی رہتی۔ سفر ابھی بظاہر پرسکون مگر اندیشوں بھرا جاری تھا کہ چند میل بعد اچانک بوٹ کو ایک زبردست جھٹکا لگا۔ میں بری طرح گڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا کہ دیکھوں ماجرا کیا ہے؟

شینا اور گردواس جو کہ تھوڑی دیر بعد کیبن میں جا چکے تھے، بوٹ کو جھٹکا لگنے کے بعد دوبارہ باہر دوڑے آئے تھے۔ سمورا کو میں نے لپک کر وہیل روم سے نکلتے دیکھا تو چونک پڑا۔ اس کے ہاتھ میں ایروشوٹر گن تھی۔ وہ اسے سنبھالتے ہوئے تیزی سے بوٹ کے دائیں جانب بڑھا، ساتھ ہی اس نے چلّاتے ہوئے ان دونوں سے کچھ کہا بھی تھا جو میں نہ سمجھ سکا۔ تاہم میں نے دیکھا کہ شینا اور گردواس فوراً کیبن کی جانب لپکے اور جب باہر آئے تو ان دونوں کے ہاتھوں میں طاقتور رائفلیں تھیں۔

میں چونک پڑا۔ سمورا نے یقیناً وہیل روم سے دریا میں کچھ دیکھا تھا یا اسے بوٹ کو زبردست دھچکا لگنے کی وجہ معلوم تھی۔ میں خود ابھی ماسوائے تماشا دیکھنے کے اور کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ میرے پاس راموکا لوڈڈ پستول تھا۔ فضا میں یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے۔ شاید شینا اور گردواس کی رائفلیں گرجی تھیں پھر دفعتاً میرے بائیں جانب دریا میں ایک زبردست ہلچل اور شور کی کیفیت پیدا ہوئی۔ ساتھ ہی بوٹ کو دوبارہ جھٹکا لگا۔ اس بار بوٹ بری طرح ہل گئی بلکہ یوں لگا جیسے الٹنے ہی والی ہو۔

بوٹ کا ایک حصہ اچھا خاصا اوپر کی جانب اٹھ گیا تھا جس کے نتیجے میں میرے پاؤں اکھڑ گئے۔ میں فضا میں چند انچ اچھل کر دنبالے کی دائیں جانب والی دیوار سے جا ٹکرایا اور گر گیا۔ شکر تھا کہ پانی میں نہیں جا پڑا۔ نہ جانے کون سی دریائی بلا نے بوٹ پر حملہ کر دیا تھا کیونکہ اس بار مجھے پانی کے شور تلے ایک بڑی خونخوار حیوانی آواز... بھی سنائی دی تھی۔

''مگرمچھ۔''

یہی ایک لفظ موقع اور محل سے میرے ذہن رسا میں ابھرا تھا اور میں دہل گیا۔ ظاہر ہے دریا میں یہی ایک بڑی بلا ہو سکتی ہے۔ سمندر تو تھا نہیں کہ کوئی بڑی وہیل یا شارک ہلا بولتی۔ میں نے خود کو سنبھالا تو اسی وقت دوبارہ مجھے فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ فائرنگ شینا اور گرد واس کر رہے تھے لیکن ذرا ہی دیر بعد سمورا حلق کے بل چلایا۔ ساتھ ہی زوردار چھپاکے کی آواز ابھری۔

میرے لیے اب حالات کا جائزہ لینا ازبس ضروری ہو گیا تھا۔ ساری احتیاط بالائے طاق رکھ کر میں نے ریلنگ سے اس طرف اٹھ کر دیکھا جہاں یہ قیامت مچی ہوئی تھی تو ایک دہلا دینے والا منظر میرا منتظر تھا۔

سمورا کو میں نے دریا میں تڑپتے اور ایک جسیم مگرمچھ کے بھیانک جبڑوں میں پھنسے پایا۔ ایروشوٹر اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ وہ مدد کے لیے چلا رہا تھا۔ شینا اور گرد واس بوٹ پر دو مختلف سمتوں پر تک کر پوزیشنیں سنبھالنے کی سعی کرتے ہوئے اس خونی مگرمچھ پر گولیاں برسانے لگے۔

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے مگرمچھ سمورا کو اپنے نکیلے دانتوں تلے دو ٹکڑوں میں تقسیم کر چکا تھا۔ شینا اور گرد واس کی گولیاں اس کی موٹی، چکنی اور کھردری بدہیت کھال پر کوئی اثر نہیں کر رہی تھیں۔

سمورا کو ہڑپ کرنے کے بعد مگرمچھ پانی کے اندر غائب ہو گیا۔ ایک دم قیامت سی ہلچل رک گئی مگر یہ خاموشی کسی بڑے طوفان کا پتا دیتی محسوس ہوئی۔ تھوڑی دیر تک اس سیلن زدہ آبی ماحول پر گہرا سکوت طاری رہا۔ یوں لگا جیسے کسی اور انہونی کے ہونے کے ہم سب منتظر ہوں اور وہی ہوا۔

اسی وقت گرد واس چلایا۔ ''بوٹ میں پانی بھر رہا ہے، شینا......! ادھر آؤ۔''

میں نے ذرا ان کے قریب سرک کر دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ بوٹ، کیبن کی طرف والی ریلنگ سے ٹوٹ چکی تھی۔ یہ اس جسیم اور خونی مگرمچھ کی زبردست ٹکروں کا ہی نتیجہ ہو سکتا تھا۔ وہاں سے پانی تیزی سے بوٹ میں بھر رہا تھا۔ وہ ایک جانب جھکتی جا رہی تھی۔ شینا اور گرد واس اپنی گنیں ایک طرف پھینک کر بالٹیاں اٹھانے کے لیے لپکے اور بھر بھر کر دریا میں پانی پھینکنے لگے۔

''ایسے کچھ نہیں ہوگا۔'' ذرا دیر بعد شینا نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں اس ٹوٹے ہوئے حصے کا بھی کچھ کرنا پڑے گا۔''

''تم پانی نکالتی رہو، میں کچھ کرتا ہوں۔'' گرد واس نے کہا اور پھر واپس پلٹا۔ وہ دوڑ کر وہیل روم اور کیبن کے درمیان بنے بڑے سے اسٹور میں جا گھسا اور وہاں سے وہ نہ جانے کس شے سے بھری ہوئی بوریاں لاد کر لانے لگا اور ٹوٹے ہوئے حصے میں جما کر رکھتا رہا۔ پانی آنا بالکل تو بند نہ ہوا تاہم اس میں کمی ضرور واقع ہو گئی تھی۔ یوں اب ایک طرف کو جھکتی ہوئی بوٹ دوبارہ اپنی سطح پر آنے لگی۔

گرد واس اِدھر اُدھر جا کر بوٹ کا جائزہ لیتا رہا، اس کے بعد شینا سے بولا۔ ''بوٹ ہمیں کنارے پر لے جانا پڑے گی۔''

''کیوں؟'' شینا نے پوچھا۔

''مگرمچھ کی ٹکروں نے اسے نقصان پہنچایا ہے۔ تھوڑی بہت مرمت کیے بغیر ہم آگے اتنا طویل سفر نہیں کر پائیں گے۔'' وہ بولا۔ شینا چپ ہو رہی۔

بوٹ کو کنارے پر لے جا کر لنگر ڈال دیا گیا اور ساتھ ہی ایک موٹے رسّے کی مدد سے ایک بڑے اور مضبوط تنے والے درخت سے باندھ بھی دیا گیا۔ وہ دونوں کنارے پر اتر آئے۔ میں بوٹ کے اندر ہی تھا۔ بوٹ پانی کی سطح پر ہلکورے لے رہی تھی۔

ابھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے کہ اچانک بوٹ زور سے ہلی۔ میں بری طرح گڑبڑا گیا۔ اگلے ہی لمحے ایسا لگا جیسے بوٹ کو کوئی زبردست قوت نے دھکیلنے کے انداز میں ٹکر ماری ہو۔ مجھے بھی زور کا جھٹکا لگا اور میں اندر ہی گر پڑا۔

اٹھا تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ بوٹ نصف سے زیادہ کنارے پر جا کھسکی تھی پھر یہی وہ وقت تھا جب مجھے پانی سے اپنی جانب ایک زوردار حیوانی...... آواز سنائی دی۔ بوٹ کے جس حصے پر میں تھا، وہ ابھی کچھ پانی میں ہی تھا۔

میں نے بری طرح ہڑبڑا کر اس طرف دیکھا اور جو شے مجھے نظر آئی، اس نے میرے اوسان خطا کر ڈالے۔ مجھے اعتراف تھا کہ اس قدر توانا اور جسیم مگرمچھ میں نے آج تک اپنی زندگی میں تو نہیں البتہ کسی فینٹسی مووی میں ضرور دیکھا تھا۔

جدھر میں چھپ کر کھڑا تھا، اس طرف ریلنگ کے نیچے ہی پانی کی سطح پر میں نے اس خونی مگرمچھ کو ابھرتے دیکھا۔ وہ کمبخت بڑے سکون آور انداز میں نظر آیا یا پھر دوسرے کسی حملے کے لیے پر تول رہا تھا۔

اس کا خوفناک جبڑا بہت بھیانک تھا۔ یہ تصور کرنا کہ سمورا کا اس نکیلے دانتوں والے جبڑے نے کیا حشر کیا ہوگا، لرزا دینے والا ہی تھا۔ وہ اپنے پورے جسم کے ساتھ پانی کی

سطح پر ابھرا ہوا تھا اور اس کے کھردرے بدہیئت سے موٹی کھال والے جسم پر خم دار اور ابھرواں خانے ایسے ہی محسوس ہو رہے تھے جیسے تیز چھرے ہوں۔ اس کی دُم بہت موٹی اور تیزی سے حرکت کرتی نظر آئی۔

مجھے ڈر لگا کہیں دوبارہ یہ بوٹ کو ٹھوکر مار کر کنارے پر ہی نہ الٹا دے اور پھر میرا کیا حشر ہوگا۔ اس نے جبڑوں کے اوپر اپنی ابھرواں ڈیلوں والی آنکھوں کو حرکت دی اور پھر غڑاپ سے پانی کے اندر غائب ہوگیا۔

بلاشبہ کسی شکاری کے لیے یہ مگرمچھ بہت شاندار ہوسکتا تھا جس کا شکار کرنے کے بعد وہ فخر محسوس کرتا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ بھارت سمیت افریقا اور برازیل کے جنگلاتی آبی علاقوں میں ایسے عظیم الجثہ مگرمچھوں کو دیوتا کا درجہ دیا جاتا ہے۔ یہ واقعی کسی دیومالائی یا تصوراتی داستانوں کا کوئی دیوتا ٹائپ کا مگرمچھ ہی تھا۔

اس عظیم الشان مگرمچھ کی ٹکر سے بوٹ کنارے پر آجانے کے سبب اب بالکل ساکت محسوس ہوتی تھی۔ میں ہنوز اندر ہی چھپا رہا۔ اس کے بعد جھکا جھکا چلتا ہوا دوسری طرف آیا جہاں کا بیشتر حصہ کنارے پر آچکا تھا۔

وہاں سے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنا سر ذرا ابھار کر دیکھا تو کنارے پر گھاس میں کھڑے شینا اور گردواس فکرمند نظر آرہے تھے۔ میں نے ابھی کچھ سوچ کر بوٹ سے باہر یا کنارے پر آنے کا اپنا ارادہ ترک کردیا۔

”اف بھگوان! میں نے اپنی ساری زندگی میں اتنا بڑا اور خطرناک مگرمچھ نہیں دیکھا۔ میں تو دہشت زدہ ہوگیا ہوں۔“ گردواس جھرجھری لے کر شینا سے کہہ رہا تھا۔

”میں سمورا کا بدلہ ضرور لوں گی۔ میں اس موذی کو ہلاک کروں گی۔“ شینا نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ میں نے دنبالے کی دیوار سے ذرا سر ابھار کر دیکھا۔ شینا کا حسین چہرہ تانبے کی طرح چمک رہا تھا اور شباب شریر اس آنچ میں جیسے دہکتا دکھائی دیا۔ اس کی بڑی بڑی گہری کالی آنکھیں غضب کی چمک نچھاور کرتی رہیں۔ اس نے رائفل ہنوز اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی۔

”بے وقوفی کی باتیں مت کرو شینا!“ گردواس نے کہا۔ ”وہ محض ایک درندہ تھا۔ اس کی چنتا چھوڑو اور اپنی فکر کرو۔ ہم صرف دو رہ گئے ہیں۔ مقدس بومبورگا کی امانت ہمارے ساتھ ہے اور منزل سے ہم ابھی بہت دور بھی ہیں۔ ابھی کشتی کی مرمت کا کام باقی ہے۔“

گردواس کے فکر و تشویش دلانے پر شینا چپ ہوکر رہ گئی۔ یہ سچ بھی تھا کہ یہ لوگ پانچ چھ سے اب صرف دو رہ گئے تھے جبکہ اہم مشن ان کا ابھی ادھورا تھا۔

شینا نے جھلا کر رائفل گھاس پر پھینکی تو گردواس اس کے قریب آگیا اور بہت محبت بھرے انداز میں اسے خود سے چمٹانے کی کوشش کی تو شینا اسے پرے دھکیل کر دور ایک درخت تلے جا کھڑی ہوئی۔ اس کا موڈ بہت بری طرح خراب تھا۔ اس نے گردواس کو بھی دھتکار دیا تھا اور دریا کے بظاہر پُرسکون پانیوں کی طرف تکتی رہ گئی۔

☆☆☆

دن کا سفر سہ پہر اور پھر اترتی شام تک چلا تو گردواس اور شینا نے مل کر کسی حد تک کشتی کی مرمت کا کام نمٹا لیا۔ وہ تھک کر اس قدر چور ہوگئے تھے کہ نڈھال ہوکر وہیں گھاس پر لیٹ گئے۔ ماحول پر اب یکایک گہرا سکوت چھا گیا۔ شام کے پنچھی اپنے گھونسلوں میں لوٹ آئے تھے اور جیسے خاموش دبک کر رہ گئے ہوں۔ پانی کی جلترنگ جاری تھی۔ دریا کے دونوں طرف کے جنگل میں اندھیرے اترنے لگے تھے۔ بوٹ کو دونوں نے کسی طرح موٹے موٹے رسّوں کی مدد سے خشکی سے پانی میں دھکیل دیا تھا۔

میں نے دنبالے کی جانب سے ابھر کر ذرا ارد گرد کا جائزہ لیا۔ کناروں پر ایک نظر ڈالنے کے بعد میں نے دریا کے پانی کو دیکھا۔ وہ خونی مگرمچھ شاید ہلچل مچانے کے بعد تہ میں پڑا آرام کر رہا تھا یا پھر آگے نکل گیا تھا۔ مجھے بھوک اور پیاس ستانے لگی۔

میں نے ایک بار پھر کنارے پر گھاس میں دونوں کو لیٹے پایا۔ وہ بے سدھ تھے۔ تسلی کے بعد میں ان کے کیبن کی طرف بڑھا۔ وہاں خشک خوراک کے کچھ ڈبے رکھے تھے۔ میں نے جلدی جلدی ان پر ہاتھ صاف کیا۔ بے چارے سمورا کے شکار کیے ہوئے جنگلی خرگوشوں کا بھی کچھ بچا کھچا گوشت مجھے ملا۔ وہ بھی میں چٹ کر گیا۔

بیئر اور وھسکی کی بوتل رکھی تھی۔ میں نے انہیں چھوئے بغیر پانی کی بوتل اٹھالی۔ بھوک پیاس سے میں پاگل سا ہو رہا تھا۔ وجہ یہی تھی کہ مجھے کھل کر کھانے پینے کو نہیں مل پا رہا تھا اسی لیے اس بار میں نے تمام احتیاط بالائے طاق رکھ دی کہ انہیں خوراک کی چوری کا شبہ ہوتا ہے تو ہوتا رہے۔

میں کیبن سے باہر آیا اور یونہی میری نظر جب کنارے پر پڑی تو یکلخت جیسے مجھے سکتہ ہوگیا۔ اس کمبخت موذی کی دہشت ہی ایسی تھی۔ اسی جسیم اور خونی مگرمچھ کو میں نے دریا کے کنارے سے ابھر کر نہایت آہستگی سے ان

دونوں سوئے ہوئے افراد کی طرف بڑھتے دیکھا۔ نیم تاریکی میں اس کا موٹا تازہ صحت مند جسم چمک رہا تھا۔ وہ مگرمچھ خونخوار ہی نہیں بلکہ مکار بھی تھا۔ وہ شاید بھوکا ہونے کے سبب آدم خوری پر مائل ہوگیا تھا۔

سمورا کو ہڑپ کرنے کے بعد سے اسے شاید شکار کی بو آتی رہی تھی۔ میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ گرد واس اور شینا بے خبر سو رہے تھے۔ اپنی جانب بڑھتے ہوئے خطرے کا انہیں بالکل احساس نہ تھا کہ بھیانک موت ان کی جانب بڑھی چلی آرہی تھی۔

ان دونوں کا ابھی زندہ رہنا میرے لیے ضروری تھا مگر میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں خود کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرے پاس سوچنے کا وقت نہ رہا تھا اور میں نے ان کی مدد کرنے کا فیصلہ کرلیا اور لپکا۔ مجھے شاید فیصلہ کرنے میں تھوڑی دیر ہوگئی تھی کیونکہ اسی وقت اس خونی مگرمچھ نے سوئے ہوئے گرد واس کی ٹانگ اپنے بھیانک نکیلے شکاری دانتوں والے جبڑے میں دبوچ لی تھی۔ وہ ایک دم ہڑبڑا کر اٹھا۔ شینا اس کے قریب ہی پڑی بے سدھ سو رہی تھی۔

مگرمچھ نے لپک کر گرد واس کی ٹانگ اپنے جبڑوں میں اس زور سے دبوچ کر اسے زوردار جھٹکا دیا کہ اس کی ٹانگ گھٹنے کی طرف سے کٹ گئی اور وہ ذرا دور جا پڑا۔ گرد واس کے حلق سے لرزہ خیز چیخیں برآمد ہو رہی تھیں۔ شینا کی آنکھ کھل گئی۔ ایک لمحے کو تو وہ یہ دل دہلا دینے والا منظر دیکھ کر ہی ہکا بکا رہ گئی۔ مگرمچھ دوبارہ گرد واس کی جانب لپکا جو اپنی ہی حالت اور اس مگرمچھ کو دیکھ کر حواس باختہ ہو رہا تھا۔ وہ گھاس پر گھسٹ کر دور نکل جانے کی کوشش کرنے لگا لیکن مگرمچھ دوبارہ تیزی سے اس کی جانب لپکا اور آن واحد میں اسے دوبارہ جا لیا۔

شینا بوٹ کی جانب دوڑی۔ وہ شاید وہاں سے کوئی ہتھیار اٹھانے کے لیے دوڑی تھی۔ کم از کم اب میرے لیے کرنے کو کچھ باقی نہ بچا تھا۔ گرد واس اپنے بھیانک انجام سے دوچار رہا۔ شینا جب تک بوٹ میں آئی مگرمچھ گرد واس کی دوسری ٹانگ بھی چبا چکا تھا۔ اس کے بعد اس نے باقی ماندہ جسم کو بھی جبڑوں میں دبوچا اور پانی کی جانب جانے لگا۔

کھلی زمین پر یہ خطرناک آبی درندہ مجھے زمانہ قدیم کا کوئی ڈائنا سور کی ہی طرح لگ رہا تھا۔ اس کی ہیبت ہی ایسی تھی کہ چند لحظوں کے لیے خود میں بھی جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔ گرد واس کی کربناک چیخیں آسمان کو چھو رہی تھیں۔ مگرمچھ اسے دبوچے دریا میں جا پڑا اور پھر یہی وہ وقت تھا جب شینا نے کیبن کے عرشے پر ہی کھڑے ہوکر رائفل سے اس پر گولیاں برسانی شروع کردیں۔

وقت گزر چکا تھا۔ مگرمچھ اپنے ادھورے سدھورے شکار کو لیے چشم زدن میں ہی دریا کی گہرائی میں جا اترا تھا۔ میں کچھ سوچ کر دنبالے سے کیبن کی جانب سرک آیا تھا۔ شینا کا چہرہ ست کر رہ گیا تھا۔ وہ نڈھال سی نظر آنے لگی۔ تب ہی جانے اس کی حسیات تیز تھیں یا پھر مجھ سے ہی کوئی معمولی کھڑکا ہوگیا تھا، وہ ایک دم چونکی اور رائفل تانے بوٹ کے اندر دائیں بائیں گھوم کر نگاہیں دوڑانے لگی۔

”کون ہو تم؟ سامنے آؤ ورنہ گولیاں برسا دوں گی۔“

وہ یکدم چلائی۔ اس میں طیش بھی تھا اور جھلاہٹ بھی۔ میں نے تیزی سے کچھ سوچا اور پھر اپنے دونوں ہاتھ فضا میں کھڑے کر کے اس کے سامنے آگیا۔

”کون ہو تم؟“ وہ مجھے دیکھ کر بپھرے ہوئے لہجے میں بولی۔ اس کی کشادہ سیاہ آنکھوں میں برہمی کے ساتھ اس بار قدرے حیرت کی چمک بھی تھی۔

”گگ...... گولی...... مت چلانا...... مم...... میں ایک بھٹکا ہوا مسافر ہوں۔ اس مگرمچھ کے خوف سے ادھر آن چھپا تھا۔“ میں نے ایک دم خوفزدہ ہونے کی ایکٹنگ کر ڈالی۔

”تم نے میرے ساتھی کو بچایا کیوں نہیں؟“ وہ بغور میرے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے بولی اور دو چار قدم اٹھا کر میرے قریب آگئی۔ اس نے اپنی رائفل ہنوز مجھ پر تان رکھی تھی۔

”میں نے بتایا نا میں خود دہشت زدہ ہوگیا تھا۔“ میں نے اداکاری جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے آج تک اتنا بڑا مگرمچھ نہیں دیکھا۔“

”تم اکیلے ہو؟“

”ہاں۔“

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”پرتم۔“ میں نے غلط سلط نام بتایا۔

”بوٹ سے اترو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ تم ایک بزدل آدمی ہو۔“

بزدل کا لفظ اگرچہ مجھے تازیانے کی طرح لگا تھا۔ اب اسے کیا معلوم تھا کہ وہ کس جنگ باز سے مخاطب ہے، جس کی ساری زندگی ہی بہادری کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرتے گزری تھی۔ اسے یہ بھی نہیں پتا تھا کہ اس مگرمچھ کا مقابلہ میں بھی کرسکتا تھا۔ میں نے کہا۔

”مجھے بزدل مت کہو۔ میں نہتا تھا، کیا کرتا؟ تم بھی تو

بھاگی تھیں گن اٹھانے کے لیے۔ میرے پاس گن ہوتی تو میں فائر ضرور کرتا۔''

یہ میرا جھوٹ تھا۔ پستول میرے پاس تھا لیکن میں جانتا تھا کہ اتنے بڑے مگرمچھ کا طاقتور رائفلیں کچھ نہیں بگاڑ سکی تھیں، بھلا عام بور کا یہ چھوٹا سا پستول کیا کرتا۔ تاہم میں نے دیکھا میرے اس جواب پر وہ کچھ خفیف سی ہو کر رہ گئی۔

''اس مگرمچھ کو ختم کرنا پڑے گا ورنہ یہ موذی ہم دونوں کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔'' میں نے شاید اس کے دل کی بات کہہ دی تھی۔ وہ رائفل نیچے کرکے بولی۔

''میں نے گردواس سے بھی یہی کہا تھا کہ میں اس موذی سے اپنے ساتھی سمورا کا بدلہ لوں گی۔ کاش، وہ میری بات مان لیتا۔''

''ہم دونوں مل کر اسے ٹھکانے لگائیں گے۔'' میں نے اس کے تیور نرم پڑتے دیکھ کر کہا۔ اس سے راہ و رسم بڑھانا ان حالات میں میرے لیے ضروری ہو گیا تھا۔ وہ مجھے سوچتی ہوئی نگاہوں سے گھورنے لگی۔

''اس مگرمچھ کو ہماری بُو لگ چکی ہے۔ اگر ہم بوٹ کو آگے بھی لے گئے تو یہ ہمارے تعاقب میں رہے گا۔ تم بھی اکیلی ہو گئی ہو اور میں بھی تنہا ہوں۔ یہاں سے بھی نکل جانا چاہتا ہوں مگر اس مگرمچھ کو ہلاک کیے بغیر ہم یوں بھی آگے کا سفر جاری نہیں رکھ سکتے۔'' میں نے پھر اس کی دکھتی رگ چھیڑی۔

وہ ذرا دیر تک پُرسوچ نگاہوں سے مجھے تکتی رہی پھر اس نے مجھے کیبن میں آنے کا اشارہ کیا۔ ہم اندر آ گئے۔

''اب سچ سچ بتا دو، کون ہو تم؟'' وہ اس بار نرمی سے بولی۔

''میں ایک قیدی ہوں۔ نیپال کی جیل توڑ کر بھاگا ہوں۔ نام تو اپنا میں تمہیں بتا ہی چکا ہوں۔'' اس پر رعب جمانے اور اپنی جھوٹی کہانی میں رنگ آمیزی کرنے کی غرض سے میں نے کہا۔ تب ہی میں نے دیکھا، اس جنگلی حسینہ کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ ابھری۔ قریب سے دیکھنے اور باتیں کرتے ہوئے مجھے وہ اور زیادہ حسین اور پُرکشش لگی۔ وہ واقعی جنگلی حسینہ تھی، شر و شباب کا نمونہ۔ ایک قیامت اور جنگجو...... جوان عورت۔

باہر دریا کے کناروں پر رات اترنے لگی تھی۔ لباس قدرے گیلا ہونے کے سبب مجھے سردی کا احساس زیادہ ہونے لگا۔

''اپنا لباس اتار دو۔'' اچھی طرح میرے ڈیل ڈول اور قد و قامت کا بغور جائزہ لینے کے بعد اس نے عجیب سا حکم دیا۔

''ہم...... مجھے سردی لگ رہی ہے۔'' میں نے قدرے سکڑ سمٹتے ہوئے چالاکی سے کہا۔

''میں کہتی ہوں لباس اتارو اپنا۔'' وہ برہمی سے بولی۔ ساتھ ہی قریب ٹکی رائفل کی جانب دوبارہ ہاتھ بڑھایا۔ ناچار میں نے اپنی جیکٹ کے بٹن کھولے اور اسے اتار دیا پھر قمیص اتار دی۔ بنیان بھی اتار دینے کو کہا گیا۔ اس کے بعد پینٹ کی باری آئی۔ جھجکتے ہوئے وہ بھی میں نے اتار ڈالی۔ اب میں صرف جانگیا میں تھا۔

میرا تندرست و توانا بدن اس وقت کسی ریسلر کی طرح چاندنی میں چمک رہا تھا اور دریا کے لہرے مارتے پانی کا عکس بھی جسم پر پڑتا عجیب دکھائی دیتا۔ شینا ایک بار پھر مجھے غور سے تکنے لگی۔ اس کے بعد قریب آئی اور باری باری میری جیکٹ اور قمیص کی تلاشی لیتی رہی۔

یکلخت کسی خدشے کے پیش نظر میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ رامو کا پستول میرے پاس تھا جبکہ میں اس سے یہ جھوٹ بول چکا تھا کہ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں لیکن اگلا لمحہ میرے لیے حیرت کا سبب بنا کیونکہ پستول اس کے ہاتھ نہیں لگا۔

یہ میری خوش قسمتی ہی رہی۔ شکر تھا کہ رامو کا پستول شاید کہیں گر گیا تھا، وہ اس کے ہاتھ نہیں لگا کیونکہ وہ اگر اس کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ مجھے ہی رامو کا قاتل سمجھتی اور اپنا دشمن بھی۔ اس نے مجھے دوسرا لباس پہننے کو دے دیا۔ یہ بلیو کلر کی جینز تھی۔ فل آستین کی شرٹ اور چمڑے کی جیکٹ، اس کے اندر سمور لگا ہوا تھا۔ نیا اور صاف ستھرا لباس پہن کر میں خود کو تازہ دم محسوس کرنے لگا۔ جوتے بھی بدل دیے گئے۔ خود اس نے بھی کیبن کے کونے میں جا کر لباس بدلا جو کم و بیش ویسا ہی تھا جیسا کہ پہلے اس کا تھا۔ اب اس نے اس کے اوپر کسی جانور کی کھال سے بنی سیاہ شال جس کے درمیان میں سوراخ تھا، وہ سر اور گلے سے گھما کر ڈال بلکہ پہن لی تھی۔

اتری ہوئی رات، کیبن میں ہلکی روشنی، باہر گہرا سکوت، اردگرد آبی ماحول، کشتی لنگر انداز...... جو دریا کے شور... میں کنارے سے ذرا پرے لنگر انداز ہلکورے لے رہی تھی۔ ایسے میں میرے سامنے سنہری بالوں والی جنگلی حسینہ پورے سرو قد کے ساتھ موجود تھی۔ اس نے بالوں میں اب سرخ ربن جیسی پٹی باندھ لی تھی۔ بغیر آستینوں کے شلوکے سے اس کی گوری سرخ و سپید مرمریں بانہیں عجب نظارہ پیش کر رہی تھیں۔ گھٹنوں سے نیچے سبک پنڈلیاں برہنہ تھیں اور ٹخنوں تک لانگ بوٹ تھے جس پر کھال کی جھالر بنی ہوئی تھی۔ یہ ایک عجیب طلسماتی اور کسی ایڈونچر

انگلش فلم کا منظر محسوس ہوتا تھا۔
اس نے مجھے کھانے پینے کو دیا۔ خود بھی شامل رہی۔ کھڑکی سے باہر نیم تاریک آبی ماحول پر اسرار بھرا سناٹا طاری تھا۔ اس موذی خونی مگرمچھ کے حملے کا خطرہ بھی دل کو دھڑکائے ہوئے تھا۔
''تم لوگ شاید کسی شکار وغیرہ پر نکلے تھے؟'' میں نے گفتگو کی ابتدا کی۔ مجھے پتا تو سب کچھ تھا مگر انجان بن کر یہ سوال کرنا بھی ضروری تھا۔
اس نے ایک گہری سانس لی اور مختصراً بولی۔ ''یہی سمجھو۔'' میرے پوچھنے پر اس نے مجھے اپنا صحیح نام بتا دیا جو ظاہر ہے میں پہلے ہی جانتا تھا۔
''تمہارے کتنے ساتھی اس خونی مگرمچھ نے ہلاک کر ڈالے؟'' میں نے پوچھا۔ میں اسے آہستہ آہستہ کھولنا چاہتا تھا تاکہ معلوم ہو سکے کہ وہ مجھ سے کتنا سچ اور کتنا جھوٹ بولتی ہے۔ پتا تو مجھے سب تھا۔
جواب میں وہ چند ثانیے پُرسوچ نگاہوں سے مجھے تکتی رہی۔ اس کے بعد کرسی سے اٹھی اور کھڑکی کی طرف جا کھڑی ہوئی پھر باہر دیکھتے ہوئے بولی تو اس کے لہجے میں دکھ کے علاوہ پریشانی کا عنصر بھی غالب محسوس ہوا۔
''میرے سارے ساتھی مارے گئے، صرف میں اکیلی بچی ہوں اور میرے سر پر اس وقت ایک بھاری ذمے داری آن پڑی ہے۔ مجھے ڈر ہے اگر میں بھی نہ رہی تو وہ ذمے داری کیسے پوری ہوگی؟''
''ذمے داری'' پر میرا دل دھڑکا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کس ''ذمے داری'' کی بات کر رہی تھی۔ میں انجان بن کر بولا۔
''ذمے داری...... کیسی ذمے داری؟ کیا تم کھل کر بات نہیں کرسکتیں؟''
وہ پلٹی۔ ایک بار پھر وہ وہیں کھڑی مجھے گھورتی رہی پھر چند قدم چلتے ہوئے میرے قریب آن کھڑی ہوئی۔ وہ کرسی پر نہیں بیٹھی پھر بولی۔
''مجھے شاید تمہاری مدد کی ضرورت پڑسکتی ہے۔''
میں نے دوستانہ انداز کی مسکراہٹ تلے اپنے سینے پر ایک ہاتھ رکھتے ہوئے اسی لہجے میں کہا۔ ''میں حاضر ہوں لیکن...... کیسی مدد؟''
وہ ایک گہری سانس کھینچ کر دوبارہ میرے سامنے والی کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے بولی۔ ''میرا خیال ہے پہلے ہمیں یہاں سے روانہ ہوجانا چاہیے۔ مجھے اس مگرمچھ سے بہت خوف آنے لگا ہے۔''

میں نے بھی زیادہ زور نہ دیا۔ سردست اتنا ہی کافی تھا کہ میں اس کے دل و دماغ میں کسی حد تک جگہ بنا چکا تھا۔ میں اٹھتے ہوئے بولا۔
''ٹھیک ہے۔ میں بوائلر روم میں جاتا ہوں۔ تم وھیل روم سنبھالو۔'' اس نے مسکرا کر ہولے سے اپنے سر کو جنبش دی۔
اگلے چند منٹوں بعد کشتی کا انجن بیدار ہوگیا۔ اس کی چمنی سے ''پھٹ پھٹ'' کی مخصوص آواز کے ساتھ سیاہ دھوئیں کے دھبے اٹھنا شروع ہوگئے۔ ایک مخصوص تعداد میں کوئلے جھونکنے کے بعد میں بوائلر روم سے نکل آیا اور وھیل روم کا رخ کیا۔
وہ وھیل سنبھالے ہوئے تھی۔ سامنے اسکرین کے نام پر ایک بڑا سا چوکھٹا تھا۔ اس کے پار دریا کا پانی۔ میں نے قدرے جھک کر باہر کا جائزہ لیا۔ تھوڑے فاصلے پر دریا کا چوڑا پاٹ دائیں جانب کو گھوم رہا تھا۔
''کچھ اندازہ ہے ہم کہاں ہیں اس وقت؟'' میں نے پوچھا۔ شینا نے کمپاس نکال لیا۔ وھیل کے آگے لکڑی کی سطح تھی۔ اس پر کمپاس رکھ کر اس نے کہا۔
''ہم نیپال سے نکل کر تبت کے علاقے تسانگ پو میں داخل ہونے والے ہیں مگر یہ سرحدی لحاظ سے ایک خطرناک زون ہے۔ خاص کر تمہارے لیے؟''
''میرے لیے؟'' میں بے دھیانی میں کہہ گیا تو وہ حیران ہوکر بولی۔
''تو کیا تمہیں نیپالی پولیس سے ڈر نہیں؟''
میں چونکا اور مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا کیونکہ میں نے اسے یہی بتایا تھا کہ میں نیپال کی جیل توڑ کر فرار ہوا ہوں۔ اس کی نظروں میں خود کو مجرم یا قیدی ظاہر کرنے میں ایک مصلحت تھی۔ اپنی کیفیت کو چھپاتے ہوئے میں بغیر چونکے مسکرا کر بولا۔
''نیپالی پولیس کے لیے میں ہمیشہ چھلاوا ثابت ہوا ہوں مگر تمہارے لیے کس بات کا خطرہ ہوسکتا ہے؟ بقول تمہارے، تم تو ایک شکاری پارٹی سے تعلق رکھتی ہو۔''
''میں نے جھوٹ بولا تھا۔'' وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔
''کیا؟'' میں نے اب کے دانستہ چونکنے کی اداکاری کی۔
''ہاں، ہم بھی غیرقانونی طور پر اور خفیہ راستوں سے سرحد پار کرکے آسام کے ساحلی علاقے دیبانگ اور پھر خلیج بنگال کی ایک کھاڑی سے گزر کر رانگاماتی دریا سے بنگال میں پیلی گھاٹ تک پہنچنا چاہتے تھے۔''

"اس پُرخطر سفر کا مقصد؟" میں نے پوچھا۔

"بہت گہرا ہے۔" شینا بولی۔ اب اسے کیا پتا تھا کہ میں اس سے انجان نہیں ہوں۔

"مقصد...... کیسا مقصد؟" میں نے پھر تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔

"جلد معلوم ہوجائے گا تمہیں۔"

جواب میں، میں بھی مسکرادیا۔ اس کی آنکھیں بڑی کشادہ اور گہری تھیں۔ کبھی کبھی میری طرف گھورتے ہوئے اس کی ان غزال چشم میں مجھے ایک عجیب سی چمک ابھرتی محسوس ہوتی۔ میں اپنا دھیان ہٹا کر بغیر شیشے کی ونڈ اسکرین کے چوکھٹے سے باہر جھانکنے لگتا۔ خود کو اس کی نگاہوں میں بدستور انجان بنے رہنے کی اداکاری جاری رکھتے ہوئے ذرا دیر کی خاموشی کے بعد میں نے کہا۔

"تم لوگ پھر ضرور کوئی اسمگلر ہو۔" میری بات پر وہ نقرئی انداز میں ہنس پڑی۔ اس نے اپنے سیاہ بالوں کو جھٹکا اور کھلکھلاتے لہجے میں بولی، جیسے میری الجھن سے حظ اٹھارہی ہو۔

"اس ہنسی کا کیا مطلب ہے؟" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"اس لیے کہ تم نے غلط نہیں سمجھا۔ ہم واقعی ایک اہم شے دوسری جگہ منتقل کرنا چاہتے ہیں۔"

"کون سی شے؟"

"آؤ، پتا نہیں کیوں تم پر بھروسا کرنے کو دل کرتا ہے۔" وہ دلبرانہ انداز میں مجھ سے مسکرا کر بولی اور ساتھ ہی اپنے ساتھ آنے کا بھی کہہ ڈالا۔

شینا مجھے بوائلر روم میں لے آئی۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھے بومبورگا کا وہ منحوس مجسمہ دکھانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ تاہم میں انجان بنا اس کے ساتھ چلتا رہا پھر جہاں وہ مجسمہ رکھا تھا، اس گوشے میں لے آئی۔ اس کے بعد مجسمے سے سیاہ موٹا چادر نما کپڑا ہٹایا تو میں نے چونکنے کی اداکاری کے ساتھ ہی منہ بسور کر کہا۔

"یہ کیسی عجیب سی بلا ہے؟"

"خشش......!" شینا نے مجھے ٹوکا۔ "یہ ہمارے دیوتا بومبورگا کا مجسمہ ہے۔ ہم شروپا قبیلے والے اس کی پوجا کرتے ہیں۔ یہی ہمارے لیے عذاب اور خیر کا سبب ہے۔"

"شروپا" کے ذکر پر میں اندر سے چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ میرا خیال درست ثابت ہوا تھا کہ پہلے ہی میں نے اس کی اور سمورا کی وضع قطع بھانپ کر اندازہ لگالیا تھا کہ ان دونوں کا تعلق سندربن میں رہنے والے ایک جنگلی قبیلے شروپا سے ہوسکتا ہے کیونکہ اس بارے میں، میں جوجی کے ایک ساتھی اقبال سے زبانی سن چکا تھا۔ تاہم میں نے دل ہی دل میں اس کے لغو خیالات اور مجسمے پر لعنت بھیجی اور بولا۔

"تو پھر اس مجسمے کو کوئی چوری کر گیا تھا؟"

"ہاں، یہ اب بھی بہت سے لوگوں کے لیے نادر ونایاب شے کی حیثیت رکھتا ہے۔ بہت سی مجرم تنظیمیں اسے ہتھیانے کے درپے ہیں۔ کہا یہی جاتا ہے کہ اسے افریقا کے صحرا کالاہاری سے دریافت کیا گیا تھا اور بعد میں سرکاری طور پر مصر کے میوزیم میں پہنچادیا گیا تھا۔" شینا بتانے لگی۔ "مگر یہ سب ملکیت جتانے کے لیے جھوٹ بولا گیا ہے۔ اسے کچھ مہم جو لوگوں نے جو سندربن میں بنگال ٹائیگرز کا شکار کرنے آئے تھے، چوری کیا تھا۔"

"ہم......!" میرے منہ سے نکلا اور کسی خیال کے تحت پوچھا۔

"تو کیا تم اسی ذمے داری کی بات کررہی تھیں؟"

"ہاں۔" اس نے میری طرف دیکھ کر اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور واپسی کا اشارہ کیا۔

"میں درحقیقت شروپا قبیلے کے سردار آٹوما کی بیٹی شینا ہوں۔"

یہ میرے لیے نیا انکشاف تھا۔ میں چونکے بنا نہ رہ سکا۔ میں اس کی سبک چال دیکھتا ہوا پیچھے پیچھے چلتا بوائلر روم سے باہر اوپر آ گیا۔

"تو اب تم اسے واپس سندربن لے جانا چاہتی ہو؟" میں اس کے برابر میں چلتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔" اس نے جواب دیا۔ اس کا رخ وہیل روم کی طرف تھا۔ بوٹ سبک رفتاری سے چلی جارہی تھی۔

"کیا تمہارے اور ساتھی بھی وہاں منتظر ہیں؟ میرا مطلب ہے تمہارے ہی قبیلے کے لوگ؟" کسی خیال کی تصدیق کے لیے میں نے سوال کیا۔

"وہاں میرے قبیلے کے لوگ بے چینی سے میرا اور اس مجسمے کا انتظار کررہے ہیں۔" اس نے جواب دیا مگر میں سمجھ رہا تھا کہ وہ اب بھی کچھ بتانے سے کنی کترا گئی ہے۔ میں نے سلیقے سے اسے سچ بولنے پر مجبور کرنے کے لیے کہا۔

"لیکن میں نے تمہارے ساتھی (گرداس) کو دیکھا تھا جب وہ مگرمچھ کے نرغے میں تھا۔ وہ تو تمہارے قبیلے کا نہیں لگتا تھا۔ انڈین لگا تھا مجھے۔"

"ہاں، کچھ بنگالی ہندو ناگا بستی کے رہائشی ہیں۔ یہ بستی ہمارے قبیلے کے قرب میں واقع ہے۔ ہمارے ان

سے اچھے تعلقات ہیں۔ اس کا نام گردواس تھا۔ وہ اور اس کے چند ایک ساتھی میرے ساتھ اس مہم میں شامل تھے۔''

میرے جی میں آئی کہ میڈم مچھی اور رانگا لنگڑا کے بارے میں دریافت کروں لیکن خطرہ تھا کہ وہ شبہے میں پڑ جاتی کیونکہ ان لوگوں نے انہیں میرے خطرے سے بھی ضرور آگاہ کیا ہوگا۔ ان دونوں کا اس کے سامنے ذکر کرنا بھی میرے لیے خطرناک ہوتا۔ میں نے دیکھا وہ ایک دم فکر مند سی نظر آنے لگی۔ میں نے بغور اس کے حسین چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''کیا بات ہے، تم کچھ پریشان سی ہو گئی ہو؟''

''ہاں، میں اپنے بہادر ساتھیوں کے بغیر اتنی بڑی ذمے داری کے ساتھ تنہا رہ گئی ہوں۔''

''فکر مت کرو۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ ہم دونوں مل کر یہ ذمے داری نبھائیں گے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ اس نے یکدم نگاہیں اٹھا کر میری جانب دیکھا۔ اس کی گھنیری پلکوں تلے آنکھوں میں وہی عجیب سی چمک ابھری۔ اس کے نرم و گداز ہونٹوں میں ارتعاش سا ابھرا اور بے اختیار اس نے میرے گلے میں اپنی مرمریں بانہوں کا ہار ڈال دیا اور میں سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ اس نے میرا بوسہ لے لیا۔

مجبوری تھی، یہ خرافات برداشت کرنا پڑی مجھے...... لیکن اس جنگلی حسینہ کی قربت ایک عام جوان مرد کو بے خود اور آپے سے باہر کر دینے کے لیے کافی تھی۔

''اگر تم نے میرا آخر تک ساتھ دیا اور ہم دیوتا بومبورگا کا مجسمہ بخیریت منزل تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے تو یاد رکھنا تم پورے شرو یا قبیلے کے ہیرو بن جاؤ گے۔ میرا سردار باپ تمہیں قبیلے میں ایک بہت بڑی معتبر شخصیت بنا دے گا۔ تم وہاں بہت عیش اور آرام سے ہمیشہ رہو گے بلکہ ہو سکتا ہے میرا سردار باپ تمہاری شادی مجھ سے کروا دے۔'' کہتے ہوئے شینا کے چہرے پر شرم کی ایک روایتی سی لالی چمکی۔ میں نے دل میں لاحول کا ورد کیا مگر اوپری دل سے خوش ہو کر بولا۔

''اچھا، پھر تو یہ میرے لیے خوش قسمتی کی بات ہوگی۔ میری بھی پولیس سے ہمیشہ کے لیے جان چھوٹ جائے گی پھر تمہاری جیسی حسین لڑکی میری بیوی بن جائے تو اور کیا چاہیے مجھے لیکن......'' میں نے دانستہ آخر میں جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک دم خاموشی اختیار کر لی۔ وہ فوراً تڑپ کر بولی۔

''لیکن کیا...... کیا میں تمہیں پسند نہیں ہوں؟''

''نن...... نہیں، یہ بات نہیں ہے۔'' میں ایک دم بولا۔ ''تمہاری جیسی حسین لڑکی اور قبیلے میں عزت و احترام اور عیش و آرام بھری زندگی کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔'' میری بات پر وہ پھر ''چیکو'' ہونے لگی تو میں نے اس سے دور ہی رہنے کے لیے بہانہ بناتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے ابھی تو فی الحال ہمیں اس خونی مگرمچھ سے خطرہ ہے۔ اس کے بعد ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''نہیں، خطرات بہت ہیں راستے میں۔'' وہ بولی۔

''کن سے خطرہ ہے تمہیں؟''

''ہیں کچھ دشمن اور مخالف گروہ۔''

''تب پھر ہمیں ان سے بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہوگی۔ ویسے کون لوگ ہیں، تم جانتی ہو انہیں؟''

''ہاں، ایک صحرائی عقاب والے ہیں۔ یہ عالمی جرائم پیشہ گروہ ہے اور اٹلی سے تعلق...... رکھتا ہے جبکہ دوسرا ایک ایشیائی ہے۔ ہمیں اس سے زیادہ محتاط رہنے کا کہا گیا تھا۔''

''ایشیائی دشمن'' کے ذکر پر میں چونکا۔ میں نے کریدا۔

''ایشیائی دشمن...... کون؟''

''سراب...... نہیں...... سہراب نام ہے اس کا۔ سنا ہے وہ بہت طاقتور ہے۔ کسی دیو مالائی داستان کے ہیرو کی طرح بلکہ...... بلکہ......'' کہتے ہوئے وہ ایک دم غور سے مجھے گھورنے لگی۔ میرے اوسان خطا ہونے لگے۔ جلد بازی میں شاید مجھ سے کوئی بھول ہو گئی تھی۔

''بالکل تمہاری طرح۔ تمہارا جسم بھی کسی طاقتور ہیرو جیسا ہی نظر آتا ہے۔'' اس نے جیسے بات مکمل کی تو میں نے اس کی بات کو ہنسی میں اڑاتے ہوئے کہا۔

''کہیں وہ دشمن میں ہی تو نہیں ہوں۔ تمہیں مجھ سے محتاط رہنا چاہیے۔''

بڑا رسک لے کر میں نے اس سے یہ بات کہہ دی تھی، مقصد ہنسی مذاق میں۔ وہ بھی یہی سمجھ کر مترنم انداز میں ہنس پڑی۔

''وہ دشمن جو میری طرح کا ہے، کیا تم نے اسے دیکھا ہے؟ میرا مطلب ہے اس کی کوئی تصویر وغیرہ یا اور دوسرے دشمن؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، کسی کو نہیں دیکھا۔ صرف بتایا گیا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''کس نے بتایا ہے؟''

''میرے ساتھیوں نے۔''

"تمہارے ساتھی...... وہ تو سب مر چکے؟" میں نے اسے کھولنے کی غرض سے کہا۔

"نہیں، اصل ساتھی...... میرے قبیلے کے لوگ اور ہمارے پڑوسی دوست ناگا سے تعلق رکھنے والے۔"

"تو یقیناً تمہارے پاس کوئی وائرلیس سسٹم ہوگا؟"

"تھا، اب نہیں ہے۔ وہ تباہ ہوگیا لیکن ہمیں پہلے سے بتا دیا گیا تھا ان کے بارے میں۔" کہتے ہوئے وہ پہلی بار سنجیدہ ہوکر ذرا دیر خاموش ہونے کے بعد مستفسر ہوئی۔

"لیکن تم یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"اس لیے تاکہ میں جان سکوں کہ آگے ہمیں کن کن لوگوں سے واسطہ پڑنے والا ہے اور اس کی تیاری کرلی جائے۔" میں نے سکون سے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر اوس سی پڑ گئی۔ وہ پھر پہلی والی پریشانی اور تشویش میں مبتلا ہوگئی اور بولی۔

"ہاں، لیکن اب تو میرے سارے ساتھی مارے گئے۔ کچھ شاید رامویا شمو کی غداری کے سبب ہلاک ہوئے اور باقی اس خونی مگرمچھ کا شکار ہوگئے۔ میں اکیلی رہ گئی۔ اب تم ملے ہو لیکن تم نے تو میری مدد کرنے کا وعدہ کیا ہے نا؟"

وہ ایک دم معصوم سی نظر آنے لگی۔ میں مسکرا دیا اور پیار جتانے کی غرض سے اس کے لمبے ریشمی بالوں کی ایک لٹ سے کھیلتے ہوئے محبت بھرے انداز میں بولا۔

"میں اپنے وعدے پر قائم ہوں لیکن میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ ہم جانے انجانے دشمنوں کے ہاتھوں بے موت نہیں مارے جائیں۔ اس کی پہلے سے تیاری رکھیں۔ کیا تمہارے پاس کوئی اسلحہ نہیں ہے؟"

"بس ایک شکاری رائفل ہے اور ایک پستول۔" وہ بولی۔

"پستول تو میرے پاس بھی تھا مگر......" میں اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ وہ مل گیا۔ میں نے اسے دکھا دیا۔ وہ حیران ہوئی۔ پہلے اسے میرے لباس کی تلاشی میں نہیں ملا تھا۔ وہ جھینپ کر مسکرا دی۔

"کیا کشتی میں سفر کرنا ضروری ہے؟" تھوڑی دیر کے توقف کے بعد میں نے پوچھا۔ "میرا مطلب تھا کہ اگر ہم باقی کا سفر خشکی کے راستے کرتے...... کیونکہ ہمارے دشمنوں کو ہماری راہ معلوم ہو چکی ہے۔"

میری بات پر وہ چند ثانیے کے لیے پرسوچ سی خاموشی میں مستغرق رہی پھر نفی میں سر ہلا کر بولی۔

"نہیں، ہمارے لیے یہی راستہ محفوظ اور آسان ہے جو سیدھا ہمیں منزل تک پہنچا سکتا ہے۔ خشکی کے راستے پر بڑی مشکلیں پیش آسکتی ہیں پھر مجسمہ کہاں کہاں اٹھائے پھریں گے؟ سواری کا کیسے بندوبست ہوگا؟ سرحدیں اور راستوں کی بندش الگ مسئلہ ہوگی۔ اگرچہ سرحدی معاملات اس آبی گزرگاہ میں بھی پڑ سکتے ہیں مگر خشکی کے مقابلے میں یہ پھر بھی آسان ہے۔ اس لیے بھی کہ میں ان چھوٹی بڑی آبی گزرگاہوں سے بہت اچھی طرح واقفیت رکھتی ہوں۔"

"ہمم۔" میرے منہ سے پرسوچ انداز میں برآمد ہوا۔

☆☆☆

ہمارا سفر جاری رہا۔ شکر تھا کہ پھر دوبارہ اس خونی مگرمچھ سے واسطہ نہیں پڑا لیکن آگے ایک اور مشکل آن کھڑی ہوئی تھی۔ ایک مقام پر معاون دریا نے ہمیں ایک تیز رو ندی میں دھکیل دیا۔ وہ پہاڑی گزرگاہوں اور کہیں کہیں سے طوفانی آبشاروں کی صورت میں گزر رہی تھی۔

ہمارے اردگرد کہیں کہیں سرسبز اور زیادہ تر برفانی پہاڑ آن کھڑے ہوئے تھے۔ ایک پورا گھنا جنگل میں نے برف سے ڈھکا ہوا دیکھا۔ تب ہی شینا نے مجھے بتایا کہ ہم اس ندی کی وجہ سے تبت کے سرحدی محافظوں کی نظروں میں آنے سے بچ گئے ہیں۔

اب ہم تسانگ پو میں تھے۔ نیپال بھی کراس کر چکے تھے۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ معاون دریا سے اس طغیانی زدہ ندی میں ہاؤس بوٹ دھکیلنے کا مقصد شینا کا ہی تھا۔ گویا یہ اسی کی دانستہ حرکت تھی لیکن اب بوٹ کو سنبھالنا دشوار ہو رہا تھا۔ اس مصیبت سے شینا خود پریشان دکھائی دی۔ میں خود بھی ادھر ڈول رہا تھا اور کبھی ادھر۔ ایک بار بوٹ اچھلی تو میں عرشے سے فرش پر آن گرا۔ شینا وھیل روم میں تھی۔ اس نے وہیں سے چلا کر کہا۔

"پرتم! بوائلر روم میں جاؤ، انجن بند کردو اور مجسمہ باہر نکال لاؤ۔" نہ جانے اس کا اب کیا ارادہ تھا۔ میں اس وقت روم کے پاس ہی تھا۔ اندر داخل ہوکر بولا۔

"یہ کام تم کرسکتی ہو، مجھے انجن بند کرنا نہیں آئے گا۔ وھیل میں سنبھال لوں گا۔"

وہ سمجھ دار تھی۔ اس نے بحث میں وقت ضائع نہیں کیا اور چلی گئی۔ میں نے وھیل سنبھال تو لیا مگر سمجھ نہیں آیا کیا کروں۔ ندی دریا سے کم چوڑے پاٹ والی تھی۔ پہلے ہم پانی کے مخالف سمت میں دخانی انجن کے زور سے آرام سے سفر کر رہے تھے لیکن ندی ہمارے ساتھ رواں دواں تھی اور اس پر مستزاد یہ کہ اس کا بہاؤ بہت تیز ہی نہیں، کسی حد تک طوفانی بھی تھا۔ وجہ اس کی یہی تھی کہ یہ کوئی بارانی ندی یا نالا

تھا جو پہاڑوں، کھالوں اور گھاٹیوں سے گزر رہا تھا اور کسی مقام پر تو یہ آبشار کی طرح سیدھا نیچے جا رہا تھا۔

چھوٹی ربڑ کی کشتی یا بوٹ کے لیے کوئی مسئلہ نہ ہوتا شاید لیکن یہ پوری بڑی ہاؤس بوٹ تھی۔ کسی وقت بھی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو سکتی تھی یا پھر اچھل اچھل کر الٹ سکتی تھی۔

شینا انجن بند کر آئی اور ساتھ ہی مجسمہ بھی کندھے پر اٹھا لائی۔ وہ خاصا بھاری معلوم ہوتا تھا کیونکہ شینا اسے دشواری سے اٹھائے ہوئے تھی اور بری طرح ہانپ بھی رہی تھی۔

"وھیل چھوڑو، میرے ساتھ آؤ، جلدی۔" شینا نے کہا اور وھیل کو ایک جگہ ایڈجسٹ کر کے میں اس کے پیچھے آیا۔ اس نے اسٹور سے مجھے کلہاڑی اور لمبے پھل والا چھرا لانے کو کہا، وہ میں لے آیا۔ اس کے بعد ہم دنبالے میں آ گئے۔

شینا نے مجھے یہ بتا کر لمحہ بھر کو حیران کر دیا کہ اس بوٹ میں ایک ربڑ کی کشتی دنبالے کی بیرونی دیوار سے موٹے رسوں سے بندھی ہوئی ہے۔

"پہلے اسے اوپر کھینچ لو۔" کہتے ہوئے اس نے مجسمہ رکھا۔ اس نے مجھ سے چھرا لیا، میرے پاس کلہاڑی تھی۔ رسے کھولنے کا وقت نہ تھا۔ ہم نے انہیں کاٹ ڈالا اور کشتی اوپر کھینچ لی۔ اسی وقت شینا سامنے دیکھ کر چلائی۔

"پرتم! جلدی کرو، آگے یہ ندی نیچے گر رہی ہے۔ ہماری بوٹ الٹ جائے گی۔" میں اس کی بات سن کر گھبرا گیا۔ سامنے دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ شرشر کرتا تیزی سے بہتا پانی بالکل نیچے کی سمت گر رہا تھا۔ یوں جیسے کوئی پہاڑی آبشار ہو۔

شینا نے نہ جانے کس طرح مجسمہ ایک رسی کی مدد سے اپنے جسم سے باندھ لیا۔ وہ اس کے وزن سے کافی جھک گئی تھی۔ ساتھ ہی اس نے ربڑ کی کشتی کو تھاما۔ یہی میں نے بھی کیا۔ کشتی کے ساتھ ربڑ پلاسٹک کے چپو بھی تھے۔

ابھی ہم اسے پانی میں اتارنے کے لیے اٹھا ہی رہے تھے کہ چشم زدن میں گرتے پانی کی حد قریب آ گئی۔ شینا کے حلق سے مارے خوف کے چیخ نکل گئی۔ میرے اوسان خطا ہونے لگے۔ ہمیں مزید موقع ہی نہ مل سکا اور اگلے ہی لمحے ہم نے ہاؤس بوٹ کو یوں حرکت کرتے دیکھا جیسے وہ عمودی ہو کر زمین میں دھنسنے والی ہو۔ ہم بوٹ سے کھلونوں کی طرح اچھل کر کئی فٹ نیچے گرنے لگے۔

پانی کی سطح موٹی چوڑی دھار کی طرح ہماری ہم رکاب تھی۔ بوٹ بھی اسی طرح نیچے گرنے لگی۔ ربڑ کی کشتی ہمارے سر پر آ رہی۔ ایک قیامت سی تھی اور بربادی کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اس خطرناک صورت حال پر کلمہ تو ضرور پڑھ ہی لیا تھا پھر زوردار چھپاکے سے ہم نیچے ایک نئی آبی گزرگاہ بناتے ہوئے دریا میں جا گرے۔ ہاؤس بوٹ تو قریبی پہاڑی سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی۔ ہم پانی میں جا گرے۔ ربڑ کی کشتی ہمارے اوپر آ رہی لیکن دریا کے چوڑے پاٹ میں گرتے ہی سکون کی کیفیت ہو گئی کیونکہ دریا نیچے ایک دلفریب اور سرسبز پہاڑی وادی کے درمیان پُرسکون روانی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔

میں نے اپنے اوسان بحال رکھے اور جلد ہی مجھے اپنے قریب ہی ربڑ کی کشتی الٹی پڑی تیرتی نظر آ گئی لیکن شینا غائب تھی۔ تباہ حال ہاؤس بوٹ کے ٹکڑے بکھرے تیرتے نظر آئے۔ مجھے ابتدا میں غوطے لگ رہے تھے، اب میں نے سنبھل کر بوٹ کو تھام لیا تھا اور اِدھر اُدھر گردن موڑ کر شینا کو آوازیں دے رہا تھا۔

تب ہی اچانک مجھے یاد آیا کہ شینا نے وہ بھاری مجسمہ اپنے جسم سے باندھ لیا تھا تاکہ ربڑ کی کشتی میں اسے بہ آسانی بار کیا جا سکے مگر بدقسمتی سے اسے موقع ہی نہ مل سکا اور وہ شاید اسی مجسمے کے زیر بار تہ آب ہو چکی تھی۔

فی الحال شینا اور مجسمہ دونوں ہی میرے لیے اہم تھے اسی لیے میں نے شینا کو تلاشنے اور اس کی جان بچانے کا ارادہ کرتے ہوئے پانی میں غوطہ لگایا۔ بھاگی بوٹی کی کرامت تھی کہ میں پانی کے اندر بھی کسی حد تک دیکھ سکتا تھا اور حبس دم بھی میرا کافی حد تک طویل ہوتا۔

پانی ندی نالوں کی "مکسنگ" کی وجہ سے خاصا گدلا ہو رہا تھا۔ کہیں صاف بھی تھا۔ نیز آبی پودے اور نباتات کی بھی بہتات نظر آئی جس سے اندازہ ہوا کہ دریا زیادہ گہرا نہ تھا۔ میں اِدھر اُدھر گہرائی میں تیرتا شینا کو تلاشتا رہا مگر وہ مجھے کہیں دکھائی نہ دی۔ یا تو وہ ڈوب کر کسی گہرے آبی گڑھے میں جا گری تھی یا پھر اندر ہی اندر بہہ کر دور چلی گئی تھی۔

میں مایوس ہو کر ابھی اوپر ہی اٹھنے لگا تھا کہ ایک آبی جھنڈ میں مجھے انسانی ٹانگیں دکھائی دیں۔ میں فوراً لپک کر وہاں پہنچا تو دیکھا شینا پودوں میں پھنسی ہوئی تھی۔ مجسمہ اس کی پشت سے بندھا ہوا تھا۔ وہ خود بے حس و حرکت تھی۔ میں نے لپک کر اسے جا لیا اور اسے مجسمے سمیت اوپر کھینچ کر تیزی سے تیرنا شروع کر دیا۔

ربڑ کی کشتی کسی پیالے کی طرح الٹی پانی کی سطح پر تیر رہی تھی۔ میں نے اسے سیدھا کیا اور پھر اس کے سہارے اوپر آ گیا۔ جلدی جلدی شینا کے جسم سے وہ مجسمہ الگ کیا۔ اس کے پھیپھڑوں سے مخصوص طبی طریقے سے پانی نکالنا تھا

جو پانی میں تیرتی ربڑ کی اس بوٹ میں ممکن نہ تھا۔ اس کے لیے میں جلدی جلدی چپو چلا کر بوٹ کو کنارے پر لایا اور پھر شینا کو زمین پر لٹا کر اس کے سینے پر دونوں ہاتھوں کا دباؤ ڈالا اور پھر اس کا منہ کھول کر آکسیجن دی۔ دو، تین، چار بار یہ عمل دہرایا تو اچانک اس کے ساکت سینے میں بھونچال سا آیا اور وہ اوپر کو اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی پانی کی دھار اس کے منہ سے برآمد ہوئی اور اس نے تیزی سے سانس لینا شروع کر دیا۔ ذرا دیر بعد ہی اس کی سانسیں بحال ہو گئیں۔

''شکر ہے اللہ کا تمہیں ہوش تو آیا۔'' میں نے اس کا حسین چہرہ جو موت کی قربت سے کملا گیا تھا، سہلاتے ہوئے نرمی سے کہا۔ ''تم مرتے مرتے بچی ہو۔'' پھر میں نے اسے بتایا کہ کس طرح میں نے اسے مجسمے سمیت پانی کی تہ سے باہر نکالا تھا۔

وہ اپنی بڑی بڑی پرکشش آنکھوں میں ممنونیت کے چراغ روشن کیے مجھے چند لمحے تکتی رہی اور پھر گھاس اور ریت پر بیٹھے بیٹھے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''پر تم! تم بہت بہادر ہو اور وفادار بھی لیکن......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

''لیکن کیا؟'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''تم نے ابھی کس کا شکر ادا کیا تھا؟''

''اللہ کا۔'' بے اختیار میرے منہ سے ادا ہوا حالانکہ میں نے اپنا جو نام بتایا تھا وہ ہندوانہ تھا۔

''تم مسلمان ہو؟'' اس نے گہری گہری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''الحمدللہ!'' میں نے کہا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ جنگلی عورت جانتی تھی کہ مسلمان ہی اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔

''پر تمہارا نام تو ہندوؤں جیسا ہے۔ مسلمانوں کے نام تو عبدل، عبداللہ، رحیم اور عبدالرحمان جیسے ہوتے ہیں۔''

''تمہیں یہ سب کیسے پتا؟ تم تو جنگلوں کی رہنے والی لڑکی ہو؟'' اس بار میں نے اس سے پوچھا۔ میرے چہرے پر ہلکی مسکراہٹ تھی۔ وہ بھی دھیرے سے مسکرائی اور بولی۔

''اس لیے کہ ہمارے قبیلے کے پڑوس میں جو بستی ہے جس کا میں نے تم سے ذکر بھی کیا تھا، وہاں کچھ مسلمان لوگ آباد ہیں۔ ان میں ایک عمر رسیدہ سا شخص بھی رہتا ہے۔ بستی کے مسلمان اس کی بہت عزت کرتے ہیں بلکہ اس کا اخلاق اس قدر اچھا ہے کہ کیا ہندو، کیا مسلمان اور عیسائی، سب ہی انہیں عزت اور احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کا نام رحم...... نہیں، رحیم...... رحیم شاہ ہے۔ اس نے وہاں عبادت گاہ بھی بنا رکھی ہے۔ کیا کہتے ہیں، شاید...... مس...... مسج......''

''مسجد۔'' میں نے فوراً اس کا جملہ مکمل کیا۔

''ہاں، مسجد۔'' وہ ایک دم بولی۔ ''اللہ کیا تمہارا دیوتا ہے کوئی؟ کیا اس کا بھی ہمارے دیوتا بومبورگا کی طرح کوئی مجسمہ ہے؟'' اس نے بڑی سادگی سے پوچھا۔

''میرا اللہ دیوتاؤں کا بھی خدا ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ پوری کائنات اور دنیا میں بسنے والی مخلوقات بلکہ جو ہماری نظروں سے اوجھل بھی ہیں، وہ ان سب کا مالک وخالق ہے۔ ہم سب کا وہی ایک پالنے والا ہے اور اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ وہ ایک اکیلا ہے۔ اس کی حقیقت جاننے کے لیے کسی پتھر کے بے جان مجسمے کی ضرورت نہیں۔ وہ ہر جگہ مجسم حقیقت کے ساتھ موجود ہے۔ تمہارے اندر، میرے اندر، یہ آسمان، زمین، فضا، یہ درخت، پھل، پودے، ہر جاندار، بدلتے دن رات، بدلتے موسم، ابھرتے سورج اور ڈوبتے چاند، چمکتے ستارے، ہمارا پیدا ہونا، ہمارا مرنا، یہ سب اسی ایک اللہ کی نشانیاں ہی تو ہیں۔''

''اوہو...... تم بھی بالکل اسی بوڑھے رحیم شاہ کی طرح باتیں کرتے ہو۔'' شینا نے ہولے سے مسکرا کر کہا۔

''نہ وہ بزرگ غلط کہتے ہیں نہ میں۔ تم نے اللہ کے بارے میں پوچھا میں نے تمہیں بتا دیا۔'' میرے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

دن نکلا ہوا تھا۔ آسمان نیلا اور شفاف ہو رہا تھا۔ دور قریب برف کی پہاڑیاں اور ان کی برفیلی ڈھلانوں پر موجود سبزہ بہت بھلا نظارہ پیش کر رہے تھے۔ ہر سو ایک گہرے سکوت کی کیفیت تھی۔ ذرا ہی پرے جنوب مشرقی سمت وہی طغیانی کا شور ابھر رہا تھا جو پہاڑی بلندی سے آبشار کی صورت میں نیچے دریا میں گر رہی تھی۔

میرے اور شینا کے درمیان تھوڑی خاموشی رہی لیکن میں نے دیکھا وہ قریب رکھے اس بدہیئت بومبورگا کے مجسمے کو سوچتی نگاہوں سے تکے جا رہی تھی۔ میں نے اس مجسمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شینا سے کہا۔

''معاف کرنا شینا! تمہیں شاید میری بات بری لگے مگر یہ سچ ہے کہ یہ صرف انسانی ہاتھوں سے بنایا ہوا ایک بے جان مجسمہ ہے جو حرکت کرنے سے بھی قاصر ہے۔ تم خود سوچو ذرا، اپنے ہی ہاتھوں سے بنایا ہوا مجسمہ بھلا خدا ہو سکتا ہے؟''

''لیکن ہمارے مذہبی پیشوا کہتے ہیں کہ دیوتا بومبورگا کی روح اس کے اندر آ جاتی ہے اور وہ ہماری باتیں، فریادیں سنتا ہے۔'' شینا سنجیدگی سے بولی۔

"تمہارا دیوتا بھلا اس قدر محتاج ہے ایک پتھر کے بے جان مجسمے کا؟ جسے لوگوں کی فریادیں سننے کے لیے ایک پتھر کے مجسمے کی ضرورت پڑتی ہے ورنہ وہ قاصر رہتا ہے؟"

"یہ ہمارا عقیدہ ہے۔ اس طرح ہم اسے احترام دیتے ہیں۔" اس نے اپنی دلیل پیش کی جو کافی حد تک ہندوانہ عزم کی پیش روئی کرتی تھی۔ میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"احترام دینے کا یہ طریقہ سراسر غلط ہے۔ اس طرح خدا کی توہین ہوتی ہے۔ خدا تو ہر جگہ ہے۔ اسے کسی مجسمے میں سمانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ بس، اس پر سچے اور صدقِ دل سے ایمان لے آؤ اور اس کی یاد دل و دماغ میں رکھ کر عبادت کرتے رہو۔"

"تم ہمارے دیوتا بومبورگا کے خلاف ہو؟" شینا نے کچھ شاکی نگاہوں سے میری طرف گھورتے ہوئے پوچھا۔

"میں کسی کے خلاف نہیں ہوں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "ہر کسی کا اپنا اپنا عقیدہ ہے لیکن جو بات سچ ہے، وہ ضرور کہنا چاہیے۔"

"خواہ کوئی مانے یا نہ مانے؟ تو کیا تم زبردستی......"

"ہرگز نہیں، ہمارے دین اسلام میں جبر نہیں ہے۔"

"تمہاری باتیں غور کرنے والی ہیں۔" بالآخر شینا نے کہا۔

"اس لیے کہ تمہارے اندر سچائی، سچی راہ کو تلاش کرنے کی جستجو ہے۔ تم اندھی تقلید کی قائل نہیں لگتی ہو۔ یہ ایک اچھی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "میں کوئی عالم دین تو نہیں نہ ہی مجھے زیادہ معلومات ہیں لیکن ایک مسلمان کی حیثیت سے جس قدر بنیادی باتیں مجھے معلوم تھیں، وہ میں نے بتادیں۔ مزید اگر تم انہی بزرگ رحیم شاہ کے پاس جاتی رہو تو وہ تمہیں اصل خدا کی حقیقت ثبوت کے ساتھ بتادیں گے لیکن اس کے لیے دل میں پہلے خدا پر ایمان لانے کا جذبہ موجود ہونا چاہیے۔"

شینا نے خاموش ہو کر میری طرف سے منہ موڑ لیا اور ایک بار پھر قریب زمین پر رکھے بومبورگا کے مجسمے کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر کھوئے کھوئے سے اور دھیمے لہجے میں بولی۔

"مجھے بہر حال جو ذمے داری ملی ہے، میں اسے ضرور پورا کروں گی۔"

"اور میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔" میں نے فوراً کہا۔ وہ میری طرف دیکھ کر پوری تسلی کے ساتھ مسکرائی۔

اس کے بعد میں نے بھی فی الحال مزید کچھ نہیں کہا اور موضوع بدل کر بولا۔ "بھوک اور پیاس ستانے لگی ہے۔ یہاں ضرور پانی اور شکار مل جانا چاہیے یا پھر جنگلی پھل وغیرہ۔"

وہ میری طرف متوجہ ہوئی۔ "ہاں، بھوک مجھے بھی لگ رہی ہے۔ سردی بھی ہو رہی ہے۔ میرا خیال ہے ہم تسانگ پو کے علاقے میں داخل ہو چکے ہیں۔"

"تمہیں معلوم ہوگا، میں تو کچھ نہیں جانتا۔" میں نے کہا۔ "ویسے کیا یہاں سرحدی محافظوں کا کوئی خطرہ نہیں؟"

"وہ خطرہ ہماری بوٹ...... کی قربانی نے ٹال دیا ہے۔" وہ بولی۔

"ہم...... میں سمجھا۔" میں نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔

اس کے بعد میں اٹھ کھڑا ہوا اور اردگرد کا جائزہ لیا۔ شینا نے اپنے لباس کے اندر سے کھال کے کسی تھیلے میں لپٹی ہوئی اشیاء نکالیں اور گھاس والی زمین پر پھیلا دیں۔ ان میں نقشہ اور نہ جانے کیا الم غلم تھا۔ وہ اس پر جھک گئی۔

میں پانی کا چشمہ تلاشنے لگا تو شینا نے بتایا کہ دریا کا پانی قابلِ استعمال ہے لیکن جب میں نے دیکھا تو وہ کچھ گدلا محسوس ہوا۔ میرا دل نہیں کیا اور میں ایک قریبی پہاڑی جھرنے کی طرف بڑھ گیا۔ پہلے تو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی "اوک" بنا کر پیا پھر پانی مجھے اس قدر ٹھنڈا اور میٹھا لگا کہ بے اختیار میں نے اپنا منہ آگے کر لیا اور خوب جی بھر کر پانی پیا۔

تھوڑی دیر بعد شینا نے بھی دیکھا دیکھی میری تقلید کر ڈالی۔ میں جنگلی پھل تلاشنے لگا۔ ایک جگہ مجھے سرخ انگوروں کے خوشے درخت سے جھولتے نظر آئے۔ ان کے درمیان سیاہ انگور بھی تھے۔ میں بڑی رغبت سے انہیں چٹ کرنے لگا۔ شینا بھی میرے ساتھ یہی کچھ کرتی رہی بلکہ وہ ایک خاص قسم کا زرد پودا بھی نچوڑ کر کھائے جارہی تھی۔ پہلے منہ سے لگا کر اس کا رس چیتی اس کے بعد گودا چٹ کر جاتی۔

میں یک ٹک اسے تکتا رہا تو اس نے دو تین بڑے زرد پھول میری جانب پھینکے جنہیں میں نے کیچ تو کرلیے لیکن کھائے نہیں۔

"یہ کیا بلا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس میں دانت گاڑ کر رس پی لو۔ یہ یہاں کا املوک ہے۔" وہ ہنس کر بولی۔

"اوہ۔" بے اختیار میرے منہ سے نکلا اور میں نے بھی کھانا شروع کیا۔

تھوڑی دیر بعد ہم گھاس پر بیٹھ گئے۔ ہمارے اردگرد جنگل پار برفیلی پہاڑیوں کی چوٹیاں ایستادہ تھیں۔ گھنا

جنگل تھا، کہیں برف سے ڈھکا ہوا اور کہیں سبز...... یہ پوری وادی تھی۔ شینا نے بتایا کہ ہم شام کو روانہ ہو جائیں گے کیونکہ ہم اس وقت نیپال، تبت اور آسام کے چوحدہ کے مقام پر ہیں اور اس بہتے دریا کے ذریعے ہم صبح تک آسام کی ایک غیر معروف آبی گزرگاہ میں داخل ہو جائیں گے۔ وہاں سے پہلی گھاٹ صرف ایک روز کی مسافت پر ہوگا۔

سچی بات یہی تھی کہ میرا دل اس دلفریب قطعہ اراضی پر آج رات گزارنے کا تھا۔ مجھے گوشت کی طلب ہو رہی تھی۔ میرا ارادہ کسی جنگلی جانور کو شکار کر کے بھون کر کھانے کا تھا۔

''کیا بات ہے، تم آگے نہیں جانا چاہتے؟'' شینا نے مجھے خاموش اور سوچتا پا کر پوچھا۔

''نہیں، ایسی بات تو نہیں لیکن میرا شکار کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ میں بے تاثر نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے کھلے دہن سے موتیوں جیسے دانت لڑیوں کی صورت بڑے بھلے معلوم ہوئے۔

''تم ہنسیں کیوں؟''

''اس لیے کہ میرا بھی یہی دل چاہ رہا ہے۔'' وہ بولی۔ ''انسان خواہ کتنا ہی پھل فروٹ کھالے مگر جب تک گوشت نہ کھائے، معدے کی تسلی نہیں ہوتی۔''

شام جھکنے لگی۔ سرد ہوائیں چلنا شروع ہو گئیں۔ موسم شاید خرابی کی جانب گامزن ہونے لگا تھا۔ سردی بڑھنے لگی تھی۔ ایک قریبی پہاڑی چشمے کو دیکھ کر میں خدا کی قدرت کا مزید قائل ہو گیا۔ اس برف زار میں بنا یہ قدرتی چشمہ جس کے پانی کی سطح سے بھاپ کا دھواں سا اٹھتا نظر آیا۔ اسے چھوا تو میں حیران رہ گیا۔ اس کا پانی ٹھنڈا یا سرد نہیں تھا بلکہ گرم تھا۔ میں اور شینا اس میں نہائے۔ اس کے بعد شینا کو شاید کوئی شکار نظر آیا۔ وہ اپنا چھرا لیے اس طرف کو لپکی۔ میں بھی کلہاڑا لیے اس کے پیچھے ہو لیا لیکن جلد ہی میں نے اسے شکار پر چھرا پھینکنے سے روک دیا۔ شینا نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ وہ ایک کوموڈو ڈریگن ٹائپ کا بڑی جسامت والا چھپکلا تھا۔ اس کی سانپ جیسی زبان باہر کو لپلپا رہی تھی۔

''کیوں؟'' وہ بولی۔

''یہ حرام جانور ہے، جانے دو اسے۔''

''حرام کیا ہوتا ہے؟''

''اس کا گوشت کھانا جائز نہیں ہوتا۔ اس سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔'' میں نے کہا۔ جلد ہی مجھے ایک شاندار جسامت کا بارہ سنگھا نظر آ گیا۔

''وہ دیکھو، ایک شاندار شکار۔ اس کا گوشت لذیذ اور طاقتور ہے۔ آؤ، اسے شکار کرتے ہیں۔'' میں نے بارہ سنگھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شینا سے کہا۔

شینا بھی اس طرف متوجہ ہو گئی پھر ہم دو مختلف سمتوں سے اس کی جانب دبے پاؤں بڑھنے لگے۔ بارہ سنگھے کی شان دیکھ کر میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ خدا کی قدرت تھی۔ حلال گوشت دیکھ کر میرے معدے کی اشتہا بڑھ گئی تھی۔ میں نے ہر صورت اسے شکار کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

بارہ سنگھا ہلکے براؤن رنگ کا اور قد آور تھا۔ اس نے بڑی شان سے اپنے بڑے بڑے سینگوں والا سر اٹھا رکھا تھا جو کسی تاج کی طرح اس کے سر پر سجا محسوس ہوتا۔ اس کے جسم پر کہیں کہیں بالوں کے روئیں جیسے سرد ہوا میں لہرا رہے تھے۔ بڑی بڑی روشن کالی اور ابھری آنکھیں، چمکتا ہوا صحت مند بدن۔

میں نے کسی شکاری داستان میں پڑھا تھا کہ بارہ سنگھا بہادر جانور ہوتا ہے۔ وہ ڈرتا نہیں نہ ہی خطرہ دیکھ کر بھاگتا ہے بلکہ بسا اوقات تو شیر جیسے درندے کے سامنے بھی ڈٹ جاتا ہے تاہم اس میں اتنی عقل ہوتی ہے کہ دور سے خطرہ بھانپ کر وہ محض اپنی جگہ بدل لیتا ہے۔

ادھر شینا نے اس کے قریب پہنچتے ہی جنگلی انداز میں چیخ مار کر اس پر حملہ کر دیا۔ میں جو ابھی بارہ سنگھے پر حملہ کرنے کے لیے پر تول ہی رہا تھا، یہ دیکھ کر چند لمحے کو مبہوت سا رہ گیا۔ شینا کی للکار نما چیخ پر بارہ سنگھا بری طرح بدکا تھا مگر بھاگا نہیں بلکہ گھوم کر وہ شینا کے مقابلے پر آ گیا۔ شینا نے چھرے سمیت اس کی صحت مند پشت پر جست لگائی تا کہ اس کے پیٹ یا پہلو میں چھرے کا تیز پھل اتار کر چیر اگا سکے مگر بارہ سنگھے نے وہیں کھڑے کھڑے تیزی سے اپنی جگہ بدل لی اور بدقسمتی سے شینا اس کی پشت کے بجائے اس کے نکیلے سینگوں پر جا پڑی۔

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے بارہ سنگھے نے اسے اپنے سینگوں کے بڑے سے تاج پر رکھ کر اسے کسی کھلونے کی طرح دور اچھال دیا۔ شینا کے حلق سے برآمد ہونے والی چیخ بڑی لرزہ خیز تھی۔ وہ شاید کہیں دور برفیلی ڈھلان یا کھڈ میں جا پڑی تھی۔ میں تب تک بارہ سنگھے کے قریب آ چکا تھا۔

یکلخت وہ مجھے چیلنج کرتا محسوس ہوا اور یہی وہ وقت تھا جب میرے اندر کا جنگ باز بیدار ہو گیا۔ میرے شکار کی طلب جاتی رہی مگر جنگ اور اپنی ساتھی کا انتقام لینے کا جذبہ غالب آ گیا۔ میں نے کلہاڑا تاک کر اس پر پھینکا۔

بے شک قدرت نے بارہ سنگھے کو سینگوں کا اتنا بڑا تاج یونہی نہیں عطا کیا تھا۔ وہ اس سے اپنے دفاع، بچاؤ اور بوقتِ ضرورت ہتھیار کے طور پر بھی کام لینا جانتا ہے۔ میرا پھینکا ہوا کلہاڑا اس کے سینگوں پر جا پھنسا۔ وہ اس نے اپنے سر کے ایک زبردست جھٹکے سے اچھالا۔ کلہاڑا میری طرف اڑا چلا آنے لگا۔ میں اگر بروقت نیچے نہ گر جاتا تو وہ یقیناً مجھے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ ایک لمحے کو تو میرا دل ہی بیٹھ گیا تھا۔

اگلے ہی لمحے میرے اندر جوش کا طوفان سا اٹھا اور میں اس کی جانب لپکا۔ اس نے پھر سینگ میرے آگے کردیے۔ میں نے شینا والی بے وقوفی نہیں کی بلکہ اس کے قریب پہنچتے ہی دونوں ہاتھوں سے اس کے سینگوں کو دبوچ لیا اور اسی کے زور پر اپنے بدن کی پوری طاقت لگا کر اس کی گردن اس کے پہلو کی جانب موڑتا چلا گیا، یہاں تک کہ اسے نیچے گرا دیا اور اس کے اصل دو سینگوں کو جس پر دیگر دوسرے سینگ ابھرے ہوئے تھے، انہیں دونوں ہاتھوں سے زور لگا کر اس طرح چیر دیا کہ بارہ سنگھے کا اوپری سمت سے سر ہی کھل گیا۔

وہ ڈکرانے اور چلانے لگا۔ میں نے اسے تڑپتا چھوڑا اور دوڑ کر قریب پڑا کلہاڑا اٹھا لایا اور اس کی گردن پر وار کیا۔ اس کے حلق سے آخری ڈکراہٹ بلند ہوئی اور وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ اس کی کٹی گردن سے بھل بھل خون بہتا چھوڑ کر میں کلہاڑا اسی کے تڑپتے جسم کے قریب پھینک کر اس طرف دوڑا جدھر بارہ سنگھے نے شینا کو اپنے سینگوں سے اچھالا تھا۔

وہ ایک کھڈ میں پڑی کراہ رہی تھی۔ میں جلدی سے اندر کودا اور اس کے زخم کا جائزہ لیا تو دنگ رہ گیا۔ اس کے پہلو کو بارہ سنگھے کے سینگوں نے خاصا پھاڑ ڈالا تھا اور وہاں سے اس کے خون آلود اعضا نظر آنے لگے تھے۔ شینا جیسی اس جنگلی حسینہ کا یہ عبرتناک حشر مجھے دکھی کر گیا۔ وہ نیم جاں اور نیم مردہ آنکھوں سے میری طرف گردن بمشکل گھما کر دیکھنے لگی۔

میں نے اسے حوصلہ دیا پھر اس کے چرے ہوئے پہلو پر آہستگی سے ہاتھ کا دباؤ ڈال کر اسے اندر کیا پھر جلدی جلدی اپنی جیکٹ اتاری۔ اندر سے شرٹ بھی اتار کر اسے پھاڑ کر جیسے تیسے پٹی کی شکل دینے کے بعد اسے زخمی پہلو پر اچھی طرح باندھ دیا کہ خون کا جریان کم سے کم ہو مگر یہ حتمی علاج نہ تھا، ایک عارضی ابتدائی طبی امداد کی کوشش تھی۔

''تم باہر آسکتی ہو؟ میں سہارا دیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''آہ......نن......نہیں۔ مجھے ہلانا مت، حرکت میری اذیت کو بڑھا دیتی ہے۔'' وہ کراہی۔ میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ شینا کا حسین چہرہ کملا گیا تھا۔ آنکھوں میں مردنی اترنے لگی تھی۔ اس پر غشی طاری ہو رہی تھی۔ شاید اس کا کوئی اندرونی عضو، شاید جگر متاثر ہوا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ اور نہ آسکا کہ میں اس کی جان بچانے کے لیے اور کیا کروں کہ اچانک ایک آواز پر میں چونکا۔ میں فوراً کھڈ سے باہر آیا تو سامنے دیکھ کر بری طرح چونک گیا۔

☆☆☆

میں نے دو افراد کو سمور کی کھالوں میں ملبوس دیکھا جو میرے شکار (بارہ سنگھے) پر قبضہ جمانے کی فکر میں تھے۔ وہ برف میں اٹے ہوئے تھے، سروں پر جانور کی کھال کے ٹوپ تھے۔ ایک درمیانے قد کا تھا، دوسرے کا قد اس سے ہلکا تھا۔ آخر الذکر نے برف میں پھسلنے والی سلیج قسم کی ہتھ گاڑی کی رسی تھام رکھی تھی اور دوسرا اس کا ساتھی بارہ سنگھے کو اس تختے والی سلیج پر لادنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اول الذکر فرد کے کندھے سے مجھے ایک رائفل بھی جھولتی نظر آئی۔

میں نے انہیں آواز لگائی۔ وہ دونوں چونک کر میری طرف متوجہ ہوئے تو میں چونک پڑا۔ چھوٹے قد والی عورت تھی اور دوسرا اس کا مرد ساتھی۔ مجھے یہ کوئی اسکیمو قسم کے لوگ محسوس ہوئے۔ حالانکہ اسکیمو قطب جنوبی یا آئس لینڈ اور گرین لینڈ کے باشندے گردانے جاتے ہیں مگر یہ بھی مجھے انہی کی طرح کے محسوس ہوئے۔ یعنی برفانی علاقوں کے قبائلی باشندے وغیرہ۔

میں ان کے قریب گیا اور ہیلو کہا۔ مرد نے بھی مجھ سے کچھ کہا۔ میں شاید اس کی زبان نہ سمجھ سکا تو میں نے انگریزی کا سہارا لیا۔ وہ بھی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بات کرنے لگا۔ پوچھا کہ میں کون ہوں؟ وغیرہ۔

تب میں نے اسے بتایا کہ میری ایک ساتھی پاس کھڈ میں شدید زخمی حالت میں پڑی ہے اور اسے مدد کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی میں نے یہ بھی بتایا کہ اس بارہ سنگھے کو شکار کرنے کے دوران یہ حادثہ پیش آیا تھا۔ وہ دونوں شاید تبتی میاں بیوی تھے۔ ان کے چہرے منگولوں کی طرح گول، بدن گٹھے ہوئے اور آنکھیں بھی چھوٹی اور گول تھیں۔ بہرحال دونوں بھلے مانس ثابت ہوئے اور فوراً شکار اور ہتھ گاڑی چھوڑ کر میرے ساتھ کھڈ کی طرف ہو لیے۔ مرد نے اندر اتر کر شینا کے زخم کو دیکھا پھر اپنی بیوی سے کچھ کہا۔ وہ فوراً پلٹ کر دوڑی اور ہتھ گاڑی کھینچ لائی۔ اس کے بعد بڑے طریقے سے اس نے مرد کے اشارے پر وہ گاڑی کھڈ

کے اندر اتاری پھر دونوں نے مل کر زخمی شینا کو آہستگی سے تھام کر ہتھ گاڑی پر لٹادیا پھر اسے باہر لے آئے۔

عورت نے مجھے ایک رسی کا گچھا دیا اور کہا کہ میں بارہ سنگھے کے جسم کو باندھ کر رسی کی مدد سے کھینچتا رہوں۔ میں نے ایسا ہی کیا اور پھر ہم ایک طرف کو چل پڑے۔ بوٹ وہیں میں نے دریا کنارے گھنی جھاڑیوں اور درختوں کے ساتھ باندھ دی تھی جبکہ مجسمے کو بھی وہیں کہیں گڑھے میں ڈھانپ کر چھپادیا۔

ہم چلتے رہے۔ شینا نیم بے ہوشی کی حالت میں کبھی زور سے کراہ اٹھتی۔ اسی وقت برف باری شروع ہوگئی۔ سرد اور کاٹ دار ہوائیں بھی چلنے لگیں۔ یہ موسم کسی طوفان کا پتا دیتا محسوس ہونے لگا۔ تقریباً نصف میل کے بعد برف سے ڈھکے ہوئے جنگل میں ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں ڈھلوانی چھت کی کیبن گاہ سی نظر آئی۔ یہ لکڑی کا مکان تھا جو تقریباً سارا برف سے ڈھکا ہوا نظر آیا۔ اس کے عقب میں گھنے درختوں کا جنگل سا بنا ہوا تھا۔ دائیں بائیں برف سے ڈھکی ہوئی جھاڑیاں اور سامنے کے رخ پر کھلا سا میدان تھا۔ اس کی محرابی کھڑکیوں سے روشنی آرہی تھی۔ چوکھٹ پر بھی ایک آدم گزار محرابی دروازہ بنا ہوا تھا۔ مکان کی مشرقی دیوار پر ایک بڑے سے چوبی چھجے تلے چھکڑا دکھائی دیا۔ پاس ہی ایک خچر بندھا ہوا تھا اور سردی اور برف سے بچنے کے لیے اس پر موٹا سا کپڑا ڈالا ہوا تھا۔

ہم قریب پہنچ کر رک گئے۔ اس کے بعد شینا کو ہتھ گاڑی سے اتارا۔ اندر کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ شینا مکمل طور پر بے ہوش ہوچکی تھی۔ اس کے پہلو والی جگہ پر جہاں میں نے اپنی شرٹ پھاڑ کر پٹی باندھ دی تھی، وہ خون سے تر بتر ہورہی تھی۔ مجھے تشویش لاحق ہونے لگی۔

ہم اندر آگئے۔ ایک چھوٹے بالوں والا کتا مجھے دیکھ کر بھونکنے لگا۔ سامنے آئل کے لالٹین نما دو بڑے چراغ روشن تھے۔ درمیان میں ایک قدرے بڑی سی میز تھی۔ اس پر ایک سات آٹھ سالہ بچہ بیٹھا باؤل میں چمچہ ڈالے سوپ پینے میں مگن تھا۔ ایک اس سے دو تین سالہ چھوٹی بچی اندر کمرے سے باہر نکل آئی اور مجھے معصومانہ حیرت سے تکنے لگی۔

مکان اندر سے گرم تھا کیونکہ پاس ہی آتش دان سلگ رہا تھا۔ عورت نے کتے کو خاموش کروایا تو وہ آتش دان کے قریب جاکر اپنے دونوں اگلے پیروں میں تھوتھنا ڈال کر لیٹ گیا۔ مرد اور عورت نے اپنی کھالوں کا کوٹ نما لباس اتارا۔ شینا کو آتش دان کے قریب زمین پر موٹی سی بچھی ایک چادر پر لٹادیا۔ عورت جلدی سے گرم پانی لے آئی اور ایک ڈبا بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ڈبا کھولا تو اس میں مجھے انواع واقسام کی جڑی بوٹیاں اور دواؤں کی شیشیاں رکھی نظر آئیں۔

مجھے اب شینا کے بچ جانے کی کچھ امید ہوئی۔ وہ دونوں میاں بیوی اس کے علاج میں جت گئے۔ پٹی کھول دی گئی۔ عورت نے ایک پیالے میں جلدی جلدی کچھ دواؤں کا لیپ بنایا اور اپنے مرد کو دیا۔ وہ نہایت احتیاط اور مہارت سے لیپ شینا کے زخم میں ملنے لگا۔ اس کے بعد عورت نے اسے ایک شیشے کا جار سا تھمادیا۔ مرد نے اس کے اندر سے انجکشن لگانے والی مخصوص قسم کی نڈل اور تھریڈ نکالا پھر اس نے شینا کے چرے ہوئے پہلو کو سینا شروع کردیا۔

میں ایک گہری سانس لے کر خدا کا شکر بجالایا اور ساتھ ہی دل میں اس برفانی جوڑے کو بھی دعا دی جنہیں اللہ نے گویا رحمت کا فرشتہ بنا کر یہاں بھیجا تھا۔ تھوڑی دیر بعد عورت نے شینا کو ہوش میں لا کر دھیرے دھیرے سوپ پلایا۔

شینا کی حالت قدرے بہتر ہوئی تو مرد تھکے تھکے انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ عورت شینا کے پاس ہی بیٹھی رہی۔ میں کھڑا ہوا تھا۔ مرد نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور اشارے سے میز پر بیٹھنے کا کہا اور خود بھی میرے ساتھ والی کرسی پر براجمان ہوگیا۔

''میرا نام موزخ ہے۔ یہ میری بیوی ہے، صوبی۔ ہم اپنے دو بچوں کے ساتھ یہاں رہتے ہیں۔ تم کون ہو اور یہاں کیسے آپھنسے؟''

میں نے بھی مسکرا کر اسے اپنا اور شینا کا نام بتایا پھر اس کا اور اس کی بیوی کا تہ دل سے شکریہ کہنے کے بعد یہی بتایا کہ ہم دونوں ایک ہاؤس بوٹ میں تھے جو کسی حادثے کا شکار ہوئی اور ہم تیرتے ہوئے یہاں آگئے...... وغیرہ۔

پھر آخر میں اس سے میں نے پوچھا۔ ''مہربان دوست! کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ کون سی جگہ ہے اور ہم اس وقت کہاں ہیں؟''

''یہ تبت کے قصبے تسانگ پو کا آخری سرحدی علاقہ ہے۔ یہاں سے صرف تین کلومیٹر کے فاصلے سے بھوٹان کا علاقہ پنا کھا شروع ہوجاتا ہے۔'' اس نے بتاتے ہوئے لمحہ بھر کو توقف کیا پھر پوچھا۔

''تم لوگوں کی منزل کون سی ہے؟''

''ہم......'' میں نے کہا۔ ''ہم آبی گزرگاہوں کے ذریعے بنگلا دیش کی جانب گامزن تھے۔ وہاں پہلی گھاٹ ہماری آخری منزل تھی۔''

''اوہ لیکن تم اس آبی گزرگاہ سے دور ہو چکے ہو کیونکہ یہ دریا جو تسانگ پو کے بیچ سے گزر رہا ہے، برہم پترا میں جاکر گرتا ہے۔ اس سے اور کوئی آبی گزرگاہ یا معاون دریا نہیں نکلتا جو تمہیں تمہاری مطلوبہ منزل تک پہنچا سکے۔''

''مسٹر میوخ! تمہارا کہنا درست ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے بتایا نا کہ ہم حادثاتی طور پر اس دریا میں آن گرے تھے کیونکہ جس دریا پر ہماری ہاؤس بوٹ تھی، اس سے ہم ہٹ گئے تھے۔ بوٹ تباہ ہوگئی اور ہم دونوں تیرتے ہوئے ایک قدرتی پہاڑی نالے میں جاگرے جو آگے ایک آبشار کی صورت میں اسی دریا پر گرتا تھا۔''

''خدا تم پر رحم کرے۔ یہ بہت عجیب و غریب علاقہ ہے۔'' میوخ بولا۔ ''ایک طرف دریاؤں اور خطرناک آبی گزرگاہوں کا جال ہے تو دوسری طرف گھنے جنگل، پہاڑیاں اور برف ہے۔''

''میری ساتھی شینا کا بھی یہی خیال ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''اس کے مطابق دراصل ہم ایک ایسے چوحدہ میں ہیں جہاں بھارت سمیت تبت، نیپال، آسام، بھوٹان اور کسی حد تک بنگلا دیش کی سرحدیں بھی ملتی ہیں۔''

''ہاں، پناکھا سے آگے سکم اور دارجلنگ ہے۔'' وہ بولا۔ ''تم لوگ ضرور شاید پہلے اپنی ہاؤس بوٹ میں دریائے برہم پترا کے ایک معاون دریا بیاسی میں سفر کررہے ہوگے۔''

''بالکل، یہی نام ہے اس دریا کا، پریشانی کے سبب میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔'' میں نے جھینپی ہوئی مسکراہٹ تلے اس مہربان آدمی سے کہا اور پھر شینا سے متعلق استفسار کیا۔

''میری ساتھی اب ٹھیک تو ہے نا؟ میرا مطلب ہے......''

''اس کی حالت اب خطرے سے باہر ہے۔'' اس نے فوراً تشفی آمیز انداز میں کہا۔ ''لیکن زخم گہرا ہے۔ اسے کافی دن بیڈ ریسٹ کرنا پڑے گا۔'' اسی وقت اس کی چھوٹی بچی ''پوپو...... پوپو'' کہتی ہوئی اپنے باپ کے قریب آگئی۔ بڑی پیاری گڑیا سی بچی تھی۔ چھوٹی چھوٹی گول آنکھیں، گورا رنگ، پونی میں بندھے سنہری بال۔ وہ میری طرف معصومانہ مسکراہٹ سے دیکھنے لگی تو میں نے پیار سے اس کے نرم گال کو ہلکے سے تھپتھپا دیا۔

''بس، یہی دو بچے اور بیوی میری کُل کائنات ہیں۔'' میوخ اسے پیار سے گود میں بٹھاتے ہوئے بولا۔

''اس کا نام چونوی ہے۔ اس سے چند سال بڑا بیٹا پوپا ہے لیکن......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''لیکن کیا؟'' بے اختیار میں نے پوچھا۔

''کچھ دنوں سے یہاں شردھی آئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ہمارا سکون برباد کرڈالا ہے۔''

''شردھی...... یہ کون ہیں؟'' میں نے الجھ کر پوچھا۔

''تبتی زبان میں شردھی ہم اجنبیوں کو کہتے ہیں۔'' وہ جواب میں بولا۔

''پھر تو میں اور میری ساتھی بھی شردھی ہوئے۔'' میں مسکرایا۔

''نہیں، تم شلوک ہو یعنی مہمان۔ شردھی وہ ہوتے ہیں جو ایک تو زبردستی علاقے میں گھسے چلے آتے ہیں اور یہاں بستی کے لوگوں سے بدمعاشیاں بھی کرتے ہیں۔'' وہ بتانے لگا۔ اس کے چہرے پر برہمی کے آثار عود کر آئے تھے۔ ''یہاں بھی وہ آئے تھے، زبردستی ہم پر حکم چلاتے ہیں اور خدمت کرواتے ہیں۔ ہماری کھانے پینے کی چیزیں بھی چھین کرلے جاتے ہیں۔''

''مجھے تو یہاں تم لوگوں کے سوا آس پاس کوئی نظر نہیں آیا؟''

''قصبہ قریب ہی ہے، ہم ذرا دور ہیں۔ وہ شردھی بھی ادھر ہی خیمہ ڈالے ہوئے ہیں۔''

''تم نے ان کی شکایت پولیس سے نہیں کی؟''

''شہر یہاں سے بہت دور ہے۔ قصبے میں پولیس برائے نام آئی جاتی ہے۔''

''کوئی شکاری پارٹی ہوگی۔'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

''نہیں، یہ لوگ مجھے کوئی چھٹے ہوئے بدمعاش یا خطرناک مجرم لگتے ہیں۔'' وہ بولا۔ ''آپس میں عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں۔ ایک روز یہ لوگ باہر بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ ان کی باتیں میں نے سنی تھیں۔ یہ لوگ کسی مجسمے کی تلاش میں ہیں۔ عجیب سا نام تھا۔''

''یومبورگا!'' بے اختیار جیسے میرے منہ سے سکتے کی سی کیفیت میں برآمد ہوا۔

''بالکل یہی۔'' میوخ ایک دم بولا۔

اسی وقت باہر کچھ لوگوں کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم دونوں چونک پڑے۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

نقب زن

عاطر شاہین

وہ جو کبھی یک جان دو قالب تھے... نہ دل سے دور تھے نہ گھروں سے... مگر پتا ہی نہیں چلا کہ کب کس کے دل میں بے ایمانی اور آنکھوں میں میل نے جگہ کرلی... اس نے بھی عزت کی حفاظت کرنے کے بجائے جب نقب لگائی تو کیسے کوئی اعتبار میں آنکھیں بند رکھ سکتا تھا... یہ اور بات کہ جب آنکھیں پوری طرح کھلیں تو منظر بدل چکا تھا۔

پیٹھ پر وار کرنے والے ایک کم ظرف دوست کی فطرت کا اظہار

اسٹڈی روم میں نائٹ بلب جل رہا تھا جو اندھیرے کو دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اس کمرے میں زمان راکنگ چیئر پر بیٹھا جھولتے ہوئے کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ اس کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں ابھری ہوئی تھیں اور چہرہ حد درجہ سنجیدہ اور سپاٹ تھا۔ اس وقت رات کے سوا گیارہ بج رہے تھے اور نیند زمان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

زمان ایک خوبرو اور نوجوان آدمی تھا۔ اس کی عمر تیس
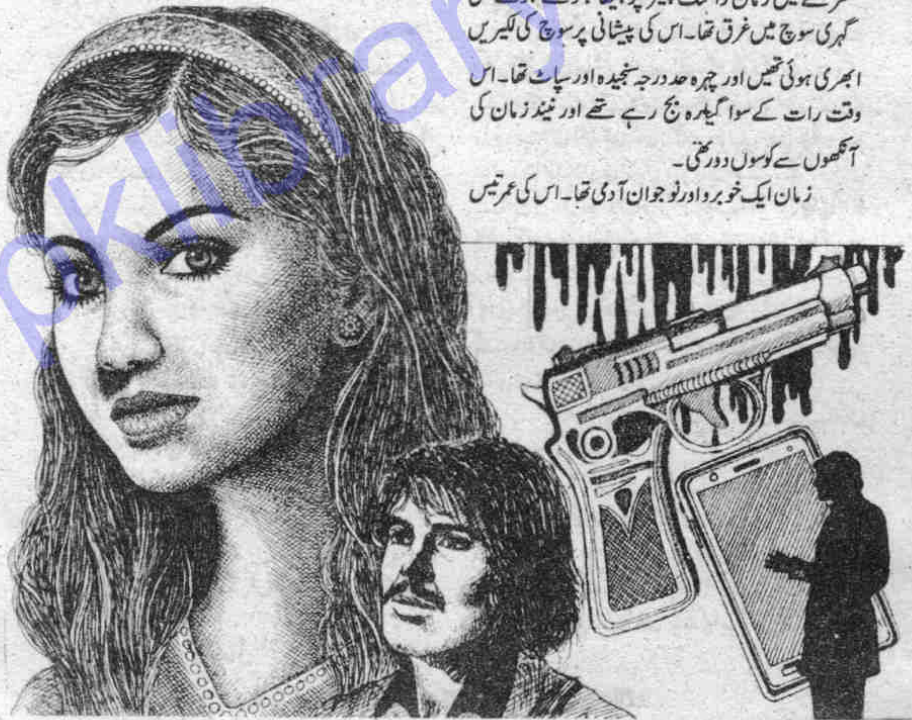
کے آس پاس تھی۔ راکنگ چیئر کے دائیں طرف شیشے کی میز پڑی تھی جس پر اس کا سیل فون موجود تھا۔ دفعتاً اسٹڈی روم کا دروازہ ہلکی سی آواز کے ساتھ کھلا اور زمان کی بیوی فاخرہ نے اندر قدم رکھا۔ زمان نے اپنی بیوی کی طرف نہ دیکھا یا اس نے جان بوجھ کر اسے نظرانداز کر دیا۔ وہ سابقہ پوزیشن میں ہی بیٹھا جھولتا رہا۔ تاہم اس کی بیوی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

''زمان!'' فاخرہ نے دھیمی آواز میں اسے آواز دی۔

''تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟'' زمان نے اس کی طرف دیکھا۔

''تم بھی تو جاگ رہے ہو۔''

''مجھے نیند نہیں آرہی۔''

''نیند نہیں آرہی یا کوئی پریشانی ہے؟'' فاخرہ نے استفسار کیا۔ وہ گھٹنوں کے بل زمان کے سامنے بیٹھ گئی اور اس نے راکنگ چیئر کے بازو تھام لیے لیکن زمان راکنگ چیئر پر بدستور جھولنے میں مصروف تھا۔

''نہیں، کوئی پریشانی نہیں ہے۔'' زمان نے تحمل سے جواب دیا۔ ''تم جا کر سو جاؤ۔ میں تھوڑی دیر تک آ کر سو جاؤں گا۔''

''ہم۔'' فاخرہ نے ہمکاری بھری اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''دیر نہ کرنا ورنہ صبح آفس سے لیٹ ہو جاؤ گے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' زمان نے فرمانبرداری سے جواب دیا تو فاخرہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اسٹڈی روم سے چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی زمان نے ایک طویل سانس لی اور ایک بار پھر گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ اس کے سیل فون کی گھنٹی گنگنا اٹھی۔ اس نے بے اختیار سیل فون کی طرف دیکھا۔ سیل فون کی اسکرین پر شوکت نام جگمگا رہا تھا۔

زمان نے جلدی سے کال ریسیو کی اور سیل فون کان سے لگاتے ہوئے بے تابانہ انداز میں بولا۔ ''ہاں شوکت......! کام بن گیا؟''

''ہاں زمان بھائی!'' دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''آپ کا کام ہو گیا ہے۔''

زمان کے چہرے پر اطمینان کے تاثرات ابھر آئے۔ لمحاتی توقف کے بعد اس نے کہا۔ ''تم ریوالور کو اپنے پاس سنبھال کر رکھ لو، میں کل شام کو آفس سے چھٹی کے بعد تم سے لیتا جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے زمان بھائی!''

''اور ہاں سنو۔'' زمان نے تنبیہی لہجہ اختیار کیا۔ ''کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے کہ میں نے تم سے ریوالور خریدا ہے۔''

''تم بے فکر رہو زمان بھائی!'' شوکت نے جواباً کہا۔ ''میں نے ریوالور کو گھر میں ایک محفوظ جگہ پر چھپا دیا ہے۔''

''ہم۔'' زمان نے ایک بار پھر ہمکاری بھری۔ ''ٹھیک ہے، پھر کل ملاقات ہوتی ہے۔'' کہنے کے ساتھ ہی اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ وہ چند لمحے راکنگ چیئر پر بیٹھا رہا پھر وہ اسٹڈی روم سے نکل کر بیڈروم کی طرف بڑھ گیا۔

اگلے روز زمان آفس سے سیدھا شوکت کے گھر گیا۔ اس کے گھر جانے سے پہلے اس نے شوکت کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ وہ اس کے گھر آرہا ہے۔ شوکت کا گھر دہلی گیٹ میں واقع تھا۔ یہ شہر کا بارونق علاقہ تھا جہاں سارا دن اور رات گئے تک لوگوں کا جم غفیر ہوتا تھا۔ ہوٹلز، ریسٹورنٹ، مارکیٹس رات گئے تک کھلے ہوتے تھے۔

شوکت نے زمان کو اپنے گھر کی بیٹھک میں بٹھایا اور اس کی مطلوبہ چیز اس کے حوالے کر دی۔ ریوالور پلاسٹک کے ایک بیگ میں تھا جسے زمان نے اپنے لیپ ٹاپ والے بیگ میں رکھ لیا۔ شوکت کو اس کی مطلوبہ رقم دینے کے بعد وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

زمان کا گھر شاہ شمس کے علاقے میں واقع تھا۔ اسے گھر پہنچنے میں چالیس منٹ لگے۔ عموماً وہ آفس سے چھٹی کے بعد بیس سے پچیس منٹ تک گھر پہنچ جاتا تھا۔ اس کے ماں باپ اس دنیا میں نہیں تھے۔ وہ اپنی بیوی فاخرہ کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی شادی کو دو سال ہو گئے تھے لیکن ابھی تک ان کی کوئی اولاد نہ ہوئی تھی۔ جب وہ آفس چلا جاتا تو فاخرہ پیچھے اکیلی ہوتی تھی لیکن اس سارے عرصے میں وہ زمان سے مسلسل رابطے میں ہوتی تھی۔ کبھی کبھی فاخرہ کی چھوٹی بہن اور ماں گھر آجاتی تھیں، اس طرح اس کا بھی دل لگ جاتا تھا۔ زمان اور فاخرہ کی محبت کی شادی تھی۔ فاخرہ زمان کی چچازاد کزن تھی۔

زمان گھر پہنچا تو فاخرہ اسی کی منتظر تھی۔ چھوٹتے ہی اس نے سوال کر دیا۔

''زمان! آج آفس سے لیٹ آئے ہو، خیریت تو تھی نا؟''

''ہاں، خیریت تھی۔'' زمان نے نارمل لہجے میں جواب دیا۔ ''تم جانتی تو ہو ہمارے ملک کے ٹریفک کا حال۔''

فاخرہ نے اثبات میں سر ہلایا اور استفسار کیا۔ ''کھانا لگاؤں؟''

''ہاں لگاؤ۔'' زمان نے کہا۔ ''میں فریش ہو کر آتا ہوں۔''

بیڈروم میں جاکر زمان نے لیپ ٹاپ والے بیگ میں سے ریوالور والا بیگ نکال کر الماری کے ایک خفیہ خانے میں چھپا دیا۔ اس خانے کی چابی زمان کے پاس ہی ہوتی تھی۔ فریش ہونے کے بعد اس نے کھانا کھایا اور ڈرائنگ روم میں ٹی وی دیکھنے بیٹھ گیا جبکہ فاخرہ اس کے لیے چائے بنانے کچن میں چلی گئی۔ زمان چند لمحے ٹی وی دیکھتا رہا پھر اس نے اپنے سیل فون سے اپنے دیرینہ دوست حامد کو فون کیا۔

''حامد! کہاں ہو؟'' علیک سلیک کے بعد زمان نے حامد سے دریافت کیا۔

''میں......'' حامد کی پُرسوچ آواز سنائی دی۔ ''میں اِن دنوں لاہور میں ہوں۔ آفس کے کام سے آیا ہوں۔ خیریت تو ہے نا؟''

''ہاں خیریت ہی ہے۔'' زمان نے جواباً کہا۔ ''کافی دنوں سے تم سے ملاقات نہیں ہوئی تو اسی لیے پوچھ رہا تھا۔ ویسے کب تک واپسی ہے تمہاری؟''

''تین دن مزید لگیں گے۔'' حامد نے بتایا۔ ''کچھ چاہیے تو بتادو، لیتا آؤں گا۔''

''نہیں شکریہ۔'' زمان نے فوراً اسے ٹوک دیا۔ ''اچھا ٹھیک ہے پھر، فون رکھتا ہوں۔ جب تم لاہور سے واپس آجانا تو مجھے مطلع کر دینا۔ کسی اچھے سے ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھائیں گے۔''

''ڈن ہوگیا۔'' حامد کی آواز سنائی دی تو زمان نے خدا حافظ کہتے ہوئے فوراً منقطع کر دیا۔ تبھی فاخرہ دو کپ چائے لیے ڈرائنگ روم میں آئی۔ اس نے ایک کپ زمان کے سامنے میز پر رکھا اور اپنا کپ لے کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

''کس سے بات کر رہے تھے؟'' فاخرہ نے چائے کی چسکی لینے کے بعد زمان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''حامد سے۔'' زمان نے فاخرہ کی بات کا جواب دینے کے بعد اس کا چہرہ بغور دیکھا۔ حامد کا نام سن کر ایک لمحے کے لیے فاخرہ کا چہرہ متغیر ضرور ہوا تھا لیکن پھر اس نے کمالِ مہارت سے اپنے تاثرات پر قابو پالیا۔ زمان نے کپ اٹھایا اور چائے کی چسکی لینے کے بعد ٹی وی کی طرف متوجہ ہوگیا۔

فاخرہ نے نارمل لہجے میں پوچھا۔ ''کس موضوع پر بات ہو رہی تھی حامد سے؟''

''کوئی خاص نہیں۔'' زمان نے سرسری انداز میں جواب دیا۔ ''بتا رہا تھا کہ وہ دفتری کام کے سلسلے میں ان دنوں لاہور میں ہے اور تین روز کے بعد واپس آئے گا۔''

''اور کوئی خاص بات؟''

نہ جانے فاخرہ زمان سے کیا اگلوانا چاہتی تھی تبھی، اس نے پوچھا۔

''کوئی خاص بات نہیں ہے۔'' زمان نے بدستور ٹی وی اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم کس حوالے سے پوچھ رہی ہو؟''

''کک...... کسی حوالے سے نہیں۔'' فاخرہ اپنی ہکلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ''تم دونوں بہت پرانے دوست ہو اس لیے میں نے پوچھ لیا۔''

''ہمم۔'' زمان نے ہنکاری بھری۔

فاخرہ چائے پینے کے ساتھ ساتھ گہری سوچوں میں گم ہوگئی۔ زمان چائے پینے اور ٹی وی دیکھنے کے ساتھ ساتھ چور نظروں سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ بھی دیکھ لیتا تھا۔ کچھ دیر کے بعد زمان سونے کے لیے بیڈروم میں چلا گیا تو فاخرہ بھی طویل سانس لیتے ہوئے اٹھی۔ ڈرائنگ روم کی لائٹس بند کرنے کے بعد وہ بھی بیڈروم میں چلی گئی۔

☆☆☆

زمان ہر روز آفس جانے سے پہلے اور آفس سے آنے کے بعد فاخرہ سے چھپ کر الماری کے خفیہ خانے میں پڑا ریوالور دیکھ کر تسلی ضرور کرتا تھا۔

حامد نے بتایا تھا کہ وہ تین روز کے بعد واپس آجائے گا لیکن چار روز گزرنے کے باوجود اس کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ پانچویں روز زمان نے اسے فون کیا۔ علیک سلیک کے بعد زمان نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''کیا تم واپس آگئے ہو؟''

''نہیں، آفس کا تھوڑا سا کام رہ گیا ہے اس لیے ابھی تک لاہور میں ہوں۔'' حامد نے جواباً کہا۔ ''ویسے خیریت تو ہے، تمہیں میری بہت یاد آرہی ہے، کوئی مسئلہ ہے؟''

''ہاں، مسئلہ ہی تو ہے۔'' زمان نے ہنس کر کہا۔

''کک...... کیا مطلب؟'' حامد ہکلایا۔ اس کی آواز میں خوف مترشح تھا۔ ''کیا مسئلہ ہے؟''

''ارے یار! گھبرا کیوں رہے ہو۔ میں نے تو ویسے ہی کہا ہے۔'' زمان نے اس کی گھبراہٹ سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ ''بس تم سے ملنے کو دل کر رہا تھا۔ کہا تو تھا کہ کافی دنوں سے کہیں اکٹھے نہیں بیٹھے۔''

''اوہ اچھا۔'' حامد کی آواز میں سکون کی آمیزش شامل ہوگئی۔ ''بس ایک دو روز میں آجاؤں گا۔ ویسے کس ہوٹل میں کھانا کھلاؤ گے؟''

''ہوٹل کا انتخاب تم نے کرنا ہے۔''
''یہ بھی ٹھیک ہے۔'' حامد کی آواز سنائی دی۔ ''اچھا، میں فون رکھتا ہوں۔ میرے سینئر کی کال آرہی ہے، اللہ حافظ۔''
زمان نے بھی اللہ حافظ کہہ کر رابطہ منقطع کیا اور سیل فون سائڈ ٹیبل پر رکھ کر صوفے کی پشت سے سر لگا کر آنکھیں موند لیں جبکہ دوسری طرف بیڈ روم کے دروازے کے ساتھ لگی کھڑی فاخرہ کی حالت دیدنی تھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ زمان نے آفس سے آتے ہی اس سے چائے بنانے کا کہا تھا اور وہ اس کے لیے چائے بنا کر لائی تھی لیکن زمان کو حامد سے باتیں کرتا سن کر وہ دروازے پر ہی رک گئی تھی۔ چہرے کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں میں بھی خوف تھا۔ بہرکیف اس نے اپنی حالت پر قابو پایا اور بیڈ روم میں داخل ہوئی۔
''زمان! چائے۔'' اس نے زمان کے قریب جا کر کہا تو اس نے آنکھیں کھولیں اور اس کی طرف دیکھا۔
''شکریہ۔'' کہنے کے ساتھ ہی زمان نے اس سے چائے لی اور ایک گھونٹ لینے کے بعد سائڈ ٹیبل پر کپ رکھ دیا۔ فاخرہ بھی ایک طرف بیٹھ گئی۔ وہ بے حد مضطرب تھی حالانکہ وہ خود کو نارمل رکھنے کی بے حد کوشش کر رہی تھی۔
''کیا کچھ کہنا چاہتی ہو؟''
''نن...... نہیں۔'' فاخرہ زمان کے سوال پر چونک پڑی۔
''تم نے اپنے لیے چائے نہیں بنائی؟''
''نہیں۔'' فاخرہ نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''میرا دل نہیں کر رہا چائے پینے کو۔''
''ہم۔'' ہنکاری بھرتے ہوئے زمان نے دوبارہ کپ اٹھایا اور ایک گھونٹ لیا۔ اس دوران اس نے کن انکھیوں سے فاخرہ کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر پریشانی اور الجھن کے تاثرات تھے۔ زمان نے اس سے مزید کوئی بات نہ کی اور نظریں پھیر کر چائے پیتا رہا۔ اس کے دماغ میں لاوا سا پک رہا تھا۔

☆☆☆

اگلے روز شام کو آفس سے نکلنے سے پہلے زمان نے فاخرہ کو فون کیا۔
''ہیلو فاخرہ! میں آج رات نہیں آؤں گا۔ تم اپنے بھائی اور بھابی کو بلا لو۔''
''کیوں، آج تم گھر کیوں نہیں آؤ گے؟'' فاخرہ کی حیرت میں ڈوبی آواز سنائی دی۔
''یار! مجھے آفس کے ضروری کام سے دفتر میں رکنا پڑ گیا ہے۔'' زمان نے وجہ بتائی۔ ''میں اب کل شام کو ہی گھر آؤں گا۔''
''اچھا ٹھیک ہے۔'' فاخرہ بولی۔ ''میں بھائی جان اور بھابی کو بلا لیتی ہوں۔''
''شکریہ...... اور ہاں، مجھے فون نہ کرنا، میں بہت مصروف ہوں۔ سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ہے۔ مجھے اگر وقت ملا تو میں خود ہی تمہیں فون کر لوں گا۔ سمجھ گئی ہو؟'' زمان نے کہا۔
''ہاں، سمجھ گئی ہوں۔''
''ٹھیک ہے۔ میں فون رکھتا ہوں۔'' کہنے کے ساتھ ہی زمان نے رابطہ منقطع کر کے سیل فون جیب میں رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھا تو اس وقت شام کے پانچ بج کر تین منٹ ہو رہے تھے۔ وہ اپنا بیگ اٹھائے آفس سے نکل کر پارکنگ میں آگیا۔ پارکنگ میں دوسری موٹر سائیکلوں کے ساتھ اس کی موٹر سائیکل بھی کھڑی تھی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پارکنگ میں تو کوئی موجود نہیں تھا البتہ گیٹ پر دو گارڈ موجود تھے جو اس کی طرف متوجہ نہیں تھے اور آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ زمان نے اطمینان کی سانس لی پھر وہ گھٹنوں کے بل اپنی موٹر سائیکل کے پاس بیٹھا اور پچھلے ٹائر سے ہوا نکالنے لگا۔ جب ٹائر سے پوری ہوا نکل گئی تو وہ ہاتھ جھاڑتا ہوا اٹھا۔ گارڈ بدستور باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ زمان چند لمحے ان کی طرف دیکھتا رہا پھر وہ تھکے تھکے قدموں سے چلتا ہوا گیٹ کی طرف بڑھا۔
''سنو۔'' اس نے ایک گارڈ کو اپنے پاس بلایا۔
''جی صاحب!''
''تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔''
''بتایئے صاحب!''
زمان نے جیب سے ہزار کا ایک نوٹ نکال کر گارڈ کی مٹھی میں دیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ضروری کام سے شہر سے باہر جانا ہے اس لیے میری موٹر سائیکل یہیں کھڑی ہے۔ اگر کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ موٹر سائیکل پنکچر ہو گئی ہے اس لیے زمان صاحب پیدل ہی گھر چلے گئے ہیں۔ ویسے میں نے پچھلے ٹائر کی ہوا نکال دی ہے۔''
ایک ہزار کا نوٹ پا کر گارڈ کی باچھیں ہی کھل گئیں۔ وہ جوش بھرے لہجے میں بولا۔ ''صاحب جی! آپ فکر ہی نہ کریں۔ آپ جب واپس آئیں گے تو میں ہوا بھروا لاؤں گا۔''
زمان نے اثبات میں سر ہلایا اور آٹو رکشا میں بیٹھ کر

ڈائیوو اسٹینڈ کی طرف بڑھ گیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ ڈائیوو میں بیٹھا لاہور کی جانب محوِ سفر تھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ تقریباً چار گھنٹے کے سفر کے بعد وہ لاہور پہنچ گیا۔ ڈائیوو اسٹینڈ سے نکل کر وہ ایک پی سی او شاپ پر گیا۔ اس نے حامد کو فون کیا۔

''ہیلو۔'' سلسلہ ملتے ہی حامد کی آواز سنائی دی۔

''حامد!'' زمان نے کہا۔ ''کہاں ہو تم؟''

''میں۔'' حامد کی چونکتی ہوئی آواز زمان کی سماعت میں پڑی۔ ''یار کل ہی تو تم سے بات ہوئی تھی۔ بتایا تو تھا کہ ابھی میں لاہور میں ہی ہوں۔''

''ہاں ہاں۔ یہی تو پوچھ رہا ہوں کہ تم لاہور میں کہاں ٹھہرے ہوئے ہو۔'' زمان نے کہا۔ ''میں بھی لاہور میں موجود ہوں۔''

''تم لاہور میں ہو؟'' حامد کو شاید زمان کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ ''تم کہاں ہو اور یہ کس کا نمبر ہے؟''

''ہاں۔ ایک ضروری کام سے لاہور آنا پڑا ہے۔'' زمان نے جواب دیا۔ ''سوچا کہ تم سے بھی مل لوں۔ مجھے اپنا ایڈریس بتاؤ، میں وہیں آجاتا ہوں۔ دراصل میرے فون کی بیٹری ختم ہوگئی ہے اسی لیے تمہیں پی سی او سے فون کررہا ہوں۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ ایڈریس نوٹ کرلو۔'' حامد نے کہا اور زمان کو اپنا موجودہ ایڈریس بتادیا تو حامد بولا۔

''میں آرہا ہوں۔''

دکان دار کو پیسے دے کر وہ ایک آٹو رکشا میں سوار ہوگیا۔ چند لمحوں کے بعد آٹو رکشا لاہور کی سڑکوں پر دوڑتا ہوا آگے بڑھتا چلا جارہا تھا۔ جس رفتار سے آٹو رکشا دوڑ رہا تھا اس سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

☆☆☆

جس فلیٹ میں حامد ٹھہرا ہوا تھا اسے تلاش کرنے میں زمان کو دقت نہیں ہوئی تھی۔ وہ دو کمروں اور ایک کچن پر مشتمل خاصا کشادہ اور خوب صورت انداز میں سجایا گیا فلیٹ تھا۔ دونوں کمروں کے ساتھ واش روم اٹیچ تھے۔ حامد اسی کا منتظر تھا۔ وہ بڑے حیرت بھرے انداز میں اس سے ملا تھا، شاید اسے زمان کے لاہور آنے کی توقع نہیں تھی۔ اس وقت دونوں دوست ایک کمرے میں صوفوں پر بیٹھے باتیں کررہے تھے۔

''رات کہاں رہو گے۔'' حامد نے پوچھا۔

''تمہارے پاس۔'' زمان نے کہا۔

گھریلو ٹوٹکے

☆ نیم کے پتے پانی میں اچھی طرح ابال کر پینے سے خارش ختم ہوجاتی ہے۔

☆ کھانسی اور کالی کھانسی کے مریض دن میں کئی بار شہد چاٹیں اور کھانسی سے چھٹکارا پائیں۔

☆ جھریاں دور کرنے کے لیے شہد کو دس منٹ تک چہرے پر لگائیں پھر دھولیں۔

☆ تیز قہوے میں لیموں نچوڑ کر پینے سے سردرد ختم ہوجاتا ہے۔

☆ منہ کے چھالے دور کرنے کے لیے چھالوں پر ٹوتھ پیسٹ لگائیں۔

☆ اگر جسم کا کوئی حصہ جل جائے تو وہاں پر انڈے کی سفیدی لگائیں۔

☆ اگر سردی زیادہ لگے تو رات کے وقت دودھ میں چھوارے پکا کر پئیں۔

☆ برتنوں پر لگنے والی کائی اور چائے کے دھبے دور کرنے کے لیے ان پر نمک لگا کر چھوڑ دیں اور چند منٹوں کے بعد دھولیں۔

(مرسلہ: محمد انور ندیم۔ حویلی لکھا، اوکاڑہ)

''میرے پاس؟'' حامد کے چہرے کا رنگ اڑا۔ ''لیکن......''

''لیکن کیا یار! سیدھی طرح بتاؤ پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو؟'' زمان اکتایا۔

''یار! دراصل یہ میرے جس دوست کا فلیٹ ہے وہ بھی اپنے دوستوں کو لے کر یہاں آرہا ہے۔'' حامد نے وجہ بتائی۔ ''بلکہ وہ آتے ہی ہوں گے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' زمان نے کہا۔ ''میں تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا جاؤں گا۔''

''ہم۔'' حامد نے ہنکاری بھرنے پر ہی اکتفا کیا۔ اس کی ظاہری حالت سے صاف ظاہر تھا کہ وہ گھبرایا گھبرایا سا تھا۔

''کھانا کھاؤ گے؟''

''ہاں بھوک تو لگی ہے۔''

''میں نے بھی ابھی کھانا نہیں کھایا۔ تم بیٹھو، میں باہر سے کھانا لاتا ہوں۔ پھر تم کھانا کھانے کے بعد چلے جانا۔''

رچرڈ برٹن

الوداع اے عزیز دوست! اے عظیم اور مرحوم ہستی، زندگی ختم ہوئی۔ اس کی بے پناہ مسرتیں بھی اور بے پناہ خطرات بھی۔

وہ جس کے لیے جان جوکھوں کے کام ہنسی کھیل تھے جو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نیزے، خنجر اور گولی کے مقابلے میں مامون ہے۔ اب مصاف ہستی سے منہ موڑ کر یہاں چپ چاپ آرام کر رہا ہے لیکن انگلستان اس عظیم ہستی کی غمزدہ بیوہ کے ساتھ نوحہ کناں ہے۔

اس دیار کے آخری اور عظیم ترین نائٹ، برطانوی سلطنت کے مشرق کے مغنی اور الف لیلہ کے لازوال عجائب کے عاشق جس کی روح ابد تک تازہ مہموں کے لیے بیتاب رہے گی۔ الوداع۔

الف لیلہ کا مترجم برٹن عجیب وغریب شخص تھا اور شاید ہی کسی اور شخص میں اتنی ساری خوبیاں ایک ساتھ جمع ہوئی ہوں۔ الف لیلہ کا ترجمہ ہی زندگی بھر کا کام ہے جسے اس نے تین چار سال میں نمٹایا۔ اس کے علاوہ بھی کوئی پچاس کے قریب تصانیف چھوڑی ہیں جن میں چار پانچ سندھ کے متعلق ہیں۔ یہ سر چارلس نیپئر کے زمانے میں 1842ء میں ہندوستان آیا تھا۔ پہلے ممبئی اور بڑودہ میں رہا پھر کراچی آیا۔ اس وقت وہ فوج میں لیفٹیننٹ تھا۔ بعد ازاں سروے کے محکمے میں چلا گیا۔ یہ 29 زبانوں کا ماہر تھا جن میں یورپ کی قریب قریب ساری زبانوں انگریزی، فرنچ، ہسپانوی، اطالوی، جرمن اور پرتگیزی، لاطینی، یونانی کے علاوہ اردو، ہندی، سنسکرت، فارسی، عربی، ترکی، مرہٹی، گجراتی اور سندھی، پنجابی، ملتانی (جس کی گرامر بھی اس نے لکھی ہے) اور چینی وغیرہ شامل ہیں۔ بعض کتابیں تو برٹن کی ذاتی لائبریری میں ایسی دیکھیں جن کا رسم الخط معلوم نہیں کیا ہے۔ ہاں افریقی زبانوں کا ہم ذکر کرنا بھول گئے اور پھر وہ کتابی کیڑا ہی نہیں، مہم باز بھی تھا۔ اس نے مسلمانوں کے بھیس میں حج کیا اور تین جلدوں میں زیارت حرمین شریف کا

حامد نے مسکراتے ہوئے کہا اور کھانا لینے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد زمان نے اپنے بیگ کی زپ کھولی اور اس میں ریوالور کی موجودگی کا اطمینان کیا۔ زپ بند کر کے وہ اطمینان سے بیٹھ گیا اور حامد کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ حامد کی واپسی بیس منٹ بعد ہوئی تھی۔ وہ کھانا لے آیا تھا۔

''آجاؤ۔'' جب حامد نے قالین پر دستر خوان لگا دیا تو اس نے زمان سے کہا۔ زمان اٹھ کر دستر خوان پر بیٹھا۔ حامد بھی بیٹھ گیا تھا۔ قبل اس کے کہ ان دونوں میں کوئی کھانا شروع کرتا، دفعتاً اطلاعی گھنٹی بج اٹھی۔ حامد اور زمان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''اس وقت کون آ گیا ہے؟'' زمان نے استفسار کیا۔

''معلوم نہیں، دیکھتا ہوں۔'' کہنے کے ساتھ ہی حامد اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا جبکہ زمان اس کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگا۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ زمان کو حامد اور کسی اور کے بولنے کی آوازیں سنائی دیں۔ زمان خاموشی سے بیٹھا رہا۔ تبھی اسے حامد کے چلانے اور پھر ٹھک کی آواز یکے بعد دیگرے سنائی دی تو وہ جلدی سے اٹھ کر باہر کی جانب بڑھا۔ دوسرے ہی لمحے جب وہ بیرونی دروازے کی طرف جانے والی راہداری میں پہنچا تو دھک سے رہ گیا۔

اس کی آنکھیں پتھرا گئیں اور وہ یوں سن ہو گیا جیسے پتھر کا بت بن گیا ہو۔ راہداری کے فرش پر حامد منہ کے بل ساکت و جامد گرا پڑا تھا۔ اس کے سر سے خون نکل کر فرش پر پھیلتا جا رہا تھا۔ بیرونی دروازہ بند تھا۔ قاتل نے اس کے سر میں گولی ماری تھی جس سے اس کی فوراً ہی موت واقع ہو گئی تھی۔

حامد کی لاش دیکھ کر زمان کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ اسے اپنا وجود کپکپاتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ جب ہوش میں آیا تو گھبرا گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ وہاں مزید کچھ دیر رکا رہا تو حامد کے قتل کا الزام اسی پر آ جائے گا۔ چنانچہ اس نے جلدی سے کمرے میں جا کر اپنا بیگ اٹھایا اور فلیٹ سے باہر نکل کر قرب وجوار کا جائزہ لیا۔ ہر کوئی اپنی دنیا میں مست تھا۔ کسی کی توجہ فلیٹ یا اس کی طرف نہیں تھی۔

چنانچہ زمان تیزی سے سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔ کچھ ہی دیر کے بعد وہ ایک آٹو رکشا میں بیٹھا ڈائیوو اسٹینڈ کی طرف جا رہا تھا تاکہ فوری طور پر اپنے شہر واپس جا سکے۔

☆☆☆

زمان صبح ہی واپس ملتان پہنچ گیا تھا۔ گھر جانے کے بجائے وہ پہلے ایک حمام پر گیا تھا۔ وہاں سے فریش ہونے

سفرنامہ لکھا۔

A Pilgrimage to Al-Madina and Makkah

افریقا میں یہ حرار گیا۔ حبشہ کے اس شہر ممنوع میں اس سے پہلے کوئی یورپین نہ گیا تھا۔ پھر دھومی کے بادشاہ کے دربار میں گیا پھر نیل کا منبع تلاش کرتا پھرا۔ زخمی ہوا، بیمار ہوا، قید ہوا۔ اس سیاحت اور مہم کا احوال لکھا اور مغربی افریقا کے ضرب الامثال جمع کیے۔ ایک کتاب زنجبار کے بارے میں بھی ہے۔ مصر کے صحرائے سینا میں سونے کی تلاش میں کان کنی بھی کی اور اس کی لائبریری میں بہت سی کتابیں کیمسٹری اور انجینئرنگ پر بھی ہیں اور قریب قریب ہر کتاب پر اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تفصیلی حاشیے ہیں۔ پھر امریکا گیا۔ ایک کتاب برازیل پر ہے، ایک یوراگوئے پر، ایک سالٹ لیک (امریکا) کے مورمون فرقے کے ''پیغمبر'' کے بارے میں بھی جس سے یہ ملا تھا۔ اور ہاں، دمشق کے متعلق اس کی تصنیف کا ذکر کرنا ہم بھول گئے جہاں یہ 1870ء کے قریب برطانوی کونسل تھا۔ مراکش جانے کا متمنی تھا لیکن اس کی اکھڑ طبیعت نے دشمن بہت بنا لیے تھے۔ مراکش کے بجائے اسے ٹریسٹ بھیجا گیا۔ الف لیلہ کا ترجمہ اور پرفیومڈ گارڈن وغیرہ اس زمانے کی تالیفات ہیں۔ اس کا انتقال ٹریسٹ میں ہوا۔ اس کی ایک معرکۃ الآرا کتاب A Book of Sword شمشیر یعنی دنیا جہاں کی تلواروں کے بارے میں بھی ہے اور ایک رسالہ Bayonet سنگین کے استعمال پر بھی جو بعد ازاں برطانوی فوجوں کے نصاب میں شامل ہوا۔ بہادر علی حسینی کی اخلاق ہندی جو فورٹ ولیم کالج نے چھاپی ہے، اس کا ترجمہ بھی اس نے کیا تھا جو مسودے کی شکل میں رکھا ہے اور حافظ کی غزلیات کا ترجمہ بھی ہم نے دیکھا۔ ناصاف مسودے کی صورت میں جس کا اس کے سوانح نگاروں نے کہیں ذکر نہیں کیا۔

(دنیا گول ہے، سفرنامہ ابن انشا سے اقتباس)

(انتخاب: مہوش سلطانہ، کراچی)

اور ایک چھپر ہوٹل سے ناشتا کرنے کے بعد وہ آفس ٹائم میں ہی آفس پہنچ گیا تھا۔

''میری موٹر سائیکل کے پہیے میں ہوا بھروا دینا۔'' آفس جانے سے پہلے اس نے گارڈ کو کہہ دیا تھا۔ اب وہ اپنے آفس میں بیٹھا تھا۔ اخبارات اس کے سامنے پڑے تھے۔

حامد کے قتل کی خبر سب اخبارات میں شائع ہوئی تھی۔ کسی اخبار نے دو کالمی خبر لگائی تھی تو کسی نے سنگل کالم۔ خبر کی سرخی کچھ یوں تھی۔ ''ملتان کا رہائشی لاہور میں قتل، قاتل گرفتار نہ ہو سکے۔'' پھر زمان خبر کی تفصیل پڑھنے لگا۔ جیسے جیسے وہ خبر پڑھ رہا تھا اس کے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہی رہی تھی لیکن جب اس نے پوری خبر پڑھ لی تب اسے سکون ملا۔ کیونکہ پوری خبر میں اس کا نام کہیں بھی موجود نہیں تھا البتہ نامعلوم افراد کا نام ضرور تھا۔ حامد کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال پہنچادی گئی تھی اور پولیس شواہد جمع کرنے کے ساتھ ساتھ قاتل کو تلاش کر رہی تھی۔

زمان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ حامد کو کس نے اور کس بنیاد پر قتل کیا تھا؟ حالانکہ وہ بھی حامد کو قتل کرنے کی غرض سے ہی لاہور گیا تھا اور اس کے پاس معقول وجہ بھی تھی لیکن اس سے پہلے ہی کوئی حامد کو کیفر کردار تک پہنچا چکا تھا۔

حامد کے قتل ہونے سے زمان کے اندر کی آگ تو ٹھنڈی ہو گئی تھی لیکن اسے قلق بھی تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے حامد کو کیوں قتل نہ کر سکا۔ وہ حامد کو قتل کرنے سے پہلے اسے وجہ بھی بتانا چاہتا تھا لیکن اس کی حسرت دل میں ہی رہ گئی تھی۔

اس نے تمام اخبارات سمیٹ کر ایک سائڈ پر رکھے اور دفتری کام میں مشغول ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ فاخرہ کا فون آگیا۔ زمان سمجھ گیا کہ وہ اسے کیوں کال کر رہی ہو گی۔ اس نے یقیناً حامد کے قتل کی خبر ٹی وی پر دیکھ لی ہو گی۔ اس نے لمبی سانس لیتے ہوئے اس کا فون سنا۔

علیک سلیک کے بعد فاخرہ نے بےتابانہ لہجے میں استفسار کیا۔ ''زمان! تم نے حامد کے متعلق خبر پڑھی، اسے......''

زمان نے سرعت سے اس کی بات کاٹی۔ ''ہاں، ابھی ابھی پڑھی ہے۔''

''اسے کس نے قتل کیا ہوگا؟''

''مجھے کیا پتا۔'' زمان نے رسانیت سے کہا۔ ''لیکن اس سے تمہاری جان چھوٹ گئی ہے۔''

کئی لمحے تو فاخرہ خاموش رہی، شاید اس پر سکتہ طاری ہو گیا تھا، پھر وہ کپکپاتے لہجے میں بولی۔ ''کک...... کیا مطلب زمان؟ میں سمجھی نہیں۔''

"مجھے سب پتا ہے فاخرہ۔" زمان نے کہا۔ "فی الحال میں کام میں مصروف ہوں۔ شام کو آؤں گا تو بات کریں گے۔"

فاخرہ نے کوئی جواب نہ دیا تو لمحاتی توقف کے بعد زمان نے رابطہ منقطع کر کے سیل فون ٹیبل پر رکھا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر دونوں ہاتھ جوڑ کر ٹھوڑی سے لگا لیے۔ وہ جانتا تھا کہ حامد کے قتل سے فاخرہ کی جان چھوٹ گئی تھی۔ وہ یقیناً خوش بھی ہوگی اور تفصیل جاننے کے لیے مضطرب بھی۔ کیونکہ زمان نے ایسی بات کہی تھی جس نے یقیناً اسے پریشان کر دیا ہوگا۔

شام کو وہ ایک گھنٹا پہلے گھر پہنچ گیا۔ فاخرہ اسی کی منتظر تھی اور بے حد سنجیدہ و مضطرب دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں بھی اڑ رہی تھیں۔ زمان اسے پریشان دیکھ کر دل ہی دل میں مسکرایا۔ وہ صوفے پر بیٹھا تو فاخرہ بھی اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"زمان! تم نے یہ کیوں کہا کہ اس سے تمہاری بھی جان چھوٹ گئی ہے۔" لمحاتی خاموشی کے بعد فاخرہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"میں سب جانتا تھا فاخرہ۔" زمان اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کہ حامد تمہیں تنگ کرتا ہے اور تمہیں اپنے ساتھ دوستی کرنے پر مجبور کرتا تھا۔"

یہ سنتا تھا کہ فاخرہ کا رنگ فق ہوگیا اور وہ بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گئی۔

"مم...... میں سمجھی نہیں؟" فاخرہ بہ مشکل تمام بولی۔

زمان نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بولا۔ "فاخرہ! میں جانتا ہوں کہ تم ایک نیک، باوفا اور پاک باز لڑکی ہو۔ لیکن میرا دوست حامد ایک کمینہ، بدفطرت اور بدنیت انسان تھا۔ اس نے تم سے دوستی کرنی چاہی، اس نے تمہیں ورغلانے کی کوشش کی تھی۔ ایک رات جب میں سو رہا تھا تو اچانک میری آنکھ کھلی تھی، تم بیڈ پر موجود نہیں تھیں، میں تمہیں ڈھونڈتے ہوئے ٹیرس پر آیا تو تم اندھیرے میں کھڑی حامد سے باتیں کر رہی تھیں۔ تم اس سے استفسار کر رہی تھیں کہ تمہیں میرا نمبر کہاں سے ملا۔ اس نے بتایا کہ اس نے زمان کے سیل فون سے نمبر چوری کیا ہے۔ بہرکیف، میں نے دیکھا کہ جب اس نے تم سے دوستی کرنے کی بات کی تو تم نے نہ صرف اسے جھڑک دیا بلکہ کہا کہ میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔ میں اپنے شوہر کی امانت ہوں اور امانت میں خیانت نہیں کر سکتی۔ میں چاہتا تو اسی وقت جا کر حامد کو قتل کر دیتا لیکن میں نے صبر سے کام لیا اور موقع کی تلاش میں رہا۔ یہ سچ ہے کہ میں اسے قتل کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس نے دوستی کی آڑ میں میری عزت پر نقب لگانے کی کوشش کی تھی۔ پھر جب حامد لاہور گیا تو میں منصوبہ بنا کر لاہور اس کے پاس پہنچ گیا لیکن مجھے اس کے گندے خون سے ہاتھ رنگنے کا موقع ہی نہ ملا، مجھ سے پہلے ہی کوئی اسے قتل کر کے چلا گیا۔" اتنا کہنے کے بعد زمان خاموش ہو کر فاخرہ کی طرف دیکھنے لگا جس کی آنکھیں اشک بار ہوگئی تھیں۔

"شش...... شکر ہے کہ تم نے اسے قتل نہیں کیا۔" فاخرہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "ورنہ تم قاتل کہلاتے۔"

"ہاں ٹھیک کہہ رہی ہو۔" زمان زیر لب مسکرایا۔

"اللہ نے مجھے قاتل بننے سے بچا لیا لیکن مجھ سے ایک بہت بڑی غلطی ہوئی تھی۔"

"کیسی غلطی؟"

"یہی کہ مجھے حامد کو اپنے گھر نہیں لانا چاہیے تھا۔" زمان نے فاخرہ کا ہاتھ چھوڑ کر طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میں نے تو اس پر اندھا اعتماد کیا تھا، اسے دوست سے زیادہ بھائی کا درجہ دیا تھا لیکن وہ نقب زن نکلا۔ مجھے اس کے قتل ہونے پر ذرہ برابر بھی افسوس نہیں ہے۔"

☆☆☆

چند روز کے بعد قومی اور مقامی اخبارات میں حامد کے قتل کی تفتیش کے حوالے سے خبر شائع ہوئی تھی۔ اس کا قاتل نہ صرف پکڑا گیا تھا بلکہ اس نے اعتراف جرم بھی کر لیا تھا۔ قاتل کا نام محسن سعید تھا۔ وہ لاہور کا رہائشی تھا۔ اس کے بیان کے مطابق حامد اس کا دوست تھا۔ وہ جب بھی لاہور آتا تھا تو اس کے ہاں ٹھہرتا تھا۔ اسی دوران اس نے اس کے سیل فون سے اس کی بیوی شہناز کا نمبر چوری کر لیا تھا۔ بعد ازاں پھر وہ انجان نمبر سے اس کی بیوی کو تنگ کرتا اور اس سے دوستی کرنے کی خواہش ظاہر کرتا۔ بالآخر اس کی بیوی حامد کے جھانسے میں آگئی اور اس سے ملنے پر رضامند ہو گئی۔ جس فلیٹ میں حامد ٹھہرا ہوا تھا، اس کی بیوی نے اسی فلیٹ میں جانا تھا۔ محسن سعید کے مطابق، وہ ایک فیکٹری میں ملازمت کرتا تھا اور اس کی نائٹ ڈیوٹی تھی۔ اس نے اس رات ڈیوٹی پر جانے کے بجائے حامد کے فلیٹ پر جا کر اسے قتل کر دیا اور فرار ہوگیا۔ فرار ہوتے وقت غلطی سے اس کا شناختی کارڈ وہیں گر گیا تھا جس کی بنا پر پولیس نے اسے گرفتار کر لیا تھا۔

⌘⌘⌘

”تم دوبارہ اپنے ناخن چبانے لگی ہو۔“
جولیا کاٹز ایک دم سے چونکی۔ ”کیا کہا تم نے آرچی؟“
”آج صبح دوسری بار میں نے تمہیں اپنے انگوٹھے کا ناخن چباتے ہوئے پکڑا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے تمہارے

ساتھ رہتے ہوئے دو ماہ اور آٹھ دن ہو رہے ہیں اور اس دوران اغوا، توڑ پھوڑ، بھاری ہتھیاروں سے لیس کمپاؤنڈز کے اندر آلات نصب کرنے اور کرائے پر لی گئی گنز سے پیرس کی گلیوں میں مجرموں کے پیچھے بھاگتے ہوئے بھی میں

تخریب کار

عائشہ نصیر

بے حسی کے نقاب میں چھپے معاشرے سے بیزار... مفاد پرستی کی عینک لگائے کچھ لوگ کسی ایک کی نہیں بلکہ پورے معاشرے کی تباہی کا سبب بن جاتے ہیں لیکن ایک کمپیوٹر نے اس تخریب کاری کی روک تھام کرکے ثابت کردیا کہ انسان ہو یا مشین اس کا استعمال ہی حقیقت میں اس کے اچھے یا برے ہونے کا ثبوت ہے۔ اس نے مشین ہوکر بھی کتنی قیمتی جانوں کو بچالیا اور یہی بات انسان کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔

انسان کے ہاتھوں انسانیت کی تباہی کا دلخراش ماجرا
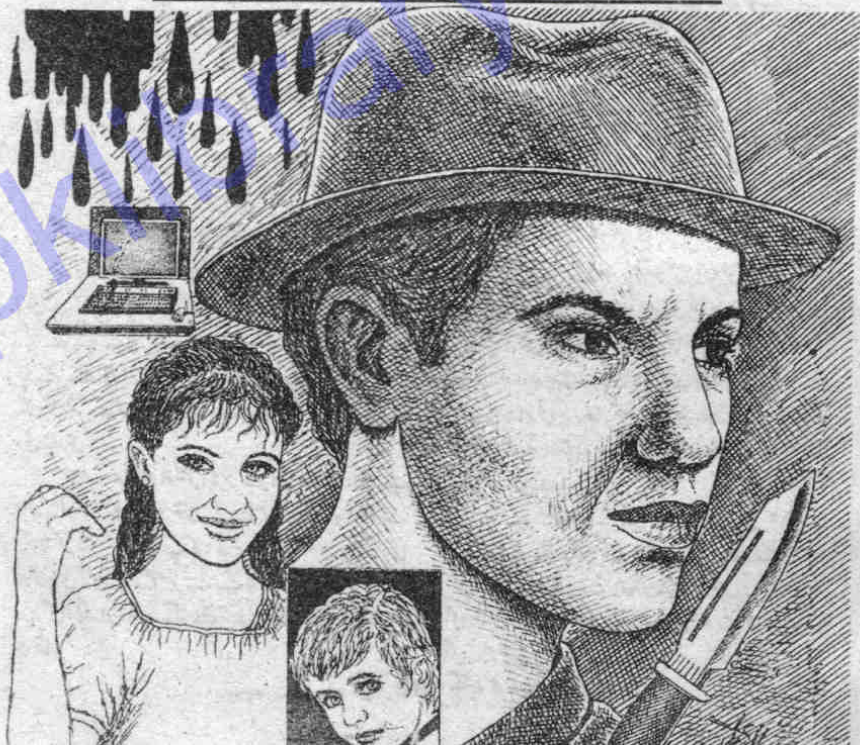
نے تمہارے چہرے پر کبھی پسینا نہیں دیکھا مگر آج پہلی بار مجھے تم گھبرائی ہوئی لگ رہی ہو۔''

وہ دھیمے سے مسکرائی۔ ''میں نروس نہیں ہوں۔''

''ٹھیک ہے، فکر مند ہو؟''

''مجھے ڈر ہے آرچی کہ تم میرے موجودہ مشن کے بارے میں سوچتے ہوئے اتنا گہرائی میں چلے گئے ہو کہ غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہو۔''

میں اس کی پریشانی کو سمجھ سکتا تھا کہ اس کا اگلا قدم کیا ہوگا۔ اگر اسے وہ دعوت نامہ نہیں ملا جس کی وہ توقع کر رہی تھی۔

جولیا ایک بین الاقوامی جاسوس تھی اور میں اس کا AI تھا، کچھ عرصے سے یعنی جب سے میرے اصل باس جولیس نے مجھے اس کام پر لگایا تھا۔

جولیا اپنے بھائی جولیس سے بالکل مختلف تھی۔ وہ آٹھ سال چھوٹی تھی۔ ظاہر ہے اسی پاؤنڈ ہلکی اور چھ انچ چھوٹی تھی۔ وہ نیلی آنکھوں کے ساتھ سنہری بالوں والی بھی تھی جبکہ جولیس کے گہرے بھورے بال اور اس سے بھی گہری آنکھیں تھیں۔ اگر اس کا موازنہ کسی بالی ووڈ ایکٹریس سے کیا جاتا تو وہ جولیا کے سامنے پھیکی پڑ جاتی۔

ان چند جسمانی اختلافات کے علاوہ جولیا کا مزاج بھی جولیس سے بہت مختلف تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ دونوں کسی خچر کی طرح ضدی تھے۔ جولیا شدید اور عمل کرنے والی شخصیت تھی جبکہ جولیس اتنا ہی مہربان تھا جتنا میں ہو سکتا ہوں۔ وہ ذہین تھا مگر ساتھ ہی ساتھ کاہل بھی تھا اور صرف اس وقت اپنے تیز دماغ سے کام لیتا جب اسے بھاری فیس مل رہی ہو۔ اسے ان سرگرمیوں میں شامل رہنے کے لیے رقم کی ضرورت تھی جس سے وہ بہت لطف اندوز ہوتا تھا۔

جولیا کی تنظیم پچھلے چوبیس گھنٹوں سے چہ میگوئیاں سن رہی تھی کہ بدنام زمانہ قاتل دی وولف کسی ایسے شخص کو قتل کرنے کے لیے لندن میں تھا جسے وہ نقصان پہنچتا نہیں دیکھنا چاہتے تھے اور اس کے علاوہ وہ اس رات ایک ڈنر پارٹی میں بھی شرکت کرے گا جو لیڈی ے ورتھنگٹن کی طرف سے دی جا رہی تھی۔

بلاشبہ اگر عظیم جولیس کاٹڑ مجھے دی وولف کے لیے صنفِ کرخت کا صیغہ استعمال کرتے سن لیتا تو یقیناً شکایت کرتا کہ میں صنفی تعصب کا مظاہرہ کر رہا ہوں کیونکہ دی وولف کی جنس کم از کم میرے لیے نامعلوم تھی اور جولیا کے لیے بھی، بلکہ ان سب کے لیے جنہوں نے صرف اس کا نام سنا تھا۔

جولیا کے فون کی گھنٹی بجی۔ یہ اس کے آفس سے تھا جو اسے بتا رہے تھے کہ وہ اس کے لیے لیڈی ورتھنگٹن کی پارٹی میں شرکت کا بندوبست کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

''میرا اندازہ ہے کہ ہم لندن جا رہے ہیں۔'' میں نے کال بند ہونے کے بعد کہا۔

''ہاں...... ہم جا رہے ہیں۔'' اس نے اتفاق کیا۔

''دو دن پہلے میں نے لندن کے نیلام گھر سے نایاب شراب کی ایک بوتل خریدی تھی۔ میں اسے جولیس کو منگنی کے تحفے کے طور پر بھیجنے کا ارادہ کر رہا تھا لیکن یہ ابھی تک نہیں بھیجی۔ اگر تم چاہو تو اسے تم لے سکتی ہو۔''

اس نے سوالیہ انداز میں ابرو اٹھائے۔ ''میں ایسا کیوں کرنا چاہوں گی آرچی؟''

''ظاہر ہے، تم اسے لیڈی ورتھنگٹن کی پارٹی میں لے جا سکتی ہو۔ کیا یہ اعلیٰ طبقے کے ان فینسی پارٹیوں کا رواج نہیں ہے؟ اس کے علاوہ یہ پرانی اور ایک نایاب شراب ہے۔ یہ یقیناً دوسرے مہمانوں پر تمہارا اچھا تاثر ڈالے گی اور وہ تمہاری طرف سے کسی شک و شبہے کا شکار نہیں ہوں گے کیونکہ بہرحال تم وہاں جاسوسی کرنے جا رہی ہو۔''

''اور یہ کتنی مہنگی ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''بارہ ہزار برطانوی پاؤنڈ سے کچھ زیادہ۔''

''اوہ......'' اس نے قیمت کے ٹیگ پر سیٹی بجائی جو موجودہ شرح مبادلہ پر تقریباً 15,702 امریکی ڈالرز تھی۔ ''تم مذاق تو نہیں کر رہے نا؟ تمہارے پاس اتنے پیسے آئے کہاں سے؟ مجھے یقین ہے تم نے دشمن کو راز تو نہیں بیچے ہوں گے نا؟''

میں نے خود کو کبھی بھی ٹیکنالوجی کے دو بائی تین انچ کے مستطیل کمپیوٹر نما کے طور پر تصور نہیں کیا جو کسی بھی سائنس دان کے تصور سے بیس سال زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جولیس نے ان تمام سالوں میں مجھے ٹائی پن کے طور پر پہنا اور مجھے پانچ فٹ دو انچ اونچائی والے شخص کی برابری پر رکھا۔ بہرحال اس وقت میں جولیا کی آنکھوں میں شرارت دیکھ سکتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ صرف مجھے چھیڑ رہی ہے۔

''کہہ سکتے ہیں۔'' میں نے اپنے وائس سمیلیٹر کے مطابق اپنے لہجے کو قدرے باوقار بنایا۔ ''ہمارے موجودہ مشن سے پہلے، میں نے کچھ دن پہلے جولیس کی جاسوسی کی تھی۔ اس وقت جولیس کے پاس کافی نقد رقم تھی اور وہ کسی بھی نئے کیس پر غور کرنے سے انکار کر رہا تھا۔ میں اس کے

لیے ایک منگنی کا تحفہ خریدنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کی کچھ رقم اسٹاک مارکیٹ میں لگائی اور جیسا کہ تم دیکھ سکتی ہو میں نے اچھا کام کیا۔''

''دلچسپ۔'' جولیا نے کہا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مسحور کن مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ''میرے پیارے بھائی کو کیسا لگے گا اگر اسے معلوم ہو جائے کہ میں نے اسے ایک نایاب شراب کی بوتل سے محروم کر دیا ہے؟''

''بہت برا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں وہ کافی عرصے سے اسے اپنے کلیکشن میں شامل کرنا چاہتا تھا اور میں حیران بھی تھا کہ اس نے اس کے لیے کوئی بولی کیوں نہیں لگائی۔ یا شاید لگائی بھی ہو تو مجھے پتا نہ چلنے دیا ہو۔''

''یا شاید وہ کسی دوسری منصوبہ بندی میں مصروف ہو جیسے کہ شادی یا انگور کا باغ خریدنا۔''

''یہ ممکن ہے۔'' میں نے اس سے اتفاق کیا۔

''اس بوتل سے ایک دلچسپ گفتگو کا آغاز ہوسکتا ہے۔'' وہ بڑبڑائی۔ ''جس سے ممکن ہے دی وولف کے بارے میں بھی کوئی سرا ہاتھ لگے...... لیکن نہیں، اسے میرے بھائی کو ہی بھیج دو۔ میں اسے محروم نہیں کرنا چاہوں گی اور ویسے بھی میں سوشلائٹ کور اسٹوری کا استعمال نہیں کر رہی۔ مجھے ایک صحافی کے طور پر جانا ہے۔''

''مگر تم نے فون کال پر کچھ اور کہا تھا۔'' میں بس اتنا ہی کہہ پایا۔

اس کی آنکھوں میں چمک آئی۔ ''جس سے میں نے بات کی اس کا نام ٹرڈی بارٹن نہیں ہے اور ہم کوڈ ورڈز میں بات کر رہے تھے۔''

میں جو کچھ بھی سنتا ہوں اسے ریکارڈ کرتا ہوں۔ اس لیے میں نے تھوڑی دیر پہلے کی گئی ان کی گفتگو کو پھر سے سنا اور اٹھارہ پوائنٹ چار سیکنڈ بعد ہی میں نے وہ کوڈ کریک کر لیا تھا۔

انہوں نے اس کے لیے نہ صرف ایک صحافی بننے کا بلکہ لیڈی ورتھنگٹن کی ڈنر پارٹی کے بارے میں ایک فیچر اسٹوری کرنے کا بھی انتظام کیا تھا۔ یہ ایک شاطر خیال تھا کیونکہ اس سے جولیا کو ہمیشہ کی طرح مہمانوں سے سوال کرنے کا بہانہ ملتا۔ اس کی تنظیم وقت ضائع نہیں کر رہی تھی۔ وہ پہلے ہی اس کی کور اسٹوری بنا رہے تھے۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد مجھے چودہ فیچر آرٹیکل ملے جو انہوں نے جولیا کی بائی لائن کے ساتھ مختلف میگزین کی ویب سائٹس پر لگائے تھے۔ اس کا اصلی نام نہیں بلکہ وہ نام جو وہ اس رات استعمال کر رہی ہوگی۔

''لندن کیسے جاؤ گی؟'' میں نے پوچھا۔ ''پلین یا ٹرین؟''

''اگر میں نقدی سے محروم فری لانس صحافی کا کردار ادا کرنے جا رہی ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ مجھے ٹرین لینا چاہیے۔''

میں نے جولیا کے لیے پیرس سے تین بجے روانہ ہونے والی ٹرین پر بکنگ کی جس سے اسے لندن آفس میں اضافی بریفنگ کے لیے کافی وقت ملتا۔

اس نے مجھے کچن ٹیبل سے اٹھایا اور اپنے بالوں میں سامنے کی طرف یوں سیٹ کیا کہ میں اس کے سامنے کھڑے کسی بھی پانچ فٹ دس انچ شخص کی آنکھوں میں دیکھ سکتا تھا اور وہ بھی مجھے دیکھ سکتا تھا مگر اسے بس میں ایک عام سے ہیئر پن کی طرح ہی نظر آتا۔ شاید کبھی ایسا وقت آئے جب میں خود کو اس مختصر، ہیوی سیٹ بے نام پی آئی کے طور پر تصور کرنا چھوڑ دوں اور اس کے بجائے اپنے نام سے جانا جاؤں، آرچی گڈون!

ٹرین کے سفر کے دوران جولیا نے ان فائلوں کا مطالعہ کیا جو اس کے آفس نے اسے چھ مشتبہ افراد کے بارے میں بھیجی تھیں جبکہ میں یہ حساب کرنے کے لیے ان فائلز کی کاپی بناتا رہا کہ ان میں سے کس کے دی وولف ہونے کا امکان سب سے زیادہ ہے۔ ان میں سے ایک تینتالیس سالہ برطانوی بیوروکریٹ تھا جس کا نام راجر کاربنکل تھا۔ اس کا امکان زیرو فیصد تھا اور باقی مشتبہ افراد کے ساتھ ان میں سے کوئی بھی کم از کم اعداد و شمار کے لحاظ سے دوسروں کے مقابلے میں نمایاں طور پر زیادہ مشکوک نہیں لگتا تھا۔

اگرچہ ان میں سے دو ایسے تھے جنہیں میں اپنے طور پر مشکوک مان رہا تھا۔ ایک سینتیس سالہ مہم جو اینیس فاؤل تھی اور دوسرا اتیس سالہ بزنس ٹائیکون تھا جس کا نام تھامس ڈنسم تھا۔

فاؤل کے بارے میں جس چیز نے مجھے متاثر کیا وہ یہ تھی کہ وولف اس کے نام کا ایک انگرام تھا۔ یعنی فاؤل کے حروف کو اگر آگے پیچھے کر دیا جائے تو وہ وولف بنتا ہے۔

اس کی فائلز میں کہا گیا تھا کہ وہ ہمالیہ میں دنیا کے پانچویں سب سے اونچے پہاڑ مکالو پر چڑھ رہی تھی جس وقت دی وولف قتل کی ایک واردات انجام دے رہا تھا اور اس کے دوسرے قتل کے دوران بحر ہند کے اس پار کشتی رانی کر رہی تھی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ دی وولف نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ ان دونوں مہم جوئیوں کو جائے واردات سے اس کی عدم موجودگی کا بہترین ثبوت مانا جاسکتا تھا۔ مکالو

کے لیے اس نے اپنی جگہ کسی اور کو بھیجا ہوگا اور کشتی رانی کے لیے بھی باڈی ڈبل کا استعمال کیا ہوگا۔ آخر کار وہ ایک شاطر قاتل تھا...... یا تھی۔

وسم کی طرف جس چیز نے میری توجہ دلائی، وہ یہ تھی کہ اس کا وزن دو سو پچاسی پاؤنڈ تھا۔ ایک ٹن کا ساتواں حصہ۔ بالکل افسانوی کردار نیرو وولف کی طرح وہ ایک سیریل کلر تھا جو پیلے رنگ کی قمیصوں کو پسند کرتا تھا۔

لیکن اگر وسم، دی وولف ہوتا تو کیا وہ اتنا بے پروا کام کرتا جیسا کہ ایسے افسانوی کردار کا ایک عرف چننا جو جسمانی طور پر اس سے مشابہت رکھتا تھا؟ یہ ایک دلچسپ سوال تھا اور اس پر تحقیق کرنے کی ضرورت تھی۔

جب میں نے جولیا کے سامنے یہ بات رکھی تو وہ کافی خوش نظر آئی۔

''جولیس نے مجھے متنبہ کیا تھا کہ تمہارا سسٹم مزید ڈویلپ ہوسکتا ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ تم واضح تجزیاتی استدلال کے بجائے اپنی سوچ کے مطابق چل رہے ہو۔''

میں اس پر بحث کر سکتا تھا مگر میں نے صرف اتنا کہا۔

''ایک مشتبہ عورت جس کا آخری نام وولف کا انگرام ہے اور دوسرا اس افسانوی سیریل کلر سے جسمانی ساخت میں مشابہت رکھتا ہے جس کا نام وولف تھا؟ تمہیں تسلیم کرنا پڑے گا، یہ بہت بڑے اتفاقات ہیں۔''

''یہی بات ہے آرچی! جب تک وہ ایک ساتھ دی وولف کے طور پر کام نہیں کر رہے ہیں، تب تک یہاں کم از کم ایک اتفاق نظر آتا ہے۔''

میں نے کوئی ایسا ثبوت تلاش کرنے کی کوشش کی جس سے مجھے ان دونوں کے بیچ کوئی کنکشن مل سکے مگر ٹرین لندن پہنچنے تک مجھے شکست تسلیم کرنا پڑی۔

جولیا کی تنظیم نے اسے جو فائلیں بھیجی تھیں ان میں وہی معلومات شامل تھیں جو میں نے خود مرتب کی تھیں اور لندن کے دفتر میں اس کی بریفنگ سے مجھے زیادہ مدد نہیں ملی۔ سوائے اس کے کہ ایجنٹ ڈنر پارٹی کے بعد ہر مشتبہ شخص کا پتا لگانے والے تھے۔

جولیا لندن کے دفتر میں اس وقت استعمال ہونے والی نان اسکرپٹ عمارت سے آدھے بلاک کے فاصلے پر تھی جب کار کے انجن کی آواز نے ہم دونوں کو خبردار کیا کہ کچھ غلط ہے۔

وہ بھاگنے لگی۔ اس کا رخ اس شیڈ کی طرف تھا تاکہ وہ وہاں کھڑی کار کے پیچھے چھپ سکے۔

گزرتی ہوئی کالی مرسیڈیز سے تین گولیاں سنسناتی ہوئی آئیں۔ اس سے پہلے کہ جولیا اپنے بیگ سے اپنی گن نکال پاتی، گاڑی چیختے ہوئے ٹائروں کی آواز کے ساتھ ہوا ہوگئی۔

میں جانتا تھا کہ ان میں سے کوئی گولی جولیا کو نہیں لگی لیکن اس کے باوجود میرا پروسیسنگ سائیکل اتنا تیز دوڑ رہا تھا جیسے کسی انسان کے دل کی دھڑکن۔

''کیا تم ٹھیک ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، آرچی! کیا تم نے نمبر پلیٹ دیکھی یا شوٹر یا ڈرائیور کی کوئی تصویر؟'' اس کی آواز ہانپتی ہوئی سی تھی، یہ شاید اس کی تیز دوڑ کا نتیجہ تھا۔

میں نے جو ریکارڈ کیا تھا اس پر گیا اور جولیا کو بتایا کہ میرے پاس پلیٹ ہے لیکن کار کے اندر کسی کی کوئی تصویر نہیں ہے۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ میں نے تین گولیوں کی رفتار کا حساب لگا لیا ہے۔ ''ان میں سے ایک گولی تم سے ایک انچ سے بھی کم فاصلے سے گزری۔''

''ہاں، مجھے پتا ہے۔''

جولیا نے لندن آفس فون کیا اور اس سپروائزر سے بات کی جس نے اسے پہلے بریف کیا تھا۔ جولیا کے بتانے کے بعد کہ ابھی ابھی اس پر ایک قاتلانہ حملہ ہوا، سپروائزر نے کہا کہ وہ اس ایریا کے سرویلنس کیمرے کا پتا لگائیں گے۔

''برا ہوا کہ تم نامعلوم شرپسندوں میں سے کسی کو بھی دیکھ نہیں پائیں لیکن ہم دیکھیں گے کہ کیا ہم ان کی شناخت کر سکتے ہیں۔ تم اس بزدلانہ حملے سے رکنے والی تو نہیں ہوتا؟''

''یقیناً نہیں۔'' جولیا کا لہجہ مضبوط تھا۔

''بس اتنا ہی؟'' میں جو انتظار میں تھا، اس کے فون بند کرتے ہی بول اٹھا۔

''ہاں...... لگتا تو ہے۔'' اس نے کندھے اچکائے۔

''کسی نے ابھی ابھی تمہیں جان سے مارنے کی کوشش کی اور وہ بس اس علاقے کا سرویلنس کیمرا کھنگالیں گے؟''

''یہ میرے لیے روز کی بات ہے آرچی! تمہیں اب تک معلوم ہو جانا چاہیے تھا۔''

تو اس کا حال ایسا ہی تھا۔ میں نے اس بات کا ذکر کرنے کی زحمت نہیں کی کہ وہ پہچانی جا چکی ہے۔ کم از کم یہاں لندن میں۔ اسی لیے قاتل اس پر گولیاں برساتے پھر رہے تھے۔ اس کے بجائے میں انتظار کرتا رہا جب تک کہ وہ شام کے لیے لیڈی ورتھنگٹن کے گھر کی طرف جانے والی ٹیکسی میں نہیں بیٹھی۔ چونکہ میں اس سے چھوٹے ائرپیس کے

ذریعے بات کرتا تھا اس لیے وہ نہیں چاہتی تھی کہ کیب ڈرائیور یہ سوچے کہ وہ خود سے بات کرنے والی ایک پاگل عورت ہے۔ اس لیے اس نے ایک نوٹ لکھا کہ اس کے ذہن میں کچھ ہے اور وہ وقت آنے پر مجھے مزید بتائے گی۔

لیڈی ورتھنگٹن خود دروازے پر آئی۔ تریپن سال کی ایک دبلی پتلی اور خوش مزاج عورت، ہیرے اور روبی جڑے نیکلس میں، ہیروں کی بالیاں اور ایک خوبصورت گلابی ڈیزائنر گاؤن میں سجی ہوئی جس کی قیمت اس شراب کی بوتل سے کہیں زیادہ تھی جو میں نے جولیس کے لیے نیلامی میں خریدی تھی۔

اس کے برعکس جولیا جینز، ایک سوتی سویٹر اور ٹینس کے جوتے پہنے ہوئے تھی۔ اگر لیڈی ورتھنگٹن اس کے لباس سے ناخوش تھی بھی تو اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔

”تم یقیناً اپریل بلوم ہو۔“ لیڈی ورتھنگٹن نے خوشی سے کہا۔

”جی بالکل، میں ہی ہوں۔“ جولیا نے تسلیم کیا۔

ہاں...... اس کے آفس نے اس رات جولیا کے لیے یہی نام چنا تھا۔

ورتھنگٹن کی مسکراہٹ سنسنی خیز ہوگئی اور اس نے ہلکے سے جولیا کا بازو پکڑ لیا۔ ”لگتا ہے اونچی جگہوں پر تمہارے کافی تعلقات ہیں۔“ اس کی آواز سرگوشی میں ڈھلی۔ ”وزیر اعظم کے آفس سے فون آیا تھا کہ تمہیں اس پارٹی میں ضرور ہونا چاہیے۔“

”میرے ذاتی تعلقات نہیں ہیں۔“ جولیا نے کہا۔ ”لیکن میرے میگزین کے پبلشر کے ضرور ہیں۔“

لیڈی ورتھنگٹن جولیا کو لیونگ روم میں لے کر آئی جہاں دوسرے مہمان پہلے سے موجود تھے۔ دو ویٹرز کے ساتھ، ہر ایک کے پاس اسٹارٹر کی ایک ٹرے تھی اور کمرے کے ایک کونے میں ایک سجے ہوئے بار میں ایک بارٹینڈر بھی موجود تھا۔

تمام چھ مشتبہ افراد جولیا کے اندر داخل ہوتے ہی اپنی گفتگو روک کر اسے دیکھنے لگے۔

وسیم نے اس پر طنز کیا۔

اینیس فاؤل اس کے آنے سے خوش نظر آئی۔

ایلک ہیتھ، ایک انتیس سالہ تھیٹر کے مشہور اداکار نے اس کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری اور ایسی مسکراہٹ دی جسے صرف بھیڑیے کی مسکراہٹ سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔

راجر کاربنکل، بیوروکریٹ نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

ایملی جانسن، ایک انتیس سالہ سوشلائٹ تھی جسے جولیا کی موجودگی اپنی بے عزتی کی طرح محسوس ہوئی۔ کم از کم اس کے تاثرات سے تو یہی لگ رہا تھا۔

اور آخری فرڈنیویل پلمپٹن، ایک چالیس سالہ مصنف جو جیمز بونڈ کی فلم ”فرام رشیا ود لو“ کے اداکار شان کونری سے مشابہت رکھتا تھا، نے اس کی طرف ایک ایسے تاثرات کے ساتھ دیکھا جس کا میں اندازہ نہیں لگا پایا۔ ہوسکتا ہے یہ عدم دلچسپی ہو، ہوسکتا ہے کہ یہ مکمل طور پر کچھ اور ہو۔

لیڈی ورتھنگٹن نے جولیا کا تعارف کرایا اور اپنے مہمانوں کو متنبہ کیا کہ وہ اچھے سے پیش آئیں ورنہ انہیں ڈیزرٹ کے بغیر جانا پڑے گا جس پر انہیں افسوس ہوگا کیونکہ وہ پارٹی کے لیے عالمی معیار کا پیسٹری شیف لے کر آئی تھیں۔

جولیا نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ تھیٹر اداکار ایلک ہیتھ کے علاوہ ان میں سے کسی کو نہیں جانتی۔ خیر، ایک طرح سے یہ سچ بھی تھا۔ جولیا نے صرف ان کی فائلز پڑھی تھیں۔

ان لوگوں نے گفتگو کے لیے خود کو دو گروپوں میں تقسیم کر لیا تھا اور جولیا نے اس گروپ میں شمولیت اختیار کی جس میں ایلک ہیتھ، اینیس فاؤل اور ایملی جانسن شامل تھے۔

ایک ویٹر جولیا کے پاس ڈرنک آرڈر لینے پہنچا اور چونکہ میرے بہتر ”وژن“ کے ساتھ مجھے تیس فٹ دور سے شراب کے لیبل پڑھنے میں کوئی دقت نہیں تھی، میں نے اسے شیمپین آزمانے کا مشورہ دیا۔ ”دو ہزار دو لوئس روڈر کرسٹل۔ بہترین ونٹیج۔ جولیس ہوتا تو یہی پیتا۔“

جولیا نے میری تجویز کو نظرانداز کیا اور ویٹر سے پوچھا کہ اس کا میزبان کیا پی رہا ہے؟

”برمبل۔“

”یہ مزیدار لگتا ہے۔ میں بھی یہی لوں گی۔“ یہ جھوٹ تھا۔ میں جانتا تھا کہ جولیا کو پھل والی الکوحل پسند نہیں تھی۔

ویٹر کے چلے جانے کے بعد سوشلائٹ، ایملی جانسن نے جولیا کو کافی تحقیر آمیز لہجے میں مخاطب کیا اور کہا کہ اس کی موجودگی ایک مداخلت تھی۔ ”مجھے لگتا ہے ہمارے درمیان ایک جاسوس بھیجا گیا ہے۔“

میں نے جولیا سے کہا۔ ”یہ تو بہت چالاک عورت ہے۔ تم اس سے کیوں نہیں پوچھتیں قاتل کون ہے؟ اس سے ہمارا کافی وقت بچ جائے گا۔“

کمرے میں کوئی ویب کیمز نہیں تھے ورنہ میں فیڈ

میں جا کر جولیا کے تاثرات دیکھ سکتا تھا لیکن ایلک بیتھ جس زاویے پر بیٹھا تھا، اس کے چشمے میں مجھے جولیا کا عکس نظر آ گیا۔ میرے تبصرے سے تو نہیں لیکن ایملی جانسن کے الزام سے اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ جھلکی تھی۔

''پھر تو میں نہایت ناکارہ جاسوس ہوتی اگر مجھے اتنی آسانی سے پہچانا جاتا۔ ویسے ایک لمحے کے لیے مان لیا کہ میں جاسوس ہوں تو میں یہاں تم لوگوں کی جاسوسی کرنے کیوں آؤں گی؟''

''اوہ، یہ ایک تفریحی کھیل لگتا ہے۔'' اینیس فاؤل نے چہکتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کھیلنے دو۔ تم یہاں ایک گھناؤنی سازش کا پردہ فاش کرنے آئی ہو۔''

''کیسی سازش؟''

''ہم میں سے ایک قاتل ہے۔'' بیتھ بھی اس گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے بولا۔

''صحیح جواب۔'' جولیا نے ہلکی سی تالی بجائی۔ ''میں ایک قاتل کو بے نقاب کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ پھر سے انگوٹھے کا ناخن کترنے لگی جیسے اس خیال پر زیادہ گہرائی سے سوچ رہی ہو پھر مزید کہا۔ ''ایک بدنام زمانہ قاتل...... اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ کوئی قتل کرے۔''

''مطلب وہ کوئی مرد ہے...... ہے نا؟'' اینیس فاؤل کے لہجے میں شکایت تھی۔ ''یہ تو ناانصافی ہے۔''

''نہیں، وہ کوئی عورت بھی ہو سکتی ہے۔'' جولیا نے اس کی تسلی کی خاطر کہا۔

''اور اس قاتل نے کتنے لوگ مارے ہیں؟'' بیتھ کے لہجے کی خوشی میری سمجھ سے باہر تھی۔

''آٹھ...... جہاں تک ہم جانتے ہیں۔''

''مرد ہو یا عورت...... اس کی کوئی عرفیت بھی ہو گی۔ شاید دی جیکال؟''

ایملی جانسن نے حقارت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ نام پہلے ہی فکشن میں استعمال ہو چکا ہے۔''

''ہاں، یاد آیا۔'' اینیس فاؤل نے کہا۔ ''دی ڈے آف دی جیکال از فریڈرک فورسیتھ۔ میں بھی کہوں یہ نام میرے ذہن میں کیوں تھا؟''

''حقیقی زندگی میں بھی اس نام کا ایک معروف دہشت گرد گزرا ہے۔'' بیتھ نے کہا۔ ''کارلوس دی جیکل۔''

''نہیں، نہیں۔'' جولیا نے ان کی بات کاٹی۔ ''جس کی میں تلاش کر رہی ہوں، وہ زیادہ شیطانی قسم کا ہے۔ کوئی ایسا شخص جو اپنے قتل کے لیے چاقو اور اسکارف کا استعمال کرنا پسند کرتا ہے۔ تو فرض کرو اس قاتل کی عرفیت ''دی وولف'' ہے۔''

اس پر اینیس فاؤل ہنسی۔ ''اوہ، یہ دلچسپ ہے کیونکہ اگر میرے نام فاؤل کے حروف کو دوبارہ ترتیب دیا جائے تو اس سے وولف بنتا ہے۔ تو اگر میں قاتل ہوں تو میں ایسا نام کیوں چنوں گی جو میرے اصل نام کا حصہ ہے؟''

میں جولیا کو جانتا تھا۔ اسے بھی یہ دلچسپ معلوم ہوا ہوگا کہ فاؤل نے کتنی جلدی یہ پوائنٹ پکڑ لیا اور اپنے لہجے کو بھی نارمل رکھنے میں کامیاب رہی۔

ایملی جانسن اس گیم کو گرما رہی تھی یا کم از کم ایسا ظاہر کر رہی تھی جیسے یہ محض ایک گیم ہو۔ اس نے جولیا سے پوچھا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلے گا کہ ہم میں سے تمہارا وہ قاتل کون ہے؟''

''میرا منصوبہ یہ تھا کہ ایک صحافی بن کر تم لوگوں کی باتیں سنوں اور بے ضرر سے سوالات پوچھوں لیکن چونکہ تم نے مجھے جاسوس والا آئیڈیا دے ہی دیا ہے تو اب میرا اندازہ ہے کہ میں اپنا پلان بدل کر تم میں سے ہر ایک سے پوچھ گچھ کر سکتی ہوں...... یا تو انفرادی طور پر یا ایک گروپ کے طور پر۔''

ایلک بیتھ نے اپنا گلاس پیچھے کی طرف جھکایا جس کے نتیجے میں کئی آئس کیوبز آپس میں ٹکرانے لگے۔ اس نے اپنی مکس ڈرنک ختم کی اور طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''ہم میں سے کوئی بھی اس کے لیے کیوں تیار ہوگا؟''

جولیا نے سوال پر غور کرنے کا بہانہ کیا۔ ''میں دھمکی دے سکتی ہوں اور میں فیصلہ کروں گی کہ پہلا شخص جو تعاون نہیں کرے گا، وہی دی وولف ہے اور میری جاسوس ایجنسی اس قاتل کو اس وقت حراست میں لے گی جب وہ پارٹی کے اختتام پر گھر جا رہا ہوگا۔ اس کے بعد آنے والے اڑتالیس گھنٹے ٹھیک نہیں ہوں گے۔ ممکنہ طور پر یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی لاش لوگوں کو دریائے ٹیمز میں ملے۔''

سوشلائٹ، ایملی جانسن، یہ سوچ کر خوفزدہ نظر آئی۔ ''لیکن یہ سراسر مضحکہ خیز ہے۔ وہ شخص بے قصور بھی تو ہو سکتا ہے؟''

جولیا نے بے ساختہ کندھے اچکائے۔ ''مجھے یہ ماننا پڑے گا کہ موت کا حقیقی خطرہ تم میں سے ہر ایک کو ساتھ دینے پر راضی کرے گا اور میں اپنی چال کا استعمال کر کے یہ دریافت کر سکوں گی کہ تم میں سے کون میرا شکار ہے۔ اگر تم میں سے کوئی میری وارننگ کو سنجیدگی سے نہیں لیتا۔ ٹھیک

ہے، سے لاوی۔'' اس نے آخر میں فرنچ کا ایک جملہ ٹانکا۔
اینیس فاؤل نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔ ''بہت مزہ آنے والا ہے۔ مجھے باقی لوگوں کو بھی اس بارے میں بتانے دو۔''

میں فاؤل، ہیتھ اور جانسن کو اس لمحے سے دیکھ رہا تھا جب سے جولیا نے اس جرأت مندانہ چال کا انتخاب کیا اور اب تک ان میں سے کسی کے بھی انداز سے یہ نہیں لگ رہا تھا کہ ان میں سے کوئی ڈی وولف ہے۔

میں نے جولیا سے پوچھا کہ کیا اسے ان میں وہ بات نظر آئی؟ اور اس نے اشارہ کیا کہ ابھی نہیں۔ اگر وولف ان تینوں میں سے ایک تھا تو وہ ایک زبردست مخالف ثابت ہونے والا تھا۔

ہم دونوں نے دیکھا جب اینیس فاؤل دوسرے گروپ کے پاس پہنچی اور اس گیم کے بارے میں بتایا جو جولیا کھیل رہی تھی۔

راجر کاربنکل نے مزید الجھے ہوئے ردعمل کا اظہار کیا۔ نیویل پلمپٹن نے پہلے جیسا ہی پراسرار تاثر دیا سوائے اس کے کہ اس بار اس میں زیادہ شدت تھی۔

تھامس وِنسم نے ناپسندیدگی سے سر جھٹکا۔

اور لیڈی ورتھنگٹن نے کہا کہ یہ ایک فن گیم کی طرح لگتا ہے۔

''میڈم!'' وِنسم نے اپنا آدھا انچ سر ہلاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا جیسا شاید افسانوی کردار نیرو وولف کرتا ہوگا۔ ''اگر آپ بچوں کے اس ناکارہ اور بے ہودہ کھیل میں حصہ لینا چاہتی ہیں تو آپ کی مرضی لیکن میں اس میں شامل نہیں ہوں گا۔''

''اوہ وِنسم! مزہ خراب کیوں کر رہے ہو۔ تمہیں اس کھیل میں شامل ہونا پڑے گا۔'' لیڈی ورتھنگٹن کے لہجے میں اصرار کم اور تحکم زیادہ تھا۔

وِنسم نے اس کی طرف دیکھا لیکن اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔

لیڈی ورتھنگٹن نے ویٹروں میں سے ایک کو کچن سے سب سے بڑے سرونگ چمچ لانے کو کہا اور جب وہ اس کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے، لیڈی ورتھنگٹن اور وِنسم ایک دوسرے کو گھورنے والے مقابلے میں مصروف تھے۔

شیطانیت کی ایک جھلک لیڈی ورتھنگٹن کے چہرے پر دیکھی جاسکتی تھی۔

اور بزنس ٹائیکون کی آنکھیں ایسے ابل رہی تھیں جیسے اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ ایسا ہو رہا ہے۔

ویٹر ایک بھاری پیتل کے سرونگ چمچ کے ساتھ واپس آیا جو اس نے ورتھنگٹن کو دے دیا۔ جب اس نے وِنسم کی طرف قدم بڑھایا، کیا وہ اسے اس چمچ سے پیٹنے والی تھی؟ میں یہی سوچ رہا تھا جب وِنسم نے اپنا گلا صاف کیا اور اسے بتایا کہ وہ اس گیم میں شریک ہونے کے لیے تیار ہے۔

اگر کاربنکل یا پلمپٹن میں سے کسی نے اس گیم کو چھوڑنے کا ارادہ کیا بھی تھا تو پیتل سرونگ اسپون لیڈی ورتھنگٹن کے تیوروں نے انہیں اس ارادے پر عمل نہیں کرنے دیا۔

لیڈی ورتھنگٹن نے چارج سنبھالتے ہوئے ویٹروں کو فرنیچر کو دوبارہ ترتیب دینے کا حکم دیا تاکہ ایک صوفہ اور دو نشستیں ایک آدھا دائرہ بن جائیں جس کے سامنے ایک کشن والی کرسی تھی۔

جب یہ سب چل رہا تھا، پلمپٹن غیر محسوس انداز میں جولیا کے قریب گیا اور بغیر کسی وارننگ کے اس کے دائیں جبڑے پر ایک گھونسا مارنے کی کوشش کی۔ عام طور پر مارشل آرٹس کی ماہر جولیا جو لڑتے وقت کسی چیتے سے مشابہت رکھتی تھی اور اپنے مخالف کو ایسے دھول چٹاتی کہ وہ سمجھ بھی نہ پاتا لیکن چونکہ وہ ایک صحافی کا کردار ادا کر رہی تھی، اس کے بجائے اس نے کسی حد تک اناڑی پن سے مکے کو روکتے ہوئے اناڑی پن سے ہی اس کی ٹانگوں کے درمیان پیر پھنسا کر اسے پیٹھ کے بل زمین پر گرا دیا۔

مگر پھر بھی پلمپٹن کی بچت ہوئی کیونکہ فرش پر موٹا قالین بچھا ہوا تھا۔

''یہ کیا حرکت تھی؟ وضاحت کرو۔'' لیڈی ورتھنگٹن نے مطالبہ کیا۔

پلمپٹن فرش پر پڑے پڑے ہی کراہا۔ ''میں بس پتا لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ مس بلوم جاسوس ہیں یا نہیں۔''

''اس کے بجائے اس نے تمہیں زمین پر پٹخ دیا۔'' اینیس فاؤل نے کہا۔

''ہاں، لیکن ایسا کرتے ہوئے مس بلوم کوئی جیمز بانڈ نہیں بلکہ اس بچے کی طرح لگ رہی تھیں جس نے کراٹے کی چھ ماہ کی ابتدائی کلاسیں لی ہوں۔'' ایلک ہیتھ نے طنز کسا۔

''تین مہینے اب تک۔'' جولیا نے تصحیح کی۔ ''میں اگلے ہفتے اپنی گرین بیلٹ کے لیے ٹیسٹ دے رہی ہوں۔''

''بہت ہوگئی یہ بیہودگی۔'' لیڈی ورتھنگٹن نے کافی

سخت انداز میں پلمپٹن کی طرف انگلی ہلائی اور اسے اٹھنے کا اشارہ کیا پھر اس نے جولیا کو سینٹر میں رکھی چیئر پر بٹھایا اور خود ایلک ہیتھ اور نیویل پلمپٹن کے درمیان صوفے پر نشست سنبھال لی۔

ویٹروں کے ڈرنکس کا تازہ دور لانے کے بعد لیڈی ورتھنگٹن نے اعلان کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ جولیا یہ دریافت کرنا شروع کردے کہ ان میں سے کون مہلک قاتل ہے۔

''دی وولف!'' اینیس نے کہا۔

''تم نے یہ نام کیسے لیا؟'' راجر کاربنکل نے حیرانی میں کئی بار پلکیں جھپکتے ہوئے پوچھا۔

ایملی جانسن نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے قاتل کی ممکنہ عرفیت جاننے کے لیے جیکال سے شروعات کی اور دی وولف پر پہنچے۔''

جولیا خاموشی سے ان کے چہروں کا مطالعہ کررہی تھی۔

کاربنکل الجھن کا شکار نظر آرہا تھا۔ پلمپٹن کا تاثر اب بھی ناقابلِ فہم رہا اور ونسم کو چھوڑ کر باقی سب اس تجربے کے لیے بے تاب نظر آئے۔ ونسم نے ایسا چہرہ بنایا ہوا تھا جیسے وہ سینے کی جلن میں مبتلا ہو لیکن اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

جولیا نے کہا۔ ''اگر میں صحافی کے بجائے جاسوس ہوتی تو میرا اندازہ ہے کہ میں اس کا آغاز تم میں سے ہر ایک سے معمول کے سوالات پوچھ کر ایک بیس لائن بنانے کے لیے کرتی۔''

''واہ، کیا بات ہے۔ مجھے زمین پر پھینک کر اپنے مارشل آرٹ کا مظاہرہ کرنے کے بعد بھی تم خود کو صحافی قرار دے رہی ہو؟'' نیویل پلمپٹن نے بحث کی۔ ''میں نے انٹرنیٹ پر اپریل بلوم کو سرچ کیا تو تمہارے لکھے ہوئے درجن بھر سے زائد آرٹیکلز کے لنک سامنے آئے جن میں انتہائی نامور میگزینز بھی شامل ہیں اور کئی میں تمہاری تصویر بھی منسلک تھی۔ اس لیے میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیا وہ بھی کوئی دکھاوا ہے؟''

مجھے یہ انتہائی دلچسپ لگا کہ اس نے صرف تجسس کی وجہ سے انٹرنیٹ پر ''اپریل بلوم'' کو سرچ کیا یا وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اپریل بلوم کس قسم کے آرٹیکلز لکھتی ہے۔ ایسا وہ اس صورت میں کرتا اگر وہ دی وولف ہوتا۔ اس سے کم از کم اس بات کی وضاحت ہو رہی تھی کہ اس نے صرف ایک منٹ پہلے جولیا کو گھونسا مارنے کی کوشش کیوں کی تھی۔

جولیا نے کہا۔ ''وہ آرٹیکلز جو تمہیں ملے، وہ حقیقی ہو سکتے ہیں یا ہوسکتا ہے کہ وہ جاسوس ایجنسی نے مجھے ایک کور اسٹوری فراہم کرنے کے لیے لگائے ہوں۔'' میں دیکھ رہا تھا کہ جولیا ان کی بے چینی سے کھیل رہی تھی۔

''یا تم ایک جاسوس بھی ہوسکتی ہو اور فری ٹائم میں ایک فری لانس صحافی بھی۔'' اینیس فاؤل ہنسی۔

جولیا کی آنکھوں کی چمک بڑھی۔ ''ہنی! تم مجھے کافی اچھی طرح سمجھتی ہو۔''

''میرا ایک سوال ہے۔'' ایلک ہیتھ نے قدرے پریشان نظر آتے ہوئے کہا، اتنا پریشان نہیں جتنا کہ راجر کاربنکل تھا۔

''بیس لائن بنانے سے تمہارا کیا مطلب تھا؟''

''بس میں تم سے ایسے سوالات پوچھوں گی جن کے جوابات میں پہلے ہی جانتی ہوں۔ اس طرح میں تمہارا ردِعمل دیکھ سکتی ہوں کہ تم سچ بول رہی ہو، جھوٹ بول رہی ہو یا ٹال مٹول کررہی ہو۔''

''میں الجھن میں ہوں۔'' کاربنکل نے کہا۔ ''تمہیں کیسے پتا کہ تمہیں ہم سب سے کیا پوچھنا ہے؟''

''اگر میں حقیقت میں صحافی ہوتی تو میرا پبلشر مجھے آج رات کے شرکاء کی فہرست دے سکتا تھا تاکہ میں یہاں آنے سے پہلے تم سب کی تحقیق کرسکتی یا اگر میں جاسوس ہوتی تو میری ایجنسی مجھے آپ میں سے ہر ایک کی فائلیں فراہم کرتی۔ تیسرے امکان کے طور پر جو تمہارے خیال میں بالوں کی ایک پن ہے۔'' جولیا نے میری طرف انگلی اٹھائی۔ ''اصل میں آرچی نامی AI (آرٹیفیشل انٹیلی جنس) کا ایک انتہائی نفیس ٹکڑا ہوسکتا ہے اور آرچی نے پہلے ہی انٹرنیٹ کھود کر تم میں سے ہر ایک کے بارے میں معلومات کا ذخیرہ مرتب کیا ہوگا۔''

وہ سب چونک کر میری طرف دیکھنے لگے، یہاں تک کہ ونسم بھی۔

پلمپٹن نے ایک ہنکارا ابھرا اور کہا کہ میں بالوں کے پن سے زیادہ ٹائی کلپ کی طرح لگ رہا ہوں۔

''اتنا شاندار تخیل۔'' لیڈی ورتھنگٹن کا لہجہ تحیر آمیز تھا۔ ''چلو اب سوال شروع کریں۔ پہلے میں۔''

جولیا نے اس سے عام سے سوالات پوچھے جیسے کہ اس کی شادی کب ہوئی اور اس کا شوہر آج کی شام کہاں تھا؟

ورتھنگٹن کے بعد جولیا نیویل پلمپٹن کی طرف آئی اور اس سے پوچھا کہ اس کی آخری کتاب کی کتنی کاپیاں فروخت ہوئی تھیں؟ پلمپٹن کے انداز میں کچھ بات تھی جو اس کے

جھوٹا ہونے کی نشاندہی کر رہی تھی۔ میں نے جولیا کو اس بارے میں بتایا اور جولیا نے اشارہ کیا کہ اسے بھی اس کی بات سے جھوٹ کی بو آ رہی ہے مگر وہ جھوٹ کیا تھا؟ یہ نہ وہ پکڑ پائی نہ میں۔ میرے لیے یہ لمحۂ فکریہ تھا کیونکہ اس کے جولیا کو مکا مارنے کی کوشش کے بعد سے وہ دی وولف کے لیے میری اولین پسند بن چکا تھا۔

ان میں سے ہر ایک سے اس نے درجن سے بھی کم سوالات پوچھے۔ میں اس کے مختصر سوالات کے پیچھے کی وجہ جانتا تھا۔ وہ ان کے بور ہونے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتی تھی لیکن ان میں سے ایک کے علاوہ سب کے لیے وہ بس ایک کھیل تھا۔

ابتدائی سوالات کے بعد جولیا اس سوال پر آئی تھی کہ کیا وہ کبھی ہومیل گئے ہیں جو یوکرین کی سرحد کے قریب بیلاروس کا ایک شہر ہے جہاں گزشتہ مئی دی وولف نے ایک جرمن صنعت کار کا گلا کاٹا تھا۔

ان میں سے دو نے اپنے ہاتھ اٹھائے۔ ایلک ہیتھ اور اینیس فاؤل۔ مجھے پہلے ہی ان کے وہاں ہونے کے ریکارڈ مل چکے تھے۔

پلمپٹن نے یوکرین کے شہر کیف کا سفر کیا تھا اور وہ جرمن صنعت کار کے مردہ پائے جانے سے چار دن پہلے وہاں پہنچا تھا۔ میں اس کا ذکر جولیا سے کرنے جا رہا تھا لیکن اس نے مجھے ہلکا سا ہاتھ مارا اور ان سب سے کہا کہ اگر وہ یوکرین میں کہیں تھے تو اپنے ہاتھ اٹھا لیں۔

پلمپٹن خاموش رہا اور کم از کم میرے نزدیک نا قابلِ غور رہا۔ میں نے جولیا کو پلمپٹن کے فریب کے بارے میں بتایا۔ ''یہی دی وولف ہے۔ میں شرط لگا سکتا ہوں۔''

بلاشبہ جولیا کو پلمپٹن کے کیف کے دورے کے بارے میں پہلے سے ہی معلوم تھا لیکن اس نے اس بات کا کوئی اشارہ نہیں دیا کہ اسے میرا اندازہ کیسا لگا۔ اس کے بجائے اس نے ہیتھ اور فاؤل سے ان کے سفر کی تاریخیں اور وہ کہاں ٹھہرے ہیں پوچھا۔ یہ ایک ہوشیار سوال تھا۔ ان کی ہوٹل کی بکنگ کی تصدیق کی جا سکتی تھی اور اگر وہ جھوٹ بولتے اس صورت میں کہ جولیا کو یہ معلوم نہ ہو کہ وہ اسی ہوٹل میں ٹھہرے تھے جس میں جرمن صنعت کار تھا، یا تو میں اسے ہیکنگ کے ذریعے معلوم کر سکوں گا یا اس کی ایجنسی۔

جولیا نے یہ سوال ان شہروں میں سے ہر ایک کے لیے دہرایا جہاں دی وولف نے قتل کیے تھے اور جب اس نے بڈاپسٹ کے بارے میں پوچھا اور ان میں سے

سفید گھوڑا

میں نے حتی الامکان کوشش کی کہ دادا جان کو نمائش دیکھنے کے لیے راضی کر لوں مگر وہ برابر انکار کرتے رہے۔ بالآخر ایک بات میری سمجھ میں آئی۔ فرائڈ نے کہا ہے کہ گہوارے سے لے کر قبر تک ہر شخص مخالف جنس میں دلچسپی لیتا ہے چنانچہ میں نے کہا۔ ''دادا جان! نمائش میں ایک سرکس بھی آیا ہوا ہے۔ اس میں ایک لڑکی صرف اپنے لمبے لمبے بالوں سے لباس کا کام لیتے ہوئے اور بالوں کے لباس کے علاوہ ہر قسم کے لباس سے بے نیاز، ایک براق جیسے سفید گھوڑے پر سوار ہو کر اسٹیج پر آتی ہے اور گھوڑے پر کبھی لیٹ کر، کبھی کھڑی ہو کر طرح طرح کے کمالات دکھاتی ہے۔''

دادا جان نے کہا۔ ''توبہ توبہ، کیسا خراب زمانہ آ گیا ہے۔ ویسے میں نے پچھلے بیس سال سے براق جیسا سفید گھوڑا نہیں دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ اس گھوڑے کو ایک نظر دیکھنے کے لیے میں تمہارے ساتھ نمائش میں چل سکتا ہوں۔''

(مرسلہ: جہانگیر بدر، راولپنڈی)

مزیدار حصہ

خان صاحب ریستوران میں داخل ہوئے۔ چائے کا آرڈر دیا۔ چائے آئی تو ایک ہی گھونٹ میں اسے پی گئے پھر پیالی کو اس طرح کھانے لگے جیسے کوئی خستہ بسکٹ کھا رہے ہوں۔ آخر میں پیالی کا پیندا ایک طرف پھینک کر ایک اور چائے لانے کا آرڈر دیا۔ اس چائے اور چائے کی پیالی کا بھی وہی حشر ہوا۔

پانچ چھ پیالیاں چبانے اور پیندے پھینکنے کے بعد جب انہوں نے اگلی چائے کا آرڈر دیا تو بیرا پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ ''آخر پیالیاں کھانے اور پیندے پھینکنے سے آپ کا کیا مطلب ہے؟''

''بکواس مت کرو۔'' خان صاحب نے کہا۔ ''تمہیں ہمارے کسی فعل سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔''

''بے شک تعلق تو کوئی نہیں ہے۔'' بیرے نے کہا۔ ''مگر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ سب سے زیادہ مزیدار حصہ پھینک رہے ہیں۔''

(مرسلہ: راحیل خان، سرگودھا)

کسی نے بھی ہاتھ نہیں اٹھایا تو لیڈی ور تھنگٹن نے کاربنکل کی طرف دیکھ کر مسکراہٹ دبائی اور اس سے پوچھا کہ کیا اسے کچھ کہنا ہے؟

کاربنکل نے جواب میں پہلے سے بھی زیادہ پریشان صورت بنا کر اس کی طرف دیکھا۔

ور تھنگٹن نے قہقہہ لگایا۔ اس کی آنکھوں میں کمینی سی خوشی تھی۔ ''میرے ایک دوست نے تمہیں گزشتہ ستمبر بڈاپسٹ میں سفر کے دوران پہچانا تھا۔''

''آپ کے دوست کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ میں اس شہر میں کبھی نہیں گیا۔''

''میرے دوست نے قسم کھائی کہ وہ تم ہی تھے اور اسے معاملہ تب اور پراسرار لگا جب ہوٹل کلرک نے تمہیں لیوس کووی کے نام سے مخاطب کیا۔ میں تمہارے منہ سے یہ ضرور سننا چاہوں گی کہ بظاہر ایک اوسط درجے کا سرکاری بیوروکریٹ ایک فرضی نام سے براعظم کا سفر کیوں کرے گا؟''

''آپ کو مایوس کرنے پر افسوس ہے مگر وہ میں نہیں تھا۔'' غصے سے کاربنکل کی آواز بلند ہوئی۔ ''اور آپ کی اطلاع کے لیے بتادوں کہ میں ایک اوسط سرکاری بیوروکریٹ سے زیادہ ہوں۔ میں اپنی حکومت کے اہم ترین تعمیراتی منصوبوں کا منتظم ہوں۔''

پچھلا ستمبر تھا جب دی وولف نے بڈاپسٹ کے شہر ہنگری میں ایک چیک سفارت کار کو گھیر لیا تھا۔ میں نے جولیا کو یہ حقیقت یاد دلائی اور اس نے مجھے فون کرنے کا اشارہ کیا۔ جب اس کے فون کی گھنٹی بجی تو اس نے ایک نظر اس پر ڈالی اور لیڈی ور تھنگٹن سے کہا کہ یہ اس کی ایڈیٹر ہے۔

''میں دیکھتی ہوں۔ شاید اسے کوئی ضروری بات کرنی ہو۔'' اس نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر فون کا جواب دینے آئی اور فون پر میری بات سننے کے بعد میں نے اس سے پوچھا کہ کیا میں ایجنسی کے لوگوں سے راجر کاربنکل کو گرفتار کروانے کو کہوں؟

اس نے ور تھنگٹن کو بتایا کہ اس کے ایڈیٹر کو اس سے ایک مضمون کے بارے میں بات کرنے کی ضرورت ہے جو چھپنے والا ہے۔

''مجھے اکیلے میں اس سے بات کرنا ہوگی۔'' اس نے کہا اور وعدہ کیا کہ وہ چند منٹوں میں واپس آجائے گی۔

باہر آنے کے بعد اس نے ایک ہاتھ سے سگریٹ جلایا اور دوسرے ہاتھ سے موبائل کان سے لگائے وہ ٹہلتی ہوئی گیٹ سے نکل کر سائڈ واک کی طرف جانے لگی تاکہ اگر ڈنر پارٹی میں سے کوئی اسے کھڑکی سے دیکھ بھی رہا ہو تو اسے یہی لگے کہ وہ اپنے ایڈیٹر سے بات کر رہی ہے۔

''مجھے یقین تھا کہ ٹمپلٹن ہی دی وولف ہے۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''کاربنکل میرا آخری انتخاب ہوتا۔''

''ہم یہاں دی وولف کا شکار نہیں کر رہے ہیں آرچی! دی وولف یہاں ہے ہی نہیں۔ یہ زیادہ بڑا گیم ہے اور اس سے زیادہ خطرناک ہے جتنا ہم نے سوچا تھا۔''

اس نے مجھے حیران کر دیا۔ کم از کم اگلے بیالیس ملی سیکنڈ کے لیے۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا یہ سب اس لیے ہے کہ تم اس قاتلانہ حملے کے بارے میں نہ سوچو جس سے تمہاری جان جاسکتی تھی؟''

''وہ مجھے مارنے کی کوشش نہیں کر رہے تھے۔ وہ صرف مجھے جھنجوڑنے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ میں سیدھا نہ سوچوں اور ان کی چال میں آجاؤں۔''

''تم کس چال کی بات کر رہی ہو؟ ان میں سے ایک گولی لگ بھگ تمہیں لگ گئی تھی۔''

''یہ صرف اس لیے تھا کہ میں نے گولی چلانے والے سے زیادہ تیزی سے حرکت کی تھی۔'' جولیا نے سگریٹ نہیں پیا۔ سگریٹ، گھر پر نظر رکھنے والے ایجنٹس کے لیے اشارہ تھا۔ ان میں سے ایک بل ٹیریر کا پٹا پکڑے چلتے ہوئے اس کے قریب پہنچا اور جولیا کو یوں روکا جیسے وہ صرف جولیا سے سگریٹ سلگا رہا ہو۔ جیسے ہی اس نے سگریٹ جلایا، جولیا نے بڑی سرعت سے اپنی جیکٹ سے رومال میں لپٹی کوئی چیز اسے دی تھی۔

''مجھے اس گلاس پر موجود فنگر پرنٹس درکار ہیں۔ جب یہ ہو جائے تو مجھ سے رابطہ کرنا۔''

جس طرح جولیا نے مجھے اپنے بالوں میں سیٹ کیا تھا، اس سے یہ سمجھ میں آتا تھا کہ میں اسے گلاس اٹھاتے ہوئے کیوں نہیں دیکھ پایا۔ میں نے فوراً ہی یہ معلوم کرنے کے لیے ریکارڈنگ دیکھی کہ اس نے یہ گلاس کب پار کیا تھا اور میں کافی متاثر ہوا۔ مجھے اب سمجھ آرہا تھا کہ جولیا کا پلان کیا تھا اور اس کا اصل شک کس پر تھا۔

''تمہیں پہلی بار یہ شک کب ہوا؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''شروع سے۔ دی وولف کا ایک سوشلائٹ کی ڈنر پارٹی میں جانے کا خیال ہی بے بنیاد تھا۔ وہاں اسے ڈسکس کرنے کا خیال اور بھی زیادہ۔''

میں نے کہا۔ ''تمہیں اب اسے ختم کر دینا چاہیے۔''
''ابھی نہیں آرچی! میں غلط بھی ہو سکتی ہوں اور ویسے آج میرے لیے کافی سخت دن رہا ہے اور مجھے بھوک بھی لگ رہی ہے۔ چلو دیکھتے ہیں کھانے میں کیا ہے؟''
واپس جانے سے پہلے اس نے مجھے ہدایات کی ایک فہرست دی۔ جب وہ کمرے میں دوبارہ داخل ہوئی تو ایک مختصر قامت والا گول مٹول آدمی شیف کے طور پر ملبوس رات کا کھانا تیار ہونے کا اعلان کرنے کے لیے موجود تھا۔
سب بیٹھ گئے۔ پہلا کورس لایا گیا جو کہ واٹر کریس سلاد معلوم ہوتا تھا۔ جولیا اس کو ختم کر رہی تھی جب اس کی ایجنسی نے تھوڑی دیر پہلے کیے گئے جولیا کے سوالات اور جوابات کے بارے میں ایک پیغام چھوڑا جو میں نے انہیں بھیجے تھے۔ میں نے جولیا کو اس بارے میں آگاہ کیا۔
''اس نے تمہارے ہر سوال کے جواب میں جھوٹ بولا ہے۔ میرے لیے یہ متاثر کن ہے کہ میں بھی اس کا جھوٹ پکڑ نہیں پایا۔ کیا ہمیں اسے ابھی گرفتار کر لینا چاہیے؟''
جولیا نے مجھے انتظار کرنے کا اشارہ کیا۔ وہ دوسرا کورس لابسٹر بسک نامی سوپ پینے میں مگن تھی جب اس کی ایجنسی نے ایک اور پیغام چھوڑا تھا۔ وہ انگلیوں کے نشانات کی شناخت کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور جولیا صحیح تھی۔
یہ کھیل واقعی اس سے زیادہ خطرناک تھا جتنا اس نے سوچا تھا۔ میں نے دوبارہ پوچھا کہ کیا ہمیں اپنے لوگوں کو لانا ہے اور اس نے دوبارہ مجھے انتظار کرنے کا اشارہ کیا۔
تیسرا کورس ایسکارگو تھا جس کا مجھے پتا تھا کہ جولیس اس کی تعریف کرتا لیکن برگر اور فرائز کھانے والی جولیا کو یہ خاص پسند نہیں آیا۔ میں نے تجویز کیا کہ آزما کر دیکھ لے۔
''ان کا ذائقہ سیپیوں کی طرح ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔ میں نے کبھی کھایا نہیں۔ ظاہر ہے میں ایک کمپیوٹر ہوں لیکن جولیس نے مجھے یہی بتایا تھا۔
جولیا نے جواب میں صرف اپنی ناک سکوڑی۔ ایلک ہیتھ نے اس کی ہچکچاہٹ کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے اس پر چوٹ کی۔ ''ڈرو مت، تم صرف اسے چکھ سکتی ہو، یہ تمہیں نہیں چکھ سکتا۔''
مین کورس جو کہ بھیڑ کی ایک روسٹ ران تھی، لانے کے فوراً بعد ہی اس کی ایجنسی نے ایک اور پیغام چھوڑا جس سے یہ واضح ہو گیا کہ اصل کھیل کیا تھا۔ میں نے یہ معلومات جولیا تک پہنچا دیں۔ وہ پہلے ہی اس کا اندازہ لگا چکی تھی۔
جولیا اس روسٹ سے کافی لطف اندوز ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے مجھے سگنل نہیں دیا جب تک کہ اس نے اپنا کھانا ختم نہیں کر لیا۔
دو منٹ اور چار سیکنڈ بعد بجلی کاٹ دی گئی اور کمرے میں مکمل اندھیرا چھا گیا۔
جولیا تیزی سے حرکت میں آئی۔ میں نے کمرے کا نقشہ بنا لیا تھا اور اسے گائیڈ کر رہا تھا کہ کہیں وہ فرنیچر سے ٹکرا نہ جائے لیکن جس رفتار سے وہ حرکت کر رہی تھی، اسے دیکھتے ہوئے لگ نہیں رہا تھا کہ اسے ان کی ضرورت ہو۔
لائٹس بجھنے کے اٹھائیس سیکنڈ بعد جولیا اپنے شکار کو بندھے ہوئے ہاتھ پیر، منہ میں ٹھنسے کپڑے کے ساتھ سامنے والے دروازے پر لے گئی جہاں اس کی ٹیم اس کا انتظار کر رہی تھی۔
قیدی کو وین کے پچھلے حصے میں لادا گیا۔ ایجنسی کے پاس لندن سے باہر ایک سیف ہاؤس تھا جو تقریباً ایک گھنٹا دس منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔ جولیا نے اس وقت اس کے چہرے پر بندھا کپڑا ہٹایا جب ہم شہری حدود سے باہر نکل آئے۔
اور اس عورت نے جو خود کو لیڈی ورتھنگٹن کہتی تھی، غصے میں چیخ کر اٹھنے کی کوشش کی مگر منہ پر لگے ٹیپ کے باعث غوغا کر کے رہ گئی۔
جولیا مسکرائی۔ ''ماننا پڑے گا تمہارے پلاسٹک سرجن نے تمہیں لیڈی ورتھنگٹن بنانے کے لیے کافی محنت کی لیکن اس نے یہ نہیں سوچا کہ تم لیڈی ورتھنگٹن کے فنگر پرنٹس کہاں سے لاؤ گی۔ میں تمہارے منہ سے ٹیپ ہٹانے لگی ہوں اس لیے چلانا مت۔''
''اگر تم ابھی تک اپنا گھٹیا کھیل ''جاسوس جاسوس'' کھیل رہی ہو تو میں تمہیں بتا دوں کہ یہ تمہیں بہت مہنگا پڑنے والا ہے۔'' جونہی جولیا نے اس کے منہ سے ٹیپ ہٹایا، وہ پھٹ پڑی۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ ''اب مجھے واپس لے چلو۔''
''ایسا نہیں ہونے والا۔ تم ایک بڑی مصیبت میں ہو۔'' جولیا کے چہرے پر ایک دم سنجیدگی چھا گئی۔ ''ہم جانتے ہیں کہ تم کون ہو...... میری شلنگ...... ریڈ تھنڈر دہشت گرد تنظیم کی ایک سینئر رکن۔ ہم تمہارے اور ڈینیل وڈلی کے بارے میں جانتے ہیں۔''
''میں نے ورتھنگٹن سے شادی کے بعد اپنا نام

تبدیل کرلیا۔'' میری شلنک سپاٹ چہرے کے ساتھ بولی۔ ''میں ریڈ تھنڈر یا ڈینیئل ووڈلی نامی کسی شخص کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔''

''ہاں، تم جانتی ہو۔ ڈینیئل ووڈلی بیورو کریٹ راجر کاربنکل کی جگہ لیتا اگر راجر کاربنکل کو کچھ ہو جاتا تو۔ راجر کاربنکل حکومتی سطح پر چنل ٹنل (ریل روڈ ٹنل) کے پروجیکٹ کا ہیڈ تھا اسی لیے تم نے ہمیں یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ ڈی وولف نامی ایک قاتل ہے۔ ہمارے پاس تمہارے اور ڈینیئل ووڈلی کے درمیان ہوئے تمام رابطوں کے ثبوت موجود ہیں۔ ہم تمہارے منصوبے کے بارے میں جانتے ہیں جس میں حکومت کی جانب سے چنل کو اپ گریڈ کرنے کی کوشش کو سبوتاژ کرنے کا پلان تھا۔ ظاہر ہے یہ اب نہیں ہوگا۔''

میری شلنک، جولیا کو غور سے دیکھتے ہوئے ساکت ہوگئی۔ چند لمحوں کے سکوت بعد جب وہ گویا ہوئی تو اس کا لہجہ یکسر بدل چکا تھا۔ اب وہ جرمن لہجے میں بات کر رہی تھی۔

''اگر تم یہ سب پہلے سے جانتی ہو تو پھر مجھ سے کیا پوچھ رہی ہو؟''

''ہم ابھی ووڈلی کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ کل تک وہ ہمارے پاس ہوگا۔ تمہارے لندن آپریشن کے باقی ارکان حراست میں ہیں لیکن ہم اور بھی جاننا چاہتے ہیں جیسے کہ ہمیں سر جان ورتھنگٹن اور لیڈی مے ورتھنگٹن کی لاشیں کہاں سے مل سکتی ہیں؟ سیف ہاؤس میں تم سے مزید پوچھ گچھ کی جائے گی اور تمہیں صرف ایک موقع دیا جائے گا۔''

جولیا نے دوبارہ میری شلنک کے منہ پر ٹیپ لگایا اور ایک بار پھر اس کے سر پر کپڑا ڈال دیا۔

میری شلنک کو جب بعد میں تعاون کرنے کا موقع دیا گیا تو اس نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور کسی طوطے کی طرح بولنے لگی۔

اس کے بعد پچھتر گھنٹے اور بتیس منٹ کا وقت بے حد مصروف تھا۔ ہمیں اس بات کی تصدیق کرنے کی ضرورت تھی کہ شلنک نے ہمیں کیا بتایا۔ نیز ریڈ تھنڈر کے تمام دہشت گردوں اور ہمدردوں کو پکڑنے کی ضرورت تھی۔ تین دن بعد یہ سارا معاملہ بہت اچھے سے ختم ہو چکا تھا۔

یہ اگلا دن تھا کہ مجھے جولیس کی طرف سے کال موصول ہوئی۔ وہ اٹھارہ سو دو کے ہارڈی میلسم کی بوتل کے لیے میرا شکریہ ادا کر رہا تھا۔

''یہ ایک شاندار تحفہ ہے آرچی!''

''تمہیں جولیا کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ میں نے اس کے مشن کے لیے اسے تقریباً رضاکارانہ طور پر پیش کر دیا تھا۔'' میں نے جولیس کو حالیہ واقعات اختصار کے ساتھ سنائے۔

میری بات سننے کے بعد اس نے پوچھا کہ میری شلنک کا مقصد مالی تھا یا دہشت گردی؟

''دہشت گردی۔ انہوں نے ریل روڈ ٹنل کو دھماکا خیز مواد سے اڑانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اگر یہ کامیاب ہو جاتا تو وہ سیکڑوں یا شاید ہزاروں اور پورے یورپ کی معیشتوں کو تباہ کر دیتے۔ خوش قسمتی سے ایسا نہیں ہوا۔''

''میں ہمیشہ سے جانتا تھا کہ میری بہن ایک شاندار جاسوس بنے گی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اسے اپنے ساتھ کام کرنے کی پیشکش کی تھی۔''

''یہ اچھا ہی ہوا۔ تمہاری بہن تمہاری بدتمیزی کو برداشت نہ کرتی اور ویسے بھی وہ اب اچھی جگہ پر ہے اور زیادہ اچھا کام کر رہی ہے۔''

''یہ تو تم نے ٹھیک کہا۔'' وہ ہنسا۔

''لیکن مجھے ایک بات پریشان کر رہی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ سیدھے سیدھے راجر کاربنکل کو مار بھی تو سکتے تھے۔ انہوں نے ایسا کیوں نہیں کیا؟''

''اگر انہوں نے کاربنکل کی موجودہ ملازمت کی تفویض کو دیکھتے ہوئے اسے مارنے کی کوشش کی ہوتی یا اسے ایک حادثہ یا خودکشی کی طرح بھی پیش کیا ہوتا تو جولیا کی ایجنسی کاربنکل کے جانشین میں کتنی دلچسپی لیتی؟''

اس کا پتا لگانے میں زیادہ پروسیسنگ سائیکل نہیں لگے۔ ''بہت زیادہ۔'' میں نے جواب میں کہا۔ ''مجھے یہ دیکھنا چاہیے تھا۔'' میں اپنے آپ سے ناراض تھا کہ میں اتنی واضح چیز کیوں نہیں سمجھ پایا۔ میں نے اپنے نیوران نیٹ ورک کو ایڈجسٹ کرنے کے لیے ایک نوٹ بنایا تاکہ ایسا دوبارہ نہ ہو۔ ''میں اسے بہت سے مختلف زاویوں سے دیکھ رہا تھا اسی لیے مجھے لگتا ہے کہ شاید میں تھوڑا چکرا گیا تھا۔''

''آرچی! ایسا لگتا ہے جیسے تم اور جولیا ایک شاندار ٹیم ثابت ہوگے۔ بس میری بہن کا خیال رکھنا۔''

''میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔''

اور اس کے ساتھ میں نے اپنے سابق باس کو شب بخیر کہا۔

⌘⌘⌘

کہتے ہیں حضرت زید کو رسول مقبول ﷺ نے ہندوستان جانے کی بشارت دی تھی۔ چنانچہ پہلے یہ ترمذ گئے، اس کے بعد ہندوستان چلے گئے۔ وہاں سیانا نامی قصبے میں آپ نے اقامت اختیار کی۔ چاروں طرف کفر کا دور دورہ تھا۔ اس

بھیکھ
میران سیّد شاہ

ضیا تسنیم بلگرامی

"بادشاہی تو ہر کوئی کرسکتا ہے مگر درویشی ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔" ایک بادشاہ کو ایک درویش کا یہ جواب دینا آسان نہ تھا مگر وہ درویش ہی کیا جو بادشاہوں اور طاقتوروں سے ڈر جائے... آپ کے حسنِ عمل کی بدولت بہت جلد آپ کے ارادت مندوں اور مریدوں میں اتنا اضافہ ہوا کہ ایک دنیا حیران تھی... میران شاہ جن باتوں پر خود عمل کرتے تھے، دوسروں کو بھی اس کی تلقین فرماتے تھے... اسی لیے آپ کے ہم عصروں نے آپ کو قطب زمان قرار دیا تھا۔

کفر کے اندھیرے میں آپ نے ایمان کی شمع روشن کی۔ سیانا پر ایک برہمن کی حکومت تھی۔ یہاں زید کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ برہمن حکمراں سے آپ کو جنگ تک کرنا پڑی۔ اس جنگ میں آپ شہید ہو گئے۔ ان کے بعد سید سلیمان نامی ایک فوجی سردار نے سیانا کو فتح کر کے اس کا نام سیوانہ رکھ دیا۔

زید کے خاندان کا سلسلہ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ سید قطب الدین نامی ایک بزرگ نے سید یوسف نامی صاحب کشف کے پدرِ بزرگوار ہونے کا شرف حاصل کیا۔ ان کے گھر میں 1046ء کو ایک بچہ پیدا ہوا۔ اس بچے کا نام محمد سعید رکھا گیا لیکن معلوم نہیں کیوں اس بچے کو مستقلاً میران سید شاہ بھیکہ کہا جانے لگا۔ کہتے ہیں یہ ان صاحبزادے کی کنیت تھی۔ ایسی کنیت کہ بڑے بڑے رشک کرتے تھے۔ ان کے والد سید یوسف نے میران سید شاہ کو بڑے ناز و نعم سے پالا مگر ابھی یہ سات سال کے تھے کہ سید یوسف ایک معرکے میں شہید ہو گئے۔

سید یوسف کی شہادت کی خبر سیوانہ میں پہنچی تو گھر میں کہرام مچ گیا۔ عزیزوں، رشتے داروں نے گھر میں جمع ہو کر پسماندگان کو دلاسے دیے اور انہیں یقین دلایا کہ جب تک وہ موجود ہیں، فکر کی کوئی بات نہیں۔ مرحوم کے ایک بھانجے نے اپنے ماموں کے کپڑے طلب کیے اور کہا۔ ''میں ماموں کی شہادت کو زندگی بھر یاد رکھوں گا اور میری خواہش ہے کہ ان کے کپڑے میں اپنے پاس تبرکاً یادگار رکھوں۔''

بیوہ ممانی نے سارے کپڑے بھانجے کے حوالے کر دیے۔

کسی چچیرے بھائی نے درخواست کی۔ ''مرحوم بھائی نے اپنی زندگی میں مجھ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی چار بھینسوں میں سے دو مجھے دے دیں گے۔ اب ان کی وفات کے بعد ان کے ورثا کا یہ فرض ہے کہ مرحوم کی خواہش کے احترام میں دو بھینسیں میرے حوالے کر دیں۔''

بیوہ نے دو بھینسیں ان کے حوالے کر دیں۔

مرحوم کے رشتے کے چچا نے درخواست کی۔ ''سید یوسف جب تک زندہ رہا، میری کفالت کرتا رہا۔ اب میں بے سہارا ہو چکا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ مرحوم کی روح مجھے بے آسرا اور بے سہارا دیکھے گی تو بے چین ہو جائے گی۔ اس لیے اگر سید یوسف کی روح کو سکون پہنچانا ہے تو میری کفالت کا بندوبست ہونا چاہیے۔''

بیوہ نے عرض کیا۔ ''بقیہ دونوں بھینسیں آپ لے لیں تاکہ میرے مرحوم شوہر کی روح پُرسکون رہے۔''

ایک ادھیڑ عمر عزیز نے بیوہ کو مشورہ دیا کہ زمینوں کا کام اس کے حوالے کر دیا جائے کیونکہ مرحوم ان پر بے حد اعتبار کیا کرتے تھے۔

بیوہ نے اس کا کوئی جواب تو دیا نہیں بس اپنے سات سالہ بیٹے محمد سعید کو ساتھ لیا اور کہرام نامی ایک قصبے میں منتقل ہو گئیں۔ اب ان کے سامنے سب سے مشکل کام محمد سعید کی تعلیم و تربیت کا تھا۔ انہیں ایک مکتب میں داخل کرا دیا گیا۔ مکتب میں بہت سارے بچے ان کے ہم سبق تھے۔ سعید کی ان سب سے دوستی ہو گئی لیکن ان میں دوستی کے سلسلے میں ایک خاص بات پائی جاتی تھی۔ سعید کسی بدصورت لڑکے سے دوستی نہیں کرتے تھے۔

ان کے ہم مکتب لڑکوں میں ایک ہندو لڑکا بہت زیادہ حسین تھا۔ سعید نے اس سے بڑی گہری دوستی کر لی۔ اٹھنا بیٹھنا، کھیلنا کودنا سب کچھ اس ہندو لڑکے سے وابستہ کر دیا۔ دوسرے لڑکے حسد کرنے لگے۔ انہیں بہت غصہ آتا تھا کہ یہ کیسا مسلمان لڑکا ہے کہ ہندو لڑکے پر کسی کو ترجیح ہی نہیں دیتا۔

ایک دن چھٹی کے بعد جب سب لڑکے باہر نکلے تو حسبِ دستور سعید نے ہندو لڑکے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور گھر کے لیے روانہ ہو گئے۔ حاسد لڑکوں نے آپس میں صلاح و مشورہ کیا اور ایک جگہ راستے میں ان دونوں کو روک لیا۔ سعید سے پوچھا۔ ''آج تمہیں ایک بات تو بتانی ہی پڑے گی۔''

سعید نے پوچھا۔ ''کون سی بات؟ اگر بتانے والی بات ہوگی تو ضرور بتاؤں گا۔''

لڑکے نے پوچھا۔ ''ہم سب مسلمان ہیں اور تمہارا یہ دوست ہندو۔ ہم پوچھتے ہیں کہ اس ہندو کو ہم پر کیوں ترجیح

دیتے ہو؟''

سعید نے ہنس کر جواب دیا۔ ''اس بیکار اور فضول سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔''

لڑکوں نے اچانک سعید کا پیچھا تو چھوڑ دیا، ہندو لڑکے کو پکڑ لیا اور پوچھا۔ ''ہم اس درویش زادے سے تو کچھ پوچھتے نہیں۔ اب تُو بتا کہ یہ چکر کیا ہے؟''

ہندو لڑکے نے جواب دیا۔ ''چکر وکر کچھ بھی نہیں، بس دوستی ہے۔ کیا تم لوگ دوستی نہیں کرتے؟''

ایک لڑکے نے کہا۔ ''ہم لوگ دوستی کرتے ہیں لیکن اپنی جیسی حیثیت والوں سے مگر تو نے جس لڑکے سے دوستی کی ہے، اس کا تعلق ایک درویش خاندان سے ہے۔ میرا خیال ہے یہ دوستی نبھ نہیں سکتی۔''

ہندو لڑکے نے جواب دیا۔ ''جب دوستی نہیں نبھے گی تو الگ الگ ہو جائیں گے۔''

ایک لڑکے کو غصہ آ گیا۔ وہ بولا۔ ''مشرک زادے! زبان سنبھال کر بات کر ورنہ میں الٹا لٹکا دوں گا تجھ کو۔''

ہندو لڑکے نے تحمل سے جواب دیا۔ ''میں نے کوئی ایسی بات تو نہیں کی جس سے تمہیں غصہ آ جائے۔ تم نے چند سوالات کیے، میں نے ان کے جوابات دے دیے۔''

لڑکا آگے بڑھا اور ہندو زادے کا گریبان پکڑ کر جھٹکا جو دیا تو وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ سعید وہیں کہیں موجود یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے دوست کا یہ حشر جو دیکھا تو بھاگ کر وہاں پہنچے اور ہندو لڑکے کو چھڑا کر دوسرے لڑکے کے منہ پر ایک زوردار گھونسا رسید کر دیا۔ وہ چکرا کر گر گیا۔

دوسرے لڑکے بھاگ کھڑے ہوئے۔

ہندو لڑکے نے خوفزدہ انداز میں پوچھا۔ ''اب کیا ہو گا؟''

سعید نے جواب دیا۔ ''ہونا کیا ہے۔ ہوش آئے گا، اپنے گھر چلا جائے گا اور آئندہ ایسی حرکت نہیں کرے گا۔''

دوسرے دن مکتب میں استاد نے سعید کو اپنے پاس بلا کر پوچھا۔ ''کل کیا ہوا تھا؟''

سعید نے پورا واقعہ سنا دیا۔ ''پھر جب شریر لڑکوں کے اس سرغنہ نے میرے دوست کو بلاوجہ مارا پیٹا تو میں نے بھی اس کی خبر لے لی اور ایسی خبر لی کہ آئندہ وہ ایسی حرکت نہیں کرے گا۔''

استاد نے برہم ہو کر کہا۔ ''لیکن تُو نے جس لڑکے کی پٹائی کی ہے اس کا تو جبڑا ٹوٹ چکا ہے۔''

سعید نے جواب دیا۔ ''مار پیٹ میں ٹوٹ پھوٹ تو ہوتی ہی ہے۔''

استاد کو اور زیادہ غصہ آ گیا، بولا۔ ''سعید! زبان سنبھال کر بات کر۔ میں ایسی باتیں سننے کا عادی نہیں ہوں۔''

سعید نے جواب دیا۔ ''تو پھر بات ہی نہ کیجیے۔ میں کسی پر ظلم ہوتے دیکھوں گا تو ضرور دخل دوں گا۔ میں اپنی فطرت سے مجبور ہوں۔''

استاد نے افسوس سے کہا۔ ''سعید! میں تیری یتیمی پر رحم کھاتا ہوں۔ تُو نے جو کچھ کیا، بہت بُرا کیا۔''

سعید نے جواب دیا۔ ''اس لڑکے نے بھی جو کچھ کیا، بہت بُرا کیا۔''

استاد نے کہا۔ ''میں نے تیرا نام اپنے مکتب سے خارج کر دیا۔ اب تُو یہاں نہیں آئے گا۔''

سعید نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ''بہت بہتر، اب میں یہاں نہیں آؤں گا۔ آپ نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ میں یہی کہہ سکتا ہوں۔''

اس کے بعد سعید وہاں سے چلے آئے۔ ماں کو جب یہ خبر ہوئی تو انہیں بہت افسوس ہوا۔ بیٹے سے کہا۔ ''بیٹے! تُو دوسروں کے معاملات میں کیوں دخل دیتا ہے؟''

سعید نے جواب دیا۔ ''ماں! میں بھی اپنی عادت سے مجبور ہوں۔ اس نے میرے کمزور دوست کے ساتھ بڑی زیادتی کی تھی۔ میں اس کو کس طرح معاف کر دیتا۔''

ماں نے بڑے دکھ سے کہا۔ ''تیرا نام مکتب سے کٹ گیا۔ اب کیا ہو گا؟''

سعید نے جواب دیا۔ ''ماں! میں نے کہہ جو دیا کہ میں حق پر ہوں۔ میرے استاد کو میرا نام دوبارہ لکھنا پڑے گا۔''

ماں نے کہا۔ ''لیکن میں نے یہ سنا ہے کہ تیرا استاد تجھ سے بہت زیادہ ناراض ہے۔ وہ تیرا نام کسی قیمت پر بھی دوبارہ نہیں لکھے گا۔''

سعید نے کہا۔ ''اللہ مالک ہے۔ میں اس سے مایوس نہیں ہوں۔''

اس کے بعد سعید کے پاس مصروف رہنے کے لیے کوئی کام بھی نہیں تھا۔ گلی کوچوں میں جو لڑکے جمع ہوتے، یہ ان کے ساتھ کھیل کود میں مشغول رہنے لگے۔ ان کا پڑھائی لکھائی سے دل اچاٹ ہوگیا۔

کچھ دنوں بعد سعید محلے کے لڑکوں میں کھیل کود رہے تھے کہ ایک طرف سے ایک بزرگ نمودار ہوئے۔ ان کے مرید پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ لڑکوں نے انہیں دیکھا تو ایک طرف ہو گئے کیونکہ یہ بزرگ شاہ جلال تھے اور ان سے ایک زمانہ واقف تھا۔ شاہ جلال کے بھائی شاہ فاضل مشہورِ زمانہ بزرگ تھے۔ ان کا قیام ایک دوسرے قصبے میں تھا۔ وہاں سے کبھی کبھی کہرام چلے آیا کرتے تھے۔ کہرام والوں میں ان کی بڑی شہرت اور وقعت تھی۔ لڑکے بھی انہیں پہچانتے تھے۔

شاہ جلال کی نظریں سعید سے مل گئیں اور دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔ کچھ دیر بعد شاہ جلال نے اپنے مریدوں سے پوچھا۔ ''اس لڑکے کا کیا نام ہے؟''

ایک مرید نے جواب دیا۔ ''سعید!''

شاہ جلال نے کہا۔ ''مجھے اس لڑکے میں یگانگت کی بو محسوس ہو رہی ہے۔ یہ مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔''

مرید نے جواب دیا۔ ''یہ مشہور صوفی سید یوسف کے صاحبزادے ہیں۔''

شاہ جلال بہت خوش ہوئے، فرمایا۔ ''وہی تو میں کہوں میں اس لڑکے میں کشش کیوں محسوس کر رہا ہوں۔''

اس کے بعد سعید کو اشارے سے اپنے قریب بلایا اور پوچھا۔ ''سعید میاں! یہ تم ان لڑکوں کے ساتھ کیا کھیل رہے تھے؟''

سعید نے جواب دیا۔ ''ہم لوگ مختلف کھیل کھیلتے رہتے ہیں۔ اس وقت بھی ایک کھیل، کھیل رہے تھے۔''

شاہ جلال نے فرمایا۔ ''صاحبزادے! یہ عمر کھیل کود کی نہیں ہے۔ لکھو، پڑھو اور اپنے خاندان کا نام روشن کرو۔''

سعید نے بڑے افسوس سے جواب دیا۔ ''حضرت! پہلے میں بھی ایک مکتب میں داخل تھا لیکن وہاں کے استاد نے مجھے اپنے مکتب سے بلاوجہ نکال دیا۔''

شاہ جلال نے پوچھا۔ ''وہ کیوں؟''

سعید نے پورا قصہ دہرا دیا اور کہا۔ ''میں نے حق کا ساتھ دیا تھا مگر استاد نے میری حوصلہ شکنی کی۔''

شاہ جلال نے فرمایا۔ ''تم نے جو کیا، بہت خوب کیا۔ میں تمہارے استاد سے بات کرلوں گا اور پھر دیکھوں گا کہ وہ تمہیں اپنے مکتب میں دوبارہ کس طرح داخل نہیں کرتا۔''

شاہ جلال، سعید کو وہیں چھوڑ کر اپنے مریدوں کے ساتھ چلے گئے۔

اس رات انہوں نے اپنے چند مرید سعید کے پاس بھیجے اور بلا کر اپنے دسترخوان پر بٹھالیا، فرمایا۔ ''صاحبزادے! میرے ساتھ کھانا کھا کر عزت و شرف بخشیے۔''

سعید نے کہا۔ ''عزت و شرف کی کیا بات ہے۔ میں آپ کے ساتھ ضرور کھاؤں گا۔''

سعید نے شاہ جلال کے ساتھ کھانا کھایا۔ اس کے بعد جب یہ چلنے لگے تو شاہ جلال نے ان کی ماں کا کھانا بندھوا کر ان کے حوالے کرنا چاہا۔ آپ نے پوچھا۔ ''یہ کیوں؟ میں اپنی والدہ کا کھانا کیوں لے جاؤں؟''

شاہ جلال نے فرمایا۔ ''اس لیے کہ وہ بھی نہایت نیک خاتون ہیں اور یہ کہ تمہاری ماں ہیں۔''

سعید نے جواب دیا۔ ''انہیں آپ کے کھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان کا رازق اللہ ہے۔''

شاہ جلال خاموش ہوگئے۔

دوسرے دن علی الصباح شاہ جلال مٹھائی، کاغذ اور پوشاک لے کر سعید کے گھر پہنچ گئے۔ اس وقت سعید سو رہے تھے۔ شاہ جلال نے انہیں جگایا اور فرمایا۔ ''سعید! جلدی جلدی کپڑے پہن لو۔ میں تمہیں ایک جگہ لے جانا چاہتا ہوں۔''

سعید جانے کے لیے تیار ہوگئے۔ شاہ جلال انہیں لے کر معلم کے پاس پہنچے اور فرمایا۔ ''حضرت! میں آپ کے

پاس ایک سفارش لے کر حاضر ہوا ہوں۔''
استاد نے شاہ جلال کو احترام اور عقیدت سے دیکھا اور پھر سعید کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ سفارش کی بات کر رہے ہیں، میں آپ کی ہر بات کو حکم سمجھ کر پورا کروں گا لیکن ایک گزارش بھی کروں گا۔''
شاہ جلال نے فرمایا۔ ''ضرور، ضرور۔''
استاد نے سعید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر سفارش کا تعلق ان صاحبزادے سے ہے تو میں معذور ہوں۔ ان کی سفارش فرما کر مجھے شرمندہ نہ کیجیے گا۔''
معلم، شاہ جلال کے مریدوں میں سے تھا۔ آپ نے غصے میں فرمایا۔ ''مردود! تو میرے حکم سے سرتابی کرے گا؟''
استاد لرز گیا۔ احتراماً سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ ''ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔ میں یہی چاہتا تھا کہ پیرومرشد سفارش کے بجائے ''حکم'' کا لفظ استعمال فرمائیں۔ اب میں انہیں دوبارہ اپنے مکتب میں داخل کر لوں گا۔''
استاد نے سعید کو دوبارہ مکتب میں داخل کر لیا اور بڑے انہماک سے پڑھانے لگا۔ آپ نے بھی بڑی توجہ سے پڑھنا شروع کر دیا۔ اب ان کی ماں ان سے بے حد خوش تھیں۔ سعید نے اپنی ماں سے کہا۔ ''ماں! میں نہ کہتا تھا کہ آپ اداس نہ ہوں۔ وقت آنے پر سب کچھ صحیح ہو جائے گا۔''
ماں نے جواب دیا۔ ''بیٹے! مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ میرا بیٹا روشن ضمیر ہے اور اس کو آنے والے دنوں کی باتیں بھی معلوم ہیں۔''
سعید نے دوستی وغیرہ ترک کر دی اور شب و روز پڑھنے لکھنے میں صرف کر دیے، چنانچہ چھ ماہ کے اندر اندر انہوں نے قرآن پاک اور گلستان و بوستان کو ختم کر ڈالا۔ استاد آپ کی ذہانت و ذکاوت پر حیران تھا۔ اس نے انہیں پہلے بھی پڑھایا تھا مگر اس وقت یہ خوبیاں ان پر منکشف نہیں ہوئی تھیں۔ اب وہ اس پر مجبور تھا کہ سعید کو خلیفۂ مکتب بنا دے۔ چنانچہ آپ نے نوعمری ہی میں خلیفۂ مکتب ہونے کا اعزاز حاصل کر لیا۔
کہرام کے ایک شخص کو فوجداری کا ایک اہم منصب عطا ہوا۔ وہ دہلی جانے لگا تو اسے اپنے لڑکے کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک لائق معلم کی ضرورت پیش آئی۔ مکتب کے معلم سے مشورہ کیا تو اس نے سعید کا نام لیا چنانچہ اس شخص نے سعید سے درخواست کی کہ آپ میرے ساتھ دہلی تشریف لے چلیں۔
آپ نے جواب دیا۔ ''یہ معاملہ آپ میری ماں سے طے فرمائیں کیونکہ میں ان کی اجازت کے بغیر ہاں یا نہ، نہیں کر سکتا۔''
اس شخص نے آپ کی ماں سے اجازت چاہی تو جواب ملا۔ ''میں اپنے بیٹے کو تمہارے ساتھ بھیج تو دوں گی لیکن شرط یہ ہے کہ اسے اپنے پاس ہی رکھنا اور جس طرح لے جا رہے ہو، اسی طرح واپس بھی لانا۔''
اس شخص نے کہا۔ ''یہ میرا وعدہ ہے۔ نہ صرف یہ کہ میں جس طرح لے جا رہا ہوں اسی طرح واپس بھی لاؤں گا بلکہ میرا یہ وعدہ بھی ہے کہ میں انہیں اس طرح رکھوں گا جس طرح میں خود رہوں گا۔''
چنانچہ وہ شخص آپ کو اپنے ساتھ دہلی لے گیا۔ آپ نے اس کے بیٹے کو بڑی توجہ سے پڑھانا شروع کر دیا۔
دہلی اور اس کے نواح میں درویشوں اور اللہ والوں کی محفلیں جمتی تھیں اور وہاں پیاس بجھانے والوں کا ایک تانتا سا لگا رہتا تھا۔ سعید بھی ان محفلوں میں جانے لگے لیکن دوسرے جانے والوں میں اور سعید میں بڑا فرق تھا۔ ان درویشوں اور اللہ والوں میں مختلف مذاہب کے لوگ تھے۔ ہندو بھی، مسلمان بھی، عیسائی بھی اور پارسی بھی۔ سعید نے دوسروں کے مقابلے میں یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ مذہب اور عقائد سے بے نیاز درویشوں کی محفل میں پہنچتے اور اپنی پیاس بجھانے کی کوشش کرتے۔ وہ شخص جوان کو اپنے ساتھ لایا تھا، سعید کے ان مشاغل سے پریشان رہنے لگا۔ ایک دن اس نے سعید سے سوال جواب شروع کر دیے۔ اس نے سعید کو جاتے ہوئے روک لیا اور پوچھا۔ ''کیا میں یہ جان سکتا ہوں کہ یہ آپ ہر روز کہاں تشریف لے جاتے ہیں؟''
سعید نے جواب دیا۔ ''آپ کو مجھ سے اس قسم کا سوال کرنا تو نہیں چاہیے تھا۔''

اس شخص نے کہا۔ ''مجھ کو اس قسم کا سوال یوں کرنا چاہیے کہ میں آپ کی والدہ سے کوئی وعدہ کر آیا ہوں۔''
سعید نے کہا۔ ''آپ میری ماں سے جو وعدہ کر کے آئے ہیں، میں اس سلسلے میں آپ کو شرمندہ نہیں ہونے دوں گا۔''
اس شخص نے جواب دیا۔ ''مجھ کو آپ کی یہ بات بالکل پسند نہیں کہ آپ ہر مذہب وملت کے بزرگوں کی محفل میں اٹھیں بیٹھیں۔''
سعید نے کہا۔ ''یہ میرا ذاتی فعل ہے۔اس میں آپ دخل نہ دیں۔''
وہ شخص خاموش ہو گیا لیکن چند دنوں بعد اس نے سعید کو کہرام پہنچا دیا۔ان کو ان کی ماں کے سپرد کرتے ہوئے کہا۔
''محترم خاتون! آپ کا بیٹا آپ کے سپرد کرنے آیا ہوں۔ میری ذمے داری ختم ہو گئی۔''
ماں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور بیٹے کو سینے سے لگا لیا۔
کہرام سے تیس میل دور ملوی نامی ایک گاؤں تھا۔اس گاؤں میں بے نوا شاہ قاسم ایک بزرگ رہتے تھے۔سعید نے ان کا ذکر سن رکھا تھا، والدہ سے اجازت لے کر بے نوا شاہ کی خدمت میں چلے گئے۔ان بزرگ نے انہیں بخوشی قبول کیا اور اپنے پاس رہنے کی اجازت دے دی۔سعید نے عرض کیا۔ ''حضرت! میں آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہوں اس لیے میرے سپرد کوئی کام بھی ہونا چاہیے۔''
بے نوا شاہ کچھ دیر خاموش رہے اور سوچتے رہے، آخر فرمایا۔ ''تم خانقاہ کے بھاڑ کے لیے لکڑیاں لایا کرو۔''
سعید نے جواب دیا۔ ''بہت بہتر، یہ میری خوش قسمتی ہے۔''
اس کے بعد سعید نے یہ دستور بنا لیا کہ صبح ہوتے ہی حوائجِ ضروریہ سے فارغ ہونے کے بعد لکڑیاں لینے چلے جاتے۔اس طرح ایک سال کا عرصہ گزر گیا۔
انہی دنوں خانقاہ کی چھت میں اضافہ کیا جا رہا تھا اور اس کے لیے شہتیر ڈالے جا رہے تھے۔ان میں ایک شہتیر بہت بڑا تھا۔بے نوا شاہ نے کئی مریدوں کو حکم دیا کہ اس کو مل جل کر اوپر چڑھا دو۔
کئی طاقتور مریدوں نے اس کو اٹھانے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ جب یہ بات بے نوا شاہ کے علم میں آئی تو انہوں نے حکم دیا کہ میران سید شاہ بھیکہ کو بلاؤ۔
مرید حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بے نوا شاہ کس کو بلا رہے ہیں۔آخر ایک مرید نے پوچھا۔ ''حضرت! یہ کون بزرگ ہیں؟''
بے نوا شاہ نے جواب دیا۔ ''تم لوگ ان بزرگ کو نہیں جانتے؟ کہرام کے میران سید شاہ بھیکہ کو نہیں جانتے؟''
مرید نے عرض کیا۔ ''ہم سب کہرام کے محمد سعید کو تو جانتے ہیں لیکن جن بزرگ کا آپ نام لے رہے ہیں، ہم ان سے قطعاً واقف نہیں۔''
بے نوا شاہ نے جواب دیا۔ ''کہرام میں محمد سعید اور میران سید شاہ بھیکہ ایک ہی ذات کے دو نام ہیں۔''
مریدوں نے سعید کو بے نوا شاہ کے سامنے کھڑا کر دیا۔
بے نوا شاہ نے سعید کو حکم دیا۔ ''سعید! آج سے تُو میران سید شاہ بھیکہ ہے ہم سب کے لیے۔تُو اس وزنی شہتیر کو اوپر رکھ دے کیونکہ میرے سارے مرید اس کوشش میں ناکام ہو چکے ہیں۔''
سعید جواب میران سید شاہ بھیکہ ہو چکے تھے، مریدوں کی طرف دیکھنے لگے پھر پوچھا۔ ''کیا واقعی مجھے یہ کام کرنا ہو گا؟''
بے نوا شاہ نے جواب دیا۔ ''اس میں شبہے کی کیا بات ہے؟''
سید شاہ بھیکہ نے کہا۔ ''افسوس کہ میں چاہتا تھا کہ کچھ دن اور خود کو چھپائے رکھوں لیکن آپ ایسا نہیں چاہتے۔''
بے نوا شاہ نے کہا۔ ''اب زیادہ باتیں نہ بنا، جو کہہ رہا ہوں فوراً کر دے۔''
سید شاہ بھیکہ نے اس وزنی شہتیر کو نہایت آسانی سے اٹھا کر اوپر رکھ دیا اور اس میں حیرت اور کمال کی بات یہ تھی کہ آپ نے یہ کام تن تنہا انجام دیا تھا۔

مریدوں نے بے نوا شاہ سے شکایتاً پوچھا۔ ''حضرت! یہ کیا بات ہوئی۔ ان صاحبزادے کو آپ کی خدمت میں آئے ہوئے صرف ایک سال گزرا ہے اور ہم لوگ برسوں سے آپ کی خدمت انجام دے رہے ہیں پھر یہ کیا بات ہے کہ ہم لوگ تو فیضان سے محروم ہیں اور اس لڑکے نے یہ کمال حاصل کر لیا۔''

بے نوا شاہ نے جواب دیا۔ ''یہ تم لوگوں کی بھول ہے۔ میں نے اس کو کچھ بھی نہیں دیا۔ یہ جب میرے پاس آیا تھا تو یہ اس وقت بھی صاحبِ کمال تھا اور اس راز سے یا تو یہ خود واقف تھا یا پھر میں جانتا تھا۔ یہ سید شاہ بھیکہ کی انکساری اور عاجزی ہے ورنہ اس کو ہماری خدمت نہیں کرنا تھی۔''

مریدوں نے عرض کیا۔ ''حضرت! کچھ ہمیں بھی عطا ہو جائے۔''

بے نوا شاہ نے جواب دیا۔ ''تم لوگ میری بات سمجھتے کیوں نہیں۔ قاسم حقیقی تو اللہ تعالیٰ ہے۔ سید شاہ بھیکہ خود سید زادے ہیں۔ ان کے باپ دادا بھی صاحبِ کمال تھے۔ میرا ان کے کمال میں کوئی دخل نہیں۔''

چند دنوں بعد بے نوا شاہ کے پیر و مرشد تشریف لائے۔ انہوں نے میران شاہ بھیکہ کو دیکھا تو بے نوا شاہ سے پوچھا۔ ''بے نوا شاہ! کیا یہ سید زادہ تیرا مرید ہے؟''

بے نوا شاہ نے جواب دیا۔ ''نہیں پیر و مرشد! یہ میرے مرید نہیں ہیں۔ یہ میرے پاس آ گئے تھے، میں واپس نہیں کر سکتا تھا۔ سو چا ان کی صحبت سے بھی فیض ہی پاؤں گا، نقصان کیا ہے۔''

پیر و مرشد نے کہا۔ ''بے نوا شاہ! اس کو رخصت کر دو کیونکہ ہم لوگ چھوٹے حوض کے مانند ہیں اور یہ سید زادہ دریائے عظیم کی طرح۔ ہم اسے کس طرح سیراب کریں گے؟''

بے نوا شاہ نے پیر و مرشد کے ایما پر میران شاہ بھیکہ کو ایک طرف لے جا کر عرض کیا۔ ''سید زادے! میں انتہائی رنج اور افسوس سے آپ کو رخصت کر دینا چاہتا ہوں۔''

میران شاہ بھیکہ نے پوچھا۔ ''وہ کیوں؟ آخر کیوں؟''

بے نوا شاہ نے جواب دیا۔ ''میرے پیر و مرشد کا یہی حکم ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک حوض کسی عظیم دریا کو کس طرح سیراب کرے گا۔''

میران شاہ بھیکہ نے کہا۔ ''اگر یہ بات ہے تو میں آج ہی چلا جاؤں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔''

انہوں نے اسی وقت اس جگہ کو چھوڑ دیا۔ اب انہیں یہ فکر تھی کہ آخر وہ جائیں کہاں؟ آخر انہیں ایک دوسرے بزرگ یاد آ گئے۔ ان بزرگ کا نام تھا شاہ بھاول۔ یہ سید تھے شاہ بھاول کے پاس پہنچے اور عرض کیا۔ ''حضرت! میں آپ کے پاس رہنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں گے تو رہ جاؤں گا ورنہ کوئی بات نہیں۔''

شاہ بھاول نے جواب دیا۔ ''تم میرے پاس رہنا چاہتے ہو تو رہو لیکن مجھے یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ تم میرے پاس کیوں رہنا چاہتے ہو؟''

میران شاہ بھیکہ نے عرض کیا۔ ''مجھے بے نوا شاہ اور ان کے پیر و مرشد نے اپنے پاس نہیں رہنے دیا۔ مجھے کسی کامل کی تلاش ہے۔ ممکن ہے اس سلسلے میں آپ میری راہنمائی کر سکیں۔''

شاہ بھاول نے کہا۔ ''تم چند دن میرے پاس رہو۔ میں سوچوں گا اور کوئی نہ کوئی راہ نکال لوں گا۔''

چنانچہ میران شاہ بھیکہ، شاہ بھاول کے پاس رہ گئے۔

کئی دن بعد شاہ بھاول نے کہا۔ ''میران شاہ بھیکہ! ابھی ابھی مراقبے میں مجھے معلوم ہوا ہے کہ میں تمہیں لے کر شاہ ابوالمعالی کے پاس پہنچوں۔ وہ تمہاری راہنمائی کر سکیں گے۔''

میران شاہ نے بے چینی سے عرض کیا۔ ''پھر اس میں دیر کیوں؟ میں تو اسی وقت چلنے کے لیے تیار ہوں۔''

شاہ بھاول، میران شاہ کو لے کر روانہ ہو گئے۔ وہ انبہٹہ نامی قصبے میں سکونت پذیر تھے۔ یہ دونوں سفر کرتے ہوئے جب انبہٹہ کے قریب پہنچے تو شاہ بھاول نے ایک جگہ پڑاؤ کیا اور کھا پی کر حقہ پینے لگے پھر یہ حقہ میران شاہ کے حوالے کیا اور کہا۔ ''تم یہیں رکو، میں تھوڑی دیر میں آ کر تمہیں لے جاؤں گا۔''

میران شاہ نے عرض کیا۔ ''جیسی آپ کی مرضی۔''
شاہ بھاول سیدھے شاہ ابوالمعالی کی خدمت میں پہنچے۔ انہوں نے سر اٹھا کر شاہ بھاول کی طرف دیکھا اور دریافت کیا۔ ''شاہ بھاول! کیا بات ہے۔ تم اکیلے ہی چلے آئے؟ اپنے شریک سفر کو کہاں چھوڑا؟''
شاہ بھاول نے شرمندگی سے جواب دیا۔ ''پیچھے آرہے ہیں۔ انہیں لانے سے پہلے آپ کی اجازت درکار تھی۔''
شاہ ابوالمعالی نے کہا۔ ''جاؤ اور اپنے رفیق کو اسی وقت میرے پاس لے آؤ۔''
شاہ بھاول اسی وقت واپس ہوئے۔ میران شاہ ان کا انتظار کررہے تھے، پوچھا۔ ''حضرت! آپ کہاں چلے گئے تھے؟''
شاہ بھاول نے جواب دیا۔ ''پیرومرشد سے اجازت لینے۔''
میران شاہ حقہ پی کر فارغ ہوچکے تھے، اٹھے اور شاہ بھاول کے ساتھ چل دیے۔
کچھ دیر بعد جب یہ دونوں شاہ ابوالمعالی کی خدمت میں پہنچے تو انہیں پہچاننے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ انہوں نے سلام میں پہل کی اور میران شاہ سے بعد سلام کے پوچھا۔ ''بیا میران من! رفیق تو کجا است یعنی حقہ؟ (میرے میران! تمہارا رفیق کہاں ہے یعنی حقہ)۔''
میران شاہ نے شرمندگی سے جواب دیا۔ ''پیرومرشد! میں نے حقہ پینا چھوڑ دیا۔ اب کوئی مجھے حقہ پیتے نہیں دیکھے گا۔''
شاہ ابوالمعالی نے پوچھا۔ ''تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟''
میران شاہ نے جواب دیا۔ ''اپنی پیاس بجھانے۔''
شاہ ابوالمعالی نے فرمایا۔ ''سوچ لو، یہ کوئی آسان راستہ نہیں ہے۔''
میران شاہ نے عرض کیا۔ ''دنیا میں کوئی بھی آسان راستہ نہیں۔''
شاہ ابوالمعالی نے فرمایا۔ ''اگر تم خوب سوچ سمجھ کر میرے پاس آئے ہو تو خیر، میں بھی کوئی کوتاہی نہیں کروں گا۔''
انہوں نے میران شاہ کو اپنے پاس رکھ لیا۔ چند دن بعد انہیں مرید کرلیا اور تعلیم و تربیت میں مشغول ہوگئے۔ وہ میران شاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر توجہ فرمایا کرتے تھے۔
کچھ عرصہ اپنے پاس رکھ کر انہیں حکم دیا کہ ملوی واپس جاؤ پھر وہاں سے اپنے گھر کہرام چلے جانا۔
میران شاہ ملوی واپس پہنچے۔ یہ بے نوا شاہ کا گاؤں تھا۔ یہ ان کے پاس پہنچتے ہی بے ہوش ہوگئے۔ منہ سے کف جاری ہوگیا۔ بے نوا شاہ نے یہ کیفیت دیکھی تو پریشان ہوگئے۔ ان کی تیمارداری میں لگ گئے۔ تین دن بعد ہوش آیا تو بے نوا شاہ نے پوچھا۔ ''میران شاہ! خیریت تو ہے، یہ تمہیں کیا ہوگیا تھا؟''
میران شاہ نے کہا۔ ''اف وہ نظر جو کئی دن تک میرے چہرے پر جمی اور گڑی رہی، اس میں کیا رنگ تھا اور کیا اثر تھا، میں اس کو کس طرح بیان کروں۔''
بے نوا شاہ نے فرمایا۔ ''تمہارا علاج ہوچکا ہے۔ اب تم کہرام واپس جاؤ۔ شاہ ابوالمعالی نے مجھے جو کچھ جواب دیا ہے میں اس سے شرمندہ ہوں اور سمجھ میں نہیں آتا اس کی تلافی کیونکر ہو؟''
میران شاہ نے جواب دیا۔ ''اس کی کس طرح تلافی ہوسکتی ہے، یہ آپ سوچتے رہیے، میں تو اپنے گھر کہرام چلا۔''
اس کے بعد میران شاہ اپنے گھر کہرام چلے گئے۔
کہرام میں ایک مسجد تھی جس کا نام تھا محمد فاضل قانون گو کی مسجد۔ میران شاہ نے اس مسجد میں رہنا شروع کردیا۔ ماں کو معلوم ہوا تو انہوں نے گھر بلانے کی کوشش کی لیکن یہ ماں سے مل کر مسجد میں واپس چلے گئے۔
کچھ عرصہ اس مسجد میں رہ کر اس کو بھی چھوڑ دیا اور ایک دوسری مسجد میں تشریف لے گئے۔ یہ حجرے میں آنکھیں بند کرکے بیٹھ جاتے اور معلوم نہیں کیا کچھ دیکھتے رہتے۔
ایک دن مراقبے میں دیکھا کہ پیرومرشد شاہ ابوالمعالی کے چند بال بوریے پر گر گئے ہیں۔ یہ انہیں اٹھانے کے لیے انبیٹھہ تشریف لے گئے۔ یہ سیدھے بوریے پر پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ بوریے پر کئی بال پڑے ہوئے تھے۔ ان

فقیر اور امیر میں فرق

کہتے ہیں کہ ایک بادشاہ ایسا تھا جو درویشوں سے نفرت کرتا اور انہیں حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ ان درویشوں میں سے ایک بادشاہ کی اس حرکت کو جان گیا تھا۔ اس نے ایک روز بادشاہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

''بادشاہ سلامت! ہم درویش اس دنیا میں عیش میں تجھ سے بہتر ہیں لشکر و فوج کے لحاظ سے آپ بہتر اور ہم کمتر مگر مرنے میں ہم برابر ہیں ہمارے اللہ نے چاہا تو ہم قیامت کے روز آپ سے بہتر ہوں گے۔ بادشاہ ہو کہ فقیر دنیا سے جاتے وقت کفن کے سوا کچھ ساتھ نہیں لے جاتے اور کفن بھی دونوں کا وہ جس میں جیبیں نہیں ہوتیں۔

بادشاہ یہ ساری باتیں غور سے سن رہا تھا اور اسے غصہ بھی آ رہا تھا۔ اس نے فقیر کو ایک مقام پر بات کو آگے بڑھانے سے روکا تو فقیر نے اپنی بات یوں مکمل کی۔

''اے بادشاہ! تجھے اپنی بادشاہت کا بستر بوریا سمیٹ کر جانا ہوگا اور جب معاملہ یہ ہو تو پھر تیری بادشاہت سے ہماری فقیری بہتر نہیں ہے۔ فقیر کے کپڑے پھٹے ہوئے ضرور ہوتے ہیں مگر وہ دلِ زندہ کا مالک ہوتا ہے اور نفس کو مار کر زندگی گزارتا ہے۔''

شیخ سعدیؒ نے اس حکایت میں جو بات اجاگر کی ہے وہ یہ ہے کہ فقر و درویشی میں ذکر الٰہی اور شکر گزاری ہوتی ہے۔ ایثار اور صبر ہوتا ہے۔ فقیر متوکل ہوتا ہے توحید پر قائم رہتا ہے۔ بادشاہ خواہ کتنی قیمتی عبا اور قبا پہن لے ان تمام اوصاف سے محروم نفسِ امارہ کے ہاتھوں شکست خوردہ اور دنیا دار ہوتا ہے۔

ڈاکٹر تصدق حسین کی کتاب ''حکایات مولانا رومیؒ و سعدیؒ'' سے اقتباس

بالوں کو نہایت احترام سے اپنے پاس محفوظ کر لیا اور پیر و مرشد کے پاس جا بیٹھے۔

شاہ ابوالمعالی نے پوچھا۔ ''میران شاہ! کیسے آنا ہوا، خیریت تو ہے؟''

میران شاہ نے عرض کیا۔ ''حضرت! میں جھوٹ تو بول نہیں سکتا۔ میں نے مراقبے میں دیکھا تھا کہ آپ کے چند بال بوریے پر موجود ہیں۔ میں انہیں حاصل کرنے چلا آیا۔''

شاہ ابوالمعالی نے جواب دیا۔ ''میران شاہ! یہ فقر نہیں ہے۔ تم مغالطے میں پڑ گئے۔ فقر ایک دوسری ہی چیز کا نام ہے۔''

میران شاہ نے شرمندگی سے عرض کیا۔ ''وہی تو جاننا چاہتا ہوں یا حضرت!''

شاہ ابوالمعالی نے فرمایا۔ ''تم چند دن میرے پاس ہی رہو۔ اللہ نے چاہا تو یہ بات بھی تمہیں جلد ہی معلوم ہو جائے گی۔'' شاہ ابوالمعالی نے انہیں روک لیا اور ایک مرغِ مسلم تین دن تک کھلاتے رہے، اس کے بعد حکم دیا کہ اب تم کہرام واپس جاؤ، جب میں طلب کروں تو میرے پاس آجانا۔

میران شاہ کہرام واپس چلے گئے۔ ابھی یہ دم بھی نہ لے سکے تھے کہ پیر و مرشد کا طلبی نامہ پہنچ گیا۔ اس میں تحریر تھا کہ فوراً میرے پاس آجاؤ۔

میران شاہ فوراً ہی پیر و مرشد کی خدمت میں روانہ ہو گئے لیکن ان دنوں میران شاہ کو اپنی کمزوری کا احساس ہوا۔ وہ خود کو سفر کرنے کے لائق نہیں سمجھ رہے تھے چنانچہ جو شخص طلبی نامہ لے کر آیا تھا، اس کو ایک خط لکھ کر دے دیا کہ میری صحت اس لائق نہیں ہے کہ میں سفر کر سکوں اس لیے فی الحال حاضری دینے سے قاصر ہوں۔ صحت مند ہوتے ہی حاضر ہو جاؤں گا۔

جب پیر و مرشد کا آدمی میران شاہ کا جواب لے کر چلا گیا تو انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ انہوں نے سوچا کہ یہ جواب کافی نہیں ہے۔ انہیں اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں پہنچنا چاہیے۔ چنانچہ یہ اسی وقت پیر و مرشد کی خدمت میں روانہ ہو گئے۔

غروبِ آفتاب سے ذرا پہلے ہی یہ ایبٹہ میں داخل ہو گئے۔
پیرومرشد نے پوچھا۔ ''میران شاہ! تم کہرام سے کب چلے تھے؟''
انہوں نے جواب دیا۔ ''آج ہی۔ دوپہر کے وقت۔''
پھر پورا قصہ سنا دیا، بولے۔ ''میں نے قاصد کو جواب دے کر بھیج دیا تھا مگر پھر یہ خیال آیا کہ میں نے مرشد کی شان میں گستاخی کی ہے، مجھے ایسا نہیں کرنا تھا۔''
پیرومرشد نے پوچھا۔ ''راستے میں دریا بھی تو پڑا تھا؟''
جواب دیا۔ ''جی پیرومرشد! دریا پڑا تو تھا۔''
پیرومرشد نے پوچھا۔ ''کوئی کشتی مل گئی تھی؟''
انہوں نے جواب دیا۔ ''نہیں، کشتی تو نہیں ملی تھی۔''
پیرومرشد نے پوچھا۔ ''پھر دریا کس طرح عبور کیا؟''
جواب دیا۔ ''پیرومرشد! مجھے ایسا محسوس ہوا گویا دریا پر راستہ بنا ہوا ہے۔ میں اس پر چلا تو واقعی وہ راستہ نکلا۔ میں اس پر اسی طرح چلتا رہا جس طرح خشکی پر چلتا ہوں۔ بہ آسانی دریا کو عبور کرلیا اور اس وقت آپ کے سامنے موجود ہوں۔''
پیرومرشد نے ایک رات خانقاہ میں رکھا، اس کے بعد علی الصباح واپس جانے کی اجازت دے دی۔ جب یہ واپس جانے لگے تو میران شاہ کو بطورِ خاص ہدایت کی۔ ''میران شاہ! فقر کیا ہے اور کشف و کرامت کسے کہتے ہیں، تم بھی جانتے ہو، میں بھی جانتا ہوں لیکن جب دریا کو عبور کرنا تو میری یہ بات یاد رکھنا کہ یہاں اسبابِ ظاہری کی رعایت ضروری ہے۔''
انہوں نے جواب دیا۔ ''پیرومرشد! میں ہمیشہ اس کا خیال رکھوں گا۔''
چنانچہ واپسی میں انہوں نے کشتی کا بڑی دیر تک انتظار کیا اور اس وقت تک دریا کو عبور کرنے کا خیال تک نہ کیا جب تک کہ اسبابِ ظاہری کی رعایت پر عمل نہیں کیا۔
کہرام پہنچ کر انہوں نے عبادت اور ریاضت کے لیے ایک عجیب سی جگہ کا انتظام کرلیا۔ انہوں نے ایک کنوئیں کے منہ پر تختہ رکھ کر بیٹھنا اور عبادت کرنا شروع کردی۔ اس تختے پر ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا کہ کہیں تختہ الٹ نہ جائے اور وہ اس میں گر جائیں۔
ایک دن ذرا سی غفلت جو طاری ہوئی تو خود کو متنبہ کیا، بولے۔ ''اے شخص! یہ غفلت کیسی؟ کیا تو نہیں جانتا کہ تیری ذرا سی غفلت تیری ہلاکت کا باعث بن جائے گی۔''
آپ نے اسی طرح سالہا سال عبادت کی اور روحانی مراتب میں اضافہ فرماتے رہے۔ کئی بار جی میں آئی کہ پیرومرشد کے پاس جائیں لیکن ایک دن پیرومرشد کا یہ پیغام موصول ہو گیا کہ تم کہرام مت چھوڑنا، میں خود آنے والا ہوں۔
چنانچہ ایک دن پیرومرشد کہرام پہنچے اور میران شاہ کو اپنا پیراہن، کلاہ، جامہ اور چادر مرحمت فرمائی۔
میران شاہ نے بصد عاجزی عرض کیا۔ ''پیرومرشد! بندے کو لباس پہننے کی لیاقت نہیں ہے۔''
پیرومرشد نے انہیں ڈانٹ دیا، فرمایا۔ ''تم کیسے انسان ہو۔ میں تو تمہیں خلافت سونپ رہا ہوں اور تم لینے سے انکار کر رہے ہو۔''
اس کے بعد میران شاہ انکار نہیں کر سکے اور پیرومرشد کا عطا کیا ہوا لباس پہن لیا۔

☆☆☆

میران شاہ ایک عرصے بعد اپنے پیرومرشد کے پاس گئے تو وہ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ میران شاہ نے دیکھا کہ پیرومرشد ابوالمعالی کے کئی مرید خانقاہ کی چھت پر چڑھے ہوئے کسی کام میں مشغول ہیں۔ میران شاہ نے پوچھا۔ ''یہ

لوگ کیا کر رہے ہیں؟''
کسی مرید نے جواب دیا۔ ''چھت کو بارش سے نقصان پہنچ گیا تھا، اسے ٹھیک کر رہے ہیں۔''
میران شاہ کچھ دیر اپنے پیرومرشد کے پاس بیٹھے' اس کے بعد نماز پڑھنے چلے گئے۔ نماز کے بعد چلّہ کشی کرنے لگے۔ دوسرے دن صبح ایک مرید میران شاہ کے پاس پہنچا اور عرض کیا۔ ''حضرت! آپ کو پیرومرشد یاد فرما رہے ہیں۔''
میران شاہ نے مرید کو بغور دیکھ کر سر جھکا لیا۔ اس نے نظریں جھکا کر عرض کیا۔ ''میں نے پیرومرشد سے عرض کر دیا تھا کہ میران شاہ چلّے میں ہیں اس کے باوجود انہوں نے فرمایا کہ میں بلا لاؤں۔''
میران شاہ فوراً چلّے سے باہر آئے اور پیرومرشد کی خدمت میں پہنچ گئے۔
مرشد ابوالمعالی انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا۔ ''میران شاہ دیکھ، میری خانقاہ کی بوسیدہ چھت کی مرمت کتنے دنوں سے ہو رہی ہے مگر کام ختم ہی نہیں ہوتا حالانکہ میں نے ان سب سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ کام میران شاہ کے علاوہ کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ سو اب اس کام کو تو ہی ختم کرے گا۔''
میران شاہ نے کہا۔ ''مجھے کام کیا کرنا ہے؟''
مرشد نے جواب دیا۔ ''چھت کی سطح پر مٹی اور گھاس کو ملا کر ڈالنا اور کوٹنا ہے تاکہ وہ اتنی ٹھوس ہو جائے کہ بارش اسے کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔''
میران شاہ نے عرض کیا۔ ''تو میں یہ کام ابھی سے شروع کیے دیتا ہوں۔''
مرشد نے کہا۔ ''بسم اللہ...... پھر دیر کیوں؟''
میران شاہ اسی وقت چھت پر چڑھ گئے اور چھت کو درست کرنے لگے۔ مٹی میں گھاس ملائی اور اس میں پانی ڈال کر کوٹنے لگے۔ وہ اسے جتنی بار کوٹتے تھے، انہیں یہ محسوس ہوتا تھا کہ کچھ حاصل ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ وہ علوم ظاہری و باطنی سے لبریز محسوس ہونے لگے اور اس وقت انہیں معلوم ہوا کہ پیرومرشد انہیں اسی بہانے مزید کچھ عطا فرما رہے ہیں۔ کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنے مرشد کے قدموں میں گر گئے، بولے۔ ''حضرت! میں کس زبان سے آپ کی نوازشوں اور بخششوں کا شکریہ ادا کروں۔''
شاہ ابوالمعالی نے جواب دیا۔ ''میران شاہ! جو دم ہے غنیمت ہے۔ کل معلوم نہیں کیا ہو۔ میں نے سوچا جو کچھ دینا ہے فوراً ہی دے دوں۔''
میران شاہ کا ماتھا ٹھنکا، بولے۔ ''یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ کہیں اس طرح آپ اپنے وصال کی خبر تو نہیں دے رہے؟''
شاہ ابوالمعالی نے فرمایا۔ ''جو ہونی ہے وہ ہو کر رہے گی۔ میں کیا خبر دوں گا۔''
میران شاہ نے عرض کیا۔ ''حضرت! اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ ہی کے پاس رہوں۔''
شاہ ابوالمعالی نے فرمایا۔ ''نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب تم کہرام واپس جاؤ۔''
میران شاہ اپنے مرشد کا حکم کس طرح ٹال سکتے تھے۔ کہرام واپس چلے گئے اور چند دنوں بعد ہی آپ کو اپنے پیرومرشد کے وصال کی خبر پہنچ گئی۔ یہ بہت روئے اور ان کے مزار پر کھڑے ہو کر حسرت و یاس سے اس کو دیکھتے رہے۔ انہوں نے شکایتاً کہا۔ ''پیرومرشد! میں آخری دنوں میں آپ ہی کے پاس رہنا چاہتا تھا مگر آپ نے مجھے کہرام بھیج دیا۔''
میران شاہ نے کہرام واپس پہنچ کر وعظ و تبلیغ کا کام شروع کیا۔ اب ان کے اپنے مریدوں کی بڑی تعداد تھی۔ یہ مرید انہیں خانقاہ سے لے کر گھر تک نہیں چھوڑتے تھے۔ یہ ہر روز آپ کی دعوتیں کرتے رہتے تھے لیکن آپ بہت کم کہیں تشریف لے جاتے تھے۔
ایک دن موضع نوندھن کا ایک مرید آپ کے پاس آیا اور عرض کیا۔ ''حضرت! بڑی ذرّہ نوازی ہوگی جو آپ کچھ دیر میرے پاس رہیں اور میری دعوت قبول فرمالیں۔''
میران شاہ نے جواب دیا۔ ''میں نہ تو خود کسی کو تنگ کرتا ہوں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ خوامخواہ مجھے عاجز و پریشان کیا جائے۔''

مرید نے لجاجت سے عرض کیا۔ ''میں آپ کو تنگ کروں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

میران شاہ نے فرمایا۔ ''میری دعوت کر کے کیا تو پریشان نہیں کر رہا؟''

مرید نے عرض کیا۔ ''میں تو ایسا نہیں سمجھتا۔''

میران شاہ کو مرید کی جرأت اور صاف گوئی بہت اچھی لگی۔ ہنس کر بولے۔ ''میں نے تیری دعوت قبول کی۔ میں تیرے گھر ضرور آؤں گا۔''

مرید شکریہ ادا کر کے اپنے گھر چلا گیا اور دعوت کا انتظام کرنے لگا۔ ابھی وہ انتظام ہی کر رہا تھا کہ اس کا دس سالہ لڑکا اچانک فوت ہو گیا۔ لڑکے کی ماں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مرید کو یہ خیال ستا رہا تھا کہ میں نے میران شاہ کو کتنی منت اور سماجت سے یہاں آنے پر مجبور کیا تھا۔ اب اس سانحے کے بعد اگر انہیں ہشاش بشاش لہجے میں خوش آمدید نہ کہا گیا تو وہ بُرا مان جائیں گے۔

مرید نے بچے کی لاش کو ایک کمرے میں بند کر دیا اور خود میران شاہ کو لینے پہنچ گیا۔

میران شاہ مرید سے بہت خوش تھے۔ جب ان کے سامنے کھانا رکھا گیا تو میران شاہ کو اس سے خوشی بھی ہوئی اور غم بھی۔ خوشی اس بات کی کہ وہ اپنے مرید کو خوش رکھنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور غمزدہ اس لیے کہ ان کے دل پر جو ایک بوجھ تھا، وہ کسی طرح کم نہ ہوتا تھا۔

آخر میران شاہ نے کھانا کھانے سے انکار فرما دیا، فرمایا۔ ''اے شخص! ذرا میرے پاس تو آ۔''

مرید آپ کے پاس جا کھڑا ہوا۔ آپ نے اس سے پوچھا۔ ''تیرا بیٹا کہاں ہے؟ اس وقت وہ نظر نہیں آ رہا۔ کیا بات ہے؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''حضرت! وہ کھیلنے گیا ہوا ہے، واپس آئے گا تو آپ سے ملوا بھی دوں گا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''نہیں، میں اس وقت تک بھوکا ہی رہوں گا جب تک کہ تیرا لڑکا نہیں آ جائے گا۔''

مرید بالکل مجبور اور بے دست و پا ہو چکا تھا۔ اس نے مجبوراً سارا قصہ سنا دیا، بولا۔ ''حضرت! اب میں آپ کو کس طرح دھوکے میں رکھوں گا...... جب میں آپ کے پاس سے آیا ہوں تو مجھے اچانک یہ خبر ملی کہ میرا دس سالہ لڑکا مر گیا۔ میں نے سوچا کہ اس غم کو جھیل جانا چاہیے کیونکہ میں آپ کی دعوت کی سعادت سے واقف ہوں۔ میں نے بچے کی موت کی خبر چھپا دی۔''

آپ نے مُسکرا کر فرمایا۔ ''کہیں تو مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہا؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''مجھ میں اتنی ہمت کہاں کہ آپ سے مذاق کروں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اگر تو نہیں تو تیرا بیٹا مذاق کر رہا ہوگا۔''

مرید نے جواب دیا۔ ''وہ بھی نہیں۔ میں اس کی ایک ایک حرکت سے آگاہ ہوں۔''

آپ نے مرید پر زور دیا۔ ''بچے کے پاس جاؤ اور بہ آوازِ بلند کہہ دو کہ چل تجھے میران شاہ بلا رہا ہے، ورنہ کر فوراً ہی اٹھ بیٹھ اور میران شاہ کی خدمت میں پہنچ۔''

مرید آپ کے حکم پر اپنے بیٹے کے سرہانے پہنچ کر بولا۔ ''لڑکے! میں نے تو تیری موت کی خبر چھپائی تھی۔ میران شاہ کو تیری موت کا یقین ہی نہیں آ رہا۔ وہ فرماتے ہیں کہ تو زندہ ہے اور آواز دینے پر اٹھ بیٹھے گا۔ چنانچہ میں تجھ سے کہتا ہوں کہ چل تجھے میران شاہ یاد فرما رہے ہیں۔''

مرید نے محسوس کیا کہ لڑکے کی سانسیں تیز تیز چل رہی ہیں۔ وہ گھبرا گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے لڑکے کو جھنجوڑ ڈالا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''بیٹے اٹھ۔ تجھے میران شاہ یاد فرما رہے ہیں۔ وہ اس وقت تک کھانا نہیں کھائیں گے جب تک کہ دسترخوان پر ان کے ساتھ تُو شریک نہیں ہوگا۔''

مرید نے دیکھا، لڑکے نے آنکھیں کھول دی ہیں اور وہ اپنے باپ کو پریشانی سے دیکھ رہا ہے پھر وہ اٹھا اور اپنے باپ کے ساتھ میران شاہ کے پاس دسترخوان پر پہنچ گیا۔

میران شاہ نے لڑکے سے پوچھا۔ ''لڑکے! تو کیا کر رہا تھا؟''

لڑکے نے جواب دیا۔ ''پیرومرشد! میں گہری نیند سویا ہوا تھا اور خواب میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا پھر

والد کی آواز نے مجھے بیدار کر دیا۔''
باپ اپنے بیٹے کی باتیں بڑی توجہ اور شوق سے سنتا رہا۔
میراں شاہ نے اپنے مرید کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔ ''نادان انسان! تیرا لڑکا مرا نہیں تھا، سکتے میں سویا ہوا تھا۔''
مرید کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، بولا۔ ''اگر آپ تشریف نہ لاتے تو اس کا یہ مطلب تھا میں اپنے بیٹے کو زندہ ہی دفن کر آتا۔''

☆☆☆

یہ محمد شاہ کا دور تھا، دہلی خشک سالی کا شکار تھی۔ بارش کا کہیں پتا نہ تھا، آسمان پر بادل کا شائبہ تک نہ تھا۔ شہر اور مضافات کے لوگ بدحواس ہو کر اِدھر اُدھر بھاگے پھر رہے تھے۔ محمد شاہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بارش کس طرح کرائی جائے۔ اس نے اپنے درباریوں سے پوچھا۔ ''ہمیں اس حال میں کیا کرنا چاہیے؟''
کسی عمر رسیدہ اور تجربہ کار درباری نے عرض کیا۔ ''بادشاہ سلامت! میرے اپنے خیال میں بس ایک ہی شخص ہے جس کی دعا سے بارش ہو سکتی ہے۔''
بادشاہ نے پوچھا۔ ''وہ کون ہے؟''
درباری نے جواب دیا۔ ''کہرام کے پیر و مرشد میراں شاہ۔''
بادشاہ نے پوچھا۔ ''اگر میں اس کو بلواؤں تو کیا وہ آ جائے گا؟''
درباری نے مؤدبانہ درخواست کی۔ ''اگر مجھ کو اجازت دی جائے کہ میں انہیں یہاں لے آؤں تو میں اس کے لیے تیار ہوں۔''
بادشاہ نے کہا۔ ''تجھ کو اجازت ہے اگر میراں شاہ کو یہاں تک لا سکتا ہے تو ضرور لے آ۔''
درباری اٹھا اور بھاگم بھاگ سرہند کے حاکم کے نام بادشاہ کی طرف سے ایک فرمان تیار کرایا۔ اس میں صاف صاف لکھ دیا گیا تھا کہ وہ فوراً تشریف لے آئیں۔
جب یہ فرمان کہرام میں آپ کو ملا تو غصہ آ گیا۔ فرمایا۔ ''اپنے بادشاہ سے کہہ دینا درویشی اتنی آسان نہیں ہے۔ بادشاہی تو کوئی بھی کر سکتا ہے مگر درویشی ہر کسی کے بس کی نہیں۔''
قاصد نے عرض کیا۔ ''حضور والا! بادشاہ کی خواہش ہے کہ آپ دعا کریں تا کہ بارش ہو۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''خوب! معلوم نہیں بادشاہ کو کس نے مغالطے میں ڈال دیا ہے۔''
قاصد نے کہا۔ ''میں واپس کیونکر جاؤں، کیونکہ وہاں تو بادشاہ موجود ہے، میں اس کو کیا جواب دوں گا۔''
آپ نے فرمایا۔ ''اب تُو واپس جا، بادشاہ سے کہہ دینا، میری حاضری ضروری تو نہیں، میں اس کا کام یہیں سے انجام دے سکتا ہوں۔''
قاصد نے کہا۔ ''تب پھر کیجیے نا، بچے منہ بسورے اِدھر اُدھر بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں۔ ان کی دعائیں بیکار ہو چکی ہیں۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''میں نے ایک بار جو کہہ دیا کہ بادشاہ جو چاہتا ہے ہو جائے گا۔''
قاصد نے عرض کیا۔ ''آپ جو کچھ فرما رہے ہیں اس کو لکھ کر مرحمت فرما دیں۔''
آپ نے بادشاہ کو لکھ دیا۔ ''تُو جو کچھ چاہتا ہے ہو جائے گا۔ اس کام کے لیے میں دہلی نہیں آ سکتا اور دیکھ جب یہ کام ہو جائے تو پھر مجھے آئندہ بھی کوئی تکلیف نہ دینا۔''
جب یہ چند سطریں بادشاہ کے پاس پہنچیں تو موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ بادشاہ بہت خوش تھا اور آپ کے خط کو بار بار اپنی آنکھوں اور ہونٹوں سے لگا رہا تھا۔

☆☆☆

ملک کے حالات بہت خراب تھے۔ ہر طرف سازشیں اور ریشہ دوانیاں تھیں۔ بادشاہ کا سکون برباد تھا۔ بادشاہ نے

اپنے وزیر روشن الدولہ کو آپ کی خدمت میں بھیجا۔ بادشاہ نے مٹھائی، کپڑے اور نقد رقم بھی روانہ کی تھی۔ جس وقت وزیر میران شاہ کی خدمت میں پہنچا، وہ عشا کی نماز پڑھ رہے تھے۔ وزیر ایک طرف بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد جب آپ نے سلام پھیرا تو بائیں جانب ایک شخص کو بیٹھے دیکھ کر کچھ پریشان سے ہو گئے۔ وزیر نے اٹھ کر ادب سے سلام عرض کیا اور اپنا تعارف کرایا۔ ''حضرت! میں ہوں روشن الدولہ...... وزیر دولت مغلیہ ہند۔''

میران شاہ نے بے نیازی سے پوچھا۔ ''آنے کی غایت؟''

وزیر نے اِدھر اُدھر دیکھا اور سرگوشی میں عرض کیا۔ ''میں یہاں چھپ کر آیا ہوں۔ مجھے بادشاہ نے اس لیے بھیجا ہے کہ میں آپ سے کہوں کہ بادشاہ اور اس کی نسل کے لیے دعا کی جائے۔''

میران شاہ نے پوچھا۔ ''کیسی دعا؟ کس قسم کی دعا؟''

وزیر نے عرض کیا۔ ''ملک میں سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا دور دورہ ہے۔ ایرانی اور تورانی امراء آپس میں برسرپیکار ہیں۔ بادشاہ کی خواہش ہے کہ یہ سلطنت اس کی اولاد ہی میں رہے۔''

میران شاہ نے کہا۔ ''پھر اس سلسلے میں، میں کیا کر سکتا ہوں۔''

میران شاہ نے جواب دیا۔ ''دعا...... آپ دعا فرما سکتے ہیں۔''

میران شاہ نے آنکھیں بند کر لیں اور مراقبے میں چلے گئے۔ کچھ دیر بعد آنکھیں کھول دیں اور فرمایا۔ ''وزیر! جا اپنے بادشاہ سے کہہ دے خواجہ نظام الدین کے روحانی فیض سے بادشاہ کی دو نسلوں تک حکومت رہے گی۔ بس اس کے بعد نہیں، اس سلسلے میں میں کچھ نہیں کر سکتا۔''

وزیر نے بے چارگی اور مجبوری سے کہا۔ ''حضرت! کچھ تو کیجیے۔''

انہوں نے جواب دیا۔ ''مشیت ایزدی میں کسی کو کیا دخل...... میں مجبور ہوں۔''

وزیر نے بادشاہ کی چیزیں آپ کو دینا چاہیں تو آپ نے فرمایا۔ ''انہیں ضرورت مندوں ہی میں تقسیم کر دے۔ میں لے کر کیا کروں گا۔''

چنانچہ وزیر نے ساری چیزیں خود ہی تقسیم کر دیں اور دہلی واپس چلا گیا۔

بادشاہ اس کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ جب اس کو میران شاہ کے جواب کا علم ہوا تو کئی دن تک پریشان اور گم صم رہا لیکن اس سے میران شاہ کی عزت اور وقعت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔

☆☆☆

آپ کے مریدوں اور ارادت مندوں کی تعداد میں اتنا زیادہ اضافہ ہوا کہ ہر طرف آپ کا چرچا رہنے لگا۔ ضعیفی میں آپ اتنے کمزور ہو گئے کہ چلنا پھرنا مشکل ہو گیا۔ آپ اس عالم میں بھی اپنے مریدوں کی تعلیم و تربیت فرماتے رہتے۔ آپ نے بڑی محنت اور کوشش سے بیالیس خلفاء تیار کیے تھے۔ ان کی علمیت اور روحانیت کا ایسا شہرہ ہوا کہ ہر کوئی انہی میں سے کسی ایک کا مرید نکل آتا تھا۔

1131ھ میں رمضان آئے تو چاند دیکھتے ہی میران شاہ کو بڑی کمزوری اور نقاہت محسوس ہونے لگی۔ معالجین نے آپ کے علاج میں کوئی سستی یا کوتاہی نہیں برتی مگر 5 رمضان تک حالت اتنی بگڑی کہ پھر سنبھل نہ سکی۔ آپ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ کہرام میں کہرام برپا ہو گیا۔ ایک زمانہ کھنچ کر کہرام پہنچ گیا۔

آپ اپنے مریدوں کو ہدایت فرمایا کرتے تھے کہ انہیں نصف رات سے زیادہ نہیں سونا چاہیے۔ وہ بلا کے مرید شناس تھے اور آپ کا یہ قول تھا کہ پیر کو مرید شناس ضرور ہونا چاہیے۔

جو فقراء اسم ذات کے ذکر میں سرگرم نہیں ہوتے تھے، آپ ان کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ ان پر لقمۂ درویش اور لباسِ پیری حرام ہے۔ میران شاہ خود جن چیزوں پر عمل کرتے تھے، اسی کی دوسروں کو تلقین کیا کرتے تھے۔ اس لیے آپ کے ہم عصروں نے آپ کو قطب زمان قرار دیا تھا۔

☆☆☆

دکھن

اے آر راجپوت

اگرچہ اولاد اس کی سب سے بڑی ضرورت تھی لیکن یہ تو خدا کی دین ہے جسے چاہے وہ نواز دے اور جسے چاہے آزمائش میں ڈال دے... لیکن آزمائش کے جن کٹھن مرحلوں سے وہ گزرا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہی آزار کسی اور کی زندگی میں زہر گھول دے... اس لیے جب اس کی شریک حیات نے وہی جرم کیا جو کبھی اس کی ماں نے کیا تھا تو جانے کیوں جی جان سے لرز کر رہ گیا۔

ہنستے بستے گھروں میں ماتم برپا کرنے
والے بے ضمیروں کا انجام

جھگی کے دروازے پر جھولتا ٹاٹ کا پردہ ہٹا..... دبلی پتلی اور تھکن سے نڈھال نازو اندر داخل ہوئی۔ کمر پر وہی کپڑے کا تھیلا جواب گویا اس کے وجود کا حصہ بن چکا تھا۔ ہاتھ میں ایک پوٹلی، جس کو دیکھ کر جھلنگا سی چارپائی پر پڑے ہوئے کالو کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک وہ بھوک کے مارے تلملا رہا تھا اور خود کو کوس رہا تھا کہ اس نے صبح نازو کو جانے ہی کیوں دیا۔ گھر میں ہوتی تو کچھ دال دلیا پکا کر آگے رکھ ہی دیتی۔ اور نہیں تو سوکھی روٹی
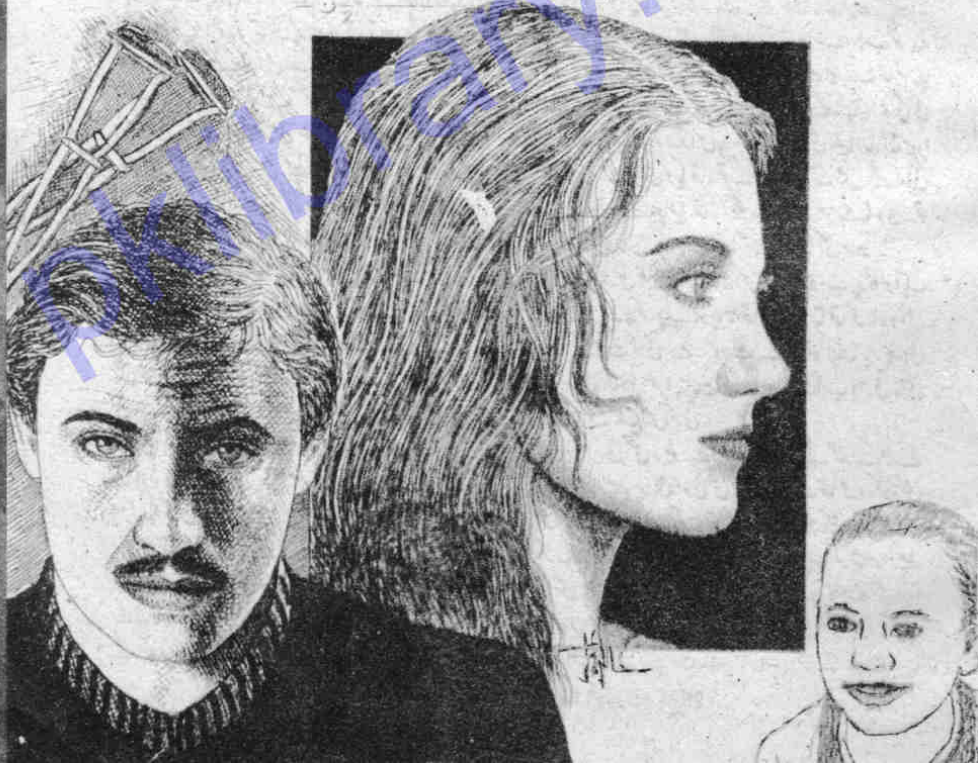
ہی سہی...... لیکن اب وہ سب کچھ بھول کر پوٹلی کو دیکھ رہا تھا۔ اس وقت اس کی توجہ اپنی جوان بیوی کی طرف بھی اتنی نہیں تھی جس کے سانولے سلونے چہرے کی نمکینی میں اس بدحالی میں بھی ایک کشش تھی۔

''رے کالو!'' نازو دھم سے قریب ہی بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''آج سیٹھ کے ہاں دعوت کا بچا ہوا کھانا بٹ رہا تھا۔ میں بھی کچرے کے دام لے کر چلی گئی۔ دیکھ، کیا کیا لائی ہوں۔''

اب کالو میں مزید صبر کی تاب نہیں تھی۔ اگر وہ معذور نہ ہوتا تو جھپٹ کر پوٹلی اس کے ہاتھ سے چھین ہی لیتا۔ بریانی، تافتان، قورمہ، مرغی......

''ارے، ایسی چیزیں ہماری قسمت میں کہاں۔''

کالو بے صبری سے بڑے بڑے نوالے نگل رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بیوی کے حصے کے نوالے بھی کھا جاتا۔

نازو بہت صبر اور سلیقے سے کھا رہی تھی۔ کھانا بہت تھا۔ تھوڑی دیر میں کالو کا پیٹ پوری طرح بھر گیا مگر وہ لالچ میں آکر کھاتا رہا۔ گویا پیٹ بھر گیا تھا مگر نیت...... نازو نے اسے روکا نہیں کہ اب جانے کب ایسا کھانا دوبارہ ملے۔

نازو کھا کر اٹھی اور دوسری کھری سی چارپائی پر کمر سیدھی کرنے پڑ گئی۔ کالو اب بالکل خاموش تھا اور اپنی جھلنگا چارپائی پر پڑا خود کو اتنا ہی پُرسکون اور آسودہ محسوس کر رہا تھا جتنا کچھ دیر قبل بے آرامی اور بھوک کی اذیت۔

یہ کھانا ضرور خلافِ معمول تھا، باقی سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ کالو جسمانی معذوری کا شکار تھا اور کوئی کام نہیں کر سکتا تھا۔ چند برس پہلے وہ ایک اچھا بھلا نوجوان تھا۔ ایک حادثے نے اسے معذور بنا کر بستر کا کر کے رکھ دیا تھا۔

اس دن سے نازو نے بڑا سا تھیلا اٹھایا اور گلی گلی، کوچے کوچے پھر کر کچرا جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایک یتیم اور بے سہارا لڑکی کو تعلیم اور ہنر کون دیتا؟ لے دے کر یہی کام تھا جو وہ کر سکتی تھی۔ پہلے پہل اس نے علاقے کے بڑے بڑے محل نما گھروں میں نوکری کی کوشش کی۔ کہیں ماسی، کہیں آیا کی ہی نوکری مل جائے لیکن اس کی شراب کی تلچھٹ جیسی سانولی سلونی رنگت اور بڑی بڑی آنکھوں میں ایسی تاثیر تھی کہ ان اونچے گھروں کی مغرور بیگمات اسے دیکھتے ہی بھڑک اٹھتیں۔

''جاؤ بی بی! ہم کو نوکرانی چاہیے، سوکن نہیں۔''

جب کئی جگہوں سے اسے یہی جواب ملا تو اس نے کچرے کے ڈھیروں کو ہی اپنا مقدر سمجھ لیا۔ دن بھر کی محنت کے بعد جو کچرا جمع ہوتا، اسے کارخانے میں فروخت کر دیتی۔ اس کے بدلے ملنے والی برائے نام رقم سے روز کی دال روٹی خرید کر گھر لے جاتی کیونکہ دن بھر مارے مارے پھرنے کے بعد اس میں دم بھی کہاں ہوتا کہ گھر جا کر دال چڑھائے اور روٹی پکائے۔

یہ روز کی بات تھی اور اسے دیکھ کر چارپائی پر بے بسی سے پڑے پڑے کالو کو سخت ذہنی اذیت پہنچتی تھی۔ وہ اپنی بیوی نازو کی معصوم سی صورت کو دیکھتا رہتا تھا۔ سراپا ایثار و وفا...... پانچ برس بیت چلے تھے۔ ان برسوں میں ایک دن نہیں گزرا تھا جب نازو نے اپنی بے لوث رفاقت اور پُرخلوص محبت کا ثبوت نہ دیا ہو۔ یوں کالو اکثر سوچتا کہ اگر نازو اس کی زندگی میں نہیں آئی ہوتی تو وہ کیا کرتا۔ بیچاری نازو کو تو ازدواجی زندگی کی تمام خوشیوں سے شادی کے صرف چند ہی ماہ بعد محروم ہونا پڑ گیا تھا۔ کالو کو اکثر خیال آتا کہ وہ نازو کو کما کر کھلانے کے بجائے الٹا اس پر بوجھ بن کر پڑا ہوا ہے۔ جب بھی وہ اس بات کا ذکر کرتا، نازو فوراً اس کے منہ پر اپنا نرم ہاتھ رکھ دیتی۔

''رے کالو!'' وہ کہتی۔ ''تجھے میرا جی جلانے میں مزہ آتا ہے کیا؟ اب آخری بار بولتی ہوں میں...... اب پھر ایسا کبھی بولا تو اچھا نہ ہوگا۔ ہاں......'' وہ اسے ایک معصومانہ دھمکی دے کر مزید کہتی۔ ''بھول گیا وہ سب، جب تُو نے مجھے بُرے دنوں میں سہارا دیا تھا اور مجھے میرے ظالم چچا سے چھٹکارا دلوایا تھا۔ مجھ سے بیاہ کر کے مجھے اپنی زندگی کی راہ پر لے آیا تھا ورنہ تو اس بدبخت اور لالچی انسان نے میرا سودا کسی سے کر ہی دیا تھا۔ تُو نے ایسے وقت میں مجھے کھائی میں گرنے سے بچا لیا تھا۔ مجھے اجت (عزت) دی۔ تو میرے سر کا تاج ہے، اب ایسا کہنا یا سوچنا بھی مت۔''

ہمیشہ کی طرح اس کے اس واضح جواب پر کالو ایک لمبی سانس لے کر چپ ہو جاتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ نازو اس سے سچی محبت کرتی ہے۔ عورت کے ساتھ ایک بار بھلائی کر دو، وہ ساری عمر اپنا پسینا بہاتی اور اپنا آپ وارتی رہتی ہے اور اُف تک نہیں کرتی۔

ان کی جھگی ریلوے لائن کے پار ایک گندے نالے سے ذرا فاصلے پر بنی ہوئی تھی۔ ایک وقت تھا کہ وہ خود بھی نازو کے ساتھ کچرا چنا کرتا تھا کیونکہ جگہ جگہ الٹے سیدھے کام کر کے اتنی آمدنی نہیں ہوتی تھی۔ چھپ چھپا کر شام ڈھلے خود بھی کچرا چننے نکلتا۔ شام کو گھٹیا دیسی شراب کا چسکا بھی ان ہی دنوں پڑا تھا۔ یوں ایک دن کچھ زیادہ ہی نشہ چڑھا گیا۔ گھر آنے کے لیے ریلوے لائن پار کرتے ہوئے ایسا

لڑکھڑایا کہ وہیں گر گیا اور چند ہی منٹ بعد گزرنے والی ایکسپریس اس کی زندگی کے ایک حصے کو کاٹتی نکل گئی۔

جب آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو اپنی جھگی کے بجائے سرکاری اسپتال کے سرخ کمبلوں والے سفید بستر پر پایا۔ نازو اس کے پاس بیٹھی مسلسل روئے جا رہی تھی اور وارڈ کے دوسرے مریض اور ان کے لواحقین اسے دیکھے جا رہے تھے۔ کالو حیران تھا کہ وہ تو گھر جا رہا تھا، یہاں کیسے پہنچ گیا؟ ابھی وہ حیران ہی ہو رہا تھا کہ اسے اپنے جسم کے نچلے حصے میں ٹیس اٹھتی محسوس ہوئی۔ اس نے بدحواس ہو کر ٹانگوں پر رکھے ہوئے ڈھانچے کو دیکھا جس کے اوپر چادر پڑی ہوئی تھی اور پھر اس کے حلق سے ایک دہشت زدہ چیخ نکل گئی۔

''ناجو...... ! ہائے میری ٹانگیں!'' اور دوبارہ بے ہوش ہو گیا۔ اسپتال کا عملہ دوڑتا ہوا آیا اور نازو کی سسکیاں، چیخوں کا روپ دھارنے لگیں۔

نازو پر سچ مچ قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ پہلے ہی وہ اسے دیسی شراب سے روکتی تھی مگر کالو اس کی باتیں قہقہوں میں اڑا دیتا۔ آخر یہی شراب اس کی زندگی کا ایک حصہ بہا کر لے گئی۔ ساتھ میں جو کچھ بچی کچھی خوشیاں تھیں، ان کو بھی۔ اب سچ مچ زندگی سڑنے لگی تھی۔

نازو بھی ان حالات سے متاثر تھی۔ ایک تو شادی شدہ عورت ہونے کے ناتے اسے بچے کی شدید خواہش اور وہ ابھی تک پوری نہ ہو سکی تھی کہ یہ دوسری مصیبت سر پر آن پڑی۔ وہ ہر وقت ایک بچے کے لیے دعا کرتی لیکن شاید ابھی قبولیت کا وقت نہیں آیا تھا۔ کبھی کبھی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ یوں بھی کرتی کہ آس پاس کے ننھے منے بچے کو اٹھا لاتی جو والدین کی جہالت، غربت، گندگی کا شاہکار ہوتا۔ اسے نہلا دھلا کر اپنے کسی وقت کے جمع کیے ہوئے ننھے کپڑے پہنا دیتی، پھر اسے دل بھر کر پیار کرتی اور اپنی ممتا کی پیاس بجھانے کا سامان کر لیتی۔ اس دن بھی یہی ہوا۔

حسبِ معمول کالو اپنی کھاٹ پر پڑا نازو کے آنے کا انتظار کر رہا تھا کہ ٹاٹ کا پردہ ہٹا اور نازو اندر آ گئی۔ اسے دیکھ کر کالو خلافِ معمول چونک اٹھا۔ اس کی وجہ نازو کی گود میں موجود ڈھائی، تین سال کا سرخ و سفید گول مٹول بچہ تھا۔ کالو کے چونکنے کی وجہ یہ تھی کہ بچہ اس غریب اور پسماندہ آبادی کا لگتا ہی نہیں تھا۔ اس کی رنگت، ناک نقشہ، قیمتی اور خوبصورت لباس اور پیروں میں مہنگے جوتے...... یہ سب بتا رہے تھے کہ بچہ کسی اونچے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اور کسی وجہ سے ادھر آنکلا ہو گا مگر سوال یہ تھا کہ نازو کی گود تک پہنچا کیسے؟

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھنے کی کوشش میں پھر سے چارپائی پر گر گیا۔ ''ارے نازو...... ! یہ...... یہ آج کس کا بچہ اٹھا لائی ہے۔ یہ تو...... یہ تو...... اس بستی کا نجر (نظر) نہیں آوے ہے؟'' کالو نے حیرت ظاہر کی۔ ''یہ تو بہوت اونچے گھرانے کا لگے ہے۔''

اس کی بات پر نازو ذرا چونکی پھر کمر پر لٹکا کچرے کا خالی تھیلا ایک طرف پھینک کر اس کی پائنتی کی جانب آ بیٹھی۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی غیر معمولی بشاشت نے کالو کو بھی غور سے دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ اس کی سلونی نمکین رنگت کے اندر کہیں سے خوشی، لہو کی سرخی بن کر ابھر آئی تھی اور رخسار تمتما اٹھے تھے۔ وہ اسی سرخوشی کے عالم میں بولی۔

''رے کالو! میں نہ کہتی تھی، ایک دن کچرا چنتے ہوئے مجھے ہیرا مل جائے گا۔ آج وہ مجھے مل گیا تو میں اسے اٹھا لائی۔ دیکھ تو کتنا پیارا ہے۔'' وہ بچے کا گورا چٹا گال ''چٹ'' سے چومتے ہوئے بولی جو اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھیلائے معصومانہ حیرت سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

نازو کی بات پر کالو کو اپنے اندر ایک عجیب و غریب اُبال سا اٹھتا محسوس ہوا جیسے دور، بہت دور کہیں کسی نامعلوم نگری کے دھندلے نقوش نظر آنے لگے ہوں۔ وہ نگری جو اس نے کبھی دیکھی نہیں لیکن اس کا کہیں نہ کہیں وجود تھا اور اس کا اس بستی سے تعلق تھا جس کو وہ شاید جانتا تھا یا شاید نہیں جانتا تھا۔ کوئی دور کی آواز تھی جو اس تک آتی تھی اور اس تک آتے آتے دھیمی پڑ جاتی تھی پھر دنیا کے شور میں گم ہو جاتی تھی۔ وہ کیسی نگری تھی اور وہ کیسی آواز تھی؟ یہ بھید تھا جو کالو کو شاید معلوم تھا اور شاید معلوم نہیں تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ کچھ معلوم ہو، کچھ نہ ہو۔ وہ تو اس وقت اس بچے کو دیکھے جا رہا تھا۔

''ناجو...... !'' بالآخر اس نے کہا۔ ''سچ سچ بتا، یہ کس کا بچہ ہے اور تو اسے یہاں کیوں لائی ہے؟'' اس کا لہجہ ذرا تیز ہو گیا۔ نازو ہڑبڑا سی گئی، بولی۔

''بتاتی ہوں...... بتاتی ہوں۔ ذرا دم تو لینے دے۔ بہت پیدل چل کر اور تھک کر آ رہی ہوں۔''

''وہ تو...... تو روز بہت پیدل چلتی ہے اور بہت تھک کر آتی ہے۔'' کالو ذرا غصے سے بولا۔ ''لیکن پہلے ایسا نہیں ہوا۔'' اس کی بات سن کر نازو بوکھلا کر اس کی پائنتی سے اٹھنے لگی تو کالو نے ہاتھ بڑھا کر لیٹے لیٹے ہی اس کی نازک

سی کلائی پکڑلی۔ اس کی فولادی گرفت ایسی تھی کہ نازو کراہ کر رہ گئی۔

’’ناجو......! پہلے اس بچے کے بارے میں بتا۔ تُو اسے کہاں سے اور کیوں لائی ہے؟‘‘

کالو کا لہجہ ایسا تھا کہ نازو پل بھر کو اپنی جگہ سکتے کی سی کیفیت میں رہ گئی۔ اتنے برسوں میں کالو نے اس سے اس لہجے میں کبھی بات نہیں کی تھی۔ آج اس کی آنکھیں گویا شعلے برسا رہی تھیں اور لہجے میں لاوے کی تپش تھی۔ وہ حیران ہی ہوگئی۔

’’یہ...... یہ تجھے کیا ہوگیا ہے کالو؟‘‘ وہ کالو کی پتھریلی گرفت میں تقریباً کراہتے ہوئے بولی۔ ’’میری کلائی تو چھوڑ پہلے، بڑا درد ہو رہا ہے۔‘‘

’’نہیں...... پہلے مجھے بتا، یہ بچہ تُو کیوں لائی ہے؟‘‘ کالو کا لہجہ بدستور درشت تھا۔

’’اچھا...... اچھا، بتاتی ہوں۔ چھوڑ میری کلائی۔‘‘ وہ تقریباً رو دی۔ کالو نے اس کی کلائی چھوڑ دی۔ وہ اسے سہلاتی ہوئی کچھ دیر بُرا سا منہ بناتی رہی پھر کچھ سوچ کر بولی۔ ’’کالو! اب یہ بچہ ہمارا ہے۔ اللہ میاں نے ہمیں دیا ہے اور یہ وہاں...... اس پار......‘‘ کہتے ہوئے نازو نے جھگی سے باہر ریلوے لائن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہا۔ ’’وہ...... ادھر پٹڑیوں کی طرف یہ معصوم بیچارہ اکیلا کھڑا تھا اور روئے جارہا تھا۔ میں سمجھی ادھر شاید ٹیشن (اسٹیشن) کی طرف اپنے ماں باپ سے بچھڑ گیا ہوگا...... اور میں اسے اٹھا لائی......‘‘ وہ چند ثانیے سانس لینے کو رکی اور پھر اصل بات کی طرف آتے ہوئے بولی۔

’’رے کالو......! بس، میں نے ایک فیصلہ کرلیا ہے، ہاں۔ اب اس معصوم بچے کو ہم اپنے پاس رکھ لیں گے۔ یہ ہمارا بیٹا بن کر رہے گا۔ یہ دیکھ تو سہی کالو! کتنا پیارا ہے...... ہے نا؟‘‘

’’نہیں، ہرگز نہیں ناجو!‘‘ کالو اتنی زور سے بولا کہ نازو سہم گئی اور بچہ جواب تک چپ تھا، رونے لگا۔ نازو نے اسے سینے سے چمٹا لیا اور تھپکیاں دینے لگی۔

’’نہیں ناجو! یہ بچہ یہاں نہیں رہے گا۔ اسے ابھی واپس چھوڑ کر آ...... بلکہ ادھر ریلوے ماشٹر کو دے آ۔ وہ آپ ہی اسے اس کے گھر والوں کے پاس پہنچا دیں گے۔‘‘

’’کالو؟‘‘ نازو نے لرزیدہ آواز میں کچھ کہنا چاہا لیکن کالو اس کی بات کاٹتے ہوئے درشت لہجے میں بولا۔

’’ناجو! دیر مت کر۔ اسے واپس لے جا۔ اگر

برجستہ

گاندھی جی اور مولانا محمد علی جوہر جلسے میں شرکت کی غرض سے پونا میں اکٹھے گئے گاندھی جی کی عادت تھی کہ صبح کو وہ سیر کو نکل جاتے تھے۔ ایک روز جوہر بھی ساتھ ہو لیے۔ پونا میں ایک کنواں شیواجی مرہٹہ کے نام سے موسوم ہے وہ راستے میں پڑتا تھا۔ گاندھی جی نے اس کے اندر جھانکتے ہوئے کہا: ’’یہ کنواں شیواجی کے نام سے موسوم ہے اور اس کے پانی میں مجھے آج بھی ان کی صورت متحرک نظر آتی ہے۔‘‘

جوہر نے جواب میں جھک کر اندر جھانکا۔ کچھ دیر دیکھتے رہے پھر سنجیدگی سے بولے۔ ’’آپ واقعی ٹھیک کہتے ہیں، شیواجی کی صورت مجھے بھی نظر آئی لیکن ذرا غور سے دیکھیں ٹھیک ان کے سر کے قریب مجھے عالمگیر کا پھینکا ہوا جوتا بھی دکھائی دے رہا ہے کیا وہ آپ کو نظر نہیں آیا؟‘‘

لڑکی: ’’تمہیں دیکھ کر مجھے ایک عظیم فلسفی یاد آجاتا ہے۔‘‘
لڑکا: ’’سچ؟ کون یاد آتا ہے تمہیں؟‘‘
لڑکی: ’’ڈارون۔‘‘

پبلک لائبریری

ایک خاتون لائبریرین نے تہلکہ مچا رکھا تھا۔ ان کی شہرت سے مرعوب ہوکر ایک صاحب جنہوں نے رکنیت کا نیا نیا کارڈ بنوایا تھا، سیدھے کاؤنٹر پر پہنچے اور دریافت کیا۔ ’’کیا اس کارڈ پر میں کوئی کتاب لے سکتا ہوں؟‘‘

’’جی ہاں!‘‘ خاتون لائبریرین نے جواب دیا۔

’’محترمہ کیا میں رسالے اپنے نام جاری کرا سکتا ہوں؟‘‘

’’جی ہاں! آپ یقیناً ایسا کرسکتے ہیں۔‘‘

’’کیا میں آپ کو کھانے پر مدعو کرسکتا ہوں؟‘‘

خاتون نے ادھر اُدھر دیکھا اور کاؤنٹر پر جھک کر کہنے لگیں۔ ’’جناب لائبریرین کو یہیں بیٹھ کر دیکھنے کے لیے ہے۔‘‘

مرسلہ: محمد علی خان دیوان، کراچی

دیری ہوگئی تو اچھا نہیں ہوگا۔ میں سچ بول رہا ہوں۔ یہ
بچہ ساری عمر کے لیے ایک پچھتاوا بن جاوے گا تیرے
لیے...... میری بات مان لے۔'' کالو نے اسے سمجھایا مگر
اس کی بات پر نازو کا چہرہ ایک دم اتر گیا اور وہ گہری
اداسی میں ڈوب گئی۔ وہ تو اسے یہاں تک لاتے لاتے،
اس بچے کو اپنا بیٹا بنا کر پالنے اور اس کے مستقبل کے لیے
اَن گنت سنہری خوابوں کا جال بن بھی چکی تھی مگر اب شوہر
کے حکم کے آگے اسے کچھ ڈوبتا محسوس ہو رہا تھا پھر بھی اس
نے آخری کوشش کی۔

''دیکھ کالو...... ! تو خوامخواہ غصہ کر رہا ہے۔ سوچ
ذرا...... یہ بچہ بڑا ہو کر ہمارا سہارا بنے گا...... اور......''

''نہیں ناجو! اس سے آگے ایک لفظ بھی مت کہنا۔''
کالو حتمی لہجے میں اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''ناجو!
میری بات مان لے...... ورنہ...... میں بھول جاؤں گا کہ میرا
تجھ سے کوئی رشتہ بھی ہے۔'' کہتے ہوئے کالو نے اپنا منہ
دوسری طرف پھیر لیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے اپنی بیوی نازو
سے کتنی بڑی بات کہہ دی ہے۔ اس سے ضرور اسے تکلیف
پہنچی ہوگی مگر اس کے نزدیک یہ سب ضروری تھا، اس معصوم
بچے کے لیے اور خود نازو کے لیے بھی۔ پھر اسے پتا بھی نہیں
چلا کہ کب نازو گئی اور کب لوٹ آئی۔ چونکا تو اس وقت
جب اسے اپنے نزدیک پائنتی پر نازو کے وجود کا دباؤ
محسوس ہوا اور دبی دبی سسکیاں سنائی دیں۔ بچہ اب اس کی
گود میں نہیں تھا۔ اس نے اپنے خاوند کی بات مان لی تھی اور
اب اپنی خالی گود دیکھ دیکھ کر رو رہی تھی۔ شاید اپنی قسمت پر
یا اپنی آباد ہو کر ویران ہو جانے والی گود پر۔ کالو دیر تک
چپ چاپ اسی طرح پڑا اس کی سسکیاں سنتا رہا اور اس کی
آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کی لکیروں کو دیکھتا رہا جو
رخساروں تک آتی تھیں، وہاں سے پھسل کر گم ہو جاتی تھیں۔
آخر اس نے سکوت توڑا۔

''ناجو...... اے ناجو! ادھر آ۔ جرا پاس آ میرے۔''
اس کی تسلی ہو چکی تھی کہ نازو نے اس کے حکم سے سرتابی نہیں
کی تھی لہٰذا اس نے پیار سے پکارا تھا۔ نازو اس سے روٹھنے
کے باوجود آہستہ سے اٹھی اور پائنتی سے اٹھ کر اس کے
سرہانے آ بیٹھی۔ ظاہر تھا کہ وہ اب تک ناراض تھی۔

کالو نے اس کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے چہرے کو
ٹھوڑی پکڑ کر اٹھایا اور اپنی طرف موڑ کر چند لمحے پیار بھری
نظروں سے دیکھتا رہا پھر دھیمی آواز سے بولا۔

''دیکھ ناجو! مجھے معاف کر دینا۔ میں جانتا ہوں کہ
میں نے کتنی بڑی بات کہہ ڈالی۔ اچھا پہلے یہ بتا تو اس بچے کو
ریلوے بابو کے حوالے کر آئی ہے نا؟ میرا مطلب ہے، تجھے
کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی نا؟'' یہ سوال کالو کو ذرا انداز بدل
کر اس لیے کرنا پڑا کہ اسے خدشہ تھا کہ کہیں لوگ الٹا نازو پر
اغوا کا الزام ہی نہ تھوپ دیں۔ یہ دیکھ کر کالو اسے پھر مناتے
ہوئے آگے بولا۔

''ناجو! میں تجھ سے ایک بار پھر معافی مانگتا ہوں کہ
میں نے تیرا جی جلایا اور تیرا دل دکھایا مگر یقین کر، یہ سب
میں نے تجھے ایک بڑے آزار سے بچانے کے لیے کیا ہے۔
اچھا تیرے کو...... میری بات کا صحیح اندازہ تب ہوگا جب
میں تجھے ایک چھوٹی سی مگر بالکل سچی کہانی سناؤں گا جو
تیرے ہی جیسی ممتا کی ماری ایک عورت کی ہے۔ سن رہی ہے
نا تو......؟''

نازو اپنا سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ البتہ اب اس
نے سسکنا بند کر دیا تھا۔ کبھی کبھی ایک دو آنسو اس کی آنکھوں
سے امڈ ہی پڑتے۔ اسے رضامند دیکھ کر کالو کہانی سنانے لگا۔

''یہ آج سے کئی سال پہلے کی بات ہے۔ ہماری
طرح ایک غریب بستی میں ہم جیسے ہی دو میاں بیوی رہا
کرتے تھے جو بے اولاد تھے۔ شوہر بھیک مانگتا تھا اور
اس کی بیوی بھیک مانگنے کے ساتھ کچرا بھی چنتی تھی۔ ایک
دن راستے میں اسے ایک ننھا سا بچہ روتا ہوا ملا۔ وہ بہت
بھولا اور پیارا تھا۔ اسے اکیلا دیکھ کر وہ عورت اسے اپنی
جھگی میں اٹھا لائی کیونکہ وہ اسے ساری زندگی کے لیے اپنا
بیٹا بنا کر رکھنا چاہتی تھی۔ اس کے شوہر نے اپنی بیوی کو
بہت روکا کہ وہ بچے کو اپنے پاس نہ رکھے کیونکہ اسے
احساس تھا کہ بچہ کسی اونچے اور امیر کبیر گھرانے کا ہے۔
اس کا خیال تھا کہ ایسے اونچے گھرانے کے بچے کو جھگی میں
پالنا بڑا ظلم ہوگا مگر اس کی بیوی اڑ گئی۔ میاں کی بات نہ
مانی اور بعد میں پکڑے جانے کے ڈر سے وہ لوگ بستی،
بلکہ وہ شہر ہی چھوڑ کر دوسرے شہر کوچ کر گئے۔ وہاں ایسی
ہی کسی گندی بستی میں جھگی ڈال کر رہنے لگے۔

''اس عورت نے اس بچے کے اچھے والے کپڑے
اور جوتے اتار دیے اور اسے اپنی ہی طرح کے گندے
اور میلے کپڑے پہنا دیے۔ وہ بچہ ان کپڑوں میں کسی
طرح ان میاں بیوی کی اولاد نہیں لگتا تھا مگر وہ پتھر دل
عورت اسی کو اپنا بچہ سمجھ کر خوب چومتی چاٹتی۔ یوں وقت
تیزی سے گزر گیا۔ وقت گزرنے کا پتا کب چلتا ہے بھلا۔
وہ بچہ جوان ہو گیا۔ اتنے برس میں اس عورت کا خاوند بھی

بیمار ہو کر دنیا سے رخصت ہو گیا۔ بعد میں وہ عورت بھی بیمار ہو کر کھاٹ سے لگ گئی۔ وہ بچہ جو اب جوان ہو چکا تھا، دن بھر شہر میں مارا مارا پھرتا اور کچرا چنتا رہتا۔ یوں گھر کی گاڑی چلتی رہتی۔ اس بیچارے نوجوان کو بالکل خبر نہ تھی کہ وہ ایک بڑے امیر کبیر اور اونچے گھرانے کا بیٹا تھا، جسے مقدر اس گندی جھگی میں لے آیا تھا۔ ادھر عورت کے ساتھ ایک عجیب بات ہونے لگی۔ اس عورت کو اب یہ سوچ سوچ کر شرم آنے لگی کہ اس نے بچے پر کتنا بڑا ظلم ڈھا دیا ہے۔ وہ اسی سوچ میں اب اندر ہی اندر جلنے کڑھنے لگی کہ اس بیچارے کو میرے پیار و محبت نے کیا دیا، یہی کہ وہ ایک شہزادے سے کچرے والا بن گیا۔

آج وہ اپنے اصل ماں باپ کے پاس ہوتا تو ضرور ایک بڑا آدمی اور افسر بنتا۔ آخر ایک طوفانی رات کو جب عورت کی حالت زیادہ خراب ہونے لگی اور اسے اپنی موت سامنے نظر آنے لگی تو اس نے اس جوان کو پاس بلایا اور بلند آواز سے رونے لگی۔ ساتھ ہی اپنے ہاتھ جوڑ کر اس سے معافیاں بھی مانگنے لگی۔ نوجوان حیرت سے اپنی ماں کو دیکھ رہا تھا کہ آج اسے کیا ہو گیا ہے؟ وہ یہی سمجھا کہ شاید بخار کا اثر اس کے دماغ پر ہو گیا ہے جو ایسی باتیں کر رہی ہے۔ بہت دیر رونے کے بعد عورت نے آنسو صاف کیے۔ نوجوان نے اسے پانی پلایا اور تسلی دی۔ ذرا سکون ہوا تو عورت نے اس سے کہا کہ ذرا کھاٹ کے نیچے پڑے صندوق کو نکال۔ ٹین کا بکسا جگہ جگہ سے زنگ کھایا ہوا اور پچکا ہوا تھا۔ نوجوان نے بکسا نکال لیا تو ماں نے اسے کھولنے کو کہا۔ جب اس نے بکسا کھولا تو بہت ساری پرانی اور بیکار چیزوں کے ساتھ ایک پرانی سی پوٹلی بھی نکلی جو جانے کب سے بندھی ہوئی پڑی تھی۔ اب تو کپڑے کے رنگ کا پتا بھی نہیں چلتا تھا۔ اس میں جگہ جگہ سوراخ ہو چکے تھے۔ عورت نے کہا۔ ''یہ پوٹلی کھولو۔'' جوان نے پوٹلی کھولی تو اس میں سے کئی ننھے منے بچے کے کپڑے اور جوتے نکلے۔ اتنے برس گزر جانے کے بعد کپڑوں کی رنگت اور چمک ختم ہو گئی تھی اور جوتے بھی پرانے لگ رہے تھے مگر اب بھی ان کی وضع قطع سے لگتا تھا کہ یہ کبھی بہت اچھے کپڑے اور جوتے ہوں گے۔ پھر اس عورت نے نوجوان کو بتا دیا کہ وہ اس کا بچہ نہیں ہے۔ وہ تو کچرا چنتے ہوئے اسے اٹھا لائی تھی، جب وہ چھوٹا سا بچہ تھا اور یہ وہی کپڑے ہیں جو اس وقت اس بچے نے پہنے ہوئے تھے۔ یہ راز بتانے کے بعد وہ عورت مر گئی۔ سن رہی ہے نا جو؟''

کالو، نازو کو یہ عبرت انگیز کہانی سنا کر خاموش ہو گیا۔ جھگی کا ماحول کچھ دیر کے لیے ایک بوجھل سناٹے میں ڈوب گیا۔ یہ سناٹا دیر تک چھایا رہا پھر ایک دم باہر بادل گرجنے اور بجلی چمکنے کی شوریدہ سر آواز ابھری۔ طوفان باد و باراں ایک دم ہی امڈ چلا آیا۔ نازو تو اس عبرت انگیز اور سچی کہانی کی اثر پذیری میں کھو سی گئی پھر آہستہ آہستہ واپس اپنی حقیقت کی دنیا میں لوٹ آئی۔ وہ اپنے خاوند کالو کے مزید قریب ہو گئی پھر لرزیدہ لہجے میں بولی۔

''ہائے...... رے کالو......! کہانی تو نے واقعی بڑی درد بھری سنائی۔ مجھے معاف کر دے۔ میں تجھے غلط سمجھی تھی۔ میں اتنا بڑا ظلم کرنے لگی تھی۔ تو نے واقعی میرے اوپر احسان کیا ہے اور مجھے اتنے بڑے پچھتاوے اور گناہ سے بچا لیا۔''

نازو کی بات سن کر کالو کے چہرے پر ایک اداس سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ باہر شرائے دار بارش جاری تھی۔ کالو عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''نا جو! کہانی کا انجام تو ابھی باقی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' نازو نے حیران ہو کر پوچھا۔ کالو نے کونے کی طرف اشارہ کیا جہاں بہت ساری الٹی سیدھی چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔

''ذرا وہ نیلے کپڑے والی پوٹلی تو نکال کر لا۔'' کالو نے دھیمے لہجے میں کہا۔ نازو کچھ حیران ہوتی ہوئی پوٹلی اٹھا لائی۔

''اسے کھول کر تو دیکھ۔'' کالو نے آہستہ سے کہا۔ باہر ہنوز طوفان باد و باراں کا شور و شغب جاری رہا۔ نازو نے مزید حیران ہوتے ہوئے پوٹلی کھولی اور پھر معاً ہی جہاں کی تہاں رہ گئی۔

پوٹلی میں ایک ننھے بچے کے قیمتی کپڑے اور جوتے، امتداد زمانہ کے اثرات کے باوجود آج بھی اپنی اصل حیثیت کی جھلک دکھا رہے تھے۔

نازو نے اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے خاوند کالو کی طرف دیکھا جس کے گالوں پر اب آنسوؤں کی دھاریں بہتی جا رہی تھیں۔ نازو کو یوں محسوس ہوا جیسے ان دھاروں میں وہ خود بھی بہتی جا رہی ہے۔ دفعتاً باہر بجلی کا زوردار کڑاکا ہوا اور نازو ایک سسکاری مار کر روتے ہوئے کالو سے لپٹ گئی۔

⌘⌘⌘

آخری حصہ

وہی راستے وہی منزلیں

ناہید سلطانہ اختر

"یہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب اس کے کردار" بہت مشہور قول ہے جسے اکثر لوگ فیشن کے طور پر کہہ جاتے ہیں مگر... ہر بار ایسا نہیں ہوتا... اس کی حقیقت کبھی کبھی حالات اتنی وضاحت کے ساتھ پیش کردیتے ہیں کہ سمجھنے والے پر حیرت کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں... وہ جو حسن کی ملکہ تھی... جسے اپنے وجود کی اہمیت کا ادراک تھا... اس کے باوجود اس نے ایک اندھے کنوئیں میں چھلانگ لگادی کیونکہ اس نے کہیں سُن رکھا تھا کہ بڑا فاصلہ طے کرنے کے لیے انسان کو تھوڑی سی پسپائی اختیار کرنا پڑتی ہے مگر... پسپائی اختیار کرنے کے فریب میں جب انسان پستی میں گرتا ہے تو ایسے ہی انجام سے دوچار ہوتا ہے... "نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم" کے شکنجے میں قید ہوکر اس کے پاس پھر سوائے پچھتاوے کے کچھ نہیں بچتا... حیرت ہے خالی دامن رہ کر بھی اس کا خود پرستی زعم ختم نہ ہوا... اور جسے وہ وفا کی راہوں میں سسکتا چھوڑ گئی تھی، قدرت نے اس کے تمام آنسوؤں کا مداوا کرڈالا کیونکہ... قدرت کے ترازو میں ظالم اور مظلوم برابر نہیں ہوسکتے۔

پلٹ پلٹ کر گمشدہ راستوں اور منزلوں کی تلاش کرنے والی ایک [illegible] اور [illegible] حسینہ کی داستان

آخری حصہ

وہی راستے وہی منزلیں

ناہید سلطانہ اختر

"یہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب اس کے کردار" بہت مشہور قول ہے جسے اکثر لوگ فیشن کے طور پر کہہ جاتے ہیں مگر... ہر بار ایسا نہیں ہوتا... اس کی حقیقت کبھی کبھی حالات اتنی وضاحت کے ساتھ پیش کردیتے ہیں کہ سمجھنے والے پر حیرت کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں... وہ جو حسن کی ملکہ تھی... جسے اپنے وجود کی اہمیت کا ادراک تھا... اس کے باوجود اس نے ایک اندھے کنوئیں میں چھلانگ لگادی کیونکہ اس نے کہیں سُن رکھا تھا کہ بڑا فاصلہ طے کرنے کے لیے انسان کو تھوڑی سی پسپائی اختیار کرنا پڑتی ہے مگر... پسپائی اختیار کرنے کے فریب میں جب انسان پستی میں گرتا ہے تو ایسے ہی انجام سے دوچار ہوتا ہے... "نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم" کے شکنجے میں قید ہوکر اس کے پاس پھر سوائے پچھتاوے کے کچھ نہیں بچتا... حیرت ہے خالی دامن رہ کر بھی اس کا خود پر سے زعم ختم نہ ہوا... اور جسے وہ وفا کی راہوں میں سسکتا چھوڑ گئی تھی، قدرت نے اس کے تمام آنسوؤں کا مداوا کرڈالا کیونکہ... قدرت کے ترازو میں ظالم اور مظلوم برابر نہیں ہوسکتے۔

پلٹ جانے والے گمشدہ راستوں اور منزلوں کی تلاش کرنے والی ایک [illegible] اور [illegible] حسینہ کی داستان
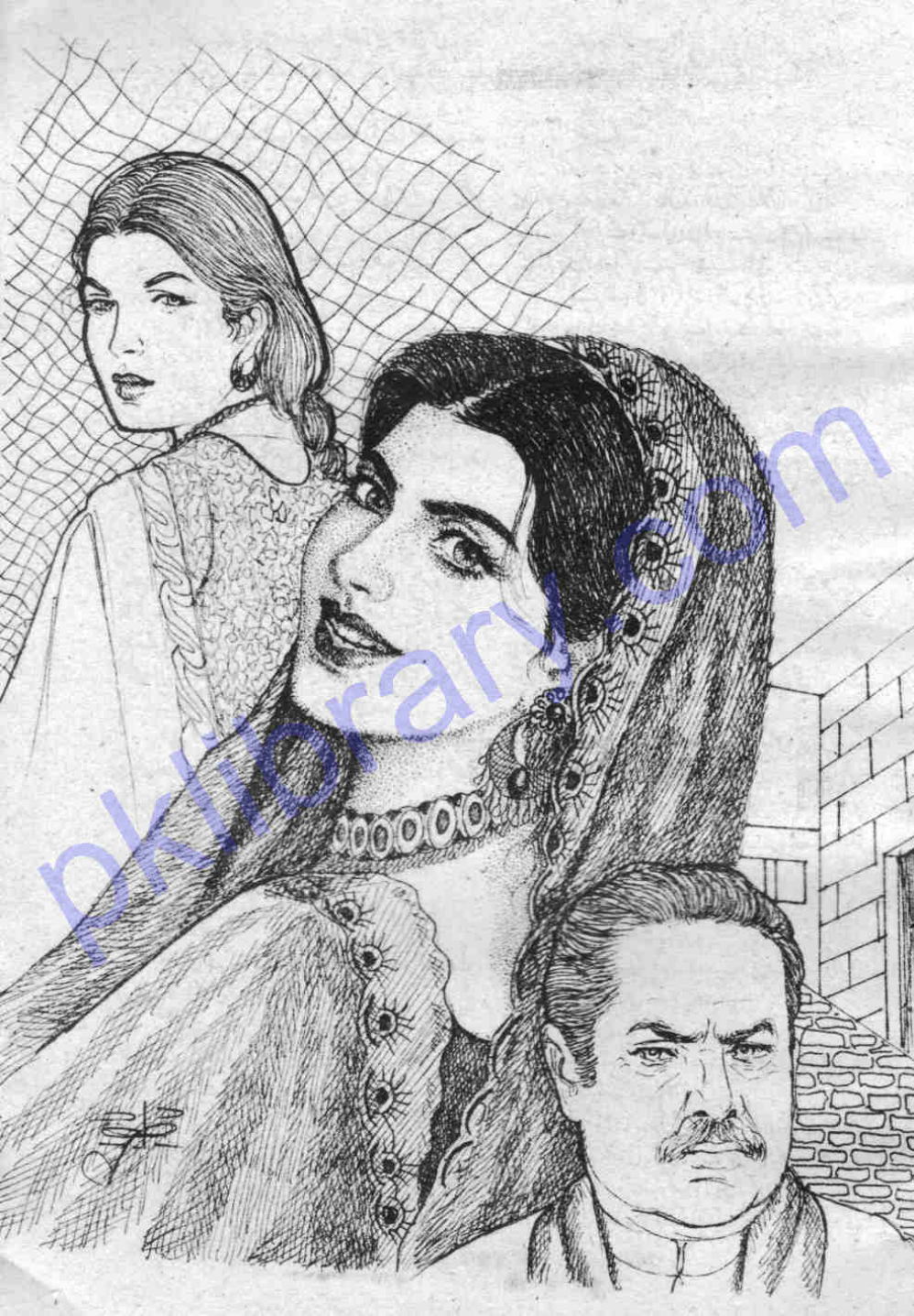
انیقہ کے لیے یہ صورت حال قطعاً غیر متوقع تھی۔ چند ثانیے تردد میں رہنے کے بعد بولی۔ ''میں اپنے فادر سے پوچھوں گی سر!''
''کہاں ہوتے ہیں آپ کے فادر؟ میرا مطلب ہے کیا کرتے ہیں؟'' سلمان بدر ہاشمی نے پوچھا۔
''جی...... وہ...... ایک میگزین کے ایڈیٹر ہیں...... فلم ڈائریکٹر بھی رہے ہیں۔''
''فلم ڈائریکٹر؟'' پروڈیوسر نے چونک کر کہا۔
''جی سر!''
''نام پوچھ سکتا ہوں ان کا؟''
''شاہ مراد!''
''اوہ...... وہ تو فلم انڈسٹری کا ایک کامیاب نام ہوا کرتے تھے۔ میں نے ان کی چند فلمیں دیکھی ہیں...... اس کا مطلب ہے آپ کو ایکٹنگ کی صلاحیت اپنے والد صاحب کی طرف سے ملی ہے۔''
''وہ ایکٹر نہیں، ڈائریکٹر تھے سر!''
ٹی وی پروڈیوسر تدبر سے مسکرایا۔ ''بی بی! ڈائریکٹر سے بڑا اداکار کوئی نہیں ہوتا...... ڈائریکٹر ہی تو ایکٹر کو ایکٹر بناتا ہے...... ایک فلم ڈائریکٹر میں لاتعداد ایکٹرز چھپے ہوتے ہیں۔ ڈائریکٹر ہی کام لیتا ہے ایکٹرز سے...... وہی انہیں اوپر لے جاتا ہے...... وہی پتھر کو ہیرا بناتا ہے...... آپ کے فادر تو اپنے دور کا ایک بڑا نام ہیں۔''
انیقہ کو یک گونہ مسرت اور فخر کا احساس ہوا۔ اپنی پرنسپل اور اساتذہ کے سامنے اس کا سر اونچا ہو گیا کہ وہ ایک بڑے نام والے باپ کی بیٹی تھی۔
''آپ پوچھ لیں اپنے فادر سے...... بلکہ ممکن ہو تو میری بات کرادیں ان سے...... میں آپ کو اپنا کارڈ دے دیتا ہوں۔''
''اوکے سر!''
سلمان بدر نے اپنی جیب سے والٹ اور والٹ سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر انیقہ کی طرف بڑھا دیا۔
''تھینک یو سر!'' انیقہ نے کارڈ لیتے ہوئے کہا۔
سلمان بدر کے ساتھ کھڑی اس کی ٹیچر اور اس کے ہمراہ آنے والی دوست اسے رشک سے دیکھ رہی تھیں۔
''آپ اپنے والد صاحب کا نمبر دے دیں تو میں خود رابطہ کرلوں گا ان سے۔'' سلمان بدر نے کہا۔
''سر! وہ خود بات کرلیں گے آپ سے۔''
''اوکے۔''
''میں جا سکتی ہوں؟''
''شیور...... آپ کا نام نہیں پوچھا میں نے؟''
''انیقہ...... انیقہ شاہ۔''
''تھینک یو۔''
کالج سے گھر واپسی پر انیقہ نے سلمٰی اور آئمہ کو اپنے کالج کو پہلا انعام ملنے کی خوشخبری سنائی تو دونوں بہت خوش ہوئیں۔
''پھپھو! مجھے ایک ٹی وی ڈرامے میں کام کرنے کے لیے آڈیشن کو بلایا گیا ہے۔'' انیقہ نے بتایا۔
''ہائے اللہ، سچ؟'' آئمہ اچھل پڑی۔ ''پھر تو تم بہت مشہور ہو جاؤ گی انیقہ! ہم تمہارے ڈرامے دیکھا کریں گے۔''
مگر سلمٰی نے قطعاً مختلف ردِعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''نہیں انیقہ! ڈراموں میں کام مت کرنا...... ساری دنیا دیکھتی ہے...... اچھی بری سو طرح کی نظریں ہوتی ہیں...... ماں تمہارے سر پر ہے نہیں...... بس باپ ہے بے چارہ...... لکھ پڑھ لو تو عزت سے اپنے گھر جاؤ...... لڑکی کا اصل مقام اس کا سسرال ہوتا ہے۔''
''پاپا کو بتانا تو ضروری ہے پھپھو!''
''ہاں، ہاں بتادو...... ضرور بتاؤ...... دیکھو وہ کیا کہتے ہیں۔''
انیقہ جانتی تھی وہ کیا کہیں گے۔ انہوں نے تو اپنی بیوی کے فلم میں اداکاری کی خواہش کی تکمیل نہیں ہونے دی تھی۔ بھلا اسے ٹی وی ڈرامے میں کام کرنے کی اجازت کب دیتے۔
مگر شام کو جب شاہ مراد کی گھر واپسی پر اس نے انہیں ٹیبلو مقابلے میں اپنے کالج کے نمبرون قرار پانے کی خبر سنانے کے بعد قدرے ہچکچاتے ہوئے انہیں بتایا کہ منصفین میں شامل ایک ٹی وی پروڈیوسر نے اسے اپنی نئی ڈراما سیریل کے لیے آڈیشن کو بلایا ہے تو وہ خوش ہو کر بولے۔
''یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔''
انیقہ کو حیرت ہوئی۔
''آپ مجھے...... اجازت دے دیں گے...... ٹی وی پر کام کرنے کی؟'' اس نے پوچھا۔
''کیا حرج ہے؟''
''لیکن...... آپ نے...... ماما کو تو فلم میں کام کرنے کی اجازت نہیں دی تھی پاپا؟''
''بیٹا...... زمانہ بدل گیا ہے...... فلم اور ٹی وی ابلاغ کے دو مختلف میڈیم ہیں۔ جس زمانے میں تمہاری ماں فلم میں کام کرنا چاہتی تھیں، شریف گھرانوں کی لڑکیوں کا فلم میں کام کرنا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ کوئی ایک آدھ فلمی اداکارہ تھی

جس کا بیک گراؤنڈ شریفانہ تھا...... زیادہ تر لڑکیاں غیر شریفانہ ماحول سے فلمی دنیا میں آتی تھیں۔ ٹی وی پڑھے لکھے اور مہذب لوگوں کا میڈیم ہے۔ اچھے گھرانوں کے لڑکے لڑکیاں آرہے ہیں اس میڈیم میں...... اگر تم آڈیشن دیتی ہو اور کامیاب ہوجاتی ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

انیقہ کے لیے شاہ مراد کا ردِعمل خلافِ توقع تھا۔

''پاپا! انہوں نے مجھ سے فادر کے بارے میں پوچھا اور جب میں نے انہیں آپ کے بارے میں بتایا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے یہ تو اپنے وقت کا بڑا نام ہیں۔ انہوں نے مجھ سے آپ کا کانٹیکٹ نمبر بھی مانگا کیونکہ جب انہوں نے مجھ سے آڈیشن کا کہا تو میں نے انہیں جواب دیا کہ میں اپنے فادر سے پوچھ کر بتاؤں گی...... وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں...... اپنا وزیٹنگ کارڈ دیا ہے انہوں نے مجھے۔''

''دے دینا...... بات کرلوں گا۔''

انیقہ حیران تھی کہ باپ نے اسے کتنی آسانی سے آڈیشن اور بشرط کامیابی ٹی وی ڈرامے میں کام کرنے کی اجازت بھی دے دی تھی۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ زمانہ بدل گیا تھا یا زمانے نے اس کے باپ کو بدل دیا تھا۔

☆☆☆

سلمان بدر ہاشمی سے فون پر بات کرنے اور انیقہ کے آڈیشن کے لیے وقت طے ہوجانے کے بعد شاہ مراد مقررہ دن انیقہ کو اپنے ہمراہ آڈیشن کے لیے لے گئے۔ انہوں نے اسے پُراعتماد رہنے اور اسرار و رموز سمجھادیے تھے۔ وہ پُرجوش تھی اور ان کے سمجھانے کے باوجود قدرے نروس بھی۔ آڈیشن ہوا اور انیقہ کو سیریل کے ایک ثانوی کردار کی پیشکش کردی گئی۔ انیقہ بہت خوش ہوئی۔ پروڈیوسر نے اس کردار کے بارے میں مختصراً بتایا کہ وہ ایک کھلنڈری سی نوجوان لڑکی کا کردار تھا جو ڈرامے کے سنجیدہ موضوع کو دھیما کرنے کے لیے سیریل کی ہیروئن کی چھوٹی بہن کے کردار میں گاہے گاہے شوخیاں کرتی رہتی ہے۔ شاہ مراد نے اس کردار کی قبولیت کے لیے انیقہ کو پروڈیوسر سے اسکرپٹ لے کر پڑھنے کا مشورہ دیا اور ایک ہی دن میں انیقہ سے پہلے اسکرپٹ خود پڑھ ڈالا۔

''بیٹا! میرا مشورہ یہ ہے کہ تم اس کیریکٹر کی ادائیگی سے معذرت کرلو۔'' انہوں نے انیقہ سے کہا۔

''کیوں پاپا؟'' انیقہ حیران ہوئی۔

''اس کیریکٹر میں پرفارمنس کی کوئی خاص گنجائش نہیں ہے۔ یہ بھرتی کا کردار ہے۔ ڈراما اس کے بغیر بھی نہایت خوبی سے جاری رہ سکتا ہے۔ شوبز میں پہلی انٹری میں کلک کرجانا بہت اہمیت رکھتا ہے۔''

''پاپا! آپ تو کہتے ہیں ہیرو بننے کے لیے زیرو سے اسٹارٹ لینا پڑتا ہے۔'' انیقہ کے جوش کو ٹھیس لگی تھی۔

''ہاں...... مگر زیرو کی وہ اہمیت ہونی چاہیے کہ اس کے بغیر باقی ہندسے اپنی جگہ کھڑے رہ جائیں۔''

''میں نہیں سمجھی آپ کی بات۔''

''ون، ٹو، تھری، فور، فائیو، سکس، سیون، ایٹ، نائن۔'' شاہ مراد ایک سانس میں گن گئے پھر بولے۔ ''اب اگر زیرو نہ ہو تو تین اور اس سے آگے اعداد کیسے بنیں...... زیرو پاورفل ہونا چاہیے...... سمجھ رہی ہو بات؟''

''جی پاپا!'' انیقہ نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے چہرے پر مایوسی تھی۔

شاہ مراد نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ ''بیٹا! میں نے برسوں نگار خانوں کی روشنیوں میں گزارے ہیں...... میں پرکھ رکھتا ہوں...... تم اگر بطور آرٹسٹ اپنا کیریئر بنانا چاہتی ہو تو پہلا قدم دیکھ بھال کر اٹھاؤ۔ تم سمجھ رہی ہو نا میری بات؟''

''جی پاپا!'' اس کے لہجے میں دل شکستگی تھی۔

انیقہ نے شاہ مراد کو دیکھا۔ ''ایک بات کہوں پاپا؟''

''کہو۔'' شاہ مراد نے اس کا سر تھپتھپایا۔

''آپ بُرا تو نہیں مانیں گے؟''

''تمہاری کسی بات کا بُرا نہیں مان سکتا میں۔''

''آپ...... مجھے ٹی وی پر کام کرنے سے روکنے کے لیے تو منع کرنے کو نہیں کہہ رہے؟''

''نہیں۔'' شاہ مراد نے بے ریائی سے کہا۔ ''مجھے منع کرنا ہوتا تو میں تمہیں آڈیشن کے لیے اپنے ساتھ کیوں لے جاتا۔'' انہوں نے لمحہ بھر کو توقف کیا پھر بولے۔ ''ایک بات یاد رکھنا بیٹے...... تم نے میرا ساتھ دیا ہے۔ تم نہ ہوتیں میرے ساتھ تو شاید زندگی گزارنا میرے لیے بہت مشکل ہوتا۔ میں جب تک زندہ ہوں، تمہاری زندگی کے ہر مقابلے میں اسی طرح تمہارا ہاتھ پکڑے رہوں گا جیسے اس شام جب تمہاری ماں میری زندگی سے جارہی تھیں تو تم نے میرا ہاتھ تھاما تھا۔ تم، تمہاری ماں، تمہارے بہن بھائی اور میں، ہم سب اکٹھے ہوتے تو میں شوبز میں تمہارے جانے کے خلاف دیوار بن کر تمہارے سامنے کھڑا ہوجاتا مگر اب نہیں...... اب میں تمہارے ساتھ ہوں بیٹا!''

"پاپا! اگر آپ کو پسند نہیں تو......"

"نہیں نہیں...... ایسی بات نہیں...... تمہاری ہر خواہش مجھے عزیز ہے۔"

"میں انکار کروں گی تو ہاشمی صاحب مائنڈ بھی تو کریں گے۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو...... میں خود بات کروں گا...... مجھے امید ہے وہ بُرا نہ منائیں گے...... آدمی اگر مگر سے پہلوتہی کرنے کے بجائے صاف بات کرے تو نقصان میں نہیں رہتا۔"

"جی پاپا!" اس نے دھیرے سے کہا۔

"مایوس مت ہو...... تمہیں تو آفر ہوئی...... انکار ادھر سے نہیں ہوا بلکہ معذرت تمہاری طرف سے ہو رہی ہے...... یو مسٹ فیل اسٹرونگر دین ایور۔" شاہ مراد بولے۔

شاہ مراد نے محبت سے اس کا سر پھر تھپتھپایا۔ انیقہ کے دل سے رنج جاتا رہا۔

☆☆☆

سلمان بدر ہاشمی نفیس آدمی تھے۔ شاہ مراد کے نکتۂ نظر سے انہوں نے خوشدلی سے نہ صرف اتفاق کیا بلکہ انیقہ کی حوصلہ افزائی کو بولے۔ "انیقہ بی بی! آپ کے والد صاحب تو فلم انڈسٹری کا بڑا نام رہے ہیں...... مجھے ان کی بات سے سو فیصد اتفاق ہے۔ ان شاء اللہ میں آپ کے لیے کسی پاورفل رول کی تلاش میں رہوں گا۔ جیسے ہی علم میں آتا ہے، رابطہ کروں گا۔"

حسن اتفاق ہاشمی کے ایک ساتھی پروڈیوسر کو عید ٹرانسمیشن کے ایک خصوصی ڈرامے کے مرکزی نسوانی کردار کے لیے منتخب کی جانے والی ایک مشہور فنکارہ کے ڈرامے کی ریکارڈنگ سے محض دو دن قبل روڈ ایکسیڈنٹ میں شدید زخمی ہو جانے کے باعث متبادل ہیروئن کی ضرورت پڑ گئی۔ ڈرامے کے اس کردار کی بنیادی ضرورت ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی تھی۔ ڈرامے کے پروڈیوسر کبیر تقی نے متبادل کی تلاش میں ٹیلی ویژن کی کئی خواتین فنکاروں سے رابطہ کیا مگر سب مصروف تھیں۔ سلمان ہاشمی نے کبیر سے کہا۔ "کردار کی ریکوائرمنٹ کے مطابق ایک لڑکی ہے تو میری نظر میں...... میں اس کا آڈیشن بھی کر چکا ہوں...... خوبصورت ہے...... اہلِ زبان ہے...... شین قاف بھی درست ہے...... مگر فیلڈ میں اس کا سابقہ تجربہ صفر ہے...... ایک پرانے فلمی ہدایت کار کی بیٹی ہے...... تم کہو تو میں اسے بلا دوں۔"

"فوراً سلمان بھائی...... ! ریکارڈنگ کی ساری تیاری ہے۔ بس لیڈنگ فی میل کی ضرورت ہے...... آپ فوراً بلوائیے اسے۔"

سلمان ہاشمی نے شاہ مراد سے رابطہ کیا۔ انہوں نے دفتر سے چھٹی لی۔ انیقہ کو کالج سے چھٹی دلوا کر اپنے ساتھ لیا اور گھر پہنچے۔ انیقہ نے جلدی جلدی چینج کیا اور شاہ مراد رکشا میں اسے اپنے ساتھ لے کر سلمان ہاشمی کے پاس پہنچے۔ انہوں نے کبیر تقی سے ملوایا۔ کبیر تقی نے انیقہ کو دیکھا...... بات چیت کی...... فوری آڈیشن لیا...... انیقہ کو اسکرپٹ دیا...... شاہ مراد نے وہیں بیٹھے بیٹھے اسکرپٹ پڑھا۔ عید کی مناسبت سے لائٹ موڈ ڈراما تھا جس کی کہانی بیشتر وقت ڈرامے کے دو مرکزی کرداروں کے گرد گھومتی تھی جن میں سے ایک کے لیے انیقہ کو بلایا گیا تھا۔ اسکرپٹ پڑھ کر شاہ مراد نے اس کردار کی ادائیگی کے لیے انیقہ کو گرین سگنل دے دیا۔ کبیر تقی نے کنٹریکٹ سائن کرا لیا۔ انیقہ کا دل خوشی سے نہال تھا۔ ٹی وی پر کام کرنے سے زیادہ اس کام کی اجرت ملنے کے خیال سے۔ رکشا میں سوار ہو کر شاہ مراد کے ساتھ گھر جاتے ہوئے اس نے ان سے پوچھا۔ "پاپا! آپ کے اندازے میں کتنے پیسے ملیں گے مجھے؟"

"بیٹا! کبیر صاحب نے بتایا تو تھا کہ ان کا چینل نئے فنکاروں کو فی منٹ ریٹ کے حساب سے ادائیگی کرتا ہے۔"

"آپ کے خیال میں میرے کتنے منٹ بن جائیں گے اور کتنے پیسے؟"

شاہ مراد نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا اور موہوم سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ "تم پیسوں کے لیے اتنی فکر مند کیوں ہو؟"

وہ پہلے کچھ جھینپ گئی پھر بولی۔ "پاپا! پیسے ملیں گے تو آپ کو میری فیس کی فکر نہیں کرنا پڑے گی۔"

شاہ مراد نے اس کا سر تھپتھپایا۔ "تم کیوں کرتی ہو فیس کی فکر...... وہ میری ذمے داری ہے بیٹا!"

☆☆☆

شاہ مراد نے انیقہ کو اسکرپٹ کے مختلف مناظر کی نسبت سے مکالمات کی ادائیگی، لہجہ، آواز کا اتار چڑھاؤ، چہرے کے تاثرات اور حرکات و سکنات نیز مکالمات یاد کرنے میں پوری مدد دی۔ ہدایت کار رہے تھے۔ کتنے ہی اداکار تھے جنہیں ان کی ہدایات و راہنمائی نے مس خام سے کندن اور پتھر سے ہیرا بنایا تھا۔ انیقہ کو تو ہمہ وقت ان کی راہنمائی حاصل تھی۔

ریکارڈنگ کے دوران اس نے ایسی آزمودہ کاری دکھائی کہ پروڈیوسر سمیت ڈرامے کی ساری ٹیم اس کی فنکارانہ صلاحیت پر حیران رہ گئے۔ پہلی پرفارمنس اور ایسی عمدگی۔

عید کی شب ڈراما آن ائر گیا تو انیقہ کی واہ واہ ہوگئی۔ فیلڈ کے لوگوں کو تجسس ہوا کہ یہ نئی اور غیر معمولی خوبصورت لڑکی کون تھی۔

☆☆☆

چڑھتے سورج کی پوجا شوبز کی روایت ہے۔ شاہ مراد جیسے ہنرمندوں کو ذرا گہن لگنے لگے تو ان سے نظر بس پھیر لی جاتی ہیں۔ نو واردوں کی ضو سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔

انیقہ کا پہلا ڈراما آن ائر جاتے ہی اسے نئی پیشکشیں ہونے لگیں۔ کالج میں اس کی تعلیم کا سلسلہ جاری تھا۔ پہلے ایک ذہین طالبہ اور کالج کی ہم نصابی سرگرمیوں میں پیش پیش رہنے کے باعث معروف تھی۔ ٹی وی ڈرامے کی ہیروئن کیا بنی، کالج میں اس کی دھوم مچ گئی۔ ہم جماعت لڑکیاں اس کی ہم جماعت ہونے پر فخر کرتیں۔ جو ہم جماعت نہیں تھیں، اسے رشک سے دیکھتیں اور دوستی کرنا چاہتیں۔ اساتذہ جو پہلے بھی اس کی ذہانت و لیاقت کی معترف تھیں، اب اسے چاہت سے دیکھتیں۔ وہ جدھر سے گزرتی، اس کے تعاقب میں دبی دبی آوازیں آتیں۔ اپنے ہی نہیں، دوسرے کالجوں تک اس کی شہرت پہنچ گئی تھی۔ دوسرے کالج کی دو لیکچررز ایک روز کسی کام سے اس کی وائس پرنسپل سے ملنے آئیں تو انہوں نے اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ وائس پرنسپل کا نائب قاصد اسے بلانے کو آپہنچا۔ وہ ڈری کہ نہ جانے کیوں طلبی ہوئی تھی۔ وائس پرنسپل کے دفتر میں پہنچی تو دو خواتین اسے نہایت تجسس سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ اس سے مل کر بہت خوش تھیں۔

وہ جانے کو اٹھی تو دونوں خواتین نے اس سے ہاتھ ملانے کو اپنا ہاتھ بڑھایا۔

اوہ خدایا! ایک لائق طالبہ کی حیثیت سے اسے اتنی عزت کب ملی تھی۔

وہ خوش ہو ہو کر شاہ مراد کو ایک ہی ڈرامے سے اپنی شہرت کا احوال بتاتی۔ وہ سنتے اور دھیرے سے مسکرا دیتے۔ کبھی ان کی اپنی شہرت کا سورج بھی تو نصف النہار پر تھا...... البتہ تب ہر گھر میں ٹیلی ویژن کی منی اسکرین نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی وہ سوشل میڈیا کا دور تھا۔

☆☆☆

انیقہ کے امتحانات سر پر تھے جب اسے ایک ڈراما سیریل میں مرکزی کردار کی پیشکش ہوئی۔ پروڈیوسر کے مطابق نہایت جاندار اسکرپٹ اور ہیروئن کا کردار بے حد پاورفل تھا۔ شاہ مراد نے اسکرپٹ پڑھنے سے پہلے ہی کہا۔

''بیٹا! تمہارا امتحان سر پر ہے۔''

''پاپا! آپ اسکرپٹ دیکھ لیجیے...... اگر آپ کو اسکرپٹ اچھا لگتا ہے تو میں مینیج کرلوں گی۔''

''کیسے...... تم امتحان کی تیاری کرو گی یا......؟''

''کرلوں گی پاپا......! آپ خود ہی تو کہتے ہیں...... اپرچونٹی نیور ناکس ٹوائس!'' انیقہ نے کہا۔

''ہاں...... میں یہ کہتا ہوں...... مگر بیٹا! تمہارا امتحان بھی تو کسی اپرچونٹی سے کم نہیں...... تعلیم بہت بڑی دولت ہے۔''

''آئی پرومس پاپا......! میں امتحان بھی اچھا دوں گی۔''

''میں جانتا ہوں...... تم جو بھی کرو گی، اچھا کرو گی۔''

''آپ اسکرپٹ دیکھ لیں۔''

''ٹھیک ہے۔''

اسکرپٹ مجموعاً اور مرکزی نسوانی کردار شاہ مراد کے دل کو لگا۔ تاہم انہوں نے انیقہ سے پھر کہا۔ ''دیکھ لو بیٹا! تم بیک وقت دو کام کر بھی سکو گی؟''

''کرلوں گی پاپا!''

انیقہ نے سیریل میں کام کرنے کی ہامی بھرلی۔

امتحانات سے قبل کالج ابھی تقریباً ایک ماہ اور کھلا تھا۔ کالج میں حاضری، گھر میں امتحانات کی تیاری، ریکارڈنگ شروع ہونے سے قبل پروڈیوسر اور دیگر کاسٹ کے ساتھ اہم نشستیں...... شاہ مراد اس کے ساتھ ہوتے۔

ریکارڈنگ شروع ہوئی تو مصروفیت اور بڑھ گئی۔ پرچے بھی شروع ہوگئے۔ وہ بری طرح تھک جاتی۔ نہ نیند پوری ہوتی نہ آرام ملتا۔ کھانا پینا بھی بھاگتے دوڑتے میں ہوتا۔ آئمہ کو اس سے ساتھ بیٹھ کر باتیں نہ کرنے کا گلہ ہوتا۔ سلمٰی کہتی۔ ''انیقہ تو عید کا چاند ہوگئی ہے۔''

انیقہ جھینپ کر معذرت کرتی۔ ''سوری پھپھو......! پڑھنا بھی ہوتا ہے، ریکارڈنگ کے لیے بھی جانا پڑتا ہے۔''

''ضرورت کیا تھی تمہیں ٹی وی پر کام کرکے دنیا کو اپنا چہرہ دکھانے کی...... بچیاں ایرے غیروں کی اچھی بری نظروں سے بچی رہیں تو اچھا ہوتا ہے۔ حیرت ہے، مراد بھائی نے تمہیں اجازت کیسے دے دی۔''

''بڑی مشکل سے اجازت دی پھپھو!'' وہ باپ کے وقار کو ٹھیس نہ پہنچنے دیتی۔

ریکارڈنگ سے اکثر رات گئے ہی واپسی ہوتی۔ شاہ مراد سائے کی طرح اس کے ساتھ ہوتے۔ صد شکر کہ پک اینڈ ڈراپ کی سہولت میسر تھی۔ بیرونی دروازے کی ایک چابی سلمٰی نے انہیں دے دی تھی۔ سلمٰی اور اس کے شوہر اور

بیٹی کی نیند میں خلل ڈالے بنا باپ بیٹی اوپر اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ انیقہ کا وجود تھکن سے چُور اور آنکھیں نیند سے بوجھل ہوتیں مگر اسے پڑھنا بھی ہوتا۔ شاہ مراد کڑک چائے بنا کر دیتے۔ خود ان کا اپنا بھی تھکن سے برا حال ہوتا مگر وہ اس کا اظہار کرنے سے گریز کرتے۔

''آپ سو جائیں پاپا! مجھے تو ابھی پڑھنا ہے۔''

''مجھے بھی پڑھنا ہے۔'' شاہ مراد ایک ہاتھ میں چائے کا مگ اور دوسرے میں کوئی رسالہ یا کتاب اور کچھ نہیں تو کوئی پرانا اخبار لیے آبیٹھتے اور جب تک وہ پڑھتی رہتی، اس کے نزدیک بیٹھے رہتے۔ گاہے گاہے ڈرامے کے بارے میں بھی بات چیت ہوتی۔ شاہ مراد اسے اپنے تجربے کی بنیاد پر مشورے دیتے...... زیرو سے ہیرو بننے والے فلمی ستاروں کی مثالوں سے اسے سمجھاتے کہ عروج پر جانے کے لیے آدمی کو اپنا خونِ جگر دینا پڑتا ہے۔ شاہ مراد کی جانب سے ملنے والی راہنمائی انیقہ کے لیے مینارۂ نور تھی۔

☆☆☆

امتحانات ختم ہوئے تو گویا دو محاذوں میں سے ایک پر جنگ بندی کا اعلان ہو گیا۔ ریکارڈنگ ابھی جاری تھی۔ ''لیڈنگ لیڈی'' کی تصویریں پرنٹ میڈیا میں جگہ پانے لگی تھیں۔ انیقہ کی پرفارمنس رپورٹ عمدہ تھی۔ سیریل آن ائر گئی تو ابتدائی چند اقساط ہی میں نئی ہیروئن کی متاثر کن پرفارمنس نے ناظرین کے دل موہ لیے۔ شوبز ناقدین کی پیش گوئی تھی کہ یہ لڑکی اپنی دلکشی اور اعلیٰ پرفارمنس کی وجہ سے بہت آگے جائے گی۔ گھر گھر اس لڑکی کے چرچے ہونے لگے اور مختلف ٹی وی چینلز اور پروڈکشن ہاؤسز کی طرف سے اسے نئی آفرز ملنے لگیں۔

ڈراما سیریل کا اختتام ہونے تک انیقہ کی شہرت سمندر پار تک جا پہنچی تھی۔ اس نے دو نئی ڈراما سیریلز میں مرکزی کردار ادا کرنے کا معاہدہ کر لیا تھا۔ پروردگار جب کسی کو نوازنا چاہتا ہے تو اس کے لیے یونہی راستے بنا دیتا ہے۔ کل کی گمنام اور اپنے والدین کی علیحدگی سے دل میں مغموم رہنے والی انیقہ کے روز و شب اتنے مصروف ہو گئے تھے کہ اسے اپنی نیند پوری کر لینے کی فرصت بھی نہ ملتی۔

نئی سیریلز کا معاہدہ ہونے پر شاہ مراد اور انیقہ نے سلمٰی کا گھر چھوڑ کر ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ سلمٰی اور آئمہ ان کے جانے پر بہت اداس ہوئیں۔ شاہ مراد نے سلمٰی اور اس کے شوہر ضمیر سے اپنی ممنونیت کا اظہار ہاتھ جوڑ کر کیا۔ ''تم لوگوں نے میرے اور میری بچی کے بُرے وقت میں جس اپنائیت اور خلوص سے ہمارا ساتھ دیا، ہم ساری زندگی اس احسان کا بدلہ اتارنے سے قاصر رہیں گے۔''

''شرمندہ نہ کریں مراد بھائی!'' ضمیر نے کہا۔

''شرمندہ تو میں ہوں کہ اتنا عرصہ تم لوگوں کی پرائیویسی میں مخل رہا۔''

''ایسی کوئی بات نہیں...... آپ کا اپنا گھر ہے۔''

''بھائی! میں تو کہتی ہوں آپ دونوں اب بھی کہیں نہ جائیں۔ مجھے اور آئمہ کو تو انیقہ کی ایسی عادت ہو گئی ہے کہ جب یہ گھر میں نہ ہو تو گھر سونا لگنے لگتا ہے۔'' سلمٰی بولی۔

''تمہاری اور آئمہ کی انیقہ کے لیے محبت ہے سلمٰی بہن!''

''مت جائیں انکل!'' آئمہ روہانسی ہو رہی تھی۔

''بیٹا! تمہاری بہن شوبز پرسن بن چکی ہے۔ اب اس کی زندگی پہلے کی طرح ایک چھوٹے سے دائرے میں محدود نہیں رہی۔ فیلڈ کے لوگ اس سے ملنے کے لیے گھر بھی آنا چاہتے ہیں...... پتا پوچھتے ہیں۔ شہرت کی قیمت یہی ہے کہ مشہور ہونے والا پبلک پراپرٹی بن جاتا ہے۔ تمہارے گھر سے جانے کو نہ میرا دل چاہتا ہے، نہ انیقہ کا مگر جانا اس لیے پڑ رہا ہے کہ تم لوگوں کی پرائیویسی متاثر نہ ہو۔''

''انیقہ! کبھی کبھی آیا تو کرو گی نا؟'' آئمہ کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

''کبھی کبھی کیوں...... بہت زیادہ۔''

آئمہ فرطِ محبت سے انیقہ کے گلے لگ گئی۔

''انیقہ بیٹے! مجھے تمہارا ٹی وی پر کام کرنا اچھا تو نہیں لگا تھا مگر اب جو تمہاری مشہوری دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں تمہارے لیے اللہ پاک نے یہی لکھا ہوگا۔''

''ایک بار پھر آپ سب کا بے حد شکریہ...... ہم رشتے دار تو تھے ہی، اب یہ گھرانا میرا اور میری بیٹی کا محسن بن گیا ہے۔''

''پاپا بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''تم اپنے پاپا کی فرمانبردار بیٹی ہو...... ان کی کسی بات سے انکار کرو گی بھلا۔'' ضمیر نے کہا۔

''ضمیر بھائی! یہ میری بیٹی ہی نہیں، میرا سب کچھ ہے۔'' شاہ مراد نے نہایت شفقت سے انیقہ کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''بے شک۔'' سلمٰی نے تائید کی۔

''اس نے اس وقت میرا ہاتھ تھاما جب سب نے مجھ سے ہاتھ چھڑا لیا تھا۔'' شاہ مراد نہایت جذباتی دکھائی دیے۔

''بھائی! اسی لیے تو اللہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا ہے۔ کل کی بات ہے، میری پڑوسن بتا رہی تھیں ان کی چھوٹی بہن

لندن میں رہتی ہے۔ انیقہ کا ڈراما وہاں بھی سب نے دیکھا اور بہت پسند کیا۔ انیقہ کی مشہوری تو لندن، امریکا تک ہو گئی ہے۔''

''اللہ کی مہربانی ہے سلمٰی بہن!''

''انیقہ! بیٹا ایک نصیحت کرتا ہوں میں تمہیں...... شہرت اچھے اچھوں کا دماغ خراب کر دیتی ہے...... تکبر کبھی نہ کرنا۔'' ضمیر نے کہا۔

''ان شاء اللہ کبھی نہیں انکل...... تھینک یو۔'' انیقہ انکساری سے بولی۔

☆☆☆

انیقہ کی دو اور سیریلز یکے بعد دیگرے آن ائر ہو گئیں۔ ان سیریلز نے اس کی شہرت کا گراف اور بلند کر دیا۔ مزید کانٹریکٹس...... معاوضہ طلب کے مطابق...... شاہ مراد اس کے مشیر بھی تھے، اتالیق بھی...... ان کی ہدایات سے اس کی پرفارمنس کو چار چاند لگے جا رہے تھے۔ ان کی راہنمائی سے وہ شوبز کی دنیا کے زیر و بم سے آگاہ ہو رہی تھی۔ یہ دنیا چڑھتے سورج کو سلام کرتی ہے۔ شاہ مراد کی اسے قدم قدم پر ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ اس نے ان سے میگزین کی ملازمت ترک کرا دی تھی۔ اپنی نئی قیام گاہ پر وہ اپنے ساتھی فنکاروں، پروڈیوسرز اور دوستوں کو بلا تکلف مدعو کر سکتی تھی۔ گھر کے کام کاج اور آنے والے مہمانوں کو چائے یا مشروب پیش کرنے کے لیے ایک نو عمر لڑکا بھی ملازم رکھ لیا گیا تھا جو صبح آتا اور رات کو اپنے گھر چلا جاتا۔

انیقہ خوش تھی۔ انٹر کے نتیجے کے بعد اسے مزید تعلیم جاری رکھنا مشکل ہوا تو شاہ مراد نے اسے پرائیویٹ طور پر پڑھنے کی صلاح دی۔ ''بیٹا! کم از کم گریجویٹ تو ہونا چاہیے تمہیں۔''

''پاپا! میں تو ماسٹرز، ایم فل، پی ایچ ڈی بھی کرنا چاہتی تھی۔'' وہ خوشدلی سے بولی۔

''تھی کے کیا معنی؟''

''سوری پاپا...... ! میرا مطلب تھا...... ہوں۔''

''تعلیم ہر عمر، ہر حال میں جاری رکھی جا سکتی ہے بیٹا!''

''بشرطیکہ آپ فیس دے سکتے ہوں۔''

''مجھے افسوس ہے بیٹا بلکہ شرم محسوس کرتا ہوں کہ تمہاری فیس دینے میں مجھے اکثر دیر ہو جایا کرتی تھی۔'' شاہ مراد سر جھکا کر شرمندگی سے بولے۔

''اوہ نو پاپا!'' انیقہ کو خفت محسوس ہوئی۔ ''میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ آپ نے تو وہ کیا ہے جو آئیڈیل باپ کرتے ہیں۔ ماما تینوں بچوں کو لے کر چلی گئیں۔ آپ چاہتے تو پلٹ کر بھی نہ دیکھتے ان کی طرف...... مگر آپ انہیں جتنا آپ سے ممکن ہو سکتا تھا، خرچہ دیتے رہے...... ان کا خیال رکھا...... آپ نے تو بعد میں بھی انہیں خرچ بھجوایا تھا مگر انہوں نے خود ہی واپس کر دیا۔ امیر آدمی سے جو شادی کر لی تھی ماما نے۔'' آخری جملہ اس نے تلخی سے ادا کیا۔

شاہ مراد نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''یو آر گریٹ پاپا!''

شاہ مراد نے اس کا سر محبت سے تھپتھپایا۔

☆☆☆

انیقہ پر قسمت مہربان تھی کہ جس عمر میں اس کی ہم سن لڑکیاں مستقبل کے تانے بانے جوڑ رہی ہوتی ہیں، وہ شوبز کا تابندہ ستارہ بن چکی تھی۔ اس کی خوبصورتی اور شاہ مراد سے ملنے والی تربیت و راہنمائی کے نتیجے میں عمدہ پرفارمنس نے اسے پروڈیوسرز اور ڈائریکٹرز کے لیے ہاٹ کیک بنا دیا تھا۔ پروڈکشن ہاؤسز اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے۔ اس کی چار ڈراما سیریلز آن ائر ہو گئی تھیں اور چاروں میں اس کی پرفارمنس کو ناظرین سے داد ملی تھی۔

ان دنوں بھی وہ تین سیریلز کی ریکارڈنگ کروا رہی تھی۔ تینوں کردار ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ ہر کردار سے انصاف کے لیے اسے اس کردار کو خود پر طاری کرنا پڑتا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ خود کو بھول جاتی۔ اسے یوں لگتا جیسے وہ اصل میں بھی وہی تھی جس کردار میں اس نے خود کو سمو رکھا تھا۔ خود کو بھلا کر کسی اور کردار میں ڈھل جانا تھا تو مشکل مگر یہی تو فنکاری ہے۔

اس شام ریکارڈنگ کے بعد وہ اور شاہ مراد گھر واپس لوٹے۔ کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ کال بیل بجنے سے گھر کے دروازے پر کسی کے آنے کی اطلاع ملی۔ انیقہ نے جو لاؤنج میں صوفے پر نیم دراز آنکھیں بند کیے سستا رہی تھی، ملازم لڑکے کو پکارا۔ ''عبدل! دیکھو کون ہے۔''

''میں دیکھتا ہوں۔'' شاہ مراد بولے۔

عبدل نے شاہ مراد سے پہلے ہی لپک کر دروازہ کھول دیا۔

''ہم اندر آ سکتے ہیں؟'' دروازے پر شاہ تاج اور امینہ کھڑے تھے۔ شاہ مراد ٹھٹک گئے اور صوفے پر نیم دراز انیقہ سیدھی ہو بیٹھی۔

''آ جائیں؟'' شاہ تاج پوچھ رہا تھا۔

''آؤ۔'' شاہ مراد بولے۔

دونوں اندر آ گئے اور انیقہ کو پُراشتیاق نظروں سے دیکھنے لگے۔

"بیٹھو۔" شاہ مراد نے ان سے کہا۔

امینہ نے اپنے ہاتھ میں پکڑا شاپر جس پر شہر کے ایک معروف بیکرز کا مونوگرام چھپا تھا، میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ ماما نے بھجوایا ہے۔"

"پاپا! ان سے پوچھیں آج انہیں ہمارے گھر کا راستہ کیسے یاد آ گیا۔" انیقہ نے اکھڑ لہجے میں کہا۔

"شکر کرو بیٹا کہ یاد آ گیا۔" شاہ مراد باپ تھے۔ وہ دونوں بچوں کو دیکھ کر خوش تھے۔ "کیسی ہو بیٹا؟" انہوں نے امینہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"میں ٹھیک ہوں۔"

انیقہ نے دزدیدہ نظروں سے امینہ کو دیکھا۔ کتنی بڑی ہو گئی تھی وہ۔

"ڈیڈی کے فرینڈ اور ان کی فیملی آئی ہے لاہور سے...... وہ لوگ انیقہ باجی سے ملنا چاہتے ہیں...... ماما نے انہیں بلایا ہے۔" شاہ تاج نے کچھ ہچکچاتے ہوئے بتایا۔

شاہ مراد نے انیقہ سے کہا۔ "کیا کہتی ہو بیٹا؟"

"ڈیڈی کون؟" انیقہ نے تجاہل عارفانہ سے کہا۔

"ماما کے ہسبینڈ!" شاہ تاج دھیرے سے اور کچھ شرمندگی سے بولا۔

"وہ تمہارا ڈیڈی ہوگا...... میرا اس شخص سے کیا تعلق؟" انیقہ نے غصے سے کہا۔

"چلی جاؤ بیٹا!" شاہ مراد نرمی سے بولے۔

انیقہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "یہ آپ کہہ رہے ہیں پاپا......! کیا آپ کو یاد نہیں کہ ان سب نے آپ کے ساتھ اور میرے ساتھ بھی کیا کیا...... کبھی پلٹ کر نہیں پوچھا ہمیں...... میں کیوں چلی جاؤں...... شوپیس نہیں ہوں میں۔"

"چلی جاؤ بیٹا...... میری خاطر۔"

"آپ کی خاطر ہی تو نہیں پاپا!" اس نے توقف کیا اور میز پر رکھے شاپر کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے بولی۔ "یہ لے جاؤ...... اور اپنی ماما سے کہہ دینا...... ہم ان کے بغیر بھی زندہ ہیں اور خوش ہیں۔"

"بیٹا! ان دونوں کا کیا قصور؟"

"سوری پاپا! آپ انہیں بے قصور نہیں ٹھہرا سکتے...... امینہ تو خیر چھوٹی تھی اس وقت...... شاہ تاج کو تو آپ کا ساتھ دینا چاہیے تھا اور...... انیتا کو بھی...... مگر انہوں نے آپ کا ساتھ نہیں دیا۔ مجھے یاد ہے جب میں آپ کے ساتھ ایک دو مرتبہ عالمہ خالہ کے گھر گئی تو ان تینوں میں سے کسی نے بھی مجھ سے بات تک نہیں کی تھی۔"

شاہ تاج نے شرمندگی سے اپنا سر جھکا لیا۔

"بیٹا! تمہارے چھوٹے بہن بھائی ہیں...... جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ تکلیف دہ باتوں کو بُھلا دینے میں ہی عافیت ہوتی ہے۔ امینہ اٹھو...... بہن کے گلے لگو...... شاہ تاج تم بھی بہن سے ہاتھ ملاؤ۔"

امینہ اٹھی مگر انیقہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی اور اس نے دروازہ بند کر لیا۔

عبدل حیران تھا کہ گھر آئے ہر مہمان سے خندہ پیشانی سے ملنے والی انیقہ بظاہر بے ضرر سے نظر آنے والے ان دو نوعمر مہمانوں کی آمد پر اتنی ناخوش کیوں تھی؟

"عبدل! بچوں کے لیے کچھ کھانے پینے کو لاؤ۔" شاہ مراد نے اس سے کہا۔

"تھینک یو...... ہم چلیں گے...... وہ لوگ ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔" شاہ تاج نے اٹھنے کا قصد کیا۔

"انیقہ تکلیف میں ہے بیٹا!" شاہ مراد نے معذرت خواہانہ لہجے میں سرگوشی کی۔

"اٹس او کے۔"

وہ جا ہی رہے تھے کہ انیقہ کمرے سے نکل آئی اور میز پر رکھے شاپر کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے بولی۔ "یہ لے جاؤ۔"

شاہ تاج اور امینہ جو ٹھٹک گئے تھے، ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ عبدل کو حیران اور متجسس دیکھ کر شاہ مراد نے خود شاپر اٹھا لیا اور ان دونوں کو رخصت کرنے کے لیے گھر سے باہر چلے گئے۔ واپس پلٹے تو انیقہ لاؤنج ہی میں تھی۔

"سوری پاپا!" اس نے دھیرے سے کہا۔ "میں اتنی روڈ ہونا نہیں چاہتی تھی۔"

"میں سمجھ سکتا ہوں۔" شاہ مراد بولے۔ "لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ وہ بھی میری اولاد ہیں۔"

"آئی کین انڈر اسٹینڈ!"

"بس یہی بات اچھی ہے کہ ہم باپ بیٹی ایک دوسرے کی بات، ایک دوسرے کی فیلنگز کو سمجھ سکتے ہیں۔"

"پاپا! کتنی بے رحمی ہے یہ کہ دوسرا شخص ہماری سفرنگز، ہمارے دکھ کو سمجھنے کے بجائے ہمیں پٹ سمجھے...... ہم زندہ انسان اور مجبور نہ ہوتے ہوئے بھی دوسروں کے اشاروں پر تو نہیں ناچ سکتے نا...... وہ مجھے اپنے مہمانوں کے سامنے پیش کر کے انہیں خوش کرنا چاہتی تھیں۔ سوری پاپا! میں شاہ تاج اور امینہ کو ہرٹ نہیں کرنا چاہتی تھی مگر...... جنہوں نے انہیں بھیجا تھا، انہیں ضرور پتا چلنا چاہیے کہ راستہ بدل لینے کا اختیار

کسی دوسرے کو بھی ہو سکتا ہے۔''

شاہ مراد خاموشی سے سنتے رہے۔ ربع صدی سے کچھ کم عرصہ قبل ان کے بازوؤں میں ہمکنے اور اپنے منہ سے بے معنی آوازیں نکالنے والی بچی بڑی ہو کر کتنی بڑی بڑی باتیں کرنے لگی تھی۔ وقت، حالات اور تجربات نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔

☆☆☆

آنے والے دنوں میں انیقہ اپنی شبانہ روز پیشہ ورانہ مصروفیت کے باعث اپنا تعلیمی سلسلہ شاہ مراد کی خواہش کے مطابق پرائیویٹ طور پر بھی جاری نہ رکھ سکی۔ اسے تو سونے کے لیے بھی مشکل سے وقت ملتا تھا لیکن شہرت، دولت اور عزت اس کے قدموں میں ڈھیر ہوتی گئی۔ وہ دنیا بھر میں کروڑوں ٹیلی ویژن ناظرین کی پسندیدہ فنکارہ بن گئی۔ اس کے ڈرامے دوسری زبانوں کے سب ٹائٹلز کے ساتھ بھی نشر کیے جاتے۔ وہ اسکرپٹ پڑھ کر...... اور یہ کام اس کے لیے شاہ مراد کرتے تھے، کام کرنے کی ہامی بھرتی۔ منہ مانگا معاوضہ لیتی...... ریکارڈنگ کے لیے اپنی مرضی کی ڈیٹس دیتی۔

دو کمروں کے فلیٹ سے وہ اور شاہ مراد پہلے ایک لگژری اپارٹمنٹ پھر ایک کوٹھی میں منتقل ہو چکے تھے۔ ان کے پاس ایک نہیں، نئے ماڈل کی دو گاڑیاں تھیں۔ انیقہ کی اپنی میک اپ وومین تھی جو اس کے بناؤ سنگھار کا خیال رکھتی۔ زندگی کے اس روپ کا جو خدا کی مہربانی سے قسمت نے اس کے دامن میں لاڈالا تھا، اس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔

مگر اس کے تصور اور توقع سے بڑھ کر اتنا کچھ مل جانے کے باوجود ایک کسک تھی جو اس کا دامنِ دل کسی صورت نہ چھوڑتی تھی۔ وہ ابر آلود شام جب اس نے اپنے ماں باپ کا راستہ جدا اور ان کے بچوں کا بٹوارا ہوتے دیکھا تھا۔ وہ ابر آلود شام آج بھی اپنی پوری سفاکیت کے ساتھ اس کے دل میں اپنے پنجے گاڑے ہوئے تھی۔ لوگ اسے رشک سے دیکھتے تھے۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں اس کی اداؤں پر فریفتہ تھے۔ وہ چوبیس گھنٹوں کا بیشتر حصہ کیمروں کی روشنیوں میں رہتی مگر اپنے دل میں جھانکتی تو اندھیرا پاتی۔ زندگی بہت سوں کے ساتھ یہی سلوک کرتی ہے۔ روشنیوں کے ہجوم میں کوئی ایک خانہ تاریک رہ جاتا ہے۔ کوئی ایک کسک دل کو ناقابلِ بیان درد سے دوچار رکھتی ہے۔

آئمہ کی شادی ہو گئی تھی۔ اپنے پھوپی زاد سے شادی کے کچھ عرصے بعد وہ آسٹریلیا چلی گئی تھی۔ وہاں سے اب بھی انیقہ سے رابطہ رکھتی۔ اسے بار بار ایک ہی مشورہ دینے پر زور رکھتی...... ''شادی کرلو۔'' کبھی بھولے بھٹکے سلمٰی بھی اسے فون کر لیتی اور یہی مشورہ دیتی۔ شاہ مراد اس قسم کے باپ نہیں تھے جو انیقہ جیسی شہرت یافتہ اور ہن برسانے والی بیٹیوں کو سونے کی چڑیا سمجھ کر پنجرے میں مقید رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ بھی اکثر انیقہ سے کہتے۔ ''بیٹا! اب تمہارا گھر بس جانا چاہیے...... دیکھو آئمہ کی بھی شادی ہو گئی۔''

''مجھے شادی نہیں کرنی پاپا!'' وہ ایک روز بولی۔

''کیوں؟'' شاہ مراد چونکے۔

''شادی کر کے آپ کو کیا ملا؟''

''تم! تم جیسی انمول بیٹی...... وہ بھی تو ہیں جو مرتے دم تک ساتھ نبھاتے ہیں...... ہر حال میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے رہتے ہیں۔ اپنی اپنی قسمت کی بات ہوتی ہے بیٹا...... میرے اور تمہاری ماں کے معاملے میں شاید مجھ سے بھی کوئی غلطی ہوئی ہو گی۔''

''آپ سے!'' وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔ ''آپ سے کیا غلطی ہوئی ہو گی...... ساری غلطی انہی کی تھی۔''

''مجھ سے......'' شاہ مراد نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ ''مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ جب میں بھنور میں پھنسا تو میں نے بھنور سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش نہیں کی۔ خود کو بھنور کی چک پھیریوں پر چھوڑ دیا اور...... ڈوبتا ہی چلا گیا۔ فلم انڈسٹری میں اپنے زوال کے بعد مجھے کوئی اور راستہ، کوئی معقول ذریعہ آمدن تلاش کرنا چاہیے تھا۔ میں اپنی ناکامی کو سینے سے لگائے وقت پلٹنے کے خواب دیکھتا رہا۔ جتنا وقت میں نے کوئی فنانسر مل جانے کی امید میں اسٹوڈیوز کے چکر لگانے میں گزارا، وہ اگر میں کسی بہتر ذریعہ معاش میں لگا دیتا تو شاید حالات مختلف ہوتے۔'' شاہ مراد نے توقف کیا پھر آزردگی سے بولے۔ ''انسان کو اپنی شکست، اپنے زوال کو قبول کرنے کا حوصلہ رکھنا چاہیے ورنہ ایسے ہی بھٹکتا ہے جیسے میں بھٹک رہا ہوں آج تک۔''

''آج تک!'' انیقہ، باپ کے دو آخری الفاظ دہراتے ہوئے انہیں ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھنے لگی پھر اس نے کہا۔ ''آج تک کیوں پاپا......؟ اب تو آپ کے پاس سب کچھ ہے۔''

''تمہارا ہے بیٹے...... میں تو آج بھی ناکام اور قلاش آدمی ہوں۔'' شاہ مراد دل گرفتگی سے بولے۔

''ایسا مت کہیں پاپا!'' انیقہ کا ہاتھ شاہ مراد کے شانے تک جا پہنچا۔ ''خدا کی مہربانی کے بعد یہ سب آپ کی عطا ہے...... سب کچھ آپ کا ہے پاپا...... آپ کا وہ اسکرپٹ

ہے نا...... کالا آدمی...... اس کے لیے آپ کو باہر سے کسی فنانسر کی ضرورت نہیں...... اب آپ خود فنانس کر سکتے ہیں...... پلیز پاپا! اس پر کام شروع کر دیں...... لیڈنگ فی میل کیریکٹر کے لیے میں آپ سے درخواست کروں گی کہ میرے سوا کسی کو نہ دیں۔''

شاہ مراد اس کا منہ دیکھنے لگے۔

''انکار مت کیجیے گا پاپا...... ! آپ کو یہ فلم بنانی ہے...... سینما ہاؤسز کی اسکرین پر آپ کے نام کو پھر سے جگمگاتے دیکھنا میری سب سے بڑی خواہش بن گئی ہے پاپا!''

''مگر مجھے اب کوئی خواہش نہیں رہی بیٹا...... میں نے اس حقیقت کو قبول کر لیا ہے کہ عروج کو زوال بھی ہوتا ہے۔ میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں...... جلدی تھک جاتا ہوں۔''

''فن کبھی بوڑھا نہیں ہوتا پاپا...... جہاں آپ تھکیں گے، میں آپ کا ہاتھ پکڑوں گی۔''

''تم نے تو برسوں سے پکڑا ہوا ہے میرا ہاتھ۔'' شاہ مراد نے اپنا ہاتھ انیقہ کے سر پر رکھ دیا۔

''پاپا! پوری کریں گے نا میری خواہش؟''

شاہ مراد نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

انیقہ کی خواہش وقتی امنگ نہیں تھی۔ وہ فلم بنانے کے لیے شاہ مراد کے پیچھے پڑ گئی۔ وہ پہلے تو ٹالتے رہے لیکن بالآخر انہیں انیقہ کے اصرار کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔

انیقہ نے ذاتی فلم بنانے کا اعلان کر دیا جس کے ہدایت کار شاہ مراد تھے۔ میڈیا میں خبر گرم ہوئی۔ ''منی اسکرین کی مقبول ترین فنکارہ انیقہ شاہ کا اپنے والد، فلم انڈسٹری کے سابق کہنہ مشق ہدایت کار شاہ مراد کی ہدایات میں ذاتی فلم بنانے کا اعلان...... مرکزی کردار خود انیقہ شاہ ادا کریں گی۔''

انیقہ کے نام پر سرمایہ کاری کرنے والے فنانسرز اور ڈسٹری بیوٹرز نے فلم میں سرمایہ کاری اور تقسیم کاری کے لیے انیقہ اور شاہ مراد سے رابطے شروع کر دیے۔ انیقہ کا نام وہ گھوڑا تھا جس پر پیسا لگاتے کسی کو ہار کا خوف نہ تھا۔ فلم کی مہورت کو میڈیا نے بھرپور کوریج دی۔

شاہ مراد گویا جی اٹھے۔ ان کے خمیدہ شانے پھر سے توانا دکھائی دینے لگے۔ چہرے کی پژمردگی شگفتگی میں بدل گئی۔ طویل وقفے کے بعد اسٹوڈیو میں ان کی آواز پھر سے گونج رہی تھی۔ انیقہ نے کم سے کم مدت میں نہایت سرعت سے فلم مکمل کرانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

ذاتی فلم کے علاوہ بیک وقت کئی سیریلز میں مسلسل ریکارڈنگ نے اسے انتہائی مصروف کر رکھا تھا۔ آنے والے دنوں میں اسے ایک سیریل کی ریکارڈنگ کے لیے ملک سے باہر بھی جانا تھا۔ دن تو دن، رات کا بیشتر حصہ بھی مصروفیت میں گزرتا۔ وہ اور شاہ مراد دونوں ہی تھکن سے چُور گھر واپس لوٹتے مگر کام سے لگن انہیں اگلے دن پھر سے تازہ دم کر دیتی۔ انیقہ کو عالیان کا فون آ جاتا۔ ''ہاں میم جی! جاگ گئی ہو؟'' وہ پوچھتا۔

''سوتے میں تو تم سے بات کر نہیں سکتی تھی۔''

''آج کا اسکیجوئل کیا ہے؟''

''پاپا بتائیں گے۔''

''یار! بہت اعلیٰ ہیں تمہارے پاپا...... کاش ہمیں بھی ایسے پاپا ملے ہوتے۔''

''آئی فیل پراؤڈ آف ہم۔''

''یو ہیو ا یوری رائٹ۔''

شوبز میں عالیان اور انیقہ کی انٹری آگے پیچھے ہوئی تھی۔ انیقہ کی تیسری ڈراما سیریل میں عالیان نے اس کے ساتھ مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ دونوں کی جوڑی کو ناظرین نے اتنا پسند کیا تھا کہ اب ہر دوسرے ڈرامے میں وہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل مرکزی کردار میں ہوتے تھے۔ ساتھ کام کرتے کرتے دونوں میں ایسی ہم آہنگی ہو گئی تھی کہ پروڈیوسرز کو بھی ان کے سین ریکارڈ کرتے پرفیکشن کا احساس ہوتا۔ انیقہ کی ذاتی فلم میں بھی شاہ مراد نے انیقہ کے مقابل عالیان کو مرکزی کردار کے لیے کاسٹ کیا تھا۔ انیقہ کی طرح عالیان کی بھی یہ بڑی اسکرین کے لیے اولین فلم تھی۔ دونوں جم کر کام کر رہے تھے۔

انیقہ اس فلم میں ایک حسین و جمیل لڑکی کا کردار ادا کر رہی تھی جو انتہائی سیاہ رنگت کے حامل ایک بدصورت شخص سے جو عمر میں بھی اس سے بڑا ہے، اس کی شہرت اور دولت کی خاطر شادی کر لیتی ہے۔ دونوں کے ہاں اولاد بھی ہوتی ہے۔ شوہر اپنی بیوی کو نہایت ناز و نعم اور آسائشوں میں رکھتا ہے لیکن چند سال گزرنے پر اس کی شہرت کا سورج غروب ہو جاتا ہے اور زمانے کے داؤ پیچ اسے امارت سے غربت کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔ حالات کے پلٹا کھانے پر اس کی بیوی بھی اس سے نظریں پھیر لیتی ہے اور دو بچوں سمیت اس کی زندگی سے نکل جاتی ہے لیکن دستِ غیب اس شخص کو دوبارہ اس کے کھوئے ہوئے مقام تک لے جاتا ہے۔ اسے چھوڑ کر جانے والی بیوی دوبارہ اس کی زندگی میں

آنا چاہتی ہے مگر...... فلم کے آخری منظر کو شاہ مراد نے خود اپنے لیے بھی اب تک سوالیہ نشان بنا رکھا تھا کہ...... اس شخص کو خراب حالات میں نظریں پھیر کر جانے والی عورت کو دوبارہ اپنی زندگی میں واپسی کی اجازت دینی چاہیے یا نہیں۔ شاہ مراد کا کہنا تھا کہ آخری سین وہ بقیہ فلم کی تکمیل کے بعد خود ضبطِ تحریر میں لائیں گے اور شوٹ کریں گے۔

فلم کے بدصورت ہیرو کا کردار عالیان ادا کر رہا تھا۔ اس کردار کی ادائیگی کے لیے شاہ مراد کی ہدایات کی اہمیت اپنی جگہ لیکن عالیان نے کردار کی ادائیگی کے لیے شاہ مراد کی اپنی شخصیت کا نہایت خاموشی اور انہماک سے گہرا مشاہدہ کیا تھا۔ ان کی حرکات و سکنات، اندازِ نشست و برخاست، لب و لہجہ، چہرے کے تاثرات کا اتار چڑھاؤ...... انہی کی جون اختیار کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگرچہ شاہ مراد اور انیقہ نے اپنی ذاتیات کے بارے میں اس سے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی مگر عالیان کا دل کہتا...... فلم کا کالا ہیرو کوئی اور نہیں، شاہ مراد کا اپنا کردار تھا تاہم وہ اس سلسلے میں زبان سے کچھ کہنے سے گریز کرتا۔ انیقہ کے ساتھ مسلسل کام کرنے سے اس کی انیقہ سے قربت بڑھ رہی تھی۔ اپنے دل میں جھانکتا تو اسے انیقہ کے لیے اپنی اور غیروں کی زبان میں بھی چہار حرفی جذبہ سجا دکھائی دیتا...... محبت اور love دونوں ہی چار حروف کا مجموعہ۔ انیقہ کی ریزروڈ طبیعت کے باعث وہ اس سے اپنی محبت کا اظہار کرنے میں متردد تھا...... بے تکلفی حدود و قیود میں تھی۔

☆☆☆

فلم تکمیل کے نزدیک تھی کہ ایک روز شاہ مراد کو اسٹوڈیو کے استقبالیہ سے اپنے مہمانوں کی آمد کی اطلاع ملی۔ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ فلم میں اداکاری کرنے کی شوقین نوجوان لڑکیاں اور لڑکے اسٹوڈیو آتے اور ہدایت کاروں سے ملنے کے خواہاں ہوتے ہی تھے۔

پیک اپ ہو چکا تھا اور شاہ مراد، انیقہ کے ساتھ اسٹوڈیو سے جانے والے ہی تھے۔ جاتے جاتے استقبالیہ پر مہمانوں سے بھی مل لینا تھا۔ وہاں پہنچے تو منتظر مہمان کوئی اور نہیں، انیتا اور شاہ تاج تھے۔ انہیں دیکھ کر شاہ مراد اور انیقہ دونوں ٹھٹک گئے۔ شاہ مراد باپ تھے۔ انیتا کو تو خاصے عرصے بعد دیکھا تھا، آگے بڑھے، دونوں سے محبت سے پیش آئے۔ پوچھا ''خیریت؟''

انیقہ جو شاہ مراد کے ساتھ آگے بڑھ آئی تھی، طنز سے بولی۔ ''شاید پھر کوئی مہمان آئے ہوں جن کے سامنے پیش کرنے کے لیے مجھے بلوایا جا رہا ہو۔''

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' شاہ تاج جس نے خوب قد نکالا تھا، بولا۔

''میں آپ سے ضروری بات کرنا چاہتی ہوں...... علیحدگی میں۔'' انیتا دھیمی آواز میں شاہ مراد سے مخاطب ہوئی۔

''آؤ۔'' شاہ مراد نے انہیں ویٹنگ روم کی طرف لے جانے کا قصد کیا۔

''میں گاڑی میں آپ کا انتظار کرتی ہوں پاپا!'' انیقہ بولی۔

''آ جاؤ بیٹا!'' شاہ مراد نے اس سے نہایت نرمی سے کہا پھر مزید بولے۔ ''بہن بھائی ہیں تمہارے۔''

انیقہ نے بادل ناخواستہ ان کا ساتھ دیا۔ چاروں ویٹنگ روم میں آ بیٹھے جہاں اس وقت کوئی اور نہ تھا۔

''ہاں بیٹا! بولو۔ کیا بات کرنا چاہتی ہو؟'' شاہ مراد نے انیتا سے کہا۔

انیتا کشمکش میں دکھائی دی۔

''بولو بیٹا!''

انیتا رونے لگی۔

''کیا ہوا؟'' شاہ مراد نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''سوری پاپا!'' انیتا اپنے ہاتھوں کو باہم مروڑتے ہوئے بولی۔

''فار وہاٹ؟''

''مجھے آپ کے ساتھ رہنا چاہیے تھا...... بلکہ ہم سب کو۔''

''ہوا کیا؟''

''پاپا......!'' انیتا رونے لگی۔

''میرا بچہ! بتاؤ تو سہی، کیا ہوا؟'' شاہ مراد جوان بیٹی کو روتا دیکھ کر مضطرب ہوئے۔

''کچھ نہیں ہوا...... بس میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔''

شاہ مراد نے انیقہ کو یوں دیکھا جیسے اس کی اجازت چاہتے ہوں۔

انیقہ نے پہلو بدلا پھر قدرے طنز و ناگواری سے بولی۔ ''ان کی والدہ کو اعتراض ہوا تو؟'' اس نے ایسے کہا جیسے انیتا کی والدہ سے اس کا اپنا تو کوئی رشتہ تھا ہی نہیں۔

''نہیں ہوگا...... ویسے بھی میں خود مختار ہوں۔'' انیتا نے کہا۔

''کیا کہتی ہو؟'' شاہ مراد کو وقت نے گویا انیقہ کی مرضی کا پابند کر دیا تھا۔

''جیسے آپ کی مرضی پاپا!''
''میں بھی آپ کے ساتھ رہوں گا۔'' شاہ تاج نے دھیرے سے کہا۔
شاہ مراد اور انیقہ نے بیک وقت اسے چونک کر دیکھا۔
''تم بھی بیٹے؟'' شاہ مراد نے بیٹے کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔
''جی پاپا!''
''امینہ کو اکیلا چھوڑ دو گے؟''
''وہ بھی آجائے گی...... اس آدمی کا بی ہیویر ہمارے ساتھ چینج ہوگیا ہے اور ماما اسے کچھ نہیں کہتیں۔'' شاہ تاج کے لہجے میں ناگواری تھی۔
انیقہ بہن تھی۔ بھائی کو پریشان دیکھ کر اسے ہمدردی محسوس ہوئی۔ اکلوتا بھائی تھا۔ انیقہ پسیج گئی۔ ''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں...... پاپا ہیں نا۔''
''آئی ایم سوری انیقہ باجی!'' شاہ تاج سر جھکا کر بولا۔
''سوری کرنے کی کوئی ضرورت نہیں...... بہت بڑا گھر ہے ہمارے پاس...... تم آرام سے ہمارے ساتھ رہ سکتے ہو...... لیکن یہ سوچ لو کہ...... تم پھر وہاں آنا جانا نہیں رکھو گے۔''
''نہیں جاؤں گا۔''
''چلیں پاپا؟'' انیقہ نے شاہ مراد سے کہا۔
''یہ دونوں ہمارے ساتھ ہی جائیں گے نا؟'' شاہ مراد بولے۔
''ان کی مرضی ہے...... ہمارے ساتھ چلنا چاہیں تو...... ویلکم!''
انیتا اور شاہ تاج ان دونوں کے ساتھ چل دیے۔
انہیں گھر پہنچا کر انیقہ کو شاہ مراد کے ہمراہ اپنی ایک سیریل کی شوٹ پر جانا تھا۔
''پاپا! آج آپ گھر پر رکیں، میں چلی جاؤں گی۔'' اس نے شاہ مراد سے کہا۔
''میرا اندازہ ہے کہ رات کو ایک دو بجے سے پہلے فراغت نہ ہوگی تمہیں۔'' شاہ مراد فکرمندی سے بولے۔
''نو پرابلم...... ڈرائیور ہوگا نا میرے ساتھ...... آئی ول منیج۔''
ریکارڈنگ سے فارغ ہو کر رات گئے جب وہ گھر واپس لوٹی تو انیتا لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ اسے نظرانداز کر کے انیقہ نے اپنے کمرے کا رخ کیا تو انیتا کی آواز نے اسے ٹھٹکنے پر مجبور کر دیا۔ ''میری بات سنو گی؟''
''کیا بات؟'' اس نے سرد مہری سے کہا۔
''جو بات میں پاپا کو نہیں بتا سکتی تھی۔''
انیقہ نے اسے چونک کر دیکھا۔ ''بولو۔''
''میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں یہاں کیوں آئی ہوں۔''
''مجھے کوئی دلچسپی نہیں یہ جاننے سے۔''
''پلیز!'' انیتا گڑگڑائی۔
انیقہ نے بے رخی سے کہا۔ ''کچھ ہوا ہوگا؟''
''کچھ نہیں...... بہت کچھ۔'' انیتا اس کے نزدیک آگئی اور دھیمی آواز میں بولی۔ ''ماما کا ہسبینڈ بہت خراب آدمی ہے۔''
انیقہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
''ماما سے شادی کے بعد وہ کافی عرصہ تمیز سے رہا۔ مجھ سے بیٹا بیٹا کر کے بات کرتا تھا...... بھیا اور امینہ سے بھی...... پھر وہ مجھے عجیب عجیب نظروں سے دیکھنے لگا۔ ایک روز جب ماما اپنے ساتھ امینہ کو لے کر ڈاکٹر کے ہاں گئی ہوئی تھیں اور میں لیپ ٹاپ پر اسائنمنٹ بنا رہی تھی، وہ میرے پاس آکر بیٹھ گیا اور اس نے مجھے اسائنمنٹ میں مدد دینے کے بہانے کبھی میرا ہاتھ پکڑتا اور کبھی کمر پر ہاتھ رکھنا شروع کر دیا۔ میں نے ماما کو نہیں بتایا...... پھر وہ میرے پیچھے پڑ گیا، ماما ذرا ادھر ادھر ہوتیں تو وہ مجھ سے الٹی سیدھی باتیں کرنے لگتا۔ میں نے ماما کو بتایا تو انہوں نے کہا...... تمہارے باپ کی جگہ ہیں، تم ان کی باتوں کو غلط سینس میں لے رہی ہو...... مگر مجھے معلوم تھا ایسا نہیں ہے۔ میں اس سے ڈرتی تھی، چھپتی پھرتی تھی۔ ایک روز وہ رات کو میرے کمرے میں آگیا اور اس نے میرے پاؤں کا انگوٹھا ہلایا۔ میں گھبرا کر اٹھی تو میرے ساتھ سوئی امینہ بھی جاگ گئی۔ وہ کمرے سے چلا گیا۔ امینہ نے بھی اسے دیکھا تھا۔ میں نے ماما کو بتایا تو انہوں نے کہا...... خاموش رہو ورنہ تمہاری وجہ سے میرا گھر برباد ہو جائے گا...... پھر اس نے مجھ سے یہ کہنا شروع کر دیا کہ میں تم سے شادی کروں گا...... میں نے ماما کو بتایا تو انہوں نے مجھے عالمہ خالہ کے ہاں بھیج دیا جس پر اس نے ماما سے لڑائی کی اور کہا ''اسے واپس بلاؤ۔'' ماما اور وہ مجھے دوبارہ اپنے گھر لے گئے۔ وہ بار بار مجھ سے کہتا ''تمہاری ماں کو چھوڑ کر میں تم سے شادی کروں گا......'' میں ماما کو بتاتی تو وہ الٹا مجھ پر غصہ ہوتیں...... ڈانٹتیں مجھے اور کہتیں۔ ''تمہاری وجہ سے میرا گھر برباد ہو جائے گا......'' آج بھی ماما نے یہی کہا تھا...... میری ان سے لڑائی ہوئی۔

میں عالمہ خالہ کے ہاں نہیں جانا چاہتی تھی۔ شاہ تاج اور میں پاپا کا پتا کر کے اسٹوڈیو پہنچ گئے۔"

"مائی گاڈ!" اپنے کمرے کی طرف جانے کے بجائے انیقہ لاؤنج میں ہی بیٹھ گئی۔ وہ گم صم تھی...... اس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا انیتا سے کیا کہے۔

"میں کوئی جاب دیکھ لوں گی...... ہاسٹل چلی جاؤں گی...... کچھ دن یہاں رہنے دو۔" انیتا گڑگڑا کر بولی۔

"کچھ دن کیوں...... تم یہیں رہو گی...... امینہ کو وہاں کیوں چھوڑ آئیں...... ایسے شخص کے گھر میں تو اس کا رہنا بھی ٹھیک نہیں۔" انیقہ نے کہا۔

انیقہ کے ہم کلام ہونے پر انیتا کو حوصلہ ہوا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ امینہ بھی اب بڑی ہے...... اسے وہاں نہیں رہنا چاہیے۔ میں کچھ بندوبست کرلوں...... بلالوں گی اسے بھی...... میں، امینہ اور بھائی ایک کمرے کے فلیٹ میں بھی رہ سکتے ہیں۔"

"یہ اتنا بڑا گھر کس لیے ہے؟"

"مجھے امید نہیں تھی انیقہ کہ تم اور پاپا ہمیں ویلکم کرو گے...... تھینک یو انیقہ...... تھینک یو سوچ!" انیتا رونے لگی۔

انیقہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس جا بیٹھی۔ "ایک فرد کی غلطی کی وجہ سے ہم سب کو کتنی تکلیف میں جانا پڑا...... پاپا، میں اور تم تینوں۔" اس نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

"ماما کی بات کررہی ہو؟"

"اور کس کی۔" انیقہ نے توقف کیا۔ "وہ اگر پاپا کے ساتھ گزارہ کرلیتیں تو آج حالات مختلف ہوتے...... خود ان کے لیے بھی اور ہم سب کے لیے بھی...... گھر ان کا ہوتا...... بچے ان کے پاس ہوتے...... اور پاپا بے چارے تو تھے ہی ان کے۔"

انیتا کی خاموشی انیقہ کی تائید تھی۔

"جاؤ، جاکر سو جاؤ...... جاگ کیوں رہی ہو اب تک۔"

"تمہارے انتظار میں...... پاپا کو میں یہ سب کچھ نہیں بتا سکتی تھی۔"

"کچھ باتیں بتائے بغیر ہی سمجھ میں آجاتی ہیں...... پاپا کو اندازہ ہے کچھ کچھ۔"

"کیا؟" انیتا چونکی۔

"کہ تم کسی بڑی وجہ کے بغیر نہیں آئی ہو۔"

"انہیں مت بتانا انیقہ!"

"بتانا پڑے گا۔"

"مجھے اچھا نہیں لگے گا۔"

"اچھا لگے یا نہ لگے...... بتانا ضروری ہے...... میں پاپا سے کوئی بات چھپا ہی نہیں سکتی...... اور یہ بات بتانا تو بہت ضروری ہے۔"

☆☆☆

فلم مکمل ہوگئی تھی۔ انیقہ کئی اور پراجیکٹس میں بھی مصروف تھی۔ کچھ عرصہ قبل آن ائر جانے والی ایک نئی ڈراما سیریل سے اس کی شہرت کو چار چاند لگ گئے تھے۔ دن بہ دن اس کی پرفارمنس میں غیر معمولی نکھار آتا جارہا تھا۔ وہ لاکھوں افراد کے دلوں کی دھڑکن تھی۔ ہمسایہ ملک سے اسے خطیر معاوضے کے عوض پرفارمنس کی پیشکشیں تھیں مگر شاہ مراد کی صلاح تھی کہ اسے شوبز میں اپنے دیس کی پہچان بنے رہنے میں زیادہ عزت اور وقار تھا۔ پیسا یقیناً اہمیت رکھتا ہے لیکن فن کے نام پر ایک فنکارہ کو خطیر معاوضہ دے کر عریاں دکھانا نسوانیت کی تذلیل تھی۔ عالیان بھی شاہ مراد کا ہمنوا تھا۔ خود اپنے دیس نے اسے کچھ کم نوازا تھا۔ جس گھر میں وہ اب رہتی تھی، اس کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتیں اس جیسی اَن گنت لڑکیاں...... جو بیش قیمت گاڑی اس کے استعمال میں تھی، کبھی وہ خود بھی اس کے نام تک سے آشنا نہ تھی۔ کون سا فائیو اسٹار ہوٹل تھا جہاں وہ قدم رنجہ نہ کرچکی تھی۔ خدا جب کسی کا ہاتھ پکڑتا ہے تو وہ یونہی فرش سے عرش پر جاتا ہے۔ اچھے وقت میں وہ بھولی تھوڑی تھی کہ کبھی ایسا بھی تھا جب وہ اور اس کا باپ رات کو بچا کر رکھے گئے نان چھولے یا باسی روٹی اور پکوڑوں سے ناشتا کیا کرتے تھے۔ ایک دو دن نہیں، بہت عرصہ یہی معمول رہا تھا۔ اللہ کی دین تھی...... عطا تھی اس کی۔ انیتا کو اس نے اپنے تصرف میں رہنے والی چیزوں کے استعمال کی پوری اجازت دے دی تھی۔

☆☆☆

انیتا کو حسن آرا کے خودغرضانہ رویے نے گھر سے جانے پر مجبور کیا تھا۔ وہ کافی عرصے سے شعیب کی حرکتیں اس کے علم میں لارہی تھی۔ حسن آرا اسی کو موردِالزام ٹھہراتیں کہ تمہاری وجہ سے میرا گھر برباد ہوجائے گا۔ جس دن انیتا نے گھر چھوڑا اس روز بھی ماں بیٹی میں یوں تکرار ہوئی تھی جیسے ان کے درمیان ماں بیٹی نہیں، رقابت کا رشتہ تھا۔

"آپ کا شوہر میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔" انیتا نے حسن آرا سے کہا تھا۔

"تمیز سے بات کرو۔"

"تمیز آپ اپنے شوہر کو سکھائیں۔"

"آپ کا شوہر...... آپ کا شوہر...... یہ کیا فضول

بکواس کرتی ہو تم۔"
"فضول وہ ہے...... جب بھی میں آپ سے اس کی شکایت کرتی ہوں، آپ مجھ ہی کو ڈانٹتی ہیں۔" انیتا روہانسی ہوگئی۔
"تو کیا کروں؟"
"سمجھا دیں...... سمجھا دیں اسے کہ میرے ساتھ تمیز سے رہا کرے۔"
"تم میرا گھر برباد کرو گی۔"
"آپ کو اپنے گھر کی فکر ہے...... میری کوئی پروا نہیں...... اور مجھے کیا پڑی ہے کہ میں آپ کا گھر برباد کروں...... بائی دی وے...... آپ کا پہلا گھر کس نے برباد کیا تھا؟"
حسن آرا ششدر رہ گئیں۔ ان کی سب سے لاڈلی اور چہیتی اولاد ان کے دوبدو تھی۔
"بکواس مت کرو۔" حسن آرا صدمے میں تھیں۔
"پاپا تو بہت شریف آدمی تھے...... کسی عورت کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے تھے...... آپ کی غلط باتوں پر بھی چپ ہوجاتے تھے...... آپ کو ان کی صورت اچھی نہیں لگتی تھی نا...... کالا آدمی کہتی تھیں آپ انہیں...... اس آدمی کو دیکھا آپ نے اندر سے کتنا کالا ہے۔"
حسن آرا پر ہیجان طاری ہوگیا۔ ان کا ہاتھ انیتا پر اٹھا اور تابڑ توڑ اٹھتا ہی چلا گیا۔ زندگی میں پہلی بار انہوں نے انیتا کو اس بری طرح مارا تھا۔ شاہ تاج نے انیتا کو ماں کی مار سے بچانے کی کوشش کی تو حسن آرا نے اسے بھی دو چار ہاتھ جڑ دیے۔ امینہ دور کھڑی خوف سے تھر تھر کانپتی رہی۔
انیتا کا دوبدو کھڑے ہونا اور طعنہ زنی کرنا حسن آرا کے لیے ایسا غیر متوقع امر تھا جس نے انہیں شدید جذباتی صدمے سے دوچار کر دیا تھا۔ ان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ وہ بیٹی جوان کی ہر بات کو آمنا صدقنا سمجھتی تھی، ان کی ہمنوا تھی، ایک روز ان پر یوں طعنہ زن ہوگی۔
"دفع ہوجاؤ میرے گھر سے...... چلی جاؤ اپنے باپ کے پاس جس کی تمہیں آج اتنی چاہت آرہی ہے۔"
"چلی جاؤں گی آپ کے گھر سے۔" انیتا دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپے سسکتی ہوئی بولی۔
اور وہ واقعی چلی گئی تھی۔ شاہ تاج بھی اس کے ساتھ تھا۔ حسن آرا صدمے اور ملال میں تھیں۔ انہوں نے دونوں کو روکنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ امینہ گم صم تھی۔
حسن آرا کا خیال بلکہ یقین تھا کہ ملّا کی دوڑ مسجد تک کے مصداق انیتا اور شاہ تاج کی پہنچ ان کی بہن عالم آرا کے گھر تک ہوگی اور وہ انہیں سارا کچا چٹھا جسے وہ بہن سے بھی راز رکھنا چاہتی تھیں، سنادیں گے۔ اپنی ناراضگی اور ملال ظاہر کرنے کے لیے انہوں نے بہن کے ہاں فون بھی نہیں کیا۔
شام کو شعیب گھر آیا تو اس نے انیتا اور شاہ تاج کو گھر میں نہ دیکھ کر حسن آرا سے پوچھا۔ "انیتا اور شاہ تاج کہاں ہیں؟"
"عالمہ آپا کے ہاں۔"
"کیوں؟"
"انیتا بدتمیزی کر رہی تھی مجھ سے...... میں نے اسے مارا تو دونوں گھر سے چلے گئے۔"
"بیوقوف ہو تم...... جوان بیٹی کو مارا جاتا ہے؟"
"بیٹی بھی تو ماں سے بدتمیزی نہیں کرتی۔"
"کیا بدتمیزی کی؟"
"بس ایسے ہی۔" حسن آرا نے ٹالنے کی کوشش کی۔
"کیا؟ پتا تو چلے۔"
"جواب دے رہی تھی مجھے۔"
"گھر بلاؤ اسے۔"
"آجائے گی خود...... شاہ تاج اس کے ساتھ ہے۔"
"میں کیا کہہ رہا ہوں...... بلاؤ اسے۔"
حسن آرا کو شعیب کے لہجے میں حکم اور آنکھوں میں عجیب سی کیفیت کا احساس ہوا۔
"آجائیں گے خود ہی۔"
"میں کیا کہہ رہا ہوں تم سے...... اور کیسی ماں ہو تم...... جوان بیٹی اور بیٹا گھر سے چلے گئے اور تم بنی سنوری اتنے اطمینان سے بیٹھی ہو۔"
حسن آرا نے چونک کر اسے دیکھا اور فقط اتنا کہہ پائیں۔ "بنی سنوری!"
"ہاں۔" شعیب نے کہا۔
"تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں خود کو ہمیشہ اپ ٹو ڈیٹ رکھتی ہوں...... سر جھاڑ منہ پہاڑ رہنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔"
شعیب نے اپنی انگلی حسن آرا کی ناک کے بانسے سے مس کی اور مضحک لہجے میں بولا۔ "آؤٹ ڈیٹڈ ہوگئی ہو اب تم۔"
حسن آرا اس کا منہ دیکھنے لگیں۔
"دس سال بڑی ہو تم مجھ سے۔" شعیب نے جتایا۔
حسن آرا کو اپنے دل کی رفتار کم ہوتی محسوس ہوئی۔
"شعیب!" وہ تنویمی سی کیفیت میں فقط اتنا ہی کہہ سکیں۔
"ہاں......" اس نے حسن آرا کو مذاق اڑانے والے

انداز میں دیکھا۔ ''بڑی تو ہو تم مجھ سے...... کتنی ہوتی ہے عورت کی خوبصورتی کی عمر...... یوں......'' اس نے چٹکی بجائی۔ ''یوں جاتی ہے عورت کی خوبصورتی...... پھر ساری عورتیں ایک جیسی لگتی ہیں...... بال ڈائی کر لینے اور چہرے پر میک اپ چڑھا لینے سے عورت کی عمر کب چھپتی ہے...... بوڑھی ہو چکی ہو تم۔'' شعیب نے حسن آرا کو استہزائیہ نظروں سے دیکھا۔

حسن آرا دم بخود اسے دیکھنے لگیں۔ ان کے حسن کی تعریف میں رطب اللسان رہنے والا شخص جوان کا شوہر تھا، انہیں بوڑھی ہونے کا طعنہ دے رہا تھا۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں شعیب!'' حسن آرا نے مردہ سی آواز میں کہا۔

''میری بہنیں ٹھیک کہتی تھیں...... مجھے چار بچوں کی ماں سے شادی کرنے کے بجائے اپنی ہم عمر یا اپنے سے کم عمر لڑکی سے شادی کرنی چاہیے تھی۔''

حسن آرا کو چار بچوں کی ماں ہونے کا طعنہ ملنے پر اپنی تضحیک محسوس ہوئی۔ ''اب اپنی بہنوں کی خواہش پوری کر لو۔'' وہ تلملا کر بولیں۔

''سوچ رہا ہوں۔''

حسن آرا کے سینے میں جیسے آگ سی بھڑکی۔

شعیب نے ان کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اوپر کیا اور استہزائیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اب جو بھی کر لو، عمر تو نہیں چھپتی۔''

حسن آرا نے اسے خونخوار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

وہ ہنس دیا۔ ''تم عورتیں عمر کے سلسلے میں اتنی کانشیس کیوں ہوتی ہو؟''

''تم مرد گرگٹ کی طرح رنگ کیوں بدلتے ہو؟'' حسن آرا نے سخت ناگواری سے کہا۔

وہ منہ لال کر ہنسا پھر حسن آرا کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر بولا۔ ''فوراً حساب بے باق کر دیا۔''

''ادھار کیوں رکھوں۔'' حسن آرا تلملائیں۔

''ادھار تم نے اپنے چار بچوں کے باپ کا نہیں رکھا تو کسی اور کو کب بخشو گی۔''

حسن آرا کا اوپر کا سانس اوپر، نیچے کا نیچے رہ گیا۔

''وہ بھی ایسی بات کرتے ہی نہیں تھے۔''

''اچھا! اوہو ہو ہو...... پھر بھی تم نے اس کی اتنی عزت افزائی کی۔'' وہ نشتر پر نشتر لگا رہا تھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''آج کل اخباروں میں اس کے ماضی کی شہرت، شرافت اور عزت کے قصے دہرائے جا رہے ہیں۔ کہتے ہیں بہت شریف آدمی رہا...... فلمی ہیروئنیں اس کی شرافت کی قسمیں کھایا کرتی تھیں...... باپ بیٹی مل کر جو فلم بنا رہے ہیں، اس کی بڑی شہرت ہو رہی ہے۔''

حسن آرا نے پہلو بدلا۔ ''مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔''

''مجھے تو ہے...... کہہ سکوں گا کہ فلم کا ڈائریکٹر میری بیوی کا ایکس ہسبینڈ ہے اور فلم کی پروڈیوسر میری بیوی کی بیٹی...... ویسے سچ بتاؤ، کبھی سوچا تھا تم نے کہ تمہاری بیٹی اتنی مشہور ہو جائے گی...... لاکھوں دیوانے ہیں اس کے۔''

حسن آرا پھر پہلو بدلنے پر مجبور ہوئیں۔

''انیتا اور شاہ تاج کو گھر بلاؤ۔'' وہ پھر اپنے مدعا پر آ گیا۔

''میں نے کہا نا آ جائیں گے خود ہی۔''

''اٹھو...... ہم خود لینے چلتے ہیں۔'' اب وہ نرمی سے بولا۔

''رہنے دو دو چار دن...... ذرا دماغ ٹھکانے پر آ جائیں ان کے۔''

''میں تم سے کیا کہہ رہا ہوں۔'' شعیب نے آنکھیں نکالیں۔

''عالمہ آپا کے ہاں جا کر انہوں نے نہ جانے کیا الٹی سیدھی لگائی ہوگی...... انہوں نے بھی فون نہیں کیا مجھے۔''

''اسی لیے کہہ رہا ہوں چلو۔''

حسن آرا کو مجبوراً اٹھنا پڑا۔

مگر عالم آرا کے ہاں پہنچنے پر جب یہ معلوم ہوا کہ انیتا اور شاہ تاج وہاں نہیں پہنچے تھے تو حسن آرا کو تشویش لاحق ہوئی۔ شاہ تاج کی حد تک تو خیر تھی کہ لڑکا تھا...... اگرچہ فی زمانہ گھر سے باہر لڑکوں کے لیے بھی معاشرتی ماحول غیر محفوظ تھا...... مگر جوان بہن شاہ تاج کے ساتھ تھی...... اور شاہ تاج ایسا دانا اور توانا نہ تھا کہ نامناسب حالات میں بہن کے لیے حفاظتی دیوار بن سکتا۔ عالم آرا کے ہاں نہیں تو پھر کہاں گئے تھے دونوں؟ حسن آرا، شعیب، عالم آرا اور عطرت چاروں خیال و گمان کے گھوڑے دوڑانے لگے۔ انیتا کی بیسٹ فرینڈ شمسہ جو کبھی کبھی پورا پورا دن انیتا کے ساتھ گزارنے کو آ جاتی تھی، دو تین مرتبہ رات کو بھی رکی تھی۔ اگر یہ گمان کر لیا جاتا کہ انیتا، شمسہ کے گھر گئی تھی تو شاہ تاج؟ شمسہ کے گھر اس کے رکنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔

حسن آرا، شعیب، عالم آرا اور عطرت سب نہایت فکرمند ہو رہے تھے۔

کہاں گئے ہوں گے دونوں؟

رات سر پر تھی۔
مناسب نہ جانتے ہوئے بھی حسن آرا نے شمسہ کو فون کیا تو جواب ملا۔ ''نہیں آنٹی! انیتا میرے گھر تو نہیں آئی..... خیریت تو ہے؟''
''ہاں..... ہاں بیٹا خیریت ہے..... انیتا بھائی کے ساتھ باہر گئی تھی..... دیر ہو گئی تو مجھے فکر ہوئی..... اس کا فون بھی نہیں مل رہا ہے۔''
''عطرت! آپ ذرا شاہ مراد کو فون کریں۔'' عالم آرا نے شوہر سے کہا۔
''نہیں آپا! وہاں فون نہ کرائیں۔'' حسن آرا بولیں۔ ''وہ تو خوش ہوں گے۔''
''رہنے دیں۔'' عالم آرا نے میاں سے کہا۔
ابھی یہ بحث جاری تھی کہ عطرت کو شاہ مراد کی کال آ گئی۔
''شاہ مراد!'' عطرت نے اپنی بیگم، حسن آرا اور شعیب کو ایک نظر دیکھتے ہوئے یکبارگی انہیں چونکا دیا۔
''جنابِ من! بہت دنوں بعد یاد آئی..... لگتا ہے بہت مصروف ہیں۔'' عطرت نے شاہ مراد کی کال ریسیو کرنے کے بعد کہا۔
''الحمدللہ! انیقہ کی فلم میں مصروف ہوں۔''
''اپنی کہو..... انیقہ کی فلم تمہاری ہی ہوئی۔'' عطرت نے اسپیکر آن کر دیا۔
''انیقہ کی خواہش تھی سو اس کے پراجیکٹ میں مصروف ہو گیا..... ورنہ آپ جانیے وقت کے ساتھ میں تو ڈائریکشن وائریکشن بھول بیٹھا تھا۔''
''ارے نہیں بھئی..... میں اخبارات میں پڑھتا رہتا ہوں..... اسٹوڈیو رپورٹ تو عمدہ ہے۔''
''دعا کیجیے..... انیقہ بہت پر جوش ہے فلم کے سلسلے میں۔''
''ان شاء اللہ اچھا ہوگا۔''
''عطرت بھائی! میں نے آپ کو یہ بتانے کو فون کیا ہے کہ آج انیتا اور شاہ تاج نہایت غیر متوقع طور پر میرے پاس آ گئے۔ میں اور انیقہ اسٹوڈیو میں تھے۔ دونوں کچھ پریشان تھے۔ میں اور انیقہ انہیں اپنے ساتھ گھر لے آئے۔ میں نے آپ کو فون اس لیے کیا ہے کہ آپ لوگوں کو اور حسن آرا کو معلوم رہے کہ بچے میرے پاس ہیں۔''
''بہت شکریہ..... میں گھر میں بتا دوں گا۔''
شاہ مراد سے عطرت کا رابطہ منقطع ہونے پر شعیب نے کہا۔ ''اب کیا کیا جائے؟''
''میرا خیال ہے کچھ بھی نہیں۔'' عطرت نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔
''کیا مطلب؟'' شعیب چونکا۔
''وہ بھی گھر ہے..... بچے اپنے ماں باپ میں سے جس کے پاس ہوں، محفوظ و مامون ہوتے ہیں۔ باپ کے علاوہ انیقہ ان کی بہن ہے، ان کا خیال رکھنے کو..... انٹرنیٹ پر دیکھو..... انیقہ جس شاہانہ گھر میں رہتی ہے وہاں رہنے کا موقع ملنے کے بعد تو مجھ جیسا آسائشوں سے بے نیاز مست قلندر آدمی بھی آنا پسند نہ کرے گا۔ انیتا اور شاہ تاج تو نوجوان بچے ہیں جنہیں اچھے گھر میں رہنے اور اچھی گاڑی میں گھومنے پھرنے کا شوق ہوتا ہے۔ میں شرطیہ کہتا ہوں وہ وہاں سے ہرگز نہ آئیں گے۔ ویسے ہوا کیا تھا جو وہ گھر سے گئے؟''
''یہ بتاتی ہیں کہ انیتا ان سے بدتمیزی کر رہی تھی۔ انہوں نے ڈانٹا اور شاید مارا بھی تھا۔ وہ بتائے بغیر شاہ تاج کے ساتھ گھر سے چلی گئی۔'' شعیب نے بتایا۔
''خیر یہ اچھا ہوا کہ دونوں باپ کے پاس ہی پہنچے۔ خدا نہ کرے کہیں ادھر اُدھر چلے جاتے اور پتا بھی نہ چلتا تو بیٹھے بٹھائے افتاد پڑ جاتی۔''
''چلو ان کو لے آتے ہیں۔'' شعیب نے حسن آرا سے کہا۔
''کیا!'' حسن آرا یوں چونکیں جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ ''میں؟ ہرگز بھی نہیں..... کسی قیمت پر نہیں جاؤں گی وہاں۔''
''عطرت بھائی! آپ اور میں چلتے ہیں۔''
''رہنے دو شعیب! کچھ دن انہیں باپ کے پاس بھی رہنے دو..... اتنے سال بعد پہلی مرتبہ تو گئے ہیں وہ وہاں۔'' عالم آرا بولیں۔
''اگر مستقل وہیں کے ہو گئے؟''
''تو اور اچھا ہے..... تم دونوں کی ذمے داری کم۔''
''عطرت بھائی! انسان کسی جانور کو پالے تو اس سے بھی لگاؤ ہو جاتا ہے۔ مجھے گھر میں ان کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔'' شعیب دکھاوے کو جذباتی ہوا۔
''تمہاری اعلیٰ ظرفی ہے ورنہ اتنا خیال کون رکھتا ہے۔'' عطرت بولے۔
''چلیں گے میرے ساتھ انہیں لینے؟''
عطرت نے بیگم کی طرف دیکھا۔
''جلدی کی کیا ضرورت ہے..... آ جائیں گے..... باپ اور بہن ہی کے پاس ہیں..... کسی غیر کے گھر میں نہیں۔''
حسن آرا خاموش رہیں۔ شعیب کے سامنے وہ یہ نہیں کہنا چاہتی تھیں کہ انیتا کے شاہ مراد کے پاس جانے سے وہ

خود بھی اطمینان محسوس کر رہی تھیں۔ انیتا بار بار شعیب کے غیر اخلاقی رویے کی شکایت کر چکی تھی اور شعیب سے اپنے رشتے کو شکست و ریخت سے بچانے کے لیے وہ خود اسی کو چپ کرا دینے پر مجبور پاتی تھیں۔ ایک دو مرتبہ انہوں نے انیتا کو عالم آرا کے ہاں بھی بھیج دیا تھا مگر اس ہدایت کے ساتھ کہ انہیں کچھ نہ بتائے مگر شعیب اسے لے آیا تھا۔ چوہے بلی کے اس کھیل سے بہتر تھا کہ انیتا کو شاہ مراد اور انیقہ کے ساتھ محفوظ و مامون رہنے دیا جاتا۔

عالم آرا کے گھر سے واپسی پر شعیب کا منہ مستقل سوجا رہا۔

☆☆☆

برسوں کی دوری کے بعد بہن بھائی انیقہ سے دوبارہ ملے تو وہ زیادہ دیر ان سے بے رخی نہ برت سکی۔ دونوں کے آجانے سے گھر کی فضا ہی بدل گئی تھی۔ انیقہ کو گھر میں فیملی کی موجودگی کا احساس ہوتا۔ شاہ مراد بھی خوش تھے۔ نوجوان بیٹا ان کے قد کو آلگا تھا۔ انیتا نے ماں کا گھر چھوڑ کر آنے کی جو وجہ انیقہ کو بتائی تھی، وہ انیقہ نے دبے لفظوں میں شاہ مراد کو بتا دینا ضروری سمجھی تھی۔ اول تو وہ ہر بات باپ سے شیئر کرنے کی عادی ہو چکی تھی۔ شاہ مراد سے اس کا رشتہ باپ بیٹی کا رشتہ تو تھا ہی، اسے وہ اپنا ایسا دوست بھی سمجھتی تھی جو اسے ہر معاملے میں راست مشورہ بھی دیتے تھے۔ ان کی راہنمائی سے اسے ہمیشہ فائدہ ہی ہوا تھا۔ دوم انیتا کی بتائی ہوئی بات ان کے علم میں لانا اس لیے بھی ضروری تھا کہ وہ باپ تھے...... مرد تھے...... دانا تھے...... آئندہ انیتا کی محافظت کے لیے بہتر حکمت عمل میں لاسکتے تھے۔ انیقہ کی زبانی جو معاملہ علم میں آیا، اس نے شاہ مراد کو کچھ وقت کو تو دم بخود کر دیا تھا...... زندگی واقعی حوادث کا مجموعہ ہے۔

شاہ تاج یونیورسٹی جانے لگا تھا۔ انیقہ نے اسے جلد ہی چھوٹی گاڑی دلوانے کا ارادہ باندھ رکھا تھا۔ فی الحال وہ فلم کے آخری اسپیل اور دیگر پراجیکٹس کی ریکارڈنگ میں اتنی مصروف تھی کہ محاورتاً نہیں واقعتاً اسے سر کھجانے کی فرصت نہ تھی۔ وہ گھر آتی تو انیتا اس کے آرام کا پورا خیال رکھتی۔ انیتا کے آنے سے گھر کو گویا ایک اچھی ہاؤس کیپر مل گئی تھی۔ انیقہ کے پاس نہ اسباب کی کمی تھی نہ پیسے کی...... ہن برس رہا تھا...... وہ اپنی فنکارانہ مقبولیت کی منہ مانگی قیمت لیتی۔ شاہ مراد نے ایک روز اس سے کہا تھا۔

''بیٹا! میں نہیں چاہتا تھا کہ تم شوبز میں آؤ لیکن میں نے تمہیں روکا بھی نہیں...... اس کی دو وجوہ تھیں۔ پہلی بات تو یہ کہ اب زمانہ بدل گیا ہے...... اچھے اور پڑھے لکھے گھرانوں کی لڑکیاں اس فیلڈ میں آرہی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ میں نے وقت سے یہ سیکھا کہ پیسے میں بہت طاقت ہے۔ رشتوں کو جوڑ بھی دیتا ہے، توڑ بھی دیتا ہے۔ پیسا تھا میرے پاس تو مجھے وہ رشتہ ملا جس کا میں گمان بھی نہیں رکھتا تھا۔ پیسا نہ رہا تو سارے رشتے بکھر گئے۔ ستاروں کی دنیا بڑی بے مروت ہے۔ چڑھتے سورج کی پوجا کرتی ہے۔ خدا تمہارا ہاتھ تھام رہا ہے۔ وقت ساتھ دے تو لوگوں کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آنا۔ اپنے کام سے مطلب رکھنا اور نام بنانے کی کوشش کرنا۔ نام بن جائے تو بے رو و رعایت اپنے نام کو کیش کرانا۔''

سو انیقہ کسی کے دام میں نہ آتی۔ اپنے کام سے کام رکھتی اور خدا کی مہربانی سے ملی شہرت اور نام کی ٹھیک ٹھیک قیمت لیتی۔ کم وقت میں اس نے شہرت کا اتنا سفر طے کرلیا تھا جو بسا اوقات ستاروں کی دنیا میں نمودار ہونے والے بعض ستارے اک عمر بتا کر بھی طے نہیں کر پاتے۔

☆☆☆

فلم ریلیز ہوگئی۔

انیقہ شاہ مراد پروڈکشنز کی فلم نے باکس آفس پر اپنی کامیابی کی دھوم مچا دی۔ طویل عرصہ گمنامی میں رہنے والے شاہ مراد کا بطور ہدایت کار نام پھر چمک اٹھا۔ کیا فلم بین، کیا ناقدین، ہر طبقے میں واہ واہ ہوگئی۔ انیقہ نے بھی ایسے جم کر اداکاری کی تھی کہ ستاروں کی دنیا کے بعض بڑے ناموں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ اسے اپنی تعریف و توصیف سے زیادہ باپ کی ناموری کی خوشی تھی۔ وہ گویا پھر سے جی اٹھے تھے۔ انیقہ کی تشنہ تمنا کی تسکین ہوگئی تھی۔ دن بھر کے تھکے ہارے باپ کو جب وہ ہونٹوں پر پپڑیاں جمائے، آنکھوں میں تھکن آمیز مایوسی سموئے شکستہ قدموں سے گھر واپس لوٹتے دیکھتی تھی تو اس کا بس نہ چلتا تھا کہ کہاں سے کوئی فلم ساز، کوئی سرمایہ کار ایسا پکڑ لائے جو اس کے باپ کو پھر سے اس کے کھوئے ہوئے مقام پر کھڑا کر دے۔ تب اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ ایک روز وہ خود فلم سازی کرے گی اور اپنے باپ کو اس کی گم گشتہ ناموری دوبارہ حاصل کرنے میں مدد دے گی۔ فلمی نقاد شاہ مراد کی ہدایت کاری میں بننے والی فلم کو ٹارزن کی واپسی قرار دے رہے تھے۔ شاہ مراد کے تجربے اور گہری نظر کو داد دے رہے تھے۔ شاہ مراد خوش تھے مگر باطناً دل گرفتہ بھی کہ اگر یہ کچھ پہلے ہو گیا ہوتا تو زندگی کے انداز و اطوار کتنے مختلف ہوتے۔ اب اس ڈھلتی عمر میں وہ ایک کامیاب فلم دے سکتے تھے تو برسوں پہلے دو تین فلموں

کی اتفاقی ناکامی پر انڈسٹری نے ان سے نظریں کیوں پھیر لی تھیں...... نہ پھیری ہوتیں تو شاید ان کا گھر نہ ٹوٹا ہوتا...... حسن آرا نے ان سے اپنا راستہ جدا نہ کیا ہوتا۔ کتنے نقصانات تھے، وہ کہاں تک شمار کرتے۔ فلمی صنعت کی اسی بے مروتی اور چڑھتے سورج کو سلام کرنے کی روش نے انہیں انیقہ کو کام اور دام کے سلسلے میں کوئی رو رعایت نہ کرنے کی راہ بجھانے پر مجبور کیا تھا۔ وقتی ناکامی کو ان کے ماتھے کا ٹیکا نہ بنا دیا گیا ہوتا تو گزرے برسوں میں وہ نہ جانے کتنی معرکۃ الآرا فلمیں انڈسٹری کو دے چکے ہوتے اور انہیں ذاتی نقصانات کا سامنا بھی نہ ہوتا۔ خیر وقت گزر گیا تھا۔ برسوں بعد ایک فلم کی غیر معمولی کامیابی نے کئی فلم سازوں اور سرمایہ کاروں کو نئی پیشکشوں کے ساتھ ان کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ ان کے کام کے بدلے انہیں منہ مانگے دام دینے کی پیشکشیں تھیں مگر اب انہیں فلم ملنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وقت نے ان کی ترجیح بدل دی تھی۔ اب ان کی اولین ترجیح اپنے بچوں کو ان کے ٹھکانے بٹھانا تھا۔ بیٹیوں کو ان کے گھروں میں آباد کرنا اور بیٹے کو اس کے قدموں پر کھڑا کر کے آئندہ نسل کی ذمے داری اٹھانے کے لائق کرنا۔

☆☆☆

فلم میں انیقہ اور عالیان کی جوڑی کو فلم بینوں نے غیر معمولی پذیرائی دی تھی۔ عالیان نے بھی اپنی شاندار پرفارمنس سے فلم بینوں کے دل موہ لیے تھے۔ دونوں کو نئی فلموں کی آفرز تھیں مگر انیقہ فلم کی نسبت ٹی وی کی رسائی دور تک دیکھتی تھی۔ فلم کی کامیاب نمائش کے دوران اسے ایک ٹی وی ڈرامے کی ریکارڈنگ کے لیے مری کے ایک دور افتادہ گاؤں جانا پڑا تھا۔ گاؤں کے سادہ لوح افراد نے اسے سینما ہاؤسز میں رش لیتی فلم نہیں، ٹی وی ڈراموں کے حوالے سے پہچانا اور اتنی قدر و منزلت دی کہ اس کا دل کھل اٹھا۔

پرنٹ میڈیا اور سوشل میڈیا پر انیقہ اور عالیان کی خوبصورت جوڑی، ہم آہنگی، نہایت شاندار پرفارمنس کے قصائد کی بھرمار کے ساتھ ان دونوں کی باہمی قربت کی اسٹوریز بھی بے لگام تھیں۔ اندر کی کہانی لانے والے بعض بلاگرز کہتے دونوں جلد ہی شادی کے بندھن میں بندھنے جا رہے تھے تو بعض دعویٰ کرتے کہ درونِ خانہ دونوں کی شادی ہو چکی تھی۔ شوبز کی بعض نزاکتوں کے باعث اسے عام نہ کیا جا رہا تھا۔ چند فوٹوگرافرز تو مستقل انیقہ اور عالیان کے تعاقب میں رہتے اور آف دی سیٹ بھی کونوں کھدروں سے ان کی تصویریں کھینچ کر میڈیا پر ڈال دیتے۔ سوشل میڈیا نے تو لوگوں کی ذاتیات کو عام کرنے میں ساری اخلاقی حدود و قیود کو پس پشت ڈال دیا تھا۔

انیقہ کو ہر روز اپنے اور عالیان کے بارے میں کوئی نہ کوئی ایسی خبر سننے کو مل جاتی جس کی اسے خود خبر نہ ہوتی۔ پیشہ ورانہ مصروفیت کے علاوہ وہ اپنی ذاتی اغراض کے لیے بھی گھر سے باہر جاتی تو عام لوگ بھی اسے بتائے بغیر اپنے موبائل فون کیمروں کا رخ اس کی اجازت کے بغیر اس کی طرف کر دیتے۔ وہ اکثر بیزار ہو جاتی۔ مانا کہ فنکار پبلک پراپرٹی سمجھا جاتا ہے مگر پراپرٹی کو ریوڑی سمجھ کر کون باشعور لوٹتا ہے۔

شاہ مراد نے اس کی محافظت چھوڑ دی تھی۔ اب وہ خود ریکارڈنگز کے لیے آتی جاتی بلکہ نئے پراجیکٹس کے لیے گفت و شنید بھی خود کرتی۔ البتہ گھر میں باپ سے صلاح مشورے کے بعد۔ عالیان کھانے پینے کا بے حد شوقین تھا۔ فرصت ملتے ہی اسے بھی کسی اچھی سی جگہ کھانے پینے کو لے جاتا۔ ایک روز اس نے عالیان سے کہا۔ ''عالی! تمہاری وجہ سے......''

''مٹی بدنام ہو رہی ہے۔'' عالیان نے مسکراتے ہوئے مذاقاً کہا۔

''میں پروا نہیں کرتی...... مجھے بس اپنے پاپا سے غرض ہے اور وہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔''

''بات کروں ان سے؟'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

''کیسی بات؟''

''تمہاری اور اپنی شادی کی۔''

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''پہلے انیتا کی ہوگی...... وہ مجھ سے بڑی ہے۔''

''اگر یہ شرط ہے تو پہلے انیتا کی کرا دیتے ہیں۔''

''انیتا میری طرح شوبز اسٹار نہیں ہے جس سے ہر اونگا بونگا بھی شادی کا خواہش مند ہوتا ہے۔ گھر بیٹھی لڑکیوں کو آسانی سے اچھا رشتہ نہیں ملتا۔''

''تم فکر کیوں کرتی ہو...... رشتہ دلوا دیتے ہیں۔'' عالیان بولا۔

''کیا مطلب!'' انیقہ نے چونک کر اسے قدرے تعجب سے دیکھا۔

''میرا ایک کزن ہے مکینیکل انجینئر۔ سعودی عرب میں جاب ہے۔ آج کل آیا ہوا ہے۔ شادی ہوئی تھی مگر لڑکی والوں

نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کی اوپن ہارٹ سرجری ہو چکی تھی اور وہ ازدواجی زندگی کے تقاضے پورے کرنے سے قاصر تھی۔ شادی کے صرف تین ماہ بعد اس نے خلع لے لیا۔"

"مائی گاڈ!"

"اسی لیے ضروری ہے کہ رشتہ طے کرتے وقت لڑکا اور لڑکی دونوں طرف ایک دوسرے سے ضروری حقائق چھپائے نہ جائیں...... کھل کر بات کی جائے۔"

عالیان کی بات پر انیقہ گہری سوچ میں پڑ گئی۔

"عالی!" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "شوبز میں ہونے کی وجہ سے لوگوں سے یہ بات تو چھپی نہیں رہ سکی کہ میری فیملی بروکن فیملی ہے اور قیافہ شناس اپنے اپنے اندازوں سے میری فیملی کے بارے میں الٹی سیدھی اسٹوریز بناتے اور لگاتے رہتے ہیں لیکن حقیقت کیا ہے، یہ کوئی نہیں جانتا کیونکہ میرے والدین کی علیحدگی کے بعد نہ پاپا نے کبھی گھر سے باہر اپنی زبان کھولی، نہ ہم میں سے کسی نے کسی سے کچھ کہا سنا۔ میرے والدین کی علیحدگی کا سبب دونوں کی شخصیت کا تضاد اور فلم انڈسٹری میں پاپا کا زوال تھا۔ میری ماں نہایت حسین عورت تھیں...... اب بھی ہوں گی...... مگر ان کے مزاج میں طنطنہ تھا۔ انہیں اپنے حسن پر غرور تھا۔ وہ آسائشوں کی متمنی تھیں۔ پاپا سے انہوں نے اس وقت شادی کی جب ان کا فلم انڈسٹری میں طوطی بولتا تھا۔ میری ماں نے ان سے شادی کرتے وقت شاید یہ سوچا ہو کہ پاپا ہمیشہ اسی طرح عروج پر رہیں گے مگر بدقسمتی سے پاپا کا عروج، زوال میں بدل گیا۔ دونوں میں جھگڑے ہونے لگے اور ایک روز میری ماں گھر چھوڑ کر چلی گئیں۔ ہم چار بہن بھائی تھے۔ ہمارا بٹوارا ہو گیا اور میں پاپا کے ساتھ رہ گئی۔ آج تک ہوں...... اور ہمیشہ رہوں گی۔ مجھے پاپا کی شرافت، بے چارگی اور ہمبل نیس سے ہمدردی اور ان کی ذات سے محبت ہے۔ محبت کو مستحکم اور پائیدار ہونا چاہیے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا، محبت قطبی ستارے کی طرح ہوتی ہے جو اپنی جگہ سے کبھی نہیں ہٹتا۔ میں بھی پاپا سے اپنی محبت سے کبھی دستبردار نہیں ہونا چاہتی۔ ماما اور پاپا کی علیحدگی کے بعد ہم باپ بیٹی نے بہت درد سہا ہے اور ایک دوسرے کا درد بٹانے کی کوشش بھی کی ہے۔ میری ماں کے جانے کے بعد انہوں نے کبھی انہیں برا بھلا نہیں کہا...... ان کی کردار کشی نہیں کی...... ہمیشہ یہی کہا میں ان کے لائق نہیں تھا۔ پاپا بہت اعلیٰ ظرف ہیں۔ پاپا سے علیحدگی کے کافی عرصے بعد میری ماں نے دوسری شادی کر لی۔ میرے بھائی بہن انہی کے ساتھ تھے لیکن وقت میرے بھائی اور ایک بہن کو پاپا کے پاس کھینچ لایا ہے۔ انہیں سوتیلے اور سگے باپ کے فرق کا احساس تو ہوا ہوگا۔ پاپا کی بڑائی اور شفقت کہ دونوں کے آنے پر انہوں نے ان سے بھولے سے بھی اتنے سال لاتعلق رہنے کا کوئی گلہ نہیں کیا بلکہ انہیں گلے سے لگا لیا۔"

انیقہ نے توقف کیا پھر بولی۔ "میں نے تمہیں یہ سب کچھ اس لیے بتایا ہے عالی کہ میں تمہارے اور اپنے تعلق میں کوئی دراڑ نہیں رکھنا چاہتی۔"

عالیان نے جو محویت سے انیقہ کی بات سن رہا تھا، اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور اسے نہایت محبت سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "آئی لو یو انیقہ تھرو کور آف مائی ہارٹ! لو یو...... ریئلی!"

انیقہ کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو ٹپکے۔

عالیان اس کے آنسو اپنی انگلی کی پور پر لیتے ہوئے بولا۔ "ان سچے موتیوں کو یوں برباد مت کرو۔"

انیقہ دھیرے سے مسکرائی۔ "تو کیا اس وقت کے لیے سنبھال کر رکھوں جب تم مجھے رلاؤ گے۔"

"نیور ان مائی لائف!" اچانک وہ اس موضوع پر آ گیا جو درمیان میں رہ گیا تھا۔ "ہاں تو میرے کزن کے بارے میں کیا کہتی ہو؟"

"پاپا سے بات کروں گی...... دیکھو وہ کیا کہتے ہیں۔"

"جلدی کرنا پھر ایک اور کیس بھی ہے۔" عالیان مسکرایا۔

انیقہ نے شاہ مراد سے بات کی تو وہ بولے۔ "بیٹا! اس معاملے میں انیتا اور تمہاری ماں کی رضا بھی شامل ہونا ضروری ہے۔"

انیقہ تعجب سے ان کا منہ تکنے لگی۔ "انیتا کی رضا تو ضروری ہے مگر...... ان کی رضا کیوں؟"

شاہ مراد نے اسے دیکھا اور متانت سے بولے۔ "تم بچے تو ہم دونوں ہی کے ہو۔"

"میں کم از کم ان کی نہیں...... صرف آپ کی ہوں۔"

"بعض حقائق جھٹلائے نہیں جا سکتے۔"

"پاپا! آپ عالیان کے کزن اور اس کے گھر والوں سے مل لیں...... ملیں گے تو پتا چلے گا کہ کیسے لوگ ہیں۔ انیتا کی شادی ہو جانی چاہیے پاپا...... ایسی بہتر ہے۔"

"اپنی فرصت دیکھ کر انوائٹ کر لو بیٹا!"

"ٹھیک ہے۔"

☆☆☆

انیقہ کو دنیا کی سب سے بڑی فلم انڈسٹری کی ایک فلم

میں مغربی معاشرے میں پلنے بڑھنے والی پاکستانی تارکین وطن گھرانے کی مسلمان لڑکی کا کردار ادا کرنے کی آفر ملی تھی۔ اس کی ہم عصر فنکارائیں اس پر رشک محسوس کررہی تھیں۔ شہرت کا سفر انیقہ نہایت سرعت سے طے کررہی تھی۔ جس مقام تک پہنچنے میں بہت سوں کی عمریں بیت جاتی ہیں اور بہت سے تو کبھی پہنچ ہی نہیں پاتے، انیقہ محض چند ہی سال میں اس مقام تک جا پہنچی تھی۔

''اب تو تم ہمیں کہاں لفٹ کراؤ گی۔'' عالیان نے مذاقاً کہا۔

انیقہ نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ ''تم نہیں جانتے میں محبت کے معاملے میں کتنی کھری ہوں...... جس کا ہاتھ تھام لیا، سو تھام لیا۔''

وہ ابر آلود شام جب اس نے اپنے باپ کا ہاتھ تھاما تھا، آج بھی اس کے تصور میں اپنی پوری سفاکی کے ساتھ حیات تھی۔

''مذاق کررہا ہوں یار!''

''مذاق میں بھی کبھی بے اعتبار نہ سمجھنا مجھے۔''

''اوکے...... اوکے میری......'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''رک کیوں گئے؟''

''اجازت ہے؟''

''قطعاً نہیں...... اچھا سنو...... پاپا کو تمہارا کزن اور اس کے گھر والے اچھے لگے ہیں۔ انیتا کو تمہارے کزن کے ڈائیوورسی ہونے پر تحفظات تھے مگر پاپا نے سمجھایا بجھایا تو وہ بھی راضی ہوگئی۔''

''اوہ، یہ تو بڑی خبر ہے۔ کزن کو مبارک باد دے دوں؟''

''جلدی کیا ہے؟''

''ہے نا جلدی...... تمہاری بہن اور میرے کزن کی ڈم ڈم ہو تو پھر یہ خاکسار بھی تمہارے والد گرامی کے حضور پیش ہونے کے لیے لائن میں لگا ہے۔''

''اس پراجیکٹ کے بعد جس کی خبر نے بہت سے دوستوں کی نیندیں اڑا رکھی ہیں، پاپا سے بات کرنا۔''

''دوستوں یا رقیبوں؟''

''اوہ عالیان! مجھے اس طرح کی باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا مگر لوگوں کے رویے مجبور کردیتے ہیں۔ دل میں کچھ، زبان پر کچھ...... منہ پر کچھ اور پیٹھ پیچھے کچھ۔''

''میرا کزن ایک ماہ کی چھٹی پر ہے۔ دس بارہ دن تو ہوچکے ہیں اسے آئے ہوئے۔ اگر ارادہ ہے تو اسپیڈ لگاؤ۔''

''پاپا کو بتاتی ہوں...... لیکن کیا وہ شادی کرکے لڑکی کو یہیں چھوڑ جائے گا؟''

''وہ تو خود ہی بہتر بتا سکتا ہے۔''

''میں پاپا سے بات کرتی ہوں...... تم ان لوگوں سے پوچھو ان کا کیا ارادہ ہے۔''

''اوکے۔''

☆☆☆

عالیان کے کزن اور گھر والوں کی طرف سے مثبت پیغام ملنے کے بعد شاہ مراد نے انیقہ سے کہا۔

''تمہاری ماں کے علم میں ہونا ضروری ہے۔''

''کیوں ضروری ہے پاپا! انہوں نے ہمارے لیے کیا کیا ہے؟'' انیقہ جارحانہ لہجے میں بولی۔

''اس نے تمہیں جنم دیا ہے...... تمہاری ماں ہے۔''

''میں حیران ہوں پاپا!''

''کس بات پر؟'' شاہ مراد دھیرے سے مسکرائے۔

''انہوں نے آپ کو چھوڑ دیا...... ہم بھائی بہنوں کو تقسیم کردیا...... خود دوسری شادی کرلی اور...... انیتا کو ڈیفینڈ کرنے کے بجائے انہوں نے اپنا گھر بچانے کی پروا کی...... پھر بھی آپ کہتے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہیے۔'' انیقہ کا لہجہ تلخ تھا۔

''میں اب بھی اپنی رائے پر قائم ہوں۔''

''آپ کی مرضی۔'' انیقہ نے ہتھیار ڈال دیے۔ ''بتانا ضروری ہے تو عطرت خالو کے ذریعے بتادیں۔''

''ایسا ہی کچھ کرنا ہوگا۔''

''بس اطلاع کروا دیجیے، اس سے آگے کچھ نہیں۔''

''معاف کرنا سیکھو بیٹا!''

''ظلم بڑا ہو تو معاف کرنے کو دل نہیں چاہتا پاپا!''

عالیان کا کزن بہ مشکل دو ہفتہ اور پاکستان میں تھا پھر اسے سعودی عرب واپس جانا تھا۔ وہ لوگ اس کی واپسی سے قبل شادی کرنا چاہتے تھے تاکہ واپس جاکر اسے اپنی شریکِ حیات کے سفری دستاویزات تیار کرا کے اسے اپنے پاس بلانے میں دقت نہ ہو۔

شاہ مراد عرصہ دراز بعد عالم آرا کے ہاں گئے اور انہوں نے عالم آرا اور عطرت کو جملہ صورتِ حال سے آگاہ کرکے حسن آرا کو مطلع کردینے کی بات کی۔

''حیرت ہے۔ بچوں کو تمہارے پاس آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے نہیں اور تم نے انیتا کی شادی کی ٹھان لی۔'' عالم آرا نے اعتراض کیا۔

''بیٹیاں بڑی ہونے پر جتنی جلدی اپنے گھر کی

ہو جائیں، اچھا ہوتا ہے۔'' شاہ مراد نے کہا۔

''ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ جب دونوں بچے ماں سے لڑ جھگڑ کر تمہارے پاس پہنچے تھے تو تمہیں ان کو شہ نہیں دینی چاہیے تھی۔'' عالم آرا نے دوسرا نکتۂ اعتراض اٹھایا۔

''شہ دینے کی بات نہ تھی...... وہ پریشان تھے، تکلیف میں تھے...... باپ ہونے کے ناتے میرا فرض تھا کہ میں ان کی تکلیف بٹاتا۔'' شاہ مراد نے کہا۔

''سنا ہے انیتا نے ماں سے بہت بدتمیزی کی...... اس کے دوبدو کھڑی ہو گئی...... بیٹیاں کوئی اس طرح کرتی ہیں۔''

''ایسا نہیں ہے۔'' شاہ مراد نے انیتا کا دفاع کیا۔

''ایسا ہی ہے...... دوسری ہیں تو وہ ٹی وی سے اب فلموں تک جا پہنچی ہیں۔ کیا خبر تھی کہ ہمارے خاندان کا یوں نام اچھلے گا۔''

''معافی چاہتا ہوں...... خاندان کا نام برائی سے اچھلتا ہے...... انیقہ کوئی برا کام نہیں کر رہی ہے۔''

''میں بھی معافی چاہتی ہوں...... اچھائی سے تو ہم نے چند برس میں محل بنتے نہیں دیکھے۔''

''وہ اپنے کام، اپنی صلاحیتوں سے اس مقام تک پہنچی ہے عالمہ آپا!''

''ارے بھئی کس بحث میں پڑ گئے تم لوگ۔'' عطرت نے بحث کو لگام دینے کی کوشش کی۔ ''بات ہو رہی تھی انیتا کے رشتے کی۔''

''یہ جانیں، انیتا کی ماں جانے۔'' عالم آرا ہاتھ جھٹک کر بولیں۔

''عطرت بھائی! میں آپ سے یہی درخواست کرنے آیا تھا کہ آپ انیتا کی والدہ کو بتا دیں کہ اس کا رشتہ آیا ہے۔ لڑکا انجینئر ہے...... سعودیہ میں جاب کرتا ہے...... چھٹی پر آیا ہوا ہے...... اس کے جانے سے پہلے وہ لوگ شادی کرنا چاہتے ہیں تاکہ اسے سعودی عرب جا کر اپنی کمپنی سے لڑکی کے سفری دستاویزات بنوانے میں آسانی رہے۔''

''میں بتا دوں گا۔''

''بہت اچھے۔ ماں کو بارہ پتھر دور بٹھا کر بیٹی کی شادی کی جا رہی ہے اور آپ کہتے ہیں بتا دوں گا...... ارے ایسے تو پڑوسیوں کو بھی خبر نہیں دی جاتی۔'' عالم آرا بھڑکیں۔

''آپ کا کہنا بجا مگر میری مجبوری آپ کے سامنے ہے...... کیا میں آپ کی بہن سے ڈسکس کرنے ان کے گھر جا سکتا تھا؟''

''تم نہ جاتے، انیقہ کے پیروں میں مہندی لگی تھی کیا؟''

''اول تو وہ بہت مصروف ہے...... دوسرے وہ ماں کے اتنے نزدیک نہیں ہے جتنے باقی تین بچے رہے۔''

''دکھ بھریں بی فاختہ، کوّے انڈے کھائیں۔'' عالم آرا بڑبڑائیں۔ ''بچوں کا دکھ سکھ حسنہ نے نبیڑا...... شادی کا موقع آیا تو ایرے غیرے انگلی کٹا کے شہیدوں میں نام لکھوانے کو کھڑے ہو گئے۔''

شاہ مراد کو تاؤ آ گیا۔ ''میں ایرا غیرا نہیں ہوں عالمہ آپا...... انیتا میری بیٹی ہے...... ولی ہوں اس کا...... جانتا ہوں اس کے لیے کیا بہتر ہے...... غلط فیصلہ نہیں کروں گا اس کے لیے۔''

''لو بھئی تم تو برا مان گئے۔'' عالم آرا پینترا بدل کر بولیں۔

''برا ماننے کی بات نہیں...... آپ کی بات کا جواب دے رہا ہوں۔'' شاہ مراد نے توقف کیا۔ ''انیتا کے مستقبل کے لیے فیصلہ کرنے کا جتنا حق مجھے ہے، اتنا ہی اس کی والدہ کو بھی ہے۔ میں اسے اس حق سے محروم نہیں رکھنا چاہتا۔''

''واہ بھئی! فیصلہ کر لیا اور اب احسان بھی دھر رہے ہو۔ میری بہن تو بچوں کے معاملے میں بھی بدقسمت رہی۔ چھوٹے تھے تو اس پر بوجھ بنے رہے، بڑے ہوئے تو ہری جھنڈی دکھا کر بھاگ لیے۔''

''کوئی مجبوری ہو گی۔''

☆☆☆

عالم آرا کا خیال تھا بہن کو یہ خبر سنائیں گی تو وہ چراغ پا ہو جائے گی مگر ان کی توقع کے برعکس حسن آرا نے کہا۔ ''اچھا ہے آپا...... انیتا کی شادی ہو جائے گی تو میں بھی سکون سے ہو جاؤں گی۔''

''کیا! کیا کہا تم نے...... اچھا ہے؟'' عالم آرا کو حسن آرا کے ردعمل پر حیرت ہوئی۔

''ہاں نا آپا...... اپنے باپ کے گھر سے رخصت ہو تو اچھا ہے۔''

''جوان تم نے کیا...... رخصت وہ کریں گے۔ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟''

''اچھا ہے رخصت ہو کر باہر چلی جائے گی۔'' حسن آرا بہن کو اصل بات بتانے سے قاصر تھیں۔

''میری سمجھ سے بالا ہے...... کتنی آسانی سے تم اپنے حق سے دستبردار ہو رہی ہو۔ انیتا باپ کے گھر سے رخصت ہو گی تو کیا تم اسے وداع کرنے وہاں جاؤ گی؟''

''نہ بھی گئی تو کیا...... باپ وداع کر دیں گے۔''

''بہت خوب!''

''آپ اور عطرت بھائی فی الحال شعیب کے سامنے یہ تذکرہ مت کیجیے گا۔''

''کیوں بھئی؟''

''انیتا رخصت ہو کر اپنے گھر چلی جائے پھر بتا دوں گی۔''

''تمہارا شوہر ہے...... وہ یہ نہ سوچے گا کہ مجھ سے چھپایا گیا؟''

''میں کہہ دوں گی مجھے بھی علم نہ تھا۔''

''کیوں چھپانا چاہتی ہو...... بتادو۔''

''وہ انیتا اور شاہ تاج کو گھر واپس لانے پر مصر ہیں...... یہ پتا چلا کہ انیتا کی شادی ہو رہی ہے تو وہ کوئی رخنہ نہ کھڑا کر دیں۔''

حسن آرا کی دلیل عالم آرا کے دل کو لگی۔

''ہاں، یہ ہو سکتا ہے۔''

''اس لیے میں چاہتی ہوں کہ ابھی شعیب کو معلوم نہ ہو۔''

مگر انیتا گمنام شخصیت نہ تھی کہ اس کی بہن کی شادی کی خبر راز رہتی۔ میڈیا خبر لے اڑا اور شعیب کو بھی علم ہو گیا۔

''تمہاری مغرور بیٹی کی شادی ہو رہی ہے۔'' شعیب نے حسن آرا سے کہا۔

''کس کی؟'' حسن آرا نے انجان بننے کی کوشش کی۔

''انیتا کی اور کس کی...... جو گھر سے فرار ہو گئی۔''

''کس نے کہا اس کی شادی ہو رہی ہے؟'' حسن آرا انجان بن رہی تھیں۔

''اخبار، سوشل میڈیا، سب کہہ رہے ہیں۔''

''کسی نے افواہ اڑائی ہوگی۔''

''افواہ نہیں...... وہ جو تمہاری ہیروئن بیٹی کا جوڑی دار ہیرو عالیان ہے، اس کے کزن سے۔''

''دفع کریں...... ہمیں کیا۔''

''ہمیں کیوں نہیں...... اتنے سال تمہارے نمک حرام بچے میرے گھر میں عیش کرتے رہے اور اب بھاگ لیے...... انیتا تو انیتا، وہ تمہارا لاڈلا بھی اس باپ کے گلے سے جا لگا جس نے کبھی پوچھا تک نہیں۔''

''شعیب! کس قسم کی باتیں کرنے لگے ہو تم...... کیا ہماری شادی سے پہلے ہم دونوں کے درمیان یہ طے نہیں ہو گیا تھا کہ بچے ہمارے ساتھ رہیں گے اور...... تم نے ان کی کفالت کا خود ذمہ لیا تھا؟''

''اسی غلطی کو تو رو رہا ہوں۔''

''آمینہ رہ گئی ہے...... کہو تو اسے بھی بھجوا دوں اس کے باپ کے پاس؟'' حسن آرا نے شاکی نظروں سے شعیب کو دیکھا۔

''میں تو کہتا ہوں تم بھی چلی جاؤ۔''

حسن آرا شاکڈ رہ گئیں۔

''کیا کہہ رہے ہو شعیب!''

''مذاق نہیں...... تمہارے بچوں کے بعد تو اب مجھے تمہارا بھی اعتبار نہیں رہا ہے...... میں تمہیں طلاق دے دیتا ہوں...... چلی جاؤ اس کے پاس واپس۔''

حسن آرا اس کا منہ تکنے لگیں۔

''مگر یہ مت سمجھنا کہ میں تمہارے بچوں کی نمک حرامی پر چپ ہو کر بیٹھ جاؤں گا۔''

''کیا کرو گے؟''

''یہ تمہیں وقت بتائے گا۔'' اس کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔

حسن آرا خاموش ہو رہیں۔ شعیب سے بحث میں الجھنا مناسب نہ تھا البتہ عالم آرا کو شعیب کے ارادے سے باخبر کرنا ضروری ہو گیا۔ وہ اور عطرت ہی شاہ مراد کو ہوشیار خبردار کر کے انیتا کی شادی کو کھٹ راگ میں پڑنے کی پیش بندی کروا سکتے تھے۔

''نہیں بھئی، ہمیں بچولیا مت بناؤ۔'' عالم آرا نے معذرت کی۔

''آپا! انیتا کے مستقبل کا معاملہ ہے۔''

''شعیب کو افسوس تو ہوا ہوگا نا کہ جن بچوں کو انہوں نے اپنی اولاد کی طرح رکھا...... کھلایا پلایا...... گھمایا پھرایا...... ان کے اخراجات اٹھائے...... وہ اگر روٹھ کر وقتی طور پر شاہ مراد کے پاس پہنچ گئے تو انہوں نے اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر لیا کہ انیتا کا رشتہ اور جلد شادی سب کچھ طے کر دیا۔''

ہر انسان کی زندگی میں ایسے کمزور لمحات ضرور آتے ہیں جب دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے نہ چاہتے ہوئے بھی کسی سے دل کی بات کہنا مجبوری بن جاتی ہے۔ حسن آرا کو بھی ایسے ہی کمزور لمحے کا سامنا تھا۔

''آپا! میں انیتا کی شادی ہو جانے ہی میں اس کی بہتری سمجھتی ہوں۔''

''ایسی جلدی کیا ہے؟''

''کیا بتاؤں آپا...... شعیب کی اصلیت بتاتے مجھے شرم آتی ہے...... وہ کمینہ انسان...... انیتا کے پیچھے لگا ہوا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' عالم آرا ہکا بکا ہو گئیں۔

''اسے اپنے اور انیتا کے رشتے کا احترام نہیں رہا ہے...... اس کی خباثت سے گھبرا کر انیتا گھر سے گئی ہے۔ اچھا ہوا اپنے باپ کے پاس چلی گئی...... لیکن شعیب سے یہ بات ہضم نہیں ہو رہی ہے اسی لیے وہ تلملا رہا ہے۔ کہہ رہا تھا

میں تمہیں طلاق دیتا ہوں، تم بھی اپنے بچوں کے باپ کے پاس واپس چلی جاؤ۔''

''یا اللہ! یہ کیا سن رہی ہوں میں۔'' عالم آرا نے کلیجا تھام لیا۔

''آپ کے ہاں بھیجا تھا میں نے انیتا کو، تب وہ منحوس آدمی اسے زبردستی یہاں سے لے گیا تھا۔''

''تم نے تب کیوں نہیں بتایا مجھے...... میں ایک سے ہزار انیتا کو یہاں سے نہ جانے دیتی۔''

''کیا کرتی آپا...... دامن اٹھاؤ تو اپنا ہی پیٹ ننگا ہوتا ہے...... مجھے اپنا گھر بھی تو بچانا تھا۔''

''اپنا گھر بچانے کے چکر میں تم نے بیٹی کی عزت داؤ پر لگائے رکھی۔'' عالم آرا نے ناگواری ظاہر کی۔

حسن آرا کو اپنے دفاع میں کہنے کو کچھ نہ تھا۔

''خیر، تم پریشان مت ہو۔'' عالم آرا نے بہن کو تسلی دی۔ ''اب تو میں بھی یہی سمجھتی ہوں کہ ان حالات میں انیتا کا شاہ مراد کے پاس چلے جانا ہی بہتر تھا۔''

''مجھے ڈر ہے آپا کہ شعیب اب انیتا کی شادی میں کوئی رخنہ نہ ڈال دے۔'' حسن آرا نے فکرمندی ظاہر کی۔

''کیا رخنہ ڈالے گا؟''

''اس نے کہا ہے کہ یہ مت سمجھنا میں چپ ہو کر بیٹھ جاؤں گا۔''

''تم پوچھتیں کہ کیا کرو گے؟''

''پوچھا تھا...... کہنے لگا یہ تمہیں وقت بتائے گا۔''

''ارے چھوڑو حسنہ...... جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں، ہاں البتہ یہ بھی سچ ہے کہ دشمن کو کبھی بھی سویا ہوا نہ سمجھو۔''

''خدا کرے انیتا کی شادی خیریت سے ہو جائے۔''

''ہو جائے گی...... ہو جائے گی...... تم فکر نہ کرو۔ شاہ مراد اور انیقہ وہاں ہیں۔ خدانخواستہ شعیب نے کچھ گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو دونوں سنبھال لیں گے۔ شاہ مراد جب انیتا کی شادی کا بتانے ہمارے ہاں آئے تو عطرت سے کہہ رہے تھے، انیقہ کے اتنے تعلقات ہیں کہ اس کے ایک فون پر دنوں کا کام منٹوں میں ہو جاتا ہے۔ البتہ شاہ مراد اور انیقہ کا شعیب کے ارادے سے آگاہ ہونا ضروری ہے تاکہ وہ اس کے شر سے نمٹنے کے لیے کوئی پیش بندی کر سکیں۔''

''عطرت بھائی ہی بتا سکتے ہیں انہیں۔''

''ہاں...... میں ان سے کہوں گی...... لیکن سچی بات یہ ہے حسنہ کہ شعیب جیسے رذیل آدمی سے شادی کرنے سے تو بہتر تھا کہ تم اپنے بچوں ہی کو لیے بیٹھی رہتیں۔ بچوں کی

راز کی بات

سلیمان بن وہب خلیفہ بغداد کا وزیر تھا۔ اس کی عادت تھی کہ وہ جلد جلد علاقوں کے عاملوں کو بدلتا رہتا تھا۔ ایک کو مقرر کرتا تو چند دنوں بعد اسے معزول کر کے کسی اور کو بھیج دیتا۔ ایک دن ایک شخص کی درخواست پر سلیمان نے اسے کسی جگہ کا عہدہ دے کر بھیجا۔ جب وہ جانے لگا تو سلیمان کا شکریہ ادا کرنے کے بعد اس نے کہا کہ علیحدگی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

سلیمان نے کہا۔ ''ہاں کہو۔''

اس شخص نے آہستہ سے اس کے کان میں کہا۔

''گھوڑا صرف جانے کے لیے کرائے پر لوں یا آنے کے لیے بھی کرایہ طے کر لوں؟''

سلیمان بہت ہنسا اور عہدیداروں کو جلد جلد تبدیل کرنا بند کر دیا۔

(مرسلہ: ناہید یوسف، اسلام آباد)

برٹرینڈ رسل نے کہا

سب سے زیادہ تسلی بخش مقاصد وہ ہیں جو ایک کامیابی سے دوسری تک جاری رہیں اور یہ سلسلہ ختم نہ ہو۔

مارنا ہے تو جڑ پر مارو شاخیں خود بخود گر جائیں گی۔

سب سے بڑی مصیبت اور عذاب یہ ہے کہ بے وقوف لوگ پُریقین ہیں اور عقل مند شک و شبے میں گھرے ہوئے ہیں۔

جو مر چکے ہیں ان کے گُن میں نے ان کی نسبت زیادہ گائے ہیں جو زندہ ہیں۔

جسے زندگی کا ذوق و شوق ہے وہ ناگوار تجربات سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے۔

اکثر اوقات غیر ضروری بزدلی کے باعث کوئی مشکل بدترین شکل اختیار کر جاتی ہے۔

کسی کو فائدہ پہنچانے سے ہماری غرض اتنی پاک نہیں ہوتی جتنی ہم سمجھتے ہیں۔

(مرسلہ: جہانگیر بدر، راولپنڈی)

عزت تو محفوظ رہتی۔ مجھے تو اب امینہ کی فکر ستانے لگی ہے...... ماشاء اللہ وہ بھی اب بڑی ہے۔''

''انیتا خیریت سے اپنے گھر کی ہو جائے، امینہ کو میں خود بھیج دوں گی اس کے باپ کے پاس۔''

''عقلمندی یہی ہے...... بلکہ اب تو میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں حسنہ کہ تم اگر شاہ مراد کے ساتھ رہتے ہوئے تھوڑے سے صبر اور برداشت سے کام لیتیں تو آج یہ سب کچھ نہ ہوتا...... تم بھی اپنے گھر میں عزت سے بیٹھی ہوتیں اور بچے بھی یوں نہ بکھرتے...... امینہ تمہارے ساتھ اور تین بچے باپ کے پاس...... شاہ مراد شریف آدمی ہیں جو بچوں کو گلے لگا لیا ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ اتنے سال اولاد کی بے مروتی سہنے کے بعد دوسرا کوئی آدمی تو پلٹ کر بھی نہ دیکھتا ان کی طرف۔''

حسن آرا سانس روکے دم بخود سنتی رہیں۔ عالم آرا جو کہہ رہی تھیں، سچ تھا مگر یہی بہن تو تھیں جو انہیں شاہ مراد کی ہزار خامیاں اور کوتاہیاں گنواتے نہ تھکتی تھیں۔ وہی تو بار بار کہتی تھیں...... شاہ مراد سے اپنی جان چھڑاؤ...... اب بھی دوسرا کوئی بہتر آدمی مل جائے گا تمہیں...... مل تو گیا تھا دوسرا آدمی مگر...... کیسا تھا۔ حسن آرا اور ان کے بچوں کے علاوہ کون جانتا تھا...... اس کی ظاہری شاندار شخصیت کی آڑ میں کیسی بدنمائی چھپی تھی۔

☆☆☆

فلمی منظر تھا...... جیسے فلم میں ولن ''یہ شادی نہیں ہوسکتی'' کی دھمکی دیتا منظر میں آتا ہے، انیتا کے نکاح کی تقریب میں یہ کردار شعیب نے ادا کیا۔ رخصتی اگلے دن تھی۔ نکاح کی تقریب ایک دن قبل مقامی ہوٹل میں تھی۔ شعیب پولیس کے ساتھ اچانک وارد ہوا۔ اس کا کہنا تھا جس لڑکی کا نکاح پڑھایا جانا تھا، وہ اس کی سوتیلی بیٹی تھی جسے اس کے باپ نے اغوا کروا کے زبردستی اس کا نکاح کردینے کا بندوبست کر رکھا تھا۔

شاہ مراد، انیقہ اور عالیان کسی بھی افتاد کا سامنا کرنے کو چوکس تھے۔ عطرت نے شاہ مراد اور انیقہ کو باخبر کر دیا تھا اور ان دونوں نے عالیان کو اعتماد میں لینا ضروری سمجھا تھا۔ دلہا اور اس کے متعلقین کو وہی سنبھال سکتا تھا۔ عالیان نے ان لوگوں سے کہہ دیا تھا کوئی غیر متوقع صورت حال سامنے آئے تو پریشان نہ ہوں۔

عالیان کی پولیس کے ایک اعلیٰ عہدیدار کے بیٹے سے دوستی تھی اور انیقہ کی رسائی اقتدار کے اعلیٰ ایوانوں تک تھی۔ نکاح کی تقریب کچھ دیر التوا میں ضرور رہی مگر حکام بالا کے احکامات ملتے ہی شعیب کے ساتھ آئے پولیس والوں نے شعیب کی دادرسی سے ہاتھ اٹھالیے۔ شعیب کو منہ کی کھانی پڑی۔ دانت پیستا اور پھنکاریں مارتا، بے نیل مرام واپس لوٹا...... اپنی اس تذلیل کا سارا غصہ اسے حسن آرا پر تھا۔ اسے غصہ تھا کہ انیتا کے اغوا کا ڈراما رچانے میں حسن آرا نے اس کے ساتھ سامنے آ کر شاہ مراد کے خلاف مدعیت سے انکار نہ کیا ہوتا تو حالات کا رخ کچھ اور ہوتا...... شاید ماں کے سامنے انیتا پسیج جاتی۔ پولیس کو یہ بیان نہ دیتی کہ اس کے اغوا کا الزام جھوٹ تھا۔ وہ اپنے بھائی کے ساتھ اپنی مرضی سے باپ کے پاس آئی تھی۔ گھر واپس آ کر شعیب، حسن آرا پر بھڑک اٹھا۔ ''تم نے خود بھگایا ہے اسے گھر سے۔''

''شعیب! خدا کی قسم میں نے نہیں بھیجا...... وہ خود وہاں گئے۔ میں تو یہ سمجھ رہی تھی کہ وہ عالمہ آپا کے ہاں گئے ہوں گے...... مجھے کیا پتا تھا کہ وہ وہاں جا پہنچیں گے۔''

''تم نے اپنی مدعیت میں انیتا کے اغوا کی رپورٹ درج کرانے کے لیے میرے ساتھ چلنے سے انکار کیوں کیا؟''

''کیونکہ میں وہاں جانا نہیں چاہتی تھی۔''

''کیوں جانا نہیں چاہتی تھیں؟''

''جس شخص سے میرا کوئی تعلق نہیں رہا، میں اس کے سامنے کیوں جاتی؟''

''تمہاری بیٹی بھی تو ہے وہاں...... گھر تو اسی کا ہے۔''

''وہ اپنے باپ کی بیٹی ہے...... اس نے مجھے ماں سمجھا ہوتا تو باقی تین کی طرح میرے ساتھ ہوتی...... اس نے تو ہمیشہ اپنے باپ کا ساتھ دیا۔''

''کہانیاں مت سناؤ مجھے...... تم اس شخص کی نہیں بنیں جو تمہارے چار بچوں کا باپ تھا تو میری کیا بنو گی...... تم ایک چالاک، مکار اور خود غرض عورت ہو۔''

''شعیب!'' حسن آرا نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔

''اگر تم وفادار ہوتیں تو میرا ساتھ دیتیں...... میرے ساتھ جا کر اس شخص کے خلاف ایف آئی آر درج کراتیں۔ تم سامنے ہوتیں تو کیس زیادہ مضبوط ہوتا...... تمہاری ہیروئن بیٹی کے لیے ہاتھ چھوٹے پڑ جاتے...... اپنے کسی پاورفل یار سے فون کرایا اس نے اور میرے ساتھ گئی پولیس ٹس ہوگئی۔''

''زبان کو لگام دو شعیب!''

شعیب کا ہاتھ اٹھا اور حسن آرا کے چہرے پر پڑا۔ اتنی شدید ضرب تھی کہ حسن آرا بلبلا اٹھیں۔

''تم نے مجھے مارا...... تم نے مجھے مارا؟'' وہ اپنے چہرے کا دایاں حصہ سہلاتے ہوئے ہیجانی کیفیت میں چلائیں۔

"میں تمہیں قتل بھی کرسکتا ہوں۔" شعیب غصے میں پاگل ہوا جا رہا تھا۔

"کردو...... کردو مجھے قتل۔" حسن آرا نے شعیب کا گریبان پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔ "تم جیسے آدمی کے ساتھ رہنے سے میرا مر جانا ہی بہتر ہے۔"

"اتنی آسانی سے نہیں ماروں گا...... بوٹی بوٹی کروں گا تمہاری...... اور دنیا کو بتادوں گا کہ بے وفا عورت کا انجام یہی ہوتا ہے۔"

"مجھے گالی مت دو شعیب!"

"گالی!" شعیب نے حسن آرا کو حقارت سے دیکھا۔ "بے وفا تو میں مروتاً کہہ رہا ہوں...... تم تو اس سے بھی آگے کی چیز ہو...... شوہر کو تو چھوڑا، ایک بیٹی کو بھی کبھی پلٹ کر نہیں پوچھا...... کیسی ماں ہو۔"

"تمہیں ہمدردی کیوں ہو رہی ہے؟"

"کیونکہ میں نے تمہارا اصلی چہرہ دیکھ لیا ہے۔"

"تم کیا دیکھو گے میرا اصلی چہرہ...... میں نے دیکھ لیا ہے تمہارا اصلی چہرہ۔"

"بکواس مت کرو۔"

"جب تم فضول طعن و تشنیع کرو گے تو میں بھی چپ نہیں رہوں گی۔"

"تمہارے بولنے کا وقت ختم ہو چکا ہے...... اب میرے بولنے کا وقت ہے...... چھٹی کرتا ہوں تمہاری۔"

"نہیں شعیب...... !تم ایسا نہیں کرسکتے۔" حسن آرا نے ہڑبڑا کر اسے دیکھا۔

"میں سو فیصد ایسا کرسکتا ہوں۔" اس نے حسن آرا کو استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔ "میں تمہیں طلاق دے رہا ہوں۔"

"نہیں...... نہیں شعیب...... ایسا مت کرو۔" حسن آرا دونوں ہاتھ جوڑ کر گڑگڑائیں۔

"میں نے تمہیں طلاق دی حسن آرا بیگم!"

"پلیز شعیب...... !" حسن آرا رونے لگیں۔

"میں نے تمہیں طلاق دی۔"

حسن آرا دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامتی ریت کی دیوار کی طرح ڈھیر ہو گئیں۔

"اب تم میرے گھر سے جا سکتی ہو۔"

مکافات عمل!

ایک وہ وقت تھا جب وہ شاہ مراد کا گھر چھوڑ کر جا رہی تھیں اور شاہ مراد انہیں روکنا چاہتے تھے...... اور ایک یہ وقت کہ شعیب انہیں اپنے گھر سے جانے کو کہہ رہا تھا اور حسن آرا کے پاس اس کے گھر میں رکنے کا کوئی جواز نہ رہا تھا۔

"اپنا سامان تم ابھی لے جانا چاہو تو ابھی لے جا سکتی ہو...... ورنہ جب لے جانا ہو، مجھے بتا دینا تاکہ میں گھر میں موجود رہوں۔"

حسن آرا بلک بلک کر رونے لگیں۔ شعیب کمرے سے چلا گیا۔

امینہ، حسن آرا کے پاس آبیٹھی۔ "مت روئیں ماما!" اس نے ماں کو تسلی دینا چاہی۔ حسن آرا نے اسے گلے لگالیا اور زیادہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

شعیب دوبارہ کمرے میں آگیا۔

"زیادہ ڈرامے بازی کی ضرورت نہیں...... میں تمہاری بہن کے گھر تک تم ماں بیٹی کو ڈراپ کرسکتا ہوں۔"

حسن آرا نے اسے ایک لمحے کو دیکھا پھر ہیجانی کیفیت میں تڑپ کر چلائیں۔ "نہیں...... میں خود چلی جاؤں گی۔"

"جاؤ...... پیچھا چھوڑو میرا۔" وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر نہایت بیزاری سے بولا۔

حسن آرا رونا بھول کر اس کا منہ دیکھنے لگیں۔ یہ وہی شخص تھا جو شادی سے پہلے ان سے ہزار وعدے وعید اور زندگی بھر ساتھ نباہنے کی باتیں کیا کرتا تھا۔

وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح ٹوٹے قدموں سے اس کے گھر سے جانے کو اٹھیں۔ امینہ ان کے ساتھ تھی۔

بھری دنیا میں ایک ہی ٹھکانا تھا جہاں وہ جا سکتی تھیں...... عالم آرا کا گھر...... مگر وہاں عطرت تھے۔ بہن تو اپنی تھی مگر بہنوئی پرایا...... ان کا سامنا کرنے کے خیال سے حسن آرا کو شرمندگی ہو رہی تھی۔ کیا سوچتے وہ کہ دوسرے شوہر کا گھر بھی نہ بسا سکی...... پھر آ گئی...... ان کے ذریعے شاہ مراد کو خبر ملنے کا خیال اور بھی روح فرسا تھا۔

ٹیکسی عالم آرا کے گھر جانے ہی کو لی مگر گھر کے اندر جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ بہت دیر تک آس پاس ہی منڈلاتی رہیں پھر ایک قریبی پارک میں جا کر دھواں دھار روئیں۔

امینہ بہت پریشان ہو رہی تھی۔ "ماما! مت روئیں نا پلیز۔" وہ بار بار گڑگڑا رہی تھی۔ امینہ کا دم انہیں اس وقت نہایت غنیمت لگ رہا تھا۔ وہ ساتھ نہ ہوتی تو اس وقت کوئی اور تسلی دینے والا بھی نہ تھا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی حسن آرا کو بہن کے گھر ہی جانا پڑا...... کوئی اور ٹھکانا نہ تھا۔ عالم آرا بہن کی حالت دیکھ کر شاکڈ رہ گئیں۔ شاہ مراد سے علیحدگی کا فیصلہ کرکے جب وہ

ان کے گھر آئی تھیں تب ان کا طنطنہ ایسا تھا جیسے دنیا کو اپنے جوتے کی نوک پر سمجھتی ہوں مگر اس بار اپنا گھر بگڑنے پر وہ یوں ٹوٹی اور بکھری ہوئی تھیں جیسے دنیا نے انہیں اپنے جوتے کی نوک پر لے کر اچھال دیا ہو۔

اپنا گھر ٹوٹنے سے بچانے کی خاطر حسن آرا نے جس جوان بیٹی کو گھر سے نکل جانے پر مجبور کر دیا تھا، وہ باپ کے پاس جا کر نہ صرف محفوظ و مامون بلکہ اپنے گھر کی بھی ہو گئی تھی۔ نکاح کی تقریب میں نکاح خوانی سے قبل شعیب کی رخنہ اندازی سے پیدا شدہ بدمزگی نے دُلہا اور اس کے ساتھ آئے لوگوں کو اس حد تک بدکا دیا تھا کہ اگر عالیان درمیان میں نہ ہوتا تو شاید تقریب کھٹائی میں پڑ جاتی لیکن عالیان نے ان لوگوں کو نہ صرف ٹھنڈا کیا بلکہ رخصتی کو التوا میں رکھنے کے بجائے فوری رخصتی پر بھی آمادہ کیا۔ شاہ مراد اور انیقہ کو بھی اس نے سمجھایا کہ آئندہ کسی پیچیدگی سے بچنے کے لیے انیتا کو رخصت کر دینا ہی بہتر تھا...... میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی!

انیتا رخصت بھی ہو گئی۔

حسن آرا اپنا گھر ٹوٹنے سے نہ بچا سکی تھیں۔

☆☆☆

حسن آرا کو طلاق کا معاملہ شاہ مراد، انیقہ، شاہ تاج اور انیتا کو بھی پتا چل گیا۔ خبر رساں عطرت تھے جنہوں نے شاہ مراد، حسن آرا اور ان کے بچوں کی زندگی کے تمام اتار چڑھاؤ کے باوجود شاہ مراد سے اپنے دوستانہ تعلق کو ہمیشہ نہایت مروت سے سنبھال کر رکھا تھا۔ شاہ مراد کے کڑے وقت میں انہوں نے دامے، درمے، سخنے ان کا ساتھ دیا تھا۔ ان کی بیروزگاری کے زمانے میں وہ بچوں کے لیے پھل فروٹ اور مٹھائی کے بہانے زبردستی ان کی مٹھی میں پیسے دبا دیا کرتے تھے۔ خاندانی آدمی کا طریق یہی ہوتا ہے کہ وہ دوسرے کی عزتِ نفس پر آنچ نہیں آنے دیتا۔ شاہ مراد آج بھی ان سے اپنی ممنونیت کا اکثر اظہار کرتے تھے۔

شعیب کی طرف سے حسن آرا کو طلاق کی خبر سن کر شاہ مراد دم بخود رہ گئے۔ انیقہ نے سنا تو بولی۔ ''بہت اچھا ہوا۔''

شاہ مراد اسے حیرانی سے دیکھنے لگے۔ ''یہ خوش ہونے والی بات تو نہیں بیٹا!''

''ناخوش ہونے والی بھی نہیں پاپا...... انہیں اب آپ کی قدر آئے گی۔'' حسن آرا کے لیے انیقہ صیغۂ غائب استعمال کرتی تھی۔

''گھر کا ٹوٹنا کسی بھی عورت کے لیے بہت بڑا صدمہ ہوتا ہے۔''

''ہر عورت کے لیے نہیں پاپا...... آپ سے تو انہوں نے خود زبردستی ڈیوورس لی تھی۔''

شاہ مراد چپ رہے۔ جانتے تھے کہ حسن آرا اور ان کی علیحدگی کے بعد ان کے چاروں بچوں میں کٹھن وقت کی سب سے زیادہ سختی اور ماں کی محبت سے محرومی انیقہ نے سہی تھی۔ حسن آرا نے کبھی پلٹ کر اس کی خبر لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ماں کے لیے اس کے دل میں نرم گوشے سخت ہو چکے تھے۔

شاہ تاج سے انہوں نے کہا۔ ''تمہیں اپنی ماں کے پاس جانا چاہیے...... انہیں اس وقت تمہاری ضرورت ہے۔''

''یہ کیا کرے گا پاپا؟'' انیقہ آڑے آئی۔

''ماں جب کسی صدمے میں ہو تو اس کے لیے سب سے بڑا سہارا اس کی اولاد ہوتی ہے۔''

''امینہ ہے نا ان کے پاس۔''

''ماں کو جو تسلی بیٹے سے ملتی ہے، وہ بیٹی سے نہیں ملتی۔''

''یعنی ہم بیٹیاں بیکار شے ہیں؟''

''ایسی بات نہیں...... میں عورت کی سائیکی بیان کر رہا ہوں۔ بیٹی کی قدر و قیمت کوئی مجھ سے پوچھے...... تم میرے ساتھ نہ ہوتیں تو میں...... میں آج نہ جانے کہاں ہوتا۔ تم نے میرے قدم نہیں اکھڑنے دیے بیٹا...... گرم و سرد میں میرا ساتھ دیا...... ایک مرتبہ میرا ہاتھ پکڑا تو پھر چھوڑا نہیں...... تم نے مجھے جینے کا حوصلہ دیا میری بیٹی!''

''آئی لو یو پاپا!'' انیقہ باپ کے سینے سے جا لگی۔ ''میں آج جو کچھ بھی ہوں، آپ ہی کی بدولت ہوں۔ آپ نے قدم قدم پر میرا خیال رکھا...... مجھے اکیلا نہیں ہونے دیا۔ انیتا سب کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی غیر محفوظ ہو گئی اور آپ نے میرے اکیلے پن کے باوجود مجھے پورا تحفظ دیا۔''

''تم میری ذمے داری تھیں بیٹا!''

''انہوں نے انیتا کے لیے ایسا کیوں نہیں سوچا...... انیتا کہتی ہے انہیں تو بس اپنا گھر بچانے کی فکر رہتی تھی...... گھر پھر بھی نہیں بچ سکا...... بہت اچھا ہوا...... میں خوش ہوں۔''

''ایک بات کہوں؟''

انیقہ باپ کا منہ دیکھنے لگی۔

''وہ تمہاری ماں ہیں۔''

''میں بھی تو ان کی بیٹی تھی اور آپ ان کے شوہر۔''

''درگزر کر دینے والا سکون پاتا ہے۔''

''میں نہیں بھول سکتی پاپا کہ شام کو جب آپ تھکے ماندے اور اداس گھر لوٹتے تھے تو میرا دل آپ کے لیے کتنا

دکھی ہوتا تھا۔"

"اب تو خوش ہو؟"

انیقہ نے ایک گہری سانس کھینچی۔ "دکھ کب بھلائے جاتے ہیں پاپا!"

"تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ حالات نے تمہیں تمہاری عمر سے زیادہ میچورٹی دے دی ہے۔"

"واپسی مشکل ہے۔"

"عالیان کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"کیا مطلب!" اس نے چونک کر باپ کو دیکھا...... عالیان کے ذکر کا کیا موقع تھا۔

"اس نے آج ہی بات کی ہے مجھ سے۔"

"کس سلسلے میں؟"

"وہ تم سے شادی کا خواہشمند ہے۔"

"پوچھوں گی اس سے...... ایسی جلدی کیوں ہے اسے۔"

"اسے کچھ مت کہنا۔"

"کیوں؟"

"کبھی کبھی ہلکی سی ٹھیس کانچ کے خوبصورت گلدان کو پارہ پارہ کردیتی ہے۔ وہ چاہتا تو مجھ پر اپنی خواہش کا اظہار خود تمہارے ذریعے کرواسکتا تھا لیکن اس نے روایت کی پاسداری کی...... مجھے خوشی ہے...... ہاں کردوں؟"

"آپ کی مرضی۔"

"نہیں نہیں...... اس معاملے میں بنیادی اہمیت تمہاری مرضی کی ہے۔ ویسے تو خیر مجھے اندازہ ہے کہ تم بھی اسے پسند کرتی ہو۔"

"جب اندازہ ہے تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"تاکہ کل تم یہ نہ کہو کہ مجھ سے تو پوچھا ہی نہیں گیا۔"

"آپ سے بہتر مجھے کون جانتا ہے پاپا...... یو آر گریٹ!"

☆☆☆

شاہ تاج ماں کے پاس گیا ضرور مگر جلد ہی لوٹ آیا...... عالم آرا کے گھر میں وہ پہلے بھی ماں اور بہنوں کے ساتھ رہا تھا لیکن اس گھر میں اسے کبھی اپنا گھر ہونے کا احساس نہیں رہا تھا۔ خالہ کا گھر...... وہ اس گھر کو ہمیشہ خالہ کا گھر ہی کہتا تھا۔ باپ اور بہن کے ساتھ رہنے سے اسے اپنے گھر میں رہنے کا احساس ہوا تھا۔ امینہ بھی اس کے ساتھ آئی تھی...... ڈری، سہمی اور جھینپی جھینپی سی...... شاہ مراد اور انیقہ دونوں نے ہی اپنی گرمجوشی سے اس کی جھینپ مٹانے کی کوشش کی۔ انیتا بھی اپنے شوہر کے ہمراہ اس سے ملنے کے لیے آئی۔ شاہ مراد جس طرح اب اپنے بچوں کے جھرمٹ میں تھے، ایسے تو حسن آرا کے ساتھ رہتے ہوئے بھی نہ رہے تھے۔ انیقہ بھی بھائی بہنوں کے آجانے سے خوش تھی۔ اسے غیر ملکی فلم میں کام کرنے کی جو پیشکش ہوئی تھی، اس سلسلے میں ابتدائی گفت وشنید تو ہوچکی تھی مگر مزید پیشرفت کے لیے اسے بیرون ملک جانا اور وہاں کام کرنے کے لیے اپنی درون وطن مصروفیات کو بھی پیش نظر رکھنا تھا۔ ایک غیر ملکی فلم میں کام کرنے کے لیے اپنی زمین پر ملنے والے متعدد مواقع کو کھودینا عقلمندی نہ ہوتی۔ عالیان چاہتا تھا اس کے بیرون ملک جانے سے پہلے اس کی اور انیقہ کی شادی ہوجائے۔ خود شاہ مراد بھی یہی چاہتے تھے۔ باہر یہاں کی طرح کام تھوڑی ہوتا ہے...... ہر ہر کام کے لیے منضبط ٹیم یہاں ایک اسکرپٹ رائٹر جو کام کرتا ہے، وہاں بیس، پچیس پچیس افراد اسکرپٹ پر کام کرتے ہیں۔ کوئی منظر نامہ نگار تو کوئی مکالمہ نگار اور مزید نوک پلک سنوارنے کے لیے اس سے آگے کے لوگ...... ایک ایک فریم پر عرق ریزی سے کام کیا جاتا ہے۔ انیقہ بیرون ملک کام کرنے کا معاہدہ کرلیتی تو نہ جانے کب تک کے لیے مصروف ہوجاتی۔ شاہ مراد کو اس کے شوبز کیریئر سے زیادہ اس کا گھر بسانے کی فکر تھی۔ یقیناً اس لیے کہ وہ باپ تھے اور شاید اس لیے بھی کہ ستاروں کی دنیا کی طوطا چشمی اور بے مروتی کا زہر اب انہوں نے نہ صرف اوروں کو پیتے دیکھا تھا بلکہ خود بھی اس کی زہرناکی کا شکار رہے تھے۔ عورت کا اصل مقام اس کا گھر...... اس کے سر کا تاج اس کا شوہر...... اس کے مستقبل کا تحفظ تربیت یافتہ اچھی اولاد...... ایک عرصہ فلمی دنیا میں گزارنے پر شاہ مراد نے یہ بھی بہت نزدیک سے دیکھا تھا کہ اکثر مرد کس کس طرح سے عورت کا استحصال کرتے ہیں۔ انیقہ کا شوبز میں جانا اس کی قسمت کا لکھا ہی تھا اور نہ باپ ہونے کے ناتے شاہ مراد تو اس خیال میں تھے کہ انیقہ کے لیے کوئی مناسب رشتہ ملتا تو اس کے فرض سے سبکدوش ہونے میں تاخیر سے کام نہیں لیں گے۔

عالیان انہیں پسند تھا، ان کے دل کو لگتا تھا۔ انیقہ کے ساتھ اس کی ذہنی ہم آہنگی بھی تھی۔ انیقہ غیر ملکی فلم میں کام کے لیے نہایت پُرجوش تھی۔ شاہ مراد چاہتے تھے اس پراجیکٹ میں اس کی مصروفیت سے قبل اس کی شادی ہوجائے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا تھا جب کسی اداکارہ کا شادی کرلینا اس کے کیریئر کا اختتام سمجھا جاتا تھا۔ اب تو روایت یہ چل پڑی تھی کہ شوبز میں آنے والی لڑکیاں مناسب رشتہ ملتے ہی شادی کرنے میں دیر نہ کرتیں...... روایات بدل گئی تھیں۔

☆☆☆

شعیب سے طلاق کے بعد حسن آرا کچھ دن تو بھی

بھی رہیں پھر وہی اسیرِ ذات، وہی روز و شب...... خود پسندی ان کا وتیرہ تھا۔ جب تک شاہ مراد کے ساتھ رہیں، اپنی ذات ان کے لیے سب سے مقدم رہی۔ اسی ذات کے لیے کبھی کبھی بچوں کے حق میں بھی ڈنڈی مار جاتی تھیں۔ شعیب سے شادی کے بعد بھی اپنی خود پرستی سے دامن نہ چھڑا سکیں ورنہ انیتا نے جب پہلی مرتبہ ان سے شعیب کے نامناسب رویے کی شکایت کی تھی تبھی اسے خاموش رہنے کی تنبیہ کرنے کے بجائے فوری اقدام کرتیں۔ بیٹی کی عزت پر اپنا گھر بچانے کو ترجیح دینے کے بجائے شعیب سے از خود پیچھا چھڑا لیتیں...... نتیجہ بہرحال تب بھی وہی آنا تھا جو کہ اب آیا۔ اب چاروں بچے ہی شاہ مراد کے ساتھ تھے اور وہ خود کو ان کی ذمے داری سے آزاد محسوس کر رہی تھیں۔ عالم آرا تھیں تو بہن مگر سالہا سال کے ساتھ نے حسن آرا کی خود پرستی ان پر بھی عیاں کر دی تھی۔ وقت خود انصاف کرتا ہے اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دکھاتا ہے۔ وہی عالم آرا جو بھی حسن آرا کو شاہ مراد کی خامیاں اور کوتاہیاں گنواتے نہ تھکتی تھیں، اب برملا شاہ مراد کی انسانیت، شرافت اور نجابت کا اعتراف کرتیں۔

"چراغ لے کر ڈھونڈے سے نہ ملے گا شاہ مراد سا شریف اور نجیب الطرفین آدمی۔" ایک روز انہوں نے کہا تو حسن آرا تڑپ کر بولیں۔

"آپا! شاہ مراد میں اب آپ کو اتنی خوبیاں کیوں نظر آنے لگی ہیں؟"

"آدمی کے عیب و ثواب وقت کے ساتھ کھلتے ہیں حسنہ......! بُرا مت ماننا، تم اگر کچھ وقت صبر و شکر سے گزار لیتیں شاہ مراد کے ساتھ تو یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا۔ مجھے تو تم سے زیادہ تمہارے بچوں سے ہمدردی محسوس ہوتی ہے۔ بے چارے کبھی تمہارے پاس، کبھی سوتیلے باپ کے رحم و کرم پر، کبھی اپنے باپ کے پاس...... اب شاہ مراد کے پاس ہی رہیں تو اچھا ہے۔ باپ سر پر تھا تو اس نے انیتا کو نمٹا دیا۔ تم بھلا کیا کرتیں...... سوتیلے باپ کی تو نیت ہی اور تھی۔ خدا بچائے ایسے مردوں سے...... ویسے بُرا مت ماننا حسنہ......! بیٹیوں کا ساتھ ہو تو عورت کو دوسری شادی سے گریز ہی کرنا چاہیے...... دوسرے مرد کی نیت کا اعتبار نہیں ہوتا۔"

"عورت جوان ہو تو بیٹیاں تو اپنے گھر چلی جاتی ہیں...... اکیلی عورت بے چاری کا ٹھکانا کہاں۔" حسن آرا نے شعیب سے اپنی شادی کا جواز پیش کر کے بہن کے اعتراض کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی۔

"اب ٹھکانا کہاں۔" عالم آرا نے فقط اتنا ہی کہا۔

حسن آرا لاجواب ہو کر ان کا منہ دیکھنے لگیں۔

☆☆☆

انیقہ کی بیرونِ ملک پراجیکٹ میں مصروفیت سے قبل عالیان اس سے شادی کر لینا چاہتا تھا۔

"تمہیں ڈر ہے کہ میں کہیں اور انوالو نہ ہو جاؤں۔" انیقہ نے اس سے کہا۔

"ہاں، یہی سمجھ لو۔"

"تمہیں یاد ہوگا میں نے تم سے کہا تھا...... میں محبت کے سلسلے میں بہت کھری ہوں۔"

"ہاں، مجھے یاد ہے۔"

"تم سے شادی کے لیے میری ایک شرط ہوگی۔"

"وہ کیا؟"

"پاپا، شاہ تاج اور امینہ میرے ساتھ رہیں گے۔"

"نو پرابلم...... بہت بڑا گھر ہے میرا۔"

"عالیان! پاپا کسی قیمت پر تمہارے گھر میں رہنے کو راضی نہ ہوں گے۔"

"کیوں؟"

"پاپا اپنے اصولوں کے ساتھ رہنے والے آدمی ہیں...... انہیں بیٹی کے سسرال میں رہنا ہرگز گوارا نہ ہوگا۔ تمہیں اس سلسلے میں میرے ساتھ کو آپریٹ کرنا ہوگا۔ ہم دونوں شادی کے بعد دونوں گھروں میں رہا کریں گے۔ میرا مطلب ہے کبھی میں تمہارے گھر میں تمہارے ساتھ اور کبھی تم میرے گھر والوں کے ساتھ۔"

"نو پرابلم...... ویسے بھی ہم دونوں کو گھر میں رہنے کے لیے زیادہ وقت کب ملتا ہے۔"

"تھینک یو عالیان!"

"تمہارا ہر مسئلہ میرا مسئلہ ہے انیقہ...... میں جانتا ہوں تم اپنے والد اور بھائی بہنوں کے سلسلے میں کتنی سچی ہو۔"

"پاپا نے ہمارے، خاص طور پر میرے لیے بڑی قربانی دی ہے۔ وہ چاہتے تو دوسری شادی کر سکتے تھے مگر انہوں نے نہیں کی...... ساری زندگی ایسے ہی گزار دی۔"

"تم اپنی مدر کا ذکر نہیں کرتیں۔"

"میں ضرورت نہیں سمجھتی عالیان!"

عالیان کو اس کی ناگواری تاڑ لینا مشکل نہ ہوئی۔

"ممی، ڈیڈی بہت ایکسائٹڈ ہیں میری شادی کے سلسلے میں۔" عالیان نے انیقہ کا موڈ تاڑ کر موضوع بدل دیا۔

"تم ایک بیٹے جو ہو ان کے۔"

''ایک ہی نہیں...... نیک بھی ہوں۔''

''اپنے منہ میاں مٹھو۔''

''آزمالو۔''

''آزمانے کا وقت گزر گیا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''اب تو جیسا ہے، جہاں ہے کی بنیاد پر قبول کرنا پڑے گا۔''

☆☆☆

وہ بھی ایک شام ہی تھی۔ انیقہ کی شادی میں ایک ہفتہ باقی تھا۔ وہ ان دنوں اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات سے فراغت لے کر شادی کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ عالیان کا کہنا تھا یہ دن زندگی میں ایک ہی بار آتا ہے اس لیے ہر ممکن اہتمام کیا جانا چاہیے۔

ایک بار!

وہ عالیان کی بات سن کر چپ رہی تھی...... نہ جانے کیوں بعض لوگ اسے کھیل سمجھتے ہیں...... تو نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی...... انیقہ کا فیصلہ تھا بلکہ اپنے آپ سے عہد کہ اس کی زندگی میں یہ دن صرف ایک بار آئے گا...... وہ آخری سانس تک اس دن اور اس عہد کا تقدس برقرار رکھے گی۔ وہ ابر آلود شام جب اس کی ماں نے اس کے باپ سے اپنا راستہ جدا کیا تھا، آج بھی اس کے دل کو اپنے خونیں پنجوں میں جکڑے ہوئے تھی۔ آج بھی اس شام کا سناٹا اس کی سماعت میں سائیں سائیں کرتا تھا۔ گھر اجڑ گیا تھا۔ اس کا اور اس کے بھائی بہنوں کا بٹوارا ہو گیا تھا۔ وہ اپنے انتہائی قریبی رشتوں کی محبت کو بوند بوند ترسی تھی۔ نہ جانے لوگ کیسے شراکتِ زندگی کا عہد توڑ لینے کی ہمت کر لیتے ہیں۔

انیقہ کو اپنی بروکن فیملی کے قصے میں سراسر اپنی ماں قصوروار نظر آتی تھی۔ اس کے باپ کا الیہ بس یہی تھا نا کہ وہ عروج سے زوال میں جانے کے بعد بیوی کو تعیشات دینے میں ناکام تھا۔ زندگی کی بنیادی ضروریات تو پھر بھی پوری کر ہی رہا تھا وہ...... نباہنے والے تو کانٹوں پر بھی گزارہ کر لیتے ہیں۔ جس رشتے کی بنیاد خلوص پر نہیں مفاد پر ہو، اس میں پائیداری اور برکت کیونکر ممکن ہے بھلا۔ اپنے ٹوٹے اور بکھرے ہوئے گھرانے کی کتھا میں انیقہ کو اپنا باپ بے قصور اور قابلِ رحم لگتا تھا۔

وہ ایک شام...... کتنی درد بھری تھی۔

ایک اور شام!

اس شام وہ شاپنگ کے بعد شاہ تاج اور امینہ کے ساتھ گھر واپس لوٹی تو شاہ مراد اپنا سینہ پکڑے لاؤنج میں

خوبی

ایک ٹیلی فون مکینک کی گاڑی کچے راستے پر کیچڑ میں پھنس گئی جو انتہائی کوشش کے باوجود نہ نکل سکی۔ مکینک نے کار میں سے فون کا اضافی ریسیور جس کے ساتھ دو تین فٹ لمبی تاریں منسلک تھیں، نکالا اور قریب ہی ٹیلی فون کی تاروں کے پول پر چڑھ کر ریسیور کی تاروں کو جوڑا اور قریبی فارم ہاؤس کے نمبر ڈائل کر کے سلسلہ ملنے پر فارم ہاؤس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہیلو مسز جانسن! میری گاڑی دلدل میں پھنس گئی ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارا شوہر فارم ہاؤس کے سامنے پودوں کو پانی دے رہا ہے۔ کیا تم اسے میری مدد کے لیے بھیج سکتی ہو؟''

''کمال ہے۔'' ریسیور پر جواب ملا۔ ''مجھے آج تک اس فون پر آواز صاف سنائی نہیں دی اور تم کو اس میں میرا شوہر بھی دکھائی دے رہا ہے۔''

(مرسلہ: رابعہ اشعر، ملتان)

ہمت

میرا دوست کاظمی شکار سے واپس آیا تو میں اس سے ملنے گیا۔ وہ اپنے شکار کی کہانیاں سنا رہا تھا۔ محفل میں دوسرے لوگ بھی تھے اور واہ واہ کر رہے تھے۔ وہ کہانیاں سنا چکا تو میں نے پوچھا۔ ''کوئی انوکھی، کوئی عجیب و غریب بات ہوئی ہو تو سناؤ۔''

کہنے لگا۔ ''ایک رات بارہ بجے میری آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں ایک سیاہ کوبرا جس کا ڈسا پانی تک نہیں مانگتا، میرے سینے پر کنڈلی مارے اور پھن پھیلائے بیٹھا ہے۔ میں نے کن انکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن قریب میں نہ کوئی لاٹھی تھی اور نہ کوئی بندوق۔ اتفاق سے وہ پستول بھی جسے میں تکیے کے نیچے رکھ کر سوتا تھا، میز کی دراز ہی میں پڑا رہ گیا تھا۔''

''خدا کی پناہ، کاظمی!'' میں نے کہا۔ ''پھر تم نے کیا، کیا؟''

''کچھ کر ہی نہیں سکتا تھا، مجبوری تھی۔'' کاظمی نے بتایا۔ ''اس لیے میں آنکھیں بند کر کے دوبارہ سو گیا۔''

(مرسلہ: محمد آذین رضوان، کراچی)

صوفے پر بیٹھے تھے۔ چہرے پر شدید تکلیف کے آثار تھے۔ تینوں گھبرا گئے۔

''کیا ہوا پاپا؟'' انیقہ نے پوچھا۔

''سانس نہیں آرہا۔'' شاہ مراد نے بہ مشکل کہا۔

''او مائی گاڈ!'' انیقہ نے عبدل کو پکارا۔ وہ لپکتا ہوا آیا اور اس نے انیقہ کے پوچھنے پر بتایا کہ ابھی ذرا دیر پہلے ہی تو وہ صاحب کو ٹھیک ٹھاک چھوڑ کر گیا تھا۔

شاہ مراد کو ایمرجنسی میں اسپتال لے جانا پڑا۔ پتا چلا دل کا دورہ تھا۔ انیقہ کے فون کرنے پر عالیان بھی اسپتال پہنچ گیا۔ انجیوگرافی ہوئی۔ دل کے دو والو بند تھے۔ انجیو پلاسٹی کرنی پڑی۔ خدا کی مہربانی اور بروقت طبی امداد سے جان بچ گئی۔

شاہ مراد اسپتال سے گھر آئے تو انہوں نے انیقہ کو ہدایت کی کہ اس کی شادی کا پروگرام ان کی علالت کے باعث التوا میں نہ ڈالا جائے۔

''پاپا! آپ ٹھیک ہوجائیں، باقی سب کام بعد میں۔'' انیقہ نے کہا۔

''میں اچھا ہوں...... ٹھیک ہوں...... شادی کی تیاری رکنی نہیں چاہیے ورنہ میں خود اٹھ کھڑا ہوں گا۔''

''اوکے...... اوکے پاپا...... ایز یو وش!''

''بیٹی ہو اس لیے تمہیں رخصت کرنے پر مجبور ہوں ورنہ...... تم تو میرا بیٹا ہو...... میرا حوصلہ، میری قوت ہو۔''

''تھینک یو پاپا!'' انیقہ نے شاہ مراد کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چوما اور اپنی آنکھوں سے لگالیا۔

''خدا تمہیں جہان بھر کی خوشیاں دے۔''

''پاپا! خوشیوں سے زیادہ ساتھ نبھانا اہم ہوتا ہے۔''

''بے شک!'' شاہ مراد نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''محرومی انسان کی خواہش بن جاتی ہے...... تم نے بروکن فیملی کا درد سہا ہے...... مجھے یقین ہے تم اپنا گھر ہمیشہ سنبھال کر رکھوگی۔''

☆☆☆

اس شام وہ ڈیزائنر سے اپنا نفیس عروسی لباس لے کر گھر واپس لوٹی تھی۔ لاؤنج میں پہنچی تو ماں کو شاہ تاج اور امینہ کے ساتھ بیٹھے دیکھ کر اس کے قدم جہاں کے تہاں رہ گئے۔ وہی حسن، وہی خوش لباسی، وہی آرائش۔ وہ کئی سال بعد ماں کو دیکھ رہی تھی۔ وقت ماں کے لیے تو جیسے گزرا ہی نہ تھا۔ شاہ تاج اور امینہ، انیقہ کو قدرے خوف اور اندیشے سے یوں دیکھ رہے تھے جیسے کمزور رعیت کو طاقتور حکمران کی ناراضگی کا خوف ہو۔ اسے دیکھ کر حسن آرا، شاہ تاج اور امینہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور حسن آرا اپنے دونوں بازو انقتاً اس کی جانب یوں وا کیے ہوئے تھیں جیسے اسے اپنے سینے سے لگانے کی منتظر ہوں۔ وہ سر موا اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ کڑی نظروں سے اس نے ماں کو سرتاپا دیکھا۔ جدید تراش خراش کا سفید لباس...... دوپٹا شانوں پر...... بال تراشیدہ اور پلاٹینم بلونڈ رنگے ہوئے...... نہایت مہارت سے کیا گیا قدرتی نظر آنے والا میک اپ...... عمدہ جیولری...... پیروں میں قیمتی سینڈلز، سینٹرل ٹیبل پر رکھا بیگ اور لاؤنج میں پھیلی مشام جاں کو معطر و متاثر کرتی خوشبو۔

''ملوگی نہیں؟'' حسن آرا اسے اپنی جگہ سے حرکت نہ کرتے دیکھ کر بولیں۔

''کس ناتے؟'' اس کا لہجہ تلخ تھا۔

''بیٹی ہو میری۔''

''صرف اپنے باپ کی۔''

''ناراض ہو؟'' حسن آرا کے انقتاً پھیلے بازو دھموداً لٹک گئے۔

''کیوں آئی ہیں؟''

''تمہارے پاپا کو دیکھنے...... تم سے ملنے۔''

''پاپا سے آپ کا اب کیا رشتہ؟''

''میرے بچوں کے باپ ہیں۔''

انیقہ کو انکار کی جا نہ ملی۔

''تمہاری ماں ہوں۔'' اسے خاموش پا کر انہوں نے اپنا دوسرا حق جتایا۔

''میری مجبوری۔''

''میں مجبور تھی بیٹا!'' حسن آرا نے روہانسی ہونے کی کوشش کی۔

''اپنی مجبوریوں کی داستان مجھے نہ سنائیں...... مجھے معلوم ہے آپ کتنی مجبور تھیں۔''

حسن آرا رونے لگیں۔

''بہت تڑپی ہوں میں تمہارے لیے۔''

''کبھی پلٹ کر خبر نہیں لی بھی۔''

''میں بہت دکھی ہوں...... بہت پریشان ہوں۔''

''مجھے اندازہ ہے۔'' انیقہ نے طنز سے کہا پھر قدرے توقف سے بولی۔ ''آپ نہ دکھی ہیں نہ پریشان...... آپ صرف سیلف سنٹرڈ ہیں...... اپنی ذات کی اسیر...... آپ کو اپنے سوا کچھ نہیں دکھتا۔ آپ آج بھی ویسی ہی بنی سنوری ہیں جیسی ہمارے بچپن میں ہوا کرتی تھیں۔ دکھی اور پریشان لوگوں کا حلیہ تو اور ہی ہوا کرتا ہے۔''

''اپنا خیال رکھنا میری عادت ہے۔''

''کبھی تو دوسروں کا خیال کب رکھا آپ نے۔''

''مجھے طعنے مت دو۔'' حسن آرا نے مٹھی میں دبا ٹشو پیپر اپنی آنکھوں پر پھیرا۔

''میرے پاس اور چھوڑا کیا تھا آپ نے۔''

''میں سمجھ رہی تھی تم کچھ بدل گئی ہو گی۔''

''بدلتے وہ ہیں جن کی نیت ٹھیک نہیں ہوتی۔''

شاہ مراد اپنے کمرے سے لاؤنج میں آ گئے اور انہوں نے سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔

''کیسی طبیعت ہے؟'' حسن آرا نے ان سے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں...... آپ سب کھڑے کیوں ہیں؟'' شاہ مراد نے کہا۔

''جس کا گھر ہے، وہ بیٹھنے کو نہ کہے تو......'' حسن آرا نے کن انکھیوں سے انیقہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''گھر پاپا کا ہے۔'' انیقہ بولی۔

شاہ مراد نے سب کو بیٹھنے کا اشارہ دیا۔ انیقہ لاؤنج سے جانے کے درپے ہوئی۔

''کہاں بیٹا...... بیٹھو۔''

انیقہ بادل ناخواستہ بیٹھ گئی۔

''میں آپ کی عیادت کو آئی تھی۔'' حسن آرا نے کہا۔

''جزاک اللہ!''

''مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ اس گھر میں میری اپنی اولاد مجھ سے دشمن کا سا سلوک کرے گی۔'' حسن آرا نے انیقہ کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے دل شکستہ لہجے میں کہا۔

''کوئی مہمان گھر آئے تو اس کی خاطر مدارات کی جاتی ہے۔'' شاہ مراد نے کہا اور عبدل کو آواز دی۔

''جی صاحب!'' عبدل لپکتا ہوا آیا۔

''کچھ کھانے پینے کو لاؤ بھئی۔''

''کچھ نہیں...... مجھے جانا ہے۔''

''ماما!'' شاہ تاج کی نظریں انیقہ کے چہرے پر تھیں اور وہ مخاطب حسن آرا سے تھا۔ ''تھوڑی دیر تو بیٹھیں۔''

''بس بیٹا...... تم آنا نا میرے پاس۔''

''میں آپ کو چھوڑنے آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔''

''نہیں نہیں...... اس کی ضرورت نہیں۔ میں خود چلی جاؤں گی۔'' وہ جانے کو اٹھ کھڑی ہوئیں۔

شاہ مراد نے امینہ، شاہ تاج اور انیقہ کے چہروں پر لکھی تحریر پڑھنے کی کوشش کی۔

''صرف ایک سوال ہے تم سے حسن آرا!'' شاہ مراد گمبھیر آواز میں بولے۔

حسن آرا چونک کر انہیں دیکھنے لگیں۔

''ہمارے بچوں کا کیا قصور تھا؟'' شاہ مراد کی آواز درد میں ڈوبی ہوئی تھی۔

حسن آرا ان کے سوال کا جواب دیے بنا چلی گئیں۔

امینہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

انیقہ آگے بڑھی اور اس نے امینہ کو گلے لگاتے ہوئے اپنا ہاتھ قریب کھڑے شاہ تاج کے شانے پر یوں رکھ دیا جیسے اسے دلاسا دینا چاہتی ہو۔

☆☆☆

انیقہ کی شادی کے دعوت ناموں میں مدعوئین کے نام لکھے جا رہے تھے۔ شاہ تاج کی ہینڈ رائٹنگ عمدہ تھی۔ وہی نام لکھ رہا تھا۔

''پاپا! ایک بات پوچھوں؟'' اس نے شاہ مراد سے کہا۔

''پوچھو بیٹا!''

''مہمانوں کی لسٹ میں ماما کا نام نہیں...... انہیں انوائٹ نہیں کریں گے؟''

''انیقہ سے پوچھو۔''

''بڑے تو آپ ہیں پاپا!''

''شادی انیقہ کی ہے۔''

''انویٹیشن تو آپ کی طرف سے جا رہی ہے۔''

''فارمیلیٹی ہے بیٹا!''

''باجی سے میں نہیں پوچھ سکتا...... وہ ناراض ہو جائیں گی۔''

''اس نے چھوٹی عمر میں درد سہا ہے بیٹے!''

''درد تو ہم سب نے سہا ہے پاپا! عالیہ خالہ کے گھر میں تھے تو انہوں نے ماما کو اور ہمیں اپنے گھر کا اوپر کا حصہ رہنے کے لیے دے دیا تھا۔ ہم سیکنڈ کلاس سٹیزن بن کر رہتے تھے۔ پھر ماما کے ساتھ اس آدمی کے گھر شفٹ ہوئے تو...... کیا ہوا۔''

شاہ مراد نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ''یہی ہوتا ہے بیٹے...... جب کوئی گھر ٹوٹتا ہے تو ایسی ہی دلدوز کہانیاں جنم لیتی ہیں۔''

''گھر توڑنے والے بڑے لوگ سوچتے کیوں نہیں پاپا؟''

''عاقبت نا اندیش ہوتے ہیں۔''

''آپ پوچھیے گا پاپا!''

''کیا؟''

''انیقہ باجی سے...... ماما کو انوائٹ کرنے کے لیے۔''

تبھی انیقہ آگئی اور شاہ مراد نے اس اتفاق کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شاہ تاج سے کہا۔ ''تم خود پوچھ لو بہن سے۔''

''کیا پاپا؟'' انیقہ نے چونک کر پوچھا۔

''بولو۔'' شاہ مراد نے اسے اکسایا۔

''وہ...... باجی...... ماما کو...... ماما کو انوائٹ کرنا ہے۔''

''نہیں۔'' انیقہ نے دوٹوک کہا۔ ''ایک پنڈورا بکس کھل جائے گا۔ سوشل میڈیا پر لوگ اگلا پچھلا ادھیڑ کر رکھ دیں گے۔ شادی سے زیادہ فیملی میٹرز کھنگالنے میں دلچسپی ہوگی۔ ریٹنگ کے چکر میں لوگ طرح طرح کی کہانیاں بنائیں گے۔ جو نہیں بھی ہوگا، وہ بیان کریں گے۔ اس منحوس آدمی شعیب کا نام بھی آئے گا اور اس کا ری ایکشن نہ جانے کیا ہو۔ انیتا کی زندگی پر اس کے اثرات پڑ سکتے ہیں۔ لوگ تو ایسی ایسی کہانیاں گھڑ لیتے ہیں کہ خدا کی پناہ...... کلوزڈ چیپٹر کلوز ہی رہے تو اچھا ہے۔''

شاہ مراد نے تائید میں سر ہلایا اور شاہ تاج سے بولے۔ ''انیقہ ٹھیک کہتی ہے۔''

شاہ تاج بھی قائل دکھائی دیا۔

شاہ مراد نے ایک گہری سانس بھری اور نہایت ملال سے بولے۔ ''کبھی کبھی ایک فرد کی غلطی بہت سوں کے لیے خوشیوں میں بھی رنج و ملال کا باعث بن جاتی ہے۔''

انیقہ کو باپ کا چہرہ دکھ سے عبارت دکھائی دیا۔

☆☆☆

انیقہ کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ شادی کے بعد تیسرے چوتھے دن وہ اور عالیان ہنی مون کے لیے چلے گئے۔ گھر میں سناٹا ہوگیا۔ شاہ تاج اور امینہ کبھی شاہ مراد کے پاس ہوتے، کبھی حسن آرا کے پاس چلے جاتے۔ ایک روز حسن آرا بھی ان کے ساتھ چلی آئیں۔

''آپ کے دونوں بچوں نے مجھے پھر یہاں آنے پر مجبور کردیا۔'' حسن آرا نے شاہ مراد سے کہا۔

''بچے صرف میرے نہیں، تمہارے بھی ہیں۔'' شاہ مراد نے کہا۔

''میں آپ سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔''

''کس بات کی؟''

''اپنی غلطی کی...... آپ بہت اچھے انسان ہیں...... مجھے آپ کی قدر کرنا نہ آئی۔''

''مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں...... جو ہوا وہ ہمارے مقسوم میں لکھا تھا۔''

''دونوں بچے چاہتے ہیں کہ ہماری فیملی ری یونائٹ ہو جائے۔'' حسن آرا کچھ جھجکتے ہوئے دبی زبان سے بولیں۔

''میں سمجھا نہیں۔''

''میں واپس آنا چاہتی ہوں۔''

''کہاں؟''

''آپ کی زندگی میں...... میں آپ سے اپنا رشتہ پھر سے جوڑنا چاہتی ہوں۔''

شاہ مراد کچھ دیر دم بخود بیٹھے رہے پھر انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

''آپ انیقہ سے تو ضرور مشورہ لینا چاہیں گے۔''

''مجھے کسی سے مشورہ لینے کی ضرورت نہیں...... میں اپنے فیصلوں میں خود مختار ہوں۔''

''تو پھر میں کیا سمجھوں؟''

''ہمارے راستے عرصہ ہوا جدا ہو چکے...... انہیں جدا ہی رکھنے میں عافیت ہے۔''

''بچوں کی خواہش ہے۔''

''خواہش کا کیا ہے...... خواہش تو میری بھی یہی تھی کہ تم اور میں تمام تر اختلافات کے باوجود اپنے بچوں کی خاطر تمام زندگی اکٹھے اپنے بچوں کے ساتھ بسر کریں مگر...... ہر خواہش کب پوری ہوتی ہے۔ میں سوچتا تھا مجھے ایک فلم ملے گی، پھر دوسری، پھر تیسری...... حالات بدل جائیں گے...... بڑی سی ڈائننگ ٹیبل پر تم اور میں...... اپنے بچوں...... اور اپنے بچوں کے بچوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا کریں گے...... باتیں کریں گے...... وہ باتیں جو ہم دوسری روز مرہ مصروفیات کے باعث ایک دوسرے سے نہیں کرپاتے...... مگر...... خواب ہوگئی وہ خواہش۔'' شاہ مراد نے ایک سرد آہ بھری۔

''ایسا ہی ہوگا...... بس ایک موقع...... ایک موقع دیں مجھے۔''

شاہ مراد نے نفی میں سر ہلایا اور دھیمی آواز میں بولے۔ ''ٹو لیٹ...... ٹو لیٹ حسن آرا!'' صوفے کی پشت سے اپنا سر ٹیک کر چھت کے رخ پر دیکھتے ہوئے ان کی آنکھوں میں سرخی اتر آئی اور شکیل بدایونی کی غزل کے چند منتخب اور حسب حال اشعار تحت اللفظ میں ان کی زبان پر دھیمی آواز میں مچلنے لگے۔

وہی آبلے ہیں وہی جلن، کوئی سوزِ دل میں کمی نہیں
جو لگا کے آگ گئے تھے تم، وہ لگی ہوئی ہے بجھی نہیں
وہی کارواں، وہی راستے، وہی زندگی، وہی مرحلے
مگر اپنے اپنے مقام پر، کبھی ہم نہیں، کبھی تم نہیں

⌘⌘⌘